مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

اسلامیات

ساتواں پرچہ

مسلمان عالمی گاؤں میں

(ایم۔اے، سال دوم)

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Maulana Azad National Urdu University

(A Central University established by an Act of Parliament 1998)

پروفیسر خواجہ محمد شاہد

وائس چانسلر (انچارج)

پروفیسر کے۔ آر۔ اقبال احمد

ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم

خود اکتسابی مواد برائے

اسلامک اسٹڈیز (سال دوم)

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد 500032

EPABX : 040-23008402/03/04

www.manuu.ac.in

طبع: ستمبر 2015ء

تحریری معاونین

مصنفین	اکائی
• پروفیسر سید محمد احسن	1-3
• ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی	4-6
• پروفیسر اشتیاق دانش	7-11
• ڈاکٹر محمد ارشد	12-15
• پروفیسر اختر الواسع	16-18

مدیر

• ڈاکٹر محمد فہیم اختر

اسوسی ایٹ پروفیسر' شعبہ اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

مدیر اعلیٰ

ڈاکٹر محمد فہیم اختر

اسوسی ایٹ پروفیسر' شعبہ اسلامک اسٹڈیز

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' حیدرآباد

فہرست مضامین

پیش لفظ

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' جو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1998ء میں قائم ہوئی' ملک کی واحد مرکزی یونیورسٹی ہے' جہاں اردو زبان کے ذریعہ مختلف مضامین کی تعلیم دی جارہی ہے۔ یہ یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی دونوں ہی طریقوں سے تعلیم وتدریس کی سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے جہاں روایتی تعلیم کے تحت' سائنس اور سماجی علوم' لسانیات' انتظامیہ وکامرس' تعلیم وتربیت' انفارمیشن ٹکنالوجی اور صحافت وغیرہ کے مختلف مضامین میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح سے لے کر ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک متعدد کورسز چلائے جارہے ہیں' وہیں فاصلاتی تعلیم کے تحت انڈر گریجویٹ' پوسٹ گریجویٹ' سرٹی فیکیٹ اور ڈپلومہ کی سطحوں پر مختلف مضامین کے کورسز چلائے جارہے ہیں' جن کے ذریعہ پورے ملک کے طلبہ وطالبات کی ایک بہت بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہورہی ہے۔ روایتی تعلیم کے تحت جاری کورسز میں ایم۔اے' اسلامیات' کا کورس بھی شامل ہے۔ جس کی دو سالہ تعلیم یونیورسٹی کے مرکزی کیمپس واقع حیدرآباد میں دی جارہی ہے۔

یونیورسٹی نے چند برسوں قبل فاصلاتی تعلیم کے تحت بی۔اے کے تین سالہ کورس میں اختیاری مضمون کے طور پر' اسلامیات' (Islamic Studies) کو شامل کیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے پہلی بار ملک کے اندر اردو زبان میں اسلامیات کا نصابی مواد فاصلاتی تعلیم کے نہج پر پیش کیا گیا تھا۔ بی۔اے کا یہ کورس کامیابی کے ساتھ جاری ہے' اور طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد' اسلامیات' کے ساتھ بی۔اے کی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔

اس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ فاصلاتی تعلیم کے تحت' اسلامیات' میں ایم۔اے کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اس کے مطالبے بھی کیے جارہے تھے۔ چنانچہ اسی ضرورت اور طلبہ وطالبات کے تقاضوں کے پیش نظر 2014ء میں ایم۔اے' اسلامیات' کا آغاز کیا گیا۔ زیر نظر کتاب اسی کورس کے لیے تیار کیے گئے' خود تدریسی مواد' (Self Learning Material) برائے سال دوم کا مجموعہ ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کورس کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے جدید دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نیا اور جامع نصاب تیار کیا ہے۔ اور اس نصاب کے مطابق اسلامیات کے ماہرین کی مدد سے درسی مواد تیار کر لیے گئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اس حوالہ سے دوبارہ یہ اعزاز حاصل ہورہا ہے کہ ملک میں پہلی مرتبہ اردو زبان میں ایم۔اے اسلامیات کا درسی مواد (آٹھ پرچوں پر مشتمل آٹھ کتابوں کی شکل میں) پیش کیا جارہا ہے اور اس سے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت مکمل ہورہی ہے۔

اسلامیات کا موضوع بڑا وسیع اور متنوع ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار برس کے طویل دورانیہ پر مشتمل اور ہندوستان کے بشمول دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلی اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وثقافت اور علوم وفنون کے میدانوں کی سرگرمیوں کا احاطہ

شامل ہے۔اس لیے اسلامیات کا موضوع نہ صرف سماج کے ایسے متعدد پہلوؤں کے مطالعہ کا موقع فراہم کرتا ہے جو انسانی زندگی سے گہرا ربط رکھتے ہیں بلکہ انسانی سماج کے گوناگوں مسائل کے بارے میں گہری بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔

ایم۔اے اسلامیات کا یہ کورس آٹھ پرچوں پر محیط ہے، جسے دو سال کی تعلیم کے دوران مکمل کیا جائے۔سال اول کے چار پرچوں میں اسلام کا تعارف اور بنیادی تعلیمات' علوم اسلامیہ' **مسلم تہذیب وثقافت کی تاریخ** 'نیز اسلامی افکار ونظریات کے جدید تناظر پر مواد پیش کیا گیا ہے۔سال دوم کے لیے بھی چار پرچے ہیں۔ چنانچہ پانچواں پرچہ '**اسلام ہندوستان میں**' کے عنوان سے ہے' جس کے پانچ بلاک میں ہندوستان میں اسلام کی آمد واشاعت پر گفتگو کی گئی ہے۔پھر دہلی سلطنت کے قیام اور اس کے تین سو سالہ دور کے تمدنی وتہذیبی کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے' علاقائی حکومتوں کے ضمن میں دکن کی بہمنی سلطنت اور اس سے نکلنے والی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ دیگر علاقائی چھوٹی حکومتوں پر گفتگو کی گئی ہے۔پھر مغل حکومت کی تاریخ، تہذیب وتمدن اور کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔آخر میں جدید ہندوستان کے عنوان سے برطانوی دور اور اس کے بعد کی مسلم ریاستوں نیز ہندوستان کی مسلم شخصیات' تحریکات اور اداروں پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔چھٹے پرچہ میں '**علوم وفنون میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی خدمات**' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔چنانچہ اس میں اسلام اور سائنس' علوم وفنون میں مسلمانوں کا حصہ' استشراق ومستشرقین اور اسلامی علوم میں غیر مسلموں کی خدمات کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ساتواں پرچہ '**مسلمان عالمی گاؤں میں**' کے عنوان سے ہے۔اس میں مسلم دنیا کے علاوہ' یورپ وامریکہ اور افریقہ وایشیا وغیرہ کی مسلم اقلیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے عالمی گاؤں کی موجودہ مسلم تحریکات واداروں اور مسلم مفکرین ومصلحین کا تعارف کرایا گیا ہے۔آٹھواں پرچہ '**مسلم فلسفہ' کلام، مسلم فرقے اور تجدید دین**' کے موضوع پر ہے، جس میں مسلم فلاسفہ' علم کلام ومتکلمین اسلام' متعدد مسلم فرقے اور تجدید دین کے حوالے سے ہونے والے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یونیورسٹی نے اس نصاب کی تیاری میں ممتاز ماہرین اسلامیات اور دانشوران فن سے استفادہ کیا ہے جنہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اسے تیار کرکے یونیورسٹی کو اپنا قیمتی تعاون پیش کیا ہے۔توقع کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اسلامیات کے طلبہ وطالبات کی ضرورت بہتر طور پر پوری کرے گی' ساتھ ہی اسلامی مطالعات کے باب میں قابل قدر استفادہ کا باعث بنے گی۔

پروفیسر خواجہ محمد شاہد

شیخ الجامعہ (کارگذار)

بلاک: 1 مسلم دنیا

فہرست

اکائی 1: مغربی ایشیاء: خلیج عرب کے ممالک، یمن، شام، اردن، لبنان

اکائی کے اجزا

1.1 مقصد

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوگا کہ مغربی ایشیاء کے ممالک میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کیا ہے، اور ان کی تاریخ کیا رہی ہے، اسلام کی آمد سے پہلے یہاں کے حالات کیا تھے، اور اسلامی دور میں یہاں کی کیا حالت تھی، نیز ہم اس بات سے بھی روشناس ہوں گے کہ مغربی نوآبادیاتی نظام میں ان ملکوں کی کیا حیثیت رہی، نوآبادیاتی نظام نے ان کو کس قدر متاثر کیا، اور دور جدید میں ان میں کیا تبدیلیاں آئیں، ان ممالک کی موجودہ وقت میں کیا حالت ہے۔

1.2 تمہید

مغربی ایشیاء کے ممالک ابتدا سے اسلام کا مرکز رہے ہیں، قرآن کا نزول جزیرۃ العرب میں ہوا، اور حضور ﷺ کی وفات تک تقریبا پورا جزیرۃ العرب آپ کے زیرنگیں آ گیا تھا، خلافت راشدہ میں فتوحات کی وسعت کے ساتھ ہی یہ ممالک اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے، اور ایک طویل عرصہ تک اسلامی تہذیب وتمدن کی تشکیل وتعمیر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ اور یوروپی نوآبادیاتی نظام کے توسع نے پوری دنیا کو عموما اور عالم عرب کو خصوصا متاثر کیا۔ جس کی زد ان ممالک پر سب سے زیادہ پڑی، کیوں کہ عرب قومیت کا پرفریب نعرہ دیکر ان ہی کے ذریعہ سلطنت عثمانیہ کو شکست سے دوچار کیا گیا تھا۔ اور یہ ممالک پہلے سے طئے شدہ پالیسی کے نتیجہ میں برطانیہ اور فرانس میں تقسیم کر لئے گئے۔ طویل جدوجہد کے بعد ان کو آزادی کا سورج دیکھنا نصیب ہوا، اور یہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکے۔ اس اکائی میں ہم ان ممالک کی مختصر تاریخ کے ساتھ ساتھ موجودہ حالت اور نظام کا جائزہ لیں گے۔

1.3 مغربی ایشیاء

عربی تاریخ میں مغربی ایشیاء کی اصطلاح نہیں پائی جاتی، یہ جدید دور کی پیداوار ہے، یہاں اس سے مراد جنوب مغربی ایشیاء کے ممالک ہیں، جن میں جزیرہ العرب کے ممالک کے علاوہ ہلال خصیب یعنی زرخیز ہلال کے ممالک شامل ہیں۔ اس اکائی میں ہم خلیج عرب کے چھ ممالک یعنی سعودی عرب، قطر، بحرین، کویت، عمان، امارات، یمن اور ملک شام، اردن اور لبنان کا جائزہ لیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ممالک ابتدا سے اسلام کا گہوارہ رہے ہیں۔ ان ممالک کی اقتصادی وجغرافیائی اہمیت کے پیش نظر ان کی اہمیت عالمی سیاست میں بے حد بڑھ جاتی ہے، خصوصا تیل کی پیداوار کے بعد یہاں عالمی برادری اور بڑی طاقتوں کی نظریں اس پر مرکوز ہو چکی ہیں۔

1.4 خلیج عرب کے ممالک

خلیج عرب کا علاقہ جسے عام طور پر جزیرہ نمائے عرب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، کے بارے میں خیال ہے کہ یہ دنیا کا وہ قدیم ترین علاقہ ہے، جس پر انسان آباد ہوا، بعض روایات کے مطابق حضرت آدم وحوّا کی ملاقات جنت سے نکالے جانے اور زمین پر بھیجے جانے کے بعد یہیں مقام عرفات میں ہوئی تھی۔ خانہ کعبہ پہلا گھر ہے، جو انسانوں نے اللہ کی عبادت کے لئے مکہ مکرمہ میں تعمیر کیا، قدیم زمانہ سے یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، اسلام کی اشاعت کے بعد سے یہ علاقہ اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ ہے۔ حالاں کہ مسلمانوں کے عروج وزوال کے مختلف ادوار میں اس علاقے نے بھی زمانہ کے سرد وگرم دیکھے ہیں، اور امن وقانون کے مسائل سے بھی دوچار

ہوا ہے۔ البتہ جدید عرب ریاستوں کے قیام اور تیل سے حاصل ہونے والی آمدنی نے قبائلی بنیادوں پر قائم ان ریاستوں کو امن واستحکام بھی عطا کیا ہے۔ اور انہیں تعمیر وترقی کے راستہ پر گامزن کیا ہے۔ یہاں اس علاقے اور اس میں واقع عرب ریاستوں کی تاریخ وثقافت اور سماج پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں، تاہم ذیل میں خلیج تعاون کونسل کے چھ رکن ملکوں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، جو ان کی جدید تاریخ پر مبنی ہے۔

1.4.1 سعودی عرب

اس عرب ملک کا پورا نام ''المملکۃ العربیہ السعودیہ'' ہے، اس کا دارالحکومت نجد کا شہر ریاض ہے، آل سعود کا یہ خاندان یہاں پر حکمراں ہے، جس کی ابتدائی تاریخ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں وادیٔ حنیفہ سے شروع ہوتی ہے، اٹھارویں صدی کے وسط میں کہا جاسکتا ہے کہ سعودی ریاست کا ظہور ہونا شروع ہوا، جب محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کے اشتراک سے نجد کے علاقہ میں ایک نئی سیاسی قوت نے جنم لیا۔ البتہ آل سعود کی سیاسی قوت آئندہ تقریباً ڈیڑھ سو برس تک عروج وزوال سے دوچار ہوتی رہی، یہاں تک کہ 1926 میں عبدالعزیز بن سعود نے نجد وحجاز اور اطراف کے بڑے علاقوں کو زیر نگیں کر کے ایک مستحکم ریاست کی بنیاد رکھی، جو اس وقت مملکت نجد وحجاز کہلائی، 1932 میں اس ریاست کا نام بدل کر مملکت سعودی عرب رکھ دیا گیا۔ اسی دوران مارچ 1938 میں سعودی عرب میں تیل (پٹرول) دریافت ہوا، اور اس دریافت نے مملکت کو معاشی طور پر مستحکم کرنے میں زبردست رول ادا کیا۔

موجودہ سعودی عرب کی اہمیت یہ ہے کہ اسے مسلم دنیا میں دنیوی اور روحانی دونوں طرح کی سیادت حاصل ہے، مذہب اسلام کے اہم ترین مقامات مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی اس ریاست میں موجودگی، اور ان دونوں کا انتظام وانصرام سعودی عرب کو پوری مسلم دنیا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ حالاں کہ سعودی عرب ایک خاندانی بادشاہت ہے، اور آل سعود کو اس میں بنیادی سیاسی ادارے کی حیثیت حاصل ہے، اس کے باوجود عوامی بہبود کے اپنے کاموں کی وجہ سے یہ ایک رفاہی حکومت کا منظر پیش کرتی ہے۔ آئینی طور پر اس ریاست کا حکمراں عبدالعزیز بن سعود کی اولاد میں سے ہوتا ہے، البتہ اس کی حکمرانی قرآن وشریعت اسلامی کے دائرہ میں ہوگی، حالیہ دنوں میں سعودی عرب میں آئینی بادشاہت کے ساتھ بنیادی جمہوری اداروں کو بھی متعارف کرانے کی کوششیں شروع ہوئی ہیں، مثال کے طور پر 2005 میں مقامی کونسلوں کے لئے انتخابات ہوئے، مگر ان میں خواتین کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی، 2011 میں اس وقت کے بادشاہ شاہ عبداللہ نے عورتوں کے لئے مقامی کونسلوں میں ووٹ ڈالنے اور انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا، جس کی حالیہ بادشاہ شاہ سلمان نے بھی تصدیق کی ہے مملکت کا عدالتی نظام اسلامی شریعت کا پابند ہے۔ اسی طرح قانون سازی میں بھی شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔

سعودی عرب جزیرہ نمائے عرب کا سب سے بڑا ملک ہے، اس کا رقبہ 21 لاکھ مربع کیلومیٹر سے زیادہ ہے، اور آبادی تین کروڑ ہے، انتظامی لحاظ سے مملکت 13 صوبوں میں منقسم ہے۔ جن میں ریاض، مکہ اور مدینہ کے صوبے بہت اہم ہیں۔ اسی طرح مملکت میں بیس بڑے شہر ہیں، ان میں بھی ریاض، مکہ اور مدینہ کے علاوہ جدہ، طائف، اور دمام بڑے اور اہم شہروں میں شمار ہوتے ہیں، مملکت کے زیادہ تر باشندے عرب ہیں، زیادہ تر علاقہ صحراء یا نیم صحراء ہے، صرف دو فیصدی علاقہ ہی قابل کاشت ہے، البتہ تیل کی دولت سے مالامال ہے۔

جدید سعودی عرب کے قیام تک اس علاقہ میں لوگوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہیں تھا، 1932 میں مملکت کے باضابطہ قیام کے

ساتھ ہی ابتدائی کوششوں کا آغاز ہوا، اس سے قبل زیادہ تر مساجد سے ملحق مدارس میں روایتی تعلیم ہوتی تھی، البتہ تیل کی دریافت سے حاصل ہونے والی آمدنی نے مملکت کی تعلیم کے فروغ کی کوششوں کو تیز گامی عطا کی، چنانچہ 1945 میں بنیادی تعلیم کے لئے اسکولوں کے قیام کا خاکہ تیار ہوا، اور صرف چھ سال کے اندر دوسو سے زیادہ اسکول قائم کئے گئے۔ جن میں تیس ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ 1954 میں باضابطہ وزارت تعلیم کا قیام عمل میں آیا، اور 1957 میں سعودی عرب کی پہلی یونیورسٹی شاہ سعود یونیورسٹی قائم ہوئی، اس کے بعد سے سعودی عرب میں نہ صرف بنیادی تعلیم کے ڈھانچے میں کافی ترقی ہوئی ہے، بلکہ اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی بڑی مقدار میں وجود میں آئے ہیں، صرف کالجز اور یونیورسٹیز کی تعداد ہی زیادہ 50 سے زیادہ پہونچ چکی ہے۔

1.4.2 عمان

اس ملک کا پورا نام سلطنت عمان ہے، اوائل اسلام میں یہاں کے باشندے مسلمان ہوگئے تھے، زمانہ قدیم سے یہ سمندری تجارت کا اہم مرکز رہا ہے، اور ایک طویل عرصہ تک یہاں ایک مضبوط سلطنت قائم تھی۔ البتہ بیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے اسے زوال ہو گیا۔ اور یہ برطانیہ کے زیر اثر آ گئی۔ مسقط اس ملک کا دارالحکومت ہے، اور خطہ کی اہم تجارتی بندرگاہ بھی ہے۔ البتہ خطے کے دوسرے ممالک کی طرح یہاں تیل کی دولت زیادہ نہیں ہے، اور اس کے تیل کے ذخائر نسبتا کم ہیں، زیادہ تر علاقہ صحرائی ہے، اور آبادی ساحلی علاقوں میں ہے۔

سلطنت پر آل سعید کی حکومت ہے، اور سلطان قابوس بن سعید آل سعید اس خاندان کے چودہویں حکمراں ہیں، اور یہ خلیجی ممالک میں سب سے طویل مدت تک حکومت کرنے کا ریکارڈ رکھتے ہیں، اور 1470 سے حکومت کررہے ہیں۔ عمان کا رقبہ تین لاکھ کیلومیٹر اور آبادی 32 لاکھ ہے، انتظامی لحاظ سے سلطنت کو 11 صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اور دس شہر ہیں۔ زبان عربی ہے، اور مذہب اسلام ہے، بیسویں صدی کے وسط تک تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا، اور بہت ہی معمولی روایتی تعلیم ہوتی تھی۔ 1970 تک مملکت میں صرف تین اسکول تھے، جن میں ایک ہزار کے قریب بچے تعلیم پاتے تھے، سلطان قابوس نے اقتدار سنبھالنے کے بعد تعلیم پر خاص توجہ دی، اور اب یہاں ایک ہزار سے زائد سرکاری اسکول ہیں جن میں ساڑھے چھ لاکھ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ 1986 میں عمان کی پہلی یونیورسٹی سلطان قابوس یونیورسٹی قائم ہوئی ہے، اس کے بعد دو دیگر یونیورسٹیاں بھی قائم ہوئی ہیں، مزید برآں کئی ادارے پیشہ ورانہ تعلیم کے لئے بھی وجود میں آئے ہیں۔

1.4.3 متحدہ عرب امارات

ملک کا پورا نام ''دولة الامارات العربية المتحدة'' ہے، اس کا دارالحکومت ''ابوظبی'' کا شہر ہے، یہ ایک وفاقی ریاست ہے، جس میں علاقہ کی سات چھوٹی چھوٹی خاندانی بادشاہتیں شامل ہیں: (1) ابوظبی، (2) دبئی، (3) الشارقہ، (4) عجمان، (5) ام القیوین، (6) الفجیرہ، (7) راس الخیمہ۔ پہلے صرف چھ ریاستیں وفاق میں شامل تھیں، راس الخیمہ نے بعد میں وفاق میں شمولیت اختیار کی، 2 دسمبر 1971 کو ان ریاستوں نے وفاق اور ایک مشترکہ نظام حکومت کا اعلان کیا۔ ریاست کا کل رقبہ 91 ہزار مربع کیلومیٹر ہے، اور آبادی تقریبا 50 لاکھ ہے، 1971 سے پہلے ان ریاستوں کو Trucial States (متصالح ریاستیں) کہا جاتا تھا، اور وہ زیادہ تر برطانوی حکومت کے زیر اثر تھیں، عربی سرکاری زبان ہے، اور ریاست کا مذہب اسلام ہے۔

1970 میں تیل کی دریافت کے بعد متحدہ عرب امارات نے تیزی سے ترقی کی ہے، تیل اور گیس کی دولت کے علاوہ امارات نے متبادل ذرائع میں دلچسپی دکھائی ہے، خاص طور سے براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کے ایک بڑے مرکز کے طور پر ابھرا ہے، اس کا شمار دنیا کی خوشحال اور امیر ترین ریاستوں میں ہوتا ہے، 1970 سے قبل ریاست کی تعلیمی صورتحال اچھی نہیں تھی، البتہ اس کے بعد سے صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی آئی ہے، نہ صرف بنیادی تعلیم پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے، بلکہ اعلی تعلیم بھی بہتر ہوئی ہے، خواندگی کی شرح 90 فیصد سے زیادہ ہے، اور اسے حاصل کرنے کے لئے تقریباً 90 تعلیم بالغان کے مراکز سے مدد لی گئی ہے، بڑی تعداد میں اسکولوں کے علاوہ یونیوسٹیاں بھی قائم ہوئی ہیں، ان میں چار متحدہ عرب امارات یونیورسٹی، خلیفہ یونیورسٹی، امریکن یونیوسٹی، شارجہ اور یونیورسٹی آف شارجہ زیادہ مشہور ہیں۔

1.4.4 قطر

ریاست کا پورا نام دولۃ قطر ہے، اور دوحہ اس ملک کا دار الحکومت ہے، سرکاری زبان عربی ہے، اور ریاست کا مذہب اسلام ہے، قطر کا علاقہ کسی زمانہ میں ایک بڑی اور قدیم حکومت کا مرکز رہ چکا ہے، اور مختلف ادوار میں اسے اہمیت حاصل رہی ہے، بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ملک برطانیہ کے انتداب میں چلا گیا، اور 1971 تک عملاً اس کے زیر اثر رہا، یکم ستمبر 1971 سے ایک آزاد ملک ہے، ملک کا رقبہ تقریباً 12 ہزار کلومیٹر ہے، اور آبادی 22 لاکھ کے قریب ہے۔

قطر بھی بنیادی طور پر ایک خاندانی بادشاہت ہے، جہاں آل ثانی کی حکومت ہے، اور تمیم بن حمد آل ثانی اس کے فرماں روا ہیں، البتہ قطر کی انفرادیت یہ ہے کہ اس ملک نے خطہ کے دیگر ملکوں کے مقابلہ سیاسی اصلاحات زیادہ کی ہیں، ملکویت کے باوجود یہاں پارلیامنٹ ہے، اور اظہار رائے کی آزادی بھی لوگوں کو کسی قدر حاصل ہے، خاص طور پر اپنے ٹیلی ویژن چینل "الجزیرہ" کے عنوان سے قطر نے عالمی سطح پر اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ عرب دنیا میں سیاسی وسماجی بیداری کے فروغ کے حوالہ سے "الجزیرہ" ٹیلی ویژن چینل کا کردار غیر معلولی ہے۔

قطر بھی تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہے، خاص طور پر اس کے پاس گیس کا ذخیرہ عالمی سطح پر تیسرے نمبر پر ہے، تعلیم کے معاملہ میں 70 کی دہائی تک قطر بھی پس ماندہ ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد اس نے تعلیم کے میدان میں نہ صرف یہ کہ سرمایہ کاری کی ہے، بلکہ بڑے پیمانہ پر اصلاحات بھی کی گئی ہیں، تازہ ترین اعداد وشمار کے مطابق عرب دنیا میں سب سے زیادہ شرح خواندگی قطر میں ہے، جو 97 فیصد سے زیادہ ہے، قطر نے اسکولوں کا نظام قائم کرنے کے علاوہ اعلی تعلیمی ادارے بھی قائم کئے ہیں۔ تعلیم کے فروغ کے لئے اس نے باضابطہ تعلیمی شہر بسایا ہے، جہاں دنیا بھر کی بڑی یونیورسٹیوں کے تعلیمی مراکز موجود ہیں۔ عرب سیاست اور سماج میں قطر کا رول انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

1.4.5 بحرین

ملک کا پورا نام دولۃ بحرین ہے، دار الحکومت منامہ ہے، اور سرکاری زبان عربی ہے، ریاست کا مذہب اسلام ہے، رقبہ 765 مربع

کیلومیٹر ہے، اور آبادی 13 لاکھ ہے، 1971 میں آزادی کے اعلان سے قبل تک بحرین بھی برطانیہ کے زیر اثر تھا، اور ترقی برائے نام تھی، البتہ آزادی کے بعد دیگر خلیجی ملکوں کی طرح بحرین نے بھی ترقی کی ہے، تیل اور گیس کی مصنوعات کے علاوہ جہاز سازی کی صنعت بحرین میں اچھی ہے، سیاحت کو بھی بحرین میں بڑے پیمانے پر فروغ دیا گیا ہے۔

بحرین کا نظام حکومت آئینی بادشاہت ہے، اور آل خلیفہ یہاں پر حکمراں ہیں، موجودہ حکمراں کا نام حمد بن عیسی آل خلیفہ ہے۔

1.4.6 کویت

ملک کا پورا نام دولۃ کویت ہے، کویت شہر اس کا دار الحکومت ہے، ملک کی سرکاری زبان عربی اور مذہب اسلام ہے، کویت جدید ملک ہے، اس کی قدیم تاریخ عراق کے شہر بصرہ سے وابستہ ہے، مغربی استعماری دور میں کویت کا علاقہ برطانیہ کے زیر اثر رہا، یہاں الصباح خاندان ایک طویل عرصہ سے حکمراں ہے، البتہ شیخ احمد الجابر الصباح کو جدید کویت کا بانی و معمار کہا جاتا ہے۔

1936 میں برطانیہ کی نگرانی میں تیل کے کنوؤں کی دریافت ہوئی، اور پھر تیل کی دولت سے مالا مال یہ ملک خطہ کی سیاست او رمعیشت کا ایک اہم رکن بن گیا، خوش حالی، ترقی اور تعلیم کے اعتبار سے یہ ملک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ریاست کا کل رقبہ تقریبا 18 کیلومیٹر ہے، اور آبادی 40 لاکھ ہے، کویت کے موجودہ امیر صباح الصباح ہیں، کویت اس اعتبار سے بھی خلیج کا اہم ملک ہے کہ اس نے سماجی ترقی اور سیاسی اصلاحات پر خاص توجہ دی ہے، تعلیم اور معیشت کی بہتری کے علاوہ کویت میں لوگوں کا سماجی شعور بھی خاصا بیدار ہے، اور خلیج کے دیگر ملکوں کے مقابلہ کویت میں خواتین کو سیاسی اختیارات بھی دئے گئے ہیں، اسی طرح کویت میں انتخابات بھی ہوتے رہتے ہیں، اور محدود پیمانہ پر پارٹیاں بھی موجود ہیں۔

1.5 یمن

یمن مشرق وسطی کا ایک خوبصورت ملک ہے، جو جنوب اور مغربی جنوب عرب میں واقع ہے، اس کے شمال میں سعودی عربیہ، جنوب میں خلیج عدن اور بحر عرب، مغرب میں، بحر احمر، اور مشرق میں عمان واقع ہیں۔ کل رقبہ 203,849 مربع میل پر مشتمل ہے۔ اس کا ساحلی علاقہ 1,184 مربع میل ہے، 2009 کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی تقریبا 23,580,000 تھی۔ 99 فیصد سے زیادہ یہاں مسلمان آباد ہیں، جن میں سنی 50 سے 55 فیصد، اور شیعہ 42 سے 47 فیصد ہیں، بہت کم تعداد میں یہاں ہندو، عیسائی، اور یہودی ہیں، دار الحکومت صنعاء ہے، اور سرکاری زبان عربی ہے۔

1.5.1 تاریخی پس منظر

قدیم زمانہ میں یمن میں منائین (Minaen) کی بادشاہت تھی، جو 1200 سے 750 قبل مسیح رہی، پھر، سبائین کی حکومت 750 سے 115 قبل مسیح تک رہی۔ اس کے بعد یہاں پہلی صدی عیسوی میں رومی اور حبشی آئے اور چھٹی صدی عیسوی سے پارسیوں نے یہاں حکومت کی۔

یمن میں سب سے پہلے مسلمان رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں 628 میں آئے، اس وقت کے ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہاں بہت تیزی سے اسلام پھیلا، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دور میں یمن کے شہر صنعا، الجناد اور حضرموت وغیرہ اسلامی ریاست کے ماتحت آچکے تھے۔ خلافت راشدہ کے بعد امویوں نے یہاں 661 سے 750 تک، عباسیوں نے 750 سے 879 تک، عثمانیوں نے 1538 سے 1635 تک حکومت کی، لیکن اس درمیان کسی کو بھی یمن کے پورے حصہ پر کنٹرول حاصل نہ رہا، خاص طور سے یمن کے شمالی حصہ میں زیدیوں کے علاوہ دوسرے کو حکومت جمانے کا بہت کم موقع ملا۔ وہاں کی مقامی حکومتیں جنہوں نے اپنے قیام کے لئے بہت زور آزمائی کی تھی وہ زیادی (818-1018)، نجاہد (1022-1150)، ایوبی (1174-1229)، رسولی (1228-1454)، صلیحد، طاہری اور زیدی وغیرہ ہیں۔

ان میں سب سے مضبوط زیدی حکومت تھی، جس کی بنیاد 897 میں یحیٰ بن حسین بن قاسم الراسی نے شمال یمن کے پہاڑی علاقے میں رکھی تھی، چوں کہ یہ شیعوں کی حکومت تھی، اس لئے اس کے حکمراں امام ہوا کرتے تھے، اور یہ حکومت 1962 تک رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد عثمانی حکومت یمن سے دست بردار ہوگئی، اس کے بعد جنوبی یمن پر انگریزوں کا قبضہ رہا، اور یمن کے شمالی حصہ پر امام یحیٰ التوکل کی حکومت رہی۔ لوگ امام کی قدامت پرستی سے اکتا چکے تھے، ساتھ ہی یمن کے لوگوں میں عرب قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہونے لگا تھا، لہٰذا یہاں کے لوگوں نے 1958 میں مصر کے صدر ناصر کے ماتحت متحدہ عرب جمہوریہ کے لئے آواز اٹھائی، امام یحیٰی 1961 میں حکومت سے دست بردار ہوئے، 1962 میں وفات پاگئے۔ کچھ مزاحمت کے بعد ان کا لڑکا محمد البدر بھی پہاڑی علاقہ میں جاکر چھپ گیا، اس کے بعد ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ 1970 میں ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت شاہی خاندان کے لوگ یمن عرب جمہوریہ (Yamen Arab Republic) کے لئے راضی ہوگئے۔

1.5.2 دورجدید

1918ء میں شمالی یمن نے عثمانی حکومت سے امداد حاصل کی، اسی وقت سے یمن کی جدید تاریخ کی شروعات ہوتی ہے۔ شمالی یمن 1962ء میں ایک جمہوریہ بن چکا تھا لیکن پورے طور سے 1967ء میں انگریزوں کے جانے کے بعد بنا۔ انگریز بھی یمن سے گزرے بغیر ہندوستان تک نہیں پہونچ سکتے تھے لہذا یمن کے جنوبی حصے پر عثمانیوں کے بعد انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ 20ویں صدی کے پہلے عشرے میں شمالی علاقوں میں زیدی قبائل کے سربراہ امام یحیٰ کی حکومت تھی۔ وہ خود کو امام کہلاتے تھے۔ اس نے یہیں سے عثمانوں کے انخلاء کے بعد جنوب کے علاقوں کی طرف پیش قدمی کی اور انگروزوں کے زیر اثر علاقہ تک پہونچ گئے۔ اس دوران اس نے اٹلی سے بھی مدد مانگ لی جو خلافت عثمانیہ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اٹلی کی مدد پر انگریز کو بھی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے ابن سعود اور تہامہ کے گورنر سے معاہدہ کرلیا۔

1934ء میں امام یحیٰ نے اپنے تہامی پناہ گزینوں سے بے وفائی کرتے ہوئے انھیں سعودیوں کے حوالے کردیا اور عدن میں اگلے چالیس سالوں کیلیے انگریزوں کی حکومت تسلیم کرلی۔ 22 مئی 1990ء کو شمالی اور جنوبی یمن ایک ہوگئے اور اسطرح جمہوریہ یمن وجود میں آیا اور سب نے متفقہ طور پر صالح کو اپنا صدر تسلیم کرلیا۔ وہاں کے لوگ شمالی اور جنوبی علاقوں کو ملا کر ایک ملک بنانے میں تو کامیاب ہوگئے، لیکن جلد ہی دونوں علاقوں کی فوجوں میں ٹکراؤ شروع ہوگیا۔ ملک میں بڑی تباہی مچی پھر صدر صالح نے اس پر کنٹرول حاصل کرنے میں کامیابی

حاصل کی۔ 1999ء میں یمن میں براہ راست صدارتی انتخابات ہوئے جس میں صالح نے 56 فیصد ووٹ لے کر ایک بار پھر اقتدار کی کرسی حاصل کی۔ اس الیکشن میں صالح کا واحد حریف اس کی اپنی سیاسی پارٹی کا ہی ایک ممبر تھا۔ صالح نشہ کی عادت بھی رکھتا تھا، اس لئے اکثر نشہ میں کیئے گئے وعدوں اور دستخطوں سے منکر ہو جایا کرتا تھا۔ 2005ء میں اپنی صدارت کی 27 ویں سالگرہ کے موقع پر جوش میں آکر صالح نے عوام کو یہ خوشخبری سنائی کہ آئندہ سال ہونے والے انتخاب میں وہ حصہ نہیں لیگا، لیکن آئندہ سال اس نے نہ صرف انتخاب میں حصہ لیا بلکہ حسب معمول جیت بھی گیا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ وہ نشہ کا عادی تھا اور اس کے دور میں ملک میں خرابی بھی پھیل گئی تھی لیکن لوگ اس کو کامیاب بناتے رہے۔ اس کے دور حکومت میں یمن کرپشن میں سرفہرست دس ممالک میں آ گیا تھا۔ صالح کے کاموں میں ایک ریپبلیکن گارڈ کا قیام بھی تھا۔

2011ء میں جب عرب بہاریہ کا آغاز ہوا اور عرب ملکوں میں عوام نے بادشاہت کے خاتمہ کے خلاف آواز اٹھائی جس کی بازگشت یمن میں بھی سنی گئی، لیکن صالح نے خود کو منتخبہ جمہوری صدر سمجھتے ہوئے اس آواز کا مخاطب نہ سمجھا، صرف اتنا کیا کہ ایک اعلان جاری کر دیا کہ آئندہ الیکشن میں نہیں آؤں گا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے پر امن عوامی مظاہروں پر تشدد جاری رکھا۔ اس کے خلاف پارلیمنٹ کے ارکان اور کئی وزراء نے استعفی دے دیا۔ بالآخر صالح نے اقتدار چھوڑ دیا۔

یمن کی حکومت تعلیم پر اچھا خاصا پیسہ خرچ کرتی ہے۔ حکومت کے خرچ کا 14 سے 20 فیصد حصہ تعلیم کیلئے ہوتا ہے۔ اسکولوں میں 5 سے 15 سال تک کے بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم دی جاتی ہے۔ ملک میں سات بڑی یونیورسٹیاں ہیں جو صنعاء، عدن، حدیدہ (hodeida)، تعز (Taiz)، اِب (ibb)، ذمار (Dhamar)، اور حضرموت میں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں جہاں میڈیکل، انجینیرنگ اور دوسرے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ 2005ء میں سرکاری جامعات میں تقریباً 174000 اور پرائیویٹ جامعات میں 12000 طالب علم تھے۔

دیہات کے اہم پیداوار میں غلہ، پھل، سبزی اور کافی وغیرہ ہیں۔ 17 ویں اور 18 ویں صدی میں یمن میں کافی کی تجارت کو بہت فروغ ملا اور یہاں کی کافی پوری دنیا میں برآمد ہوتی تھی۔ زیادہ تر لوگ کسان ہیں صرف ایک چوتھائی لوگ سرکاری نوکری، تعمیرات اور تجارت کے کام سے جڑے ہوئے ہیں۔ قدرتی وسائل: گیس، پٹرول، سنگ مرمر، سونا، کوپر وغیرہ ہیں۔ یمن کے تجارتی تعلقات زیادہ تر تھائی لینڈ، چین، متحدہ عرب امارات، ہندوستان، شمالی کوریا، سویٹزرلینڈ وغیرہ سے ہوتے ہیں۔

1.6 شام

بلاد شام مغربی ایشائی ممالک میں عظیم تاریخ اور شہرت کا حامل ملک رہا ہے، اس کی برکتوں کی خود رسول ﷺ نے تعریف فرمائی، حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ساکنان شام کو خوشخبری ہو، ساکنان شام کو خوشخبری ہو، ساکنان شام کو خوشخبری ہو، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ کس وجہ سے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے فرشتے اپنے پر شام پر پھیلائے ہوئے ہیں (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فتنوں کے دور میں ملک شام کو وطن بنانے کا حکم دیا ہے۔ (ابوداود)۔

ملک شام سے مراد موجودہ سوریا ہے، عصر حاضر سے قبل بلاد شام کا لفظ صرف سوریہ کے لئے نہیں بولا جاتا تھا، بلکہ اس سے مراد بلاد شام کا وسیع علاقہ تھا، جس میں چار ممالک سوریا، اردن، لبنان اور فلسطین بشمول اسرائیل کی کالونی شامل تھے، پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں جب سلطنت عثمانیہ سے عرب ممالک علیحدہ ہوئے، اور یوروپی استعمار نے عالم عرب کے حصے بخرے کئے تو 1916 میں برطانیہ اور فرانس نے خفیہ معاہدہ کے تحت جس کو سائکس پیکو معاہدہ کہا جاتا ہے، عالم عرب کو تقسیم کرلیا، اور انہوں نے اس وسیع علاقہ کو چار چھوٹے چھوٹے ملکوں سوریا، لبنان، فلسطین، اور اردن میں تقسیم کردیا، اور اس طرح قدیم بلاد شام کے صوبے مستقل ملک کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے، اور اپنے وجود و بقا کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔ ان میں سب سے بڑا رقبہ سوریا کا ہے، پھر لبنان کا اور پھر اردن کا، یہاں ہم ان میں سے ہر ایک ملک کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کریں گے۔

1.6.1 سوریا کی تاریخ

قدیم بلاد شام کے سب سے زیادہ حصہ پر محیط ملک سوریا ہے، جس کی راجدھانی دمشق ہے، سوریا کا لفظ آشور سے نکلا ہے، جو اس ملک پر حکمراں ایک قوم تھی، ابتدا سے یہ علاقہ علم وفن، تہذیب وتمدن اور ادیان و مذاہب کا مرکز رہا ہے، یہودیت، نصرانیت اور اسلام تینوں مذاہب کا تاریخی تقدس اس سرزمین سے وابستہ ہے، قدیم دور میں یہاں سریانی عبرانی فینقی اور آرامی زبانیں بولی جاتی رہی ہیں، ملک شام کی تاریخ ایک ملین سال قبل مسیح پرانی ہے، اور دمشق کا شہر دنیا کے قدیم ترین آبادیوں میں سے ہے، تاریخ میں اس کا سراغ دو ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے، اور اسی وقت سے یہ انسانی آبادی کا مرکز رہا ہے، یہاں کی خوشگوار آب وہوا، قدرتی حسن، اور ملنسار باشندوں نے ہر دور میں دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ اور کئی قوموں مثلاً آرامی آشوری وغیرہ نے اس علاقہ پر حملہ کیا، سکندر یونانی نے 333 قبل مسیح میں ایران کو زیر کرنے کے بعد دمشق پر حملہ کیا، اور اس وقت سے یہاں پر یونانی تہذیب کے اثرات موجود ہیں، 64 قبل مسیح میں رومیوں نے یہاں پر حملہ کیا، اور اس کو اپنی کالونی بنایا، جب رومیوں میں اختلاف ہوا تو یہ علاقہ بیزنطینی سلاطین کے حصہ میں آیا، اسلامی دور میں رسول اللہ ﷺ نے یہاں کے بادشاہ کو اسلام کی دعوت دی، 9 ہجری میں تبوک کا غزوہ پیش آیا، خلافت راشدہ میں یرموک کی فیصلہ کن لڑائی میں شام میں رومیوں کی حکومت کا زور ٹوٹا، خلافت فاروقی میں 14/656 میں دمشق پر حملہ ہوا، طویل محاصرہ کے بعد حضرت خالد بن ولید نے مشرقی سمت سے باب شرقی سے حملہ کیا، اور فاتحانہ داخل ہوئے، اسی لمحہ اہل دمشق نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مغربی دروازہ سے جس کا نام بعد میں باب الجابیہ پڑا، ابوعبیدہ بن الجراح سے صلح کی درخواست کی اور وہ دمشق میں صلحاً داخل ہوئے، ان کو خالد کے فاتحانہ داخلہ کی خبر نہ تھی، بیچ شہر میں دونوں کی ملاقات ہوائی۔ بہر حال باشندوں کو امان عطا کی گئی۔ خلافت راشدہ کے دور میں حضرت معاویہ شامی مقبوضہ جات کے امیر تھے، جن کی دور اندیشی اور رواداری کی سیاست سے اہل شام ان سے محبت کرنے لگے۔

جب امیر معاویہ نے شہر دمشق کو عالم اسلام کا دار الخلافہ بنایا تو اس کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی شناخت زیادہ ابھر کر سامنے آئی، اور عہد اموی میں یہاں شاندار عمارتیں، باغات مساجد و محلات اور مدارس قائم ہوئے۔ 132ھ میں جب اموی دور کا خاتمہ ہوا تو عباسی خلافت نے دمشق کے بجائے بغداد کو دار الخلافہ قرار دیا، اس کے باوجود اس علاقہ کی تہذیبی، علمی اور اقتصادی شناخت باقی رہی۔ علاقائی حکومتوں کے دور میں بھی اس کو اہمیت حاصل رہی، خصوصاً نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے شام پر حکومت کی، اور دمشق وحلب میں کئی تعمیری اور علمی کام

انجام دئے۔ مصر سے قربت کی وجہ سے طولونی، اخشیدی، فاطمی اور مملوکی دور میں یہ علاقہ مصر کے ماتحت رہا، یہاں تک کہ سلطنت عثمانیہ کی ابھرتی ہوئی طاقت نے حلب کے قریب مرج دابق کے میدان میں 1516 میں مملوکوں کو شکست دی، اور شام براہ راست عثمانی خلافت کے ماتحتی میں آ گیا۔ عثمانی دور میں شام میں حلب، سوریا (دمشق)، بیروت، لبنان اور قدس (فلسطین) پانچ صوبے تھے۔

1.6.2 فرانسیسی استعمار

پہلی جنگ عظیم کے دوران 1916 میں جب عربوں نے سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کی، اور ترکوں کو شکست ہوئی تو یہ مما لک عثمانی خلافت سے علیحدہ ہوئے، اور ملک فیصل بن حسین کی حکومت قائم ہوئی، جلد ہی یوروپی اقوام نے اپنے خفیہ معاہدہ کے تحت بندر بانٹ کے ذریعہ ان علاقوں کو تقسیم کرلیا، 24 دسمبر 1920 کو فرانسیسی دمشق میں داخل ہوئے، اور انہوں نے سائکس بیکو معاہدہ کے تحت بلاد شام کو چار ملکوں میں تقسیم کر دیا، حالاں کہ یہاں کی تہذیب، رسم و رواج، مذہب، زبان اور تاریخ سب کچھ ایک تھا۔ لبنان اور شام پر انتداب کے نام سے فرانس کا قبضہ ہوا، اور فلسطین برطانیہ کے حصہ میں آیا، تا کہ وہ اسے لقمہ تر بنا کر یہودیوں کو پیش کر دے۔ 1920 میں فرانس نے شام کو فرقوں کے اعتبار سے مزید چھ ریاستوں میں تقسیم کر دیا، یعنی مملکت حلب، مملکت دمشق، مملکت علویہ، مملکت لبنان، مملکت دروز، اور ریاست اسکندرون۔ ان میں سے ہر ایک کی راجدھانی، سکہ، حکومت، پارلیمنٹ، قومی دن، مالی امور اور ڈاک کے ٹکٹ وغیرہ سب علیحدہ کر دئے، لیکن قوم کی شدید مخالفت کی بنا پر 1922 میں ایک مرکزی (فیڈریل) نظام کے تحت مملکت حلب، مملکت دمشق، مملکت علویہ کو آپس میں جوڑ دیا۔ شامیوں میں آزادی کی لہر اٹھنے لگی، 1925 میں انہوں نے فرانس کو نکال باہر کرنے کے لئے لڑائی لڑی، اس کے بعد فرانسیسی انتداب سے آزادی کی کوششیں تیز ہوتی گئیں، 1930 میں فرانسیسیوں سے بات چیت کر کے شامیوں نے نیا دستور بنایا، جس میں سوریا کو جمہوریہ سوریہ کا نام دیا گیا، نیا علم تیار ہوا، پھر 1936 میں آزادی کے متوالوں نے سوریا کے تمام صوبوں کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، ایک وفد ہاشم اتاسی کی سرکردگی میں پیرس گیا، جس نے ایک فرانس سے نیا معاہدہ کیا، اس کے تحت دیرہ زور اور لاذقیہ کی مملکتوں کو جمہوریہ سوریہ میں انضمام کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد شام میں موجود تاج الدین حسینی کی قومی حکومت کو ختم کر کے ہاشم اتاسی کی سرکردگی میں نئی حکومت بنی، لیکن جلد ہی فرانس نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا اعلان کیا۔ 1939 میں فرانس نے اپنے نمائندہ کو دمشق بھیجا، جس نے شام کو دوبارہ انتداب کے معاہدہ کے تحت لانے اور براہ راست پیرس کی ماتحتی میں آنے کا اعلان کیا۔ اور تمام معاہدات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ قومی حکومت ختم کر دی گئی، لاذقیہ اور جبال عرب کو دوبارہ جمہوریہ سوریہ سے الگ کر دیا گیا، اسی دوران دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا، 1945 میں فرانس نے اپنے توپ خانہ کے ساتھ شام پر حملہ کر دیا، قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا، سیکڑوں قتل اور ہزاروں زخمی ہوئے، شامیوں نے بے مثال پامردی کا مظاہرہ کیا، جنگ کے بعد عالمی برادری نے شام اور لبنان کے معاملات میں دلچسپی لی، سوریا اور لبنان نے 1946 میں فرانسیسی انتداب کے مسئلہ کو مجلس اقوام میں پیش کیا، سوویت یونین، چین اور امریکہ نے اس کے حق میں ووٹ ڈالا، اور مجلس اقوام کے نمائندوں نے جلد از جلد تمام غیر ملکی طاقتوں کے خروج کا فیصلہ کیا، اور 17 اپریل 1946 کو تمام غیر ملکی افواج کا اخراج عمل میں آیا، اور یہی دن قومی دن قرار پایا۔

1.6.3 سوریا جدید دور میں

فرانس کے اخراج کے بعد یہاں مقامی حکومت قائم ہوئی، 1952 میں فرانس سے تمام تر تعلقات ختم ہوگئے، 1958 کا سال سوریا

کی تاریخ میں بے حد اہم ہے، جب کہ شامی صدر شکری قوتلی اور نے عالم عربی کے اتحاد کے لئے صدارت سے دست کش ہوکر مصر سے شام کا الحاق کیا، اور جمال عبدالناصر جمہوریہ متحدہ عربیہ کے صدر قرار پائے، لیکن سیاسی واقتصادی اسباب ومصالح کی بنیاد پر 1961 میں یہ اتحاد ختم ہوگیا، اور دمشق میں فوجی انقلاب نے جگہ لے لی۔ اور جمہوریہ عربیہ سوریہ کے نام سے نئی فوجی حکومت نے کام کرنا شروع کیا۔

مارچ 1963 سے یہاں پر حزب البعث العربی الاشتراکی کی حکومت ہے، 1970 میں اس کی قیادت حافظ الاسد نے سنبھالی، اور 1971 سے 2000 تک ملک کے صدر کی حیثیت سے حکومت کی، یہ قیادت اشتراکیت کی طرف مائل ہے، اس کا مقصد قومیت عربیہ کی بنیاد پر اشتراکیت کو فروغ دینا، اور اشتراکی حکومتی نظام قائم کرنا ہے، 2000 میں حافظ کی وفات کے بعد اس کے لڑکے بشارالاسد نے حکومت سنبھالی، 5 مارچ 2011 کو بہار عرب کے اثرات سے متاثر ہوکر سوریا میں بھی ظالم وجابر نظام کے خلاف عوامی مخالفت کی شدید لہر اٹھی، جس نے حکومت اور نظام کو مختل کردیا، عوام نے بشارالاسد کے استعفا کا مطالبہ کیا، لیکن حکومت نے ان کی بات ماننے سے انکار کردیا، اور اس طرح خانہ جنگی شروع ہوگئی، جو ابھی تک جاری ہے۔

موجودہ سوریا کا رقبہ 185,180 مربع کیلومیٹر ہے، یہاں چودہ صوبے ہیں، راجدھانی دمشق ہے، بیس بڑے شہر ہیں، حلب اور اس کے بعد دمشق کی آبادی سب سے زیادہ ہے۔ شمال میں ترکی، مشرق میں عراق، جنوب میں اردن اور مغرب میں فلسطین اور لبنان اور بحر متوسط ہے، ساحل لاذقیہ، طرطوس اور بانیاس میں ہے، آبادی 2,25,30,746 افراد پر مشتمل ہے، جن میں سنی 63 فیصد، علوی شیعہ 12 فیصد، مسیحی 10 فیصد، کردی 9 فیصد، دروزی 3 فیصد، اور بقیہ اقلیتیں 3 فیصد ہیں، جن میں اسماعیلی، صابئ وغیرہ ہیں۔ یہاں کے سکہ کو لیرہ کہا جاتا ہے، اور عربی یہاں کی سرکاری زبان ہے، غیر ملکی زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی بڑے پیمانہ پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ سوریا میں سات حکومتی یونی ورسٹیاں اور سولہ نجی یونیورسٹیاں ہیں، ابتدائی تعلیم لازمی ہے اور حکومت کی جانب سے مفت فراہم کی جاتی ہے۔

1.6.4 اہم شخصیات

ملک شام ابتدا ہی سے علوم وفنون کا مرکز رہا ہے، اسلامی دور میں یہاں بے شمار باکمال ہستیاں پیدا ہوئیں، جن میں امام اوزاعی، سلطان العلماعز الدین بن عبدالسلام، ابن نفیس، ابن ابی اصیبعہ، ابن صلاح، امام ابن تیمیہ، امام ذہبی، سبکی، ابن جماعہ، ابن قیم الجوزیہ، ابن شامہ، ابن عبدالہادی، ابن خلکان، ابن عساکر، ابن کثیر امام سخاوی، ابن عابدین شامی، وغیرہ عظیم علما گذرے ہیں جن کے نقوش جریدہ عالم پر ثبت ہوچکے ہیں۔

شام میں موجودہ دور میں علمی ترقی، شیخ بدرالدین حسنی، جمال الدین قاسمی، خیرالدین زرکلی، نزار قبانی، عمر رضا کحالہ، محمد کرد علی، محمود شاکر، سراج الدین الحسینی، سعید رمضان، شعیب ارناط، حسن حبنکہ وغیرہ کے ذریعہ ہوئی ہے، محمد کرد علی نے المجمع العلمی العربی دمشق کی بنیاد رکھی، المقتبس نامی پرچہ جاری کیا، خطط الشام کے نام سے شام کی تاریخ پر ایک جامع کتاب تصنیف کی، اس کے علاوہ تاریخ الحضارہ، الاسلام والحضارۃ الغربیہ جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں، وہ علمی ترقی کے ستونوں میں سے ہیں۔ علی طنطاوی کا تعلق بھی ملک شام سے ہے، جنہوں نے زندگی کا اکثر حصہ سعودی عرب میں گذارا، وہ مفتی، فقیہ، ادیب اور مفسر قرآن تھے، ان کی کتابوں میں ذکریات، رجال من التاریخ، تعریف عام بدین الاسلام وغیرہ ہیں۔ خیرالدین زرکلی مشہور مؤرخ اور ادیب وشاعر ہیں، انہوں نے اپنی مشہور موسوعی کتاب الاعلام ترتیب دی، جو عربی واسلامی

کتب خانہ میں اہم اضافہ ہے،نزار قبانی دور جدید کے اہم شاعر ہیں۔شیخ عبدالفتاح ابوغدہ حدیث وتاریخ میں گہری بصیرت رکھتے ہیں،انہوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا،علمائے ہند سے بے حد متاثر تھے اور ہندوستان کے اہل دانش سے محبت کرتے تھے،انہوں مشہور لکھنوی عالم شیخ عبد الحیی حسنی کی کئی کتابوں کو تحقیق وتعلیق کے ساتھ عالم عرب سے شائع کیا ہے،جن میں الاجوبہ الفاضلہ،الرفع والتکمیل اور دوسری اہم کتابیں شامل ہیں،شیخ عبدالفتاح کی وجہ سے ہندوستان کے علما کا عالم عرب میں تعارف ہوا ہے۔مصطفیٰ سباعی موجودہ دور کے اہم علما میں ہیں،جو حمص میں پیدا ہوئے،مصر میں اخوان المسلمین سے وابستہ ہوئے، میں المنار نامی جریدہ جاری کیا،ان کی مشہور کتابوں میں شرح قانون الاحوال الشخصیہ ،من روائع حضارتنا،المرأۃ بین الفقہ والقانون ،السنہ ومکانتہا فی التاریخ الاسلامی،الاستشراق والمستشر قون وغیرہ کتابیں ہیں۔علامہ جمال الدین قاسمی دمشق میں پیدا ہوئے،ان کی سو سے زائد تصنیفات ہیں،جن میں قرآن مجید کی تفسیر محاسن التاویل کے نام سے،قواعد التحدیث،میزان الجرح والتعدیل،تطہیر الشام وغیرہ ہیں۔محمود شاکر مشہور مؤرخ اور محقق ہیں،دوسو سے زائد تصنیفات ہیں،جن میں موسوعہ التاریخ الاسلامی 22 جلدوں میں،سلسلہ العالم الاسلامی،سلسلہ مواطن الشعوب الاسلامیہ کے تحت کئی کتابیں ہیں۔ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی شام کے عظیم عالم ہیں،انہوں نے جن عناوین اور موضوعات کے تحت قلم اٹھایا ہے،ان کی تعداد 500 تک پہونچتی ہے،فقہ اصول فقہ اور تفسیر تو آپ کا اختصاص ہیں، ڈاکٹر بدیع اللحام نے آپ کی چھوٹی بڑی تصنیفات، کتب ورسائل کی جملہ تعداد ایک سوتیں لکھی ہے،جن میں موسوعۃ الفقہ الاسلامی وادلتہ، التفسیر المنیر ،موسوعۃ الفقہ الاسلامی المعاصر جیسی انسائکلو پیڈیائی کتابیں بھی ہیں،اور چھوٹے چھوٹے رسائل بھی،کئی کتابوں کا دیگر زبانوں مثلا اردو،انگریزی،فرانسیسی،ترکی اور ملیشیائی میں ترجمہ ہوا ہے۔

1.6.5 تحریکات اور ادارے

اخوان المسلمین

مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی اس نے عالم عرب کے تمام ممالک کو متاثر کیا،اور شام میں بھی ان کی شاخ قائم ہوئی،اخوان نے یہاں کے تعلیمی اور دینی معیار کو بلند کیا۔اور سماجی وعلمی، سیاسی سطح پر پورے شام پر اثر انداز ہوئے؛لیکن جلد ہی فوجی حکومت نے اس کی سرگرمیوں پر پابندی لگادی،اور اس کے ارکان کو قید وبند میں ڈال دیا،ان میں شیخ مصطفیٰ سباعی،شیخ طنطاوی،عبدالفتاح ابوغدہ اور دیگر اخوان نے مصائب برداشت کئے۔

الجمعیۃ الغرا

شیخ علی دقر اور شیخ بدرالدین حسنی نے 1914 میں اس اکیڈمی کی بنیاد ڈالی،اس کے ابتدائی صدر شیخ محمد ہاشم الخطیب تھے،انہوں نے دمشق میں علمی سرگرمیوں کو عام کرنے کے لئے کئی مدارس قائم کئے،جن میں روضہ الحیا،زہر الحیا،بچیوں کے لئے،اور سعادۃ الابناء،وقایۃ الابناء اور ہدایہ الابناء لڑکوں کے لئے قائم کئے،اسی جمعیت کے قائم کئے ہوئے مدارس سے شیخ حسن حبنکہ،شیخ عبدالوہاب الحافظ اور شیخ عبدالکریم رفاعی جیسے کبار علما پیدا ہوئے۔

جمعیۃ الفتح الاسلامی

اس ادارہ کی بنیاد شیخ صالح فرفور نے ڈالی تھی، جس نے تعلیمی اور سماجی اصلاح کو اپنا مقصد بنایا تھا، 1956 میں اس کو منظوری حاصل ہوئی، اس ادارے نے معہد الفتح الاسلامی نامی ادارہ قائم کیا، اس کے تحت تمام مراحل میں دینی تعلیم فراہم کی جاتی ہے، اس وقت اس کی ایک اور شاخ معہد الشام العالی کے نام سے قایم ہوئی ہے۔

جمعیت ابوالنور

اس ادارے کی بنیاد شیخ محمد امین کفتارو نے قاسیون پہاڑ کے دامن میں ڈالی تھی، ان کے فرزند شیخ احمد کفتارو نے والد کے بعد اس کی ذمہ داری سنبھالی، 1964 میں شیخ کفتارو کو شام کا مفتی عام بنایا گیا تھا۔ احمد کفتارو نے اس ادارے کو بہت ترقی دی، ابتدا میں اس کے تحت 1949 میں معہد الانصار کے نام سے ثانویہ قائم کیا، اور 1964 میں لڑکیوں کئے معہد بدر قائم کیا، اور 1970 میں مجمع کفتارو قایم کیا، یہ دینی تعلیمی ادارہ ہے، اس کے تحت ابتدائیہ سے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم دی جاتی ہے، اس میں ایک دارالایتام بھی قائم ہے۔

المجمع العلمی العربی دمشق:

1919 میں اس ادارے کی بنیاد میں رکھی گئی، اس کے صدر محمد کرد علی تھے، اور امین سوید، سعید کرمی، عیسی معلوف، عبد القادر مغربی اور طاہر الجزائری جیسے مشاہیر اس سے وابستہ تھے، اس ادارے کے اغراض ومقاصد میں عربی زبان پر غور کرنا، اس کو موجودہ زمانہ کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنا، مخطوطات کی تحقیق، جدید علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ، اصطلاحات وضع کرنا، آثار قدیمہ پر توجہ دینا شامل تھا۔ اس ادارے نے اپنا ایک مجلّہ جاری کیا، جو عالم عرب کے موقر جرائد میں شمار کیا جاتا ہے، اس کا پہلا پرچہ جنوری 1921 میں شائع ہوا، ابتدا میں ماہانہ تھا، اس کے بعد سہ ماہی ہو گیا، مجمع اللغۃ العربیہ نے فصیح عربی زبان کی ترویج کے لئے محاضرات اور دروس کا اہتمام کیا، اور عربی زبان وادب کی خدمت کی۔

دارالکتب الظاہریہ

دمشق کا سب سے بڑا مخطوطات کا مرکز، جو مملوکی سلطان ظاہر بیبرس کے قائم کردہ مدرسہ میں 1296 مطابق 1879 میں قائم کیا گیا، اس کی بنیاد شیخ طاہر الجزائری نے رکھی، اس میں بارہ ہزار مخطوطات ہیں، اور 65000 مطبوعات ہیں۔ یہ کتب خانہ دنیا کے مشہور ترین اور نادر مخطوطات کے مراکز میں سے ہے، بڑے بڑے علمائے عصر نے یہاں سے استفادہ کیا ہے، اس کتب خانہ میں دمشق کے مختلف اداروں اور علمی گھرانوں سے مخطوطات جمع کئے گئے، جن میں مکتبہ عمریہ، مکتبہ عبداللہ باشا، مکتبہ عثمان کردی، خانقاہ سمیساطیہ کا مکتبہ وغیرہ شامل ہیں۔ دمشق میں مکتبہ الاسد کے قیام کے بعد یہ کتب خانہ اسی میں ضم کردیا گیا۔

1.7 اردن

ملک شام کے جنوب میں واقع عربی مملکت ہے، جس کے جنوب میں سعودی عرب، مشرق میں عراق اور مغرب میں فلسطین واقع

ہے۔ملک کی مغربی سرحد پر ایک نہر اردن کے نام سے بہتی ہے، جس کی نسبت سے اس ملک کا نام اردن پڑا، دار الحکومت عمان ہے، اور عربی سرکاری زبان ہے، غیر ملکی زبانوں میں انگریزی زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، کے اعداد و شمار کے مطابق اردن کی آبادی 57 لاکھ ہے، جن میں سنی 92 فیصد، مسیحی 6 فیصد، دروزی 2 اور دیگر باقی دیگر اقلیتیں ہیں۔مملکت کا رقبہ 92300 مربع کلومیٹر ہے، یہاں کے سکہ کو اردنی دینار کہا جاتا ہے۔

ملک عبد اللہ بن حسین نے اس مملکت کی بنیاد برطانیہ کی مدد سے 1921 میں ڈالی تھی، یہ ملک ابتدا میں فلسطین کے برطانوی انتداب کے تابع تھا، اور 1946 میں آزاد ہوا، 25 مئی کو یوم آزادی منایا جاتا ہے، ملک عبد اللہ کا شجرہ نسب ہاشمی خاندان سے ملتا ہے، اس وجہ سے اس مملکت کو المملكة الاردنية الهاشمية کہا جاتا ہے۔اردن میں دستوری بادشاہت کا نظام قائم ہے، 1952 میں ملک حسین معظم بادشاہ بنے، ان کی وفات کے بعد 1999 میں ملک عبد اللہ ثانی سریر آرائے سلطنت ہوئے، جو افواج کے سربراہ اعلی بھی ہیں۔بادشاہ وزرا کی 55 رکنی کمیٹی کو مقرر کرتے ہیں، جو 110 ارکان پر مبنی مجلس نائبین کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔

1.8 لبنان

جمہوریہ لبنان شرق اوسط میں واقع عربی ملک ہے، جس کے شمال اور مشرق میں سوریا، جنوب میں فلسطین، اور مغرب میں بحر متوسط ہے، یہ ملک مختلف فرقوں کی آماج گاہ ہے، اکثر آبادی عربوں مشتمل ہے، جن میں مسلمان اور مسیحی بڑی تعداد میں ہیں، لبنان کی آبادی 4259000 ہے، جس میں 59 فیصد مسلمان، 41 فیصد مسیحی ہیں، ان کے علاوہ درزی اور دیگر اقلیتیں بھی رہتی ہیں۔

لبنان تاریخ میں شام کا حصہ رہا ہے، جدید لبنان کی تاریخ 1920 سے شروع ہوتی ہے، جب کہ فرانس کے حملہ کے بعد مملکۃ لبنان الکبیر کا اعلان کیا گیا، اور بیروت کو اس کا دار الحکومت بنایا۔1926 میں جمہوریہ لبنان کا قیام عمل میں آیا، جو موجودہ لبنان کی تاریخ کا نقطہ آغاز ہے، مسلمانوں نے اس تقسیم کی مخالفت کی تھی، کیوں کہ اس میں وہ اقلیت میں آگئے تھے، ایک عرصہ تک دیگر پڑوسی ممالک کی طرح یہاں بھی فرانسیسی انتداب رہا، اور 1946 میں اس کی آزادی عمل میں آئی، آزادی کے فورا بعد ہی اس نوزئیدہ مملکت کو 1948 میں اسرائیل سے جنگ میں حصہ لینا پڑا، یہ لڑائی 1949 میں اختتام کو پہونچی، اور عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان معاہدہ ہوا۔1982 میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا، تاکہ وہاں سے ہونے والے فلسطینی حملوں کو روکے، یہ جنگ معاہدہ پر ختم ہوئی۔2000 میں ایہود باراک نے لبنان پر حملہ کیا، لیکن حزب اللہ نے ان کو واپس جانے پر مجبور کر دیا۔لبنان میں موجود مختلف فرقوں کی وجہ سے یہاں اکثر داخلی انتشار رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود عالم عربی میں اس کو علمی اور ثقافتی اہمیت حاصل ہے، عربی ادب کے فروغ میں یہاں کے ادبا نے عظیم خدمات انجام دیں ہیں، بیروت میں واقع جامعہ امریکیہ سے عالم عرب کے مشاہیر نے تعلیم حاصل کی ہے۔

1.8.1 حزب اللہ

حزب اللہ لبنان کی ایک سیاسی اور عسکری تنظیم ہے، جو لبنان پر 1982 کے حملہ کے بعد قائم کی گئی، اس کی تاسیس میں محمد حسین فضل اللہ، عباس موسوی اور راغب حرب شریک تھے، موجودہ قیادت حسن نصر اللہ کی ہے، 2000 اور 2006 میں اس نے اسرائیل کے خلاف سخت مقابلہ کیا۔شیعہ تنظیم ہونے کی وجہ سے ایران سے اس کو کافی تعاون حاصل ہوتا ہے، اس تنظیم نے عسکری قوت کے علاوہ سماجی تعلیمی، اور

مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے بھی اپنی شاخیں قائم کر رکھی ہیں۔

1.9 خلاصہ

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے جانا کہ مغربی ایشیا کے ملکوں سے مراد خلیج عرب کے ممالک یعنی سعودی عرب، بحرین، کویت، عمان، یمن، ملک شام، اردن اور لبنان ہیں، ان ریاستوں کو ابتدائے اسلام سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے آغاز ہی میں اسلام میں داخل ہوگئے تھے، بیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کی شکست و ریخت کے بعد ان ممالک پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کرلیا، دوسری جنگ عظیم کے بعد پانچویں اور ساتویں دہائی میں ان ریاستوں کو انتداب سے آزادی ملی، خلیج عرب کے ممالک میں تیل کی دریافت نے ترقی کی رفتار تیز کردی، معاشی اور تعلیمی ترقی میں بہتری آئی، البتہ سیاسی اور سماجی بیداری میں عموماً شعور بیدار نہیں ہے، اور خاندانی بادشاہت کے نظام میں سب جکڑے ہوئے ہیں۔ شام میں اگرچہ جمہوری حکومت ہے، لیکن وہ بھی ایک ہی خاندان سے مربوط ہے۔ موجودہ دور میں بہار عرب سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں ان ممالک میں بھی عوامی تحریکیں اٹھیں، لیکن خلیجی ممالک میں ان کو زر کی طاقت سے دبا دیا گیا، لیکن یمن اور شام ابھی تک خزاں کے موسم سے باہر نہیں آسکے۔

1.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1. سعودی عرب میں آل سعود کی حکومت کا جائزہ لیجئے۔
2. قطر اور کویت کے نظام حکومت اور ان ملکوں کی سماجی بیداری پر گفتگو کیجئے۔
3. یمن کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1. ملک شام کی اہم شخصیات اور اداروں کے بارے میں گفتگو کیجئے۔
2. لبنان اور اردن کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، تحریر کیجئے۔

1.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ — ثروت صولت — مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی
2. الاستیطان الاجنبی فی الوطن العربی — ڈاکٹر عبدالمالک خلف التمیمی — عالم المعرفہ۔ 1978
3. الدیمقراطیہ فی العالم العربی — المؤسسہ الدولیہ للدیمقراطیہ والانتخابات — لبنان، 2004-2003
4. الموسوعۃ الموجزہ، الدرر السنیہ — فضائل الشام — عبدالکریم سمعانی، دار الثقافہ العربیہ، دمشق، 1992
5. خطط الشام، محمد کرد علی، مکتبہ نوری، دمشق، 1983

اکائی 2 : وسط ایشیا: آزادشدہ ریاستیں

اکائی کے اجزاء

2.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اسلامی دنیا کے اس خطہ سے واقف ہوں گے جو دور وسطیٰ میں اسلامی دنیا کا اہم ترین حصہ ہوا کرتا تھا۔ 19 ویں صدی اور 20 ویں صدی عیسوی میں یہ خطہ زار اور سویت روس کے زیر اثر تھا۔ 1991 میں جاری تحریک کی وجہ سے وسط ایشیا آزاد ملکوں میں تبدیل ہو گیا۔

2.2 تمہید

موجودہ وسط ایشیا پانچ آزاد ریاستوں پر مشتمل ہے، یہ ہیں: قزاقستان (Kazakhstan)، کیرغیزستان (Kyrgyzstan)، ازبکستان (Uzbekistan)، ترکمانستان (Turkmenistan) اور تاجکستان (Tajikistan)۔ 1917 عیسوی میں زار کی حکومت کے خاتمے کے بعد روس میں کمیونسٹ قابض ہو گئے اور سوویت یونین کا آغاز ہوا، سوویت یونین نے قزاقستان کو کبھی مسلم وسط ایشیا میں شامل نہیں

کیا، اسے غیر ایشیائی ملک تصوّر کیا اور اسکو روس اور سائبیریا کے ساتھ شامل کیا۔ وسط ایشیا تقریباً 3994300 مربع کیلومیٹر پر مشتمل ہے۔ اسکی آبادی تقریباً 51 ملین ہے اور 100 سے زاید نسلیں ہیں۔ جن نسلوں کے لوگ شامل ہیں ان میں جیسے جرمن اور آسٹریا سے لے کر تبتی اور کورین تک ہیں۔ سب سے بڑی نسل ازبک ہے۔ ازبکستان کی آبادی 30 ملین سے زاید ہے۔ اور ازبکس دیگر چار ممالک میں اقلیت میں ہیں۔ 1992 عیسوی میں وسط ایشیا میں روسی آبادی تقریباً 10.6 ملین تھی، لیکن نسلی خلفشار کے سبب بڑے پیانے پر روسیوں کی تاجکستان اور ازبکستان سے ہجرت ہوئی۔

تاشقند اور اشک آباد، ازبکستان اور ترکمانستان کے دارالحکومت ہیں، ان شہروں کی تاریخ طویل ہے لیکن دیگر تین دارالحکومت شہر، جیسا کہ تاجکستان میں دوشنبہ، قزاقستان میں الماتی اور کرغستان میں بشکیک، ان شہریوں کو بالشویکوں نے لوگوں کو نسلی شناخت کا احساس دینے کے لئے قائم کیا تھا۔ ازبکستان میں وسطی ایشیا کے سب سے زیادہ مشہور تاریخی شہروں میں موجود ہیں: سمرقند، بخارا، خیوا اور کھوقند۔ ماضی میں خانہ بدوش سلطنتیں اور بندوبستی حکومتیں تھیں اور پورا خطہ اسلام کی ترقی کا مرکز رہا ہے۔ بخارا و سمرقند کے سینکڑوں مدارس و اسلامی درس گاہوں نے مراکش اور انڈونیشیا کے طالب علموں کو صدیوں سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ مکہ، مدینہ اور یروشلم کے بعد بیشتر مسلمان بخارا کو مقدس و اہم شہر کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسلامی تصوّف وصوفیانہ رجحان کی جائے پیدائش وسطی ایشیا ہیں اور یہاں سے افریقہ اور ایشیا میں یہ رجحان تیزی سے پھیلا۔

2.3 وسط ایشیا

تاریخی پس منظر

قدیم زمانے میں وسط ایشیا پر ایرانی خانہ بدوش قابض ہوئے، ان کا اس خطہ میں داخلہ ہزار سال قبل مسیح شمالی چراگاہ سے ہوا جو اب ازبکستان ہے۔ اس وقت بخارا اور سمرقند شہر سرکاری و تہذیبی مرکز تھے۔ پانچویں صدی قبل مسیح تک اس خطہ میں بکتری (Bactrian)، صوگدی (Soghdian)، اور توخاری (Tokharian) ریاستوں کا دبدبہ رہا۔ جیسے ہی چین کا مغرب سے ریشم کی تجارت کا آغاز ہوا، تو ایرانیوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور تجارت کا مرکز بن گیا۔ انھوں نے ازبکستان کے ماوراء النہر (Transoxiana) (اس علاقے کا نام مسلمانوں کی فتوحات کے بعد پڑا) کے علاقے میں لوگوں کو آباد کیا۔ اس تجارت کی وجہ سے یہ راستہ ریشمی راستہ کے نام سے مشہور ہوا، بخارا اور سمرقند دولت مند شہر بن گئے۔ چھٹی صدی عیسوی تک یہاں زرتشتی (Zoroastrian) مذہب غالب رہا، بدھ (Buddhism) اور عیسائیت (Christianity) مذاہب نے بھی خاصی تعداد میں لوگوں کو متوجہ کیا۔ ماوراء النہر اپنی دولت کی وجہ سے ہمیشہ بڑی حکومتوں کے لئے دلکشی کا مرکز رہا ہے، اسی وجہ سے مستقل سوغدی (Soghdian) ریاست اور دیگر کے درمیان جنگیں ہوئیں۔ سکندر اعظم نے اس کو 328 قبل مسیح میں فتح کیا اور ماوراء النہر کو مختصر وقت کے لئے مقدونیہ (Mecedonian) حکومت کے اختیار میں لے لیا۔

اسلام آٹھویں صدی میں وسط ایشیا میں پھیلا، اور اس علاقے میں نئے ایمان اور تہذیب کی شروعات ہوئی جو اب تک غالب ہے۔ ما وراء النہر میں مسلمان سب سے پہلے ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں فارس کی فتوحات کے وقت داخل ہوئے۔ وسط ایشیا کے سوغدی

(Soghdian) اور دیگر ایرانی لوگ مسلم فوج کا سامنا نہیں کر پائے، مؤرخین کے مطابق ان میں کوئی مضبوط سردار نہیں تھا۔ اس کے برعکس مسلم فوج کے پاس ذہین سپہ سالار قتیبہ ابن مسلم تھا، جس کی تمنا اور خواہش اسلام کو فروغ دینا تھا۔ حالاں کہ وسط ایشیا اسلامی ریاست کا حصہ خلافت کے دور میں ہوا۔ اسلامی حکومت میں وسط ایشیا تمدن، تہذیب، وتجارت کا مرکز صدیوں تک رہا۔ آٹھویں اور نوی صدی میں جب عباسی خلافت عروج پر تھی تو اس خطہ نے بھی اپنا سنہرا دور محسوس کیا۔ بخارا اسلامی تعلیم، تمدن، ثقافت، عماراتی تعمیرات کا معیاری مرکز بن گیا۔ وسط ایشیا کے کچھ مشہور اور نامور تاریخ داں، سائنس داں، اور جغرافیہ داں، اسی جگہ کے رہنے والے ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ 19 صدی تک چلا۔

دھیرے دھیرے زار پورے وسط ایشیا پر قابض ہوگیا اور اسکی حکومت 1917 تک رہی، روس میں کمیونسٹ اتھارٹی نے وسط ایشیا کو سوویت یونین کا حصہ بنالیا۔ زار کی حکومت کا خاتمہ پہلی جنگ عظیم کے ساتھ ہوا۔ زار کے دور سے ہی سیاسی خلفشار وسط ایشیا کے ان علاقوں میں چل رہا تھا اور سوویت یونین کے بننے کے بعد بھی چلتا رہا۔ لیکن کمیونسٹ حکمرانوں نے وسط ایشیا کو اپنی جگہ سے نکلنے نہیں دیا۔ سوویت یونین نے اسلام کے برعکس نسلی جمہوریت کو ترجیح دیا۔ سوویت یونین نے اسلام کو ذہانتی دلائل اور مارکسسٹ عقائد پر چیلنج کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی کسی بھی طرح کی عوامی تقریب پر پابندی لگادی۔ دوسری جنگ عظیم کی بعد اسلامی جذبات سوویت یونین میں دیکھا گیا جس کی وجہ سے حکومت کے خاکے میں اسلامی پہلو کو شامل کیا گیا۔ اسی وجہ سے سوویت میں 'سرکاری اسلام' کو کچھ حد تک قبولیت حاصل ہوئی اور اس دور میں 'پوشیدہ اسلام' بھی موجود رہا کیوں کہ مسلمان اپنے مذہب اور عبادات کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔

گزرتے وقت سے ساتھ سوویت یونین میں مسلمانوں کو مظالم سہنا پڑا اور ان پر ہر طرح کی پابندی لگادی گئی، 1980 میں جب سوویت یونین کے سربراہ میخائیل گورباچیف (Michael Gorbachev) بنے تو انہوں نے سماجی آزادی کی طرف خاص دھیان دیا اور انکی پیرسترویکا (Perestroika) اور گلاستوسٹ (Glasnost) کی پالیسی کی وجہ سے اسلامی خیالات کا اظہار پھر سے شروع ہوا۔ اسی وجہ سے ازبکستان میں اسلامی عبادات اور جذبات پھر سے وجود میں آنے لگے، گورباچیف کی اس سماجی آزادی نے مسلم ممالک ازبکستان، تاجکستان، اور کرغستان میں اہم رول ادا کیا، جسکی وجہ سے ان علاقوں کے مسلمانوں کو کمیونسٹ آئیڈیالوجی سے نجات ملی اور وہ پھر سے اپنی تہذیب اور اعمال کو دوبارہ روبہ عمل لاسکیں۔ 1991 میں جب سوویت یونین کا خاتمہ ہوگیا تو وسط ایشیا کے ممالک آزاد ہو گئے اور اس طرح سے پانچ ملک، ازبکستان، تاجکستان، کرغستان، ترکمانستان، اور قزاقستان قائم ہوئے۔

2.4 قزاقستان (Kazakhstan)

جمہوریہ قازاقستان کی آزاد ریاست کا آئینی قانون 16 دسمبر 1991 کو منظور کر دیا گیا، اور اس بنیاد پر ریاست کی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ آزاد قازاقستان، ایک جمہوری، سیکولر اور قاعدہ قانون پر مبنی ریاست کے طور پر قائم ہوا۔ تاکہ سیاسی جماعتوں اور عوامی ایسوسی ایشن قائم ہو سکیں۔ میڈیا کو نظریاتی کنٹرول اور سینسرشپ سے آزاد کر دیا گیا۔

قزاقستان وسط ایشیا کا سب سے بڑا اور معاشی طور پر ترقی یافتہ ملک ہے۔ قومی روایات اور قزاق کی تہذیب کو ان کے ماضی میں ان کے آباء واجداد کی خانہ بدوش طرز زندگی سے منسوب کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ پورے قبائل کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ قزاقی صحرا میں گھوما

کرتے تھے۔ جدید قزاقستان کی دلچسپ تصویر روسی و اسلامی تہذیب کا اثر و رسوخ، مشرقی ذہنیت اور عالمگیریت (globalization) کے جدید رجحانات کا نتیجہ ہے۔

جمہوریت قازاقستان میں اسلام سب سے بڑا مذہب ہے۔ تقریباً 52 سے 65 فیصد کی آبادی مسلمان ہے۔ حالانکہ ان میں بیشتر اسلامی مذہبی قانون اور پابندی پر مضبوطی کی حد تک عمل نہیں کرتے۔ بیشتر قزاقی مسلمان مذہبی ذمہ داری کو بھی پورا نہیں کرتے۔ دیگر وسط ایشیائی ممالک کی طرح، قزاقستان میں بھی مسلمان اکثریت میں ہیں۔ جنوبی اور مغربی قازاقستان علاقے میں یہ بسے ہوئے ہیں۔ ملک کے شمال اور مشرقی حصوں میں انکی تعداد کافی حد تک کم ہے۔

1990 کے دوران قزاقستان میں اسلامی عقائد کی بحالی محسوس کیا گیا۔ 1990 میں جمہوریت کی آزادی کے بعد سے خاصی تعداد میں مسلمانوں کا اسلام کی طرف رجحان دیکھا گیا، ساتھ ہی ساتھ عبادت گاہوں اور ان سے وابستہ لوگوں کی تعداد بڑھتی دیکھی گئی۔ جہاں 1989 میں کل 46 مساجد تھی اور 1998 تک انکی تعداد بڑھ کر 1000 تک پہنچ گئی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلم اداروں کی تعداد 2003 میں 1652 درج کی گئی، اور مستقل اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔

آزادی کے بعد ترکی، پاکستان اور عرب ممالک سے پہنچنے والے غیر ملکی مسلم مبلغین اور مذہبی گروپوں کی آمد بھی دیکھی گئی۔ اگرچہ ازبکستان اور تاجکستان نے بیرون ملک سے بیشمار مسلم کارکن کو متوجہ کیا ہے، لیکن قازاقستان نے بھی بیرون ملکی مذھبی تحریکوں کو بھی محسوس کیا ہے۔

قزاخستان میں نورسی اور گولین تحریکیں کافی مضبوطی سے موجود ہیں، ان تحریکوں کی ابتداء ترکی سے ہوئی۔ پھر بھی ان کی تعلیمات کا اثر ان کے مریدین سے لگایا جا سکتا ہے۔ وسط ایشیا میں نورسی تحریک کا مشن یہاں کے مسلمانوں کو اسلام میں دوبارہ داخل ہونے میں مدد کرنا ہے۔ فتح اللہ گولین کی تحریک جو کہ نورسی تحریک کی شاخ ہے، اس نے تعلیم اور اسلام کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے کو بھرپور کوشش کی ہے۔ اسی رجحان کے تحت نورسی تحریک نے پورے وسط ایشیا میں سو سے زاید بزنس شروع کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ روزنامہ اخبار 'ضمن' کی اشاعت بھی کی ہے۔ درجنوں اسکول اور کمپنی کے قیام کے باوجود بھی نورسی تحریک قزاقستان میں کافی کمزور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے اشراف نے ان ترکی اسکولوں کی مخالفت کی، کیوں کہ ان تحریکوں کے مذہبی خیالات کو وہاں کے علاقائی اسلامی روایت کا دشمن تصور کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کی وسط ایشیا کی حکومتیں ان تنظیموں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کی نورسی تحریک کو کبھی مذہبی آزادی سرکاری طور پر نہیں ملی۔

قزاقستان میں حزب التحریر جیسی دیگر تنظیموں کی موجودگی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان تنظیموں کا مقصد اسلامی تعلیمات کو نافذ کرنا ہے اور شریعہ کے مطابق خلافت نافذ کرنا ہے۔ لیکن یہ تنظیمیں دیگر جہادی تحریکوں سے متاثر ہیں جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ 2000 کی ابتدائی دہائی میں شمالی قزاقستان میں حزب التحریر کی کارکردگی دیکھی گئی، اور اس تحریک کے ممبران کی تعداد 100 بھی نہیں پہنچ سکی۔ ایک تصنیف سے پتہ چلتا ہے کی موجودہ وقت میں اس تنظیم کے ممبران میں اضافہ ہوا ہے۔ اسکے علاوہ قزاقی حکومت نے تبلیغی جماعت کی موجودگی کا بھی اعلان کیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اعتدال پسند سلفی (Salafi) تحریک بھی قزاقستان میں موجود ہے جس کا مقصد ملک میں روحانی بیداری پیدا کرنا ہے۔ اسنبیو (Asanbaev) نے 2006 کے اپنے رسالے میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ قزاقی حکومت اور قزاقستان کی مسلم روحانی انتظامیہ (DUMK) کے تحت حزب التحریر، تبلیغی جماعت، نورسی تحریکیں دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں۔ مسلم روحانی

انتظامیہ (DUMK) وہ ادارہ ہے جو قزاقی مسلمانوں کو حنفی مذہب کے عین مطابق زندگی گزارنے کی طرف راغب کرتا ہے، جو ملک کا واحد سرکاری مذہب ہے۔ اکتوبر 2011 میں قزاقی پارلیمنٹ نے نیا پابندی پر مبنی مذہبی قانون منظور کیا، جس نے صرف روایتی حنفی اسلام کا تاریخی کردار تسلیم کیا، تا کہ ملک کی ثقافتی اور روحانی ترقی ہو سکے۔ اس قانون کے تحت اسکولوں، جیلوں، فوجی اڈوں اور دیگر ریاستی اداروں میں عبادت پر پابندی عاید کر دی گئی ہے۔ اس نئے قانون کی وجہ سے بیشمار اسلامی ادارے اور درجنوں مدرسے اور مساجد غیر قانونی ثابت ہو گئے ہیں۔ اس تناظر میں 2012 تک صرف ایک ہی اسلامی یونیورسٹی درج ہو سکی۔ الماتی (Almaty) کی نور مبارک یونیورسٹی (Nur University Mubarak)۔ 2011 میں صدر نظر بایوو (Nazarbayev) نے خاص سرکاری ادارہ، مذہبی امور ایجنسی (Religious Agency for Affairs (ARA) پیشہ ور سفارتکار کیرت لاما شریف (Kairat Lama Sharif) کی قیادت میں قائم کیا تا کہ دار الحکومت کا اختیار ان مذہبی اداروں پر مضبوط ہو سکے۔

2.5 کیرغیزستان (Kyrgyzstan)

کیرغیزستان کے علاوہ شاید ہی وسط ایشیا کا کوئی خطہ اور ملک ہو جس کی سرزمین قدرتی مقامات کی کثرت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس کا تین چوتھائی سے زائد علاقہ تیان شان (Shan-Tien) اور پامیر آلہ (AlayPamir) کی عظیم پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ صدیوں پہلے قائم قومی روایات اور خانہ بدوش تہذیب کرغستان میں اب بھی مضبوط ہے۔

جب روس نے کرغستان کو آزاد کیا تو اس ملک کو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ سوویت یونین کے وقت جو ترقی ہوئی وہ اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔ 2000 کے بعد اس ملک نے پھر ترقی کرنا شروع کر دیا اور حالت بہتر ہونے لگی۔ مئی 1993 میں نیا آئین پارلیمنٹ نے پاس کیا جس کے تحت جمہوریت کرغستان کا نام کرغس جمہوریت کر دیا گیا۔ اس ملک نے کافی سیاسی اتار چڑھاؤ دیکھا، یہاں تک کہ صدر مملکت پر الزامات لگائے گئے۔ نئی تحقیق سے معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ موجودہ کرغستان میں حالت کچھ حد تک سازگار ہوئے ہیں اور وہاں کی حکومت ملک کی ترقی کے لئے قدم اٹھا رہی ہے اور اس میں حکومت کافی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

کرغستان میں علم اور سائنس کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ اسکی وجہ سے آزادی کے بعد حکومت نے دسمبر 1993 میں سائنس اکادمی کو قومی سائنس اکادمی میں تبدیل کر دیا۔ اسی کے بعد سے درجنوں انسٹیٹیوٹ اور اکادمی قائم ہوئے۔ کارکنوں کی کمی کی وجہ سے بہت سارے اداروں کو بند کرنا پڑا۔ کیونکہ بیشتر لوگ بیرون ملک اچھے مواقع کی تلاش میں ہجرت کر گئے۔ تب حکومت نے 1994 میں ان اداروں کی تعداد میں کمی کر دی۔ 2000 کے بعد سے نئی نسل نے اس طرف رجحان دکھایا ہے تو حکومت نے بھی تحقیق کے لئے اسکالرشپ فراہم کرنی شروع کر دی تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس طرف مایل ہوں اور اس کا اثر بھی نظر آنے لگا۔ گذشتہ 10 سالوں میں کرگستان کے سائنس دانوں کا معاہدہ یوروپی یونین اور متحدہ امریکا سے ہوا ہے۔

2.6 ازبکستان (Uzbekistan)

ازبکستان وسطی ایشیا کے قلب میں واقع ہے۔ عظیم و مشہور ریشمی راستہ (Silk Route) بھی اسی ملک میں ہے۔ ازبکستان درحقیقت تاریخی و ثقافتی سیاحت کا ملک ہے۔ وسطی ایشیا وہ جگہ ہے جہاں قیمتی مشرقی جواہرات کثرت سے ہیں جیسے سمرقند (Samarkand)، بخارا (Bukhara)، خیوا (Khiva)، تاشقند (Tashkent) اور شگھر سبز (Shakhrisabz) اور دورِ وسطی کی شاندار و یادگار تعمیر شدہ عمارتیں۔

ازبکستان کے سیاستدانوں نے ریاستی کمیٹی کا قیام کو سیاسی مہم سمجھا۔ قومی حکومت کو فوراً بلا سمجھوتہ اپنی پالیسی کا اعلان کردیا جو خصوصی طور پر جمہوریت کے مفادات کے لیے تھا۔ 31 اگست 1991 کو سیاسی آزادی سپریم سوویت کے غیر معمولی چھٹے اجلاس میں حاصل ہوئی۔ ملک کو جمہوریت ازبکستان نامزد کیا گیا، اور 1 ستمبر کو یوم آزادی، اور ریاست کا قومی تہوار قرار دیا گیا۔ آزادی کے بعد ملک کے صدر کے انتخاب کا اعلان ہوا جس میں 86 فیصد عوام نے ازبکستان کے پہلے صدر اسلام کریموف (Islam Karimov) کو منتخب کیا۔

ستمبر 1991 سے جولائی 1993 کے مختصر وقت میں، دنیا بھر میں جمہوریہ ازبکستان کو 160 سے زائد ملکوں نے ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کیا۔ 2 مارچ 1992 کو ازبکستان اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ آزادی کے حصول کے سے تاریخی ترقی کے دور کی شروعات ہوئی۔

دور آزادی کی کامیابی تھی کہ تاریخی شخصیات احمد فرغنی، امام بخاری، امام ترمذی، ابومنصور الماتریدی، برہان الدین مرغینانی، بہاؤالدین نقشبندی، اور احمد یسوی کی یادیں لوگوں میں تازہ کردی جائیں جنہوں نے اپنی بیش قیمت خدمات اور کارناموں سے دنیا کی ثقافت اور قومی روحانیت کے خزانہ کو مالا مال کیا۔ بڑے اقدام ان لوگوں کو پھر سے بسانے کے لئے کے گئے جنہوں نے آزادی ملک کی تحریک اور زار و سوویت کی مطلق العنانیت، اور ساتھ ہی ساتھ سٹالن کا جبر اور مظالم سہے تھے۔ ان میں محمد خوجہ بہبودی، منور قاری، عبیداللہ خوجہیو، عبداللہ قدری، عبدالرؤف فطرت، عبدل حمد چولپاں، عثمان ناصر اور الیک شامل ہیں۔

ازبک کو قومی زبان کا درجہ دینے کے اقدام نے اہم کردار ادا کیا جس کی بنا پر ملک میں روحانیت پھر سے پیدا ہوگئی، اور اس اقدام کو قانونی شکل ملک کی آزادی کے ساتھ حاصل ہوئی۔ 2 ستمبر 1993 کو لاطینی رسم الخط کے طرز پر ازبک حروف کی شروعات ہوئی، تاکہ انکی اپنی پہچان اور زبان منظر عام پر آسکے۔ اسکے باوجود دیگر زبانیں بھی استعمال میں ہیں، موجودہ دور میں اب بھی روسی زبان کے بولنے والوں کی ازبکستان میں کثرت ہے۔ بہرکیف 22 دسمبر 1995 کو اولے مجلس (Oliy Majlis) میں ریاستی زبان کی نئی ترمیم پر قانون اختیار کیا گیا۔

روحانی قومی قدروں کی بحالی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ مقبول اور مذہبی تہوار (نوروز، فارسی نیا سال) کی تجدید کی گئی، اس جشن پر سوویت دور میں پابندی تھی۔ وسط ایشیا کے عظیم مذہبی مفکرین امام ترمذی، امام بخاری، محمود زمخشری، نجم الدین کبری، خواجہ نقشبند، خوجہ احرار ولی وغیرہ کی برسیاں پر بڑے پیمانے میں تقریبات ہوئیں۔ ان لوگوں کے کاموں کی دوبارہ اشاعت سے ان کے نام لافانی ہوگئے۔ 19 مئی 1995 کو وزراء کابینہ کے قرارداد کے ذریعے، بین الاقوامی ریسرچ سینٹر اسلام اور تاریخی اور ثقافتی وراثت کا مطالعہ کرنے کے لئے تاشقند میں کھولا گیا۔ اسی وقت، ازبکستان میں اسلامی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ آزادی کے بعد، 1000 سے زائد مساجد اور مدارس ملک میں قائم و تعمیر کئے گئے۔ ہر سال سینکڑوں مسلمان حج کے لیے مکہ جاتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی احیا کی شروعات ہوئی ہے۔ جمہوریت میں سب سے بڑا مذہب روسی قدامت پسند چرچ (Russian OrthodoxChurch) ہے جس کے تقریباً 30 مقامی چرچ ہیں، تاشقند میں راہبہ کدہ (nunnery) اور چرچک (Chirchiq) میں عیسائی خانقاہ (Monastery) ہے۔ 1998 میں مدرسے (seminary) کو موجودہ مذہبی

کالج کے احاطے میں کھولا گیا تھا؛ جس میں وسطی ایشیا کے مقامی چرچ کے پادریوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ روسی قدامت پسند چرچ (Russian OrthodoxChurch) کے علاوہ، 13 دیگر مذہبی فرقے، رومن کیتھولک (RomanCatholic)، ارمنی گریگورین (Armenian Gregorian) لوتھران (Lutheran) اور بپٹسٹ (Baptist) کو شامل کرکے نمائندگی دی جارہی ہے۔

آزادی کے بعد، کئی اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم ہوئے جہاں ماہرین کو مہارت کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان میں فوجی اکیڈمی (AcademyMilitary)، ریاستی اکیڈمی وترقی عوام (Academy of State and Public Development)، عالمی اقتصادیات اور ڈپلومیسی یونیورسٹی (University of World Economics and Diplomacy)، اور تاشقند ایوی ایشن ادارہ (Tashkent Aviation Institute) شامل ہیں۔ ستمبر 2001 کو اعلیٰ بزنس اسکول (High School of Business) کی شروعات ہوئی، یہیں معروف غیر ملکی پروفیسروں نے درس دیا۔ جنوری 2002 میں ازبکستان کے کابینہ وزراء نے تاشقند میں بین الاقوامی ویسٹ منسٹر یونیورسٹی (International Westminster University) کے قیام کی قرارداد منظور کی۔

2001 میں ازبکستان UNESCO کا 190 ممبر ملک بن گیا جس کو تعلیم، سائنس اور تمدن کے میدان میں اقوام متحدہ انعام سے نوازا گیا۔ جمہوریت نے جسمانی کھیل کود کے ماحول کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ازبکستان ستمبر 1993 میں بین الاقوامی اولمپک کمیٹی کا رکن بن گیا۔ تبدیلی عمل سے سائنس کے کردار میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے سائنسی تحقیق کے نیٹ ورک کے تحت 361 تعلیمی اداروں، اعلیٰ تعلیم اور شعبے کی مہارت، جس میں 101 تحقیقی ادارے، 55 تحقیق کے محکمے اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے، 65 منصوبہ اور ڈیزائن کی تنظیم (Planning and Design Organisation)، 32 سائنس اور پیداوار انجمن اور تجرباتی اکیڈمیاں (Science & Production Associations and Experimental Enterprise) اور 30 آئی ٹی (T.I.) اور کمپیوٹنگ مراکز شامل ہیں۔ جمہوریت ازبکستان کی سائنس اکیڈمی (Academy of Science.) ملک کی سائنسی صلاحیت کی بنیاد ہے۔

2.7 ترکمانستان (Turkmenistan)

ترکمانستان وسط ایشیائی خطے کے مسلم ممالک میں سے ایک ہے۔ یہ ملک سپرمراد نیازوف آزاد ترکمانستان کے پہلے صدر کی شخصیت پرستی سے منسلک ہے، یہ شخصیت پرستی لینن اور سٹالن جیسے سوویت رہنما کے برابر ہے۔ تاہم ترکمانستان وہ ملک ہے جہاں ماضی کی عظیم حکومتوں اور مشہور یادگاروں کی وراثت ہیں۔ دارالحکومت اشک آباد اپنی نایاب تعمیرات کے نقطہ نظر سے ترکمانستان کے لوگوں کا فخر ہے۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد 27 اکتوبر 1991 میں ترکمنستان آزاد ہوا، شاپرمراد نیازوف (Saparmurad Niyazov) جو ترکمنستان کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ تھے انکو آزاد ملک کا نیا صدر منتخب کرلیا گیا۔ نیازوف نے "ترکمنباشی" (Turkmenbashi) یا "ترکمن کا لیڈر" (TurkmenofLeader) کا لقب اختیار کیا۔ نیازوف کی کتاب روح نامہ کو ترکمنستانی اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا گیا اور اسکا پڑھنا ضروری قرار دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کیلنڈر کے مہینوں کا نام انکے خاندان والوں کے نام پر رکھا گیا۔ نیازوف نے تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی عاید کردی تھی اور انکی حکومت نے سب خبر رساں اداروں پر مکمل کنٹرول رکھا۔ 1999 میں آئین میں تبدیلی کی گئی تاکہ نیازوف صدر کی

حیثیت سے رہ سکیں۔

آئینی غیر جانبداری کے اصل حامی نیازوف تھے۔اس پالیسی کے تحت ترکمنستان کسی طرح کا فوجی معاہدہ نہیں کرسکتا تھا۔اسی وجہ سے ملک بالکل الگ تھلگ ہوگیا۔2006 میں نیازوف کے انتقال کے بعد حالت میں تبدیلی ہوئی۔ملک نے دیگر ممالک سے باہمی تعلقات قائم کئے۔ 2006 بعد فروری 2007 میں الیکشن ہوا جس میں گربنگلی بردی محمدوو(Gurbanguly Berdimuhamedow)صدر منتخب ہوئے،انہوں نے نیازوف کی پالیسی کوتبدیل کردیااور ملک کو ترقی کی طرف لے گئے۔

آزادی کے بعد ترکمنستان کی نئی حکومت نے تبدیلی نافذ کی اسکے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی سیکٹر میں تبدیلی ہوئی۔صدر نیازوف نے ملک کی سائنس اکادمی کو بند کر دیا تھا۔اس وقت خاص سائنس تحقیق گاہیں اس طرح تھیں: سائنس کی اعلی کونسل،کاشتکاری سائنس کی اکادمی، میڈیکل سائنس کی اکادمی،اور یونیورسٹی۔نیازوف کے بعد 2010 میں حکومت نے سائنس اور تعلیم کی طرف رجحان دکھایااور اس کوفروغ دینا شروع کردیا۔اب اس ملک میں پھر سے تحقیق کے کاموں پر زور دیا جارہا ہے۔

2.8 تاجکستان(Tajikistan)

تاجکستان وسط ایشیا کی واحد فارسی بولنے والی ریاست ہے جس کی منفرد ثقافت اور روایات ہیں۔یوریشیا تجارتی راستوں سے دور اور پامیر کے دامن میں واقع اس خوبصورت ملک کی آب وہوا شدید ہے۔ایرانیوں،فارسیوں،اسلام،ہمسایہ ازبکستان اور سوویت روس کی قدیم رسوم ورواج کے زیراثر جدید تاجکستا قائم ہوا ہے۔تاجکستان کے شمالی علاقہ میں آبادی کا بڑا حصہ آباد ہے۔دوشنبہ(Dushanbe)اور خجند(Khujand)دو بڑے اور ترقی یافتہ شہر یہاں واقع ہیں۔

تاجکستان سوویت یونین سے آزاد ہونے والا آخری وسط ایشیائی ملک ہے۔اسکو آزادی 9 ستمبر 1991 میں حاصل ہوئی۔اس وقت تاجک زبان وہاں کی قومی زبان تھی جسکا شمار روسی زبان کے بعد ہوتا تھا۔لیکن گزرتے وقت سے ساتھ روسی زبان سے زیادہ تاجک زبان کے بولنے پر زور دیا جانے لگا تو موجودہ دور میں تاجک سرکاری زبان بن گئی۔

آزادی کے بعد ملک میں خلفشار برپا ہوگیا اور حالات بدتر ہوگئے۔اسکا اصل سبب اندرون خانہ جنگی تھی۔غیر مسلم آبادی خاص کر روسی،اور یہودی قوموں کو ملک سے جانا پڑا۔بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی کے تحت اسکی وجہ ظلم وستم،بڑھتی ہوئی غربت اور مغربی ممالک میں معاشی مواقع ہیں۔1994 میں صدر کے انتخاب میں امام علی رحمان(Emomali Rahmon)صدر منتخب ہوئے جواب تک ملک کے سربراہ ہیں۔1994 سے اب تک تاجکستان نے کافی ترقی حاصل کی۔اسکی وجہ امام علی رحمان(Emomali Rahmon)کی دوراندیشی ہے۔انہوں نے اجڑتے ہوئے ملک کو سنوار دیا۔اسکے لئے صدر نے روسی،امریکی،ہندوستانی اور فرانسیسی فوج کی خدمات حاصل کی۔

علمی میدان میں اگر روشنی ڈالی جائے تو یہ پتا چلتا ہے کی آزادی کے قبل تاجکستان میں تقریبا 100 تحقیقی اور سائنسی ادارے تھے۔ لیکن 1991 میں آزادی کے بعد سرکاری امداد کی کمی کی وجہ سے بہت سے ادارے بند ہوگئے۔ صرف چند کو سرکاری امداد حاصل ہوسکی۔1995 سے 2000 میں حکومت کی طرف سے معاشیات ترمیم پروگرام کے تحت حکومت نے سائنسی تحقیقی اداروں کو امداد فراہم کی اور اس پر توجہ بھی دی۔

فی الوقت تاجکستان میں 10 تحقیقی ادارے ہیں [فن تعمیر (Architecture)، عمارت (Building)، انجینئرنگ (Engineering)، اعلیٰ تعلیم (Higher Education)، طب (Medicine)، موسیقی (Music)، قدرتی سائنس (Natural Sciences)، تدریسی سائنس (Sciences Pedagogical) اور سائنس (Sciences)]۔ اسکے علاوہ وہاں بہت سے چھوٹے انسٹیٹیوٹ مختلف سرکاری شعبوں سے وابستہ ہیں۔ 2000 کے بعد علم کے شعبے میں ترقی ہوئی اور جدید تاجکستان ترقی کے راستے پر ہے

2.9 خلاصہ

موجودہ وسط ایشیا پانچ آزاد ریاستوں پر مشتمل ہیں، قزاقستان (Kazakhstan)، کیرغیزستان (Kyrgyzstan)، ازبکستان (Uzbekistan)، ترکمانستان (Turkmenistan) اور تاجکستان (Tajikistan)۔ 1917 میں زار کی حکومت کے خاتمے کے بعد روس میں کمیونسٹ قابض ہوگئے اور سوویت یونین کا آغاز ہوا، سوویت یونین نے قزاقستان کو کبھی مسلم وسط ایشیا میں شامل نہیں کیا، اسے غیر ایشیائی ممالک میں تصوّر کیا اور اسکو روس اور سائبیریا کے ساتھ شامل کیا۔ وسط ایشیا تقریباً 3994300 مربع کیلومیٹر پر مشتمل ہے۔ اسکی آبادی تقریباً 51 میلین ہے اور 100 سے زاید نسلیں ہیں۔ جن نسلوں کے لوگ شامل ہیں ان میں جرمن اور آسٹریا سے لے کر تتی اور کورین ہیں۔ سب سے بڑی نسل ازبک ہے۔ ازبکستان کی آبادی 30 ملین سے زاید ہے اور ازبکس دیگر چار ممالک میں اقلیت میں ہیں۔ 1992 عیسوی میں وسط ایشیا میں روسی آبادی تقریباً 10.6 ملین تھی، نسلی خلفشار کے سبب بڑے پیمانے پر روسیوں کی تاجکستان اور ازبکستان سے ہجرت ہوئی۔

جدید وسط ایشیا ترقی کے راستے پر ہے۔ پھر بھی اسے امداد کی سخت ضرورت ہے کیونکی سوویت یونین سے الگ ہونے کے بعد اس خطے میں معاشی زوال آ گیا اور ان ملکوں کی آبادی بھی اس تبدیلی کو قبول نہیں کر پائی ہے۔ ہم سماجی تجزیہ کر کے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ادھر چند برسوں میں یہاں کی عوام میں بیداری پیدا ہوئی ہے۔ انقلاب آیا ہے۔ حکومتیں بھی ان کی طرف متوجہ ہوئی ہے کہ کس طرح ملک کو پر وقار بنایا جائے۔

2.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1۔ وسط ایشیا سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجئے۔

2۔ وسط ایشیا نے سوویت یونین سے کس طرح آزادی حاصل کی۔ مختصر نوٹ لکھیں؟

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجئے۔

3۔ قزاقستان کی موجودہ سیاست پر روشنی ڈالیں؟

4۔ تاجکستان کی صورت حال پر ایک مضمون لکھیے۔

2.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- Histroy of the Arabs	Philip K Hitti
2 ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ	ثروت صولت
3 History of Civilizations of Central Asia Vol IV	UNESCO Publishing
4 Encyclopedia of Islam and the Muslim World	Macmillan Reference USA

اکائی 3: ترکی، عراق، ایران، بوسنیا

اکائی کے اجزاء

3.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ اسلامی دنیا کے اس خطہ سے واقف ہوں گے جو عثمانی سلطنت کا اہم ترین حصہ ہوا کرتا تھا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ چنانچہ اس اکائی میں طلبہ ترکی، عراق، ایران اور بوسنیا کے بارے میں پڑھیں گے۔

3.2 تمہید

دنیا میں اسلام نے بہت ترقی کی اور تقریبا %70 اس دنیا کے علاقے پر اپنی حکومت قائم کی۔ 19 ویں صدی کے وسط سے مسلم حکومتوں میں زوال آتا گیا اور دھیرے دھیرے بڑی اسلامی حکومتیں فنا ہو گئیں اور انکے اختیار والی ریاست آزاد ہوئی جیسا درج ذیل سبق سے اندازہ ہوگا کہ عثمانی خلافت کے آخری دور کے بعد کون کون سے ملک منظر عام پر ابھرے۔ اور ان ملکوں میں مسلمانوں کو کس طرح کی سہولیات حاصل تھیں۔

3.3 ترکی

ترکی ملک کا نام درحقیقت لفظ "ترک" یا "ترو ک" سے بنا ہے۔ برصغیر اناطولیہ (Anatolia) جو جدید ترکی میں شمار ہے وہ در

حقیقت دنیا کا سب سے پرانا تہذیبی خطہ ہے، اور یہ علاقہ قدیم زمانے سے آباد تھا۔ مسلمانوں کی اس علاقے میں آمد 11 ویں صدی میں ہوئی۔ اس سلسلہ میں سلجوقی ترکوں نے سب سے پہلے داخلہ حاصل کیا۔

11 ویں صدی کے دوسرے حصے میں سلجوقی ترکوں نے آرمینیا (Armenia) اور اناطولیہ (Anatolia) کے مشرقی علاقے میں اپنی پہنچ بنائی۔ 1071 میں سلجوقیوں نے جنگ منزکرٹ (Battle of Manzikert) میں بازنطینی (Byzantine) کو ہرایا اور اسکے بعد ترکیت (Turkification) کا سلسلہ شروع ہوا۔

ترکی زبان اور اسلام آرمینیا (Armenia) اور اناطولیہ (Anatolia) میں داخل ہوا، دھیرے دھیرے پورا علاقہ اسکے اثر میں آ گیا۔ گزرتے وقت سے ساتھ سلجوقی ترکوں کا دبدبہ کم ہوتا گیا اور اس کے برعکس انہی سلجوقی ترکوں کی ایک نسل اناطولیہ (Anatolia) میں بس گئی جو تاریخ اسلام میں عثمانی (Ottoman) سلطنت اور پھر خلافت کے نام سے تقریبا 600 برس حکومت کی اسی وجہ سے اناطولیہ اور اس پاس کا علاقہ ترکی کے نام سے مشہور ہوا۔

عظیم الشان عثمانی خلافت کا 19 صدی کے شروعات سے ہی زوال شروع ہوگیا۔ دھیرے دھیرے ہر پیانے پر خلافت کا دبدبہ کم ہوتا گیا اور اسکی طاقت و دولت گھٹنے لگی، بیشتر بلقانی مسلمان و دیگر نسل کے لوگ اناطولیہ میں جا بسے۔ اناطولیہ میں آبادی کے اضافے کے وجہ سے نسلی خلفشار شروع ہو گیا۔

پہلی جنگ عظیم میں عثمانی فوجیں شکست سے دوچار ہوئیں اور 1924 میں خلافت کا دور ختم ہوگیا۔ جنگ عظیم کے اسباب کے تحت ترکی قومی تحریک (Turkish Nationalist Movement) منظر عام پر آئی۔ مصطفیٰ کمال پاشا جو فوجی کمانڈر تھے، کی رہنمائی میں ترکی جنگ آزادی (Turkish War of Independence) لڑی گئی۔

18 ستمبر 1922 میں خلافت کی ترکی فوج کو نکال دیا گیا اور ترکی دور کی شروعات انقرہ (Ankara) سے کی گئی، جس نے اپریل 1920 میں خود کو جائز حکومت قرار دیا۔ اور یہاں سے ملک نظام خلافت سے ریپبلکن سیاسی نظام (Republican Political System) میں تبدیل ہوگیا۔ 1 نومبر 1922 میں نئی تعمیر شدہ پارلیمنٹ نے رسمی طور پر سلطنت کو ختم قرار دیا، اس طرح 623 سال کا عثمانی دور ختم ہوا۔

24 جولائی 1923 میں لوسانے کے معاہدہ (Treaty of Lausanne) کے تحت بین الاقوامی سطح پر ملک کو جمہوریت کا درجہ حاصل ہوا، اور جمہوریت ترکی (Republic of Turkey) کا اعلان 29 اکتوبر 1923 میں ہوا اور انقرہ (Ankara) کو دارالحکومت قرار دیا گیا۔ لوسانے کے معاہدہ (Treaty of Lausanne) کے تحت یونان اور ترکی کے درمیان آبادی کا تبادلہ ہوا اور تقریبا 1•1 ملین یونانیوں (Greeks) نے ترکی سے یونان ہجرت کی اور اسکے برعکس 380000 مسلمان یونان سے ترکی منتقل ہوئے۔

مصطفیٰ کمال پاشا جمہوریت ترکی کے پہلے صدر بنے اور انہوں نے کچھ بنیادی ترمیم اس مقصد کے تحت لاگو کیا تاکہ قدیمی عثمانی ترکی ریاست کو جدید سیکولر ریاست میں تبدیل کیا جاسکے۔ ترکی کی پارلیمنٹ میں 1934 کی کنیت قانون (Surname Law) کے تحت مصطفیٰ

کمال پاشا کو اتاترک (Ataturk) کی کنیت ولقب سے نوازا گیا۔

جمہوریت کے قیام کے 10 سالوں میں اتاترک کی اصلاحات کے تحت مغربیت کا مستحکم عمل شروع ہوا، جس میں تعلیم کو متحد کرنا، مذہبی ودیگر عنوان کے تسلسل کو ختم کرنا، اسلامی کورٹ کو بند کرنا اور اسلامی قانون کو سیکولر سول کوڈ (Secular Civil Code) سے تبدیل کرنا جو کی سوئٹزرلینڈ (Switzerland) کے طرز پر تھا اور پینل کوڈ (CodePenal) جو کی اطالوی (Italian) طرز پر تھا، وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نئی ترکی زبان جس کے حروف لاطینی (Latin) طرز کے تھے، شروع کی گئی۔

درج ذیل امور اہم کمالی اصلاحات (Kemalist Reforms) ہیں:

☆ 1 نومبر 1922: عثمانی سلطان کے دفتر کا خاتمہ۔

☆ 29 اکتوبر 1923: جمہوریت ترکی کا اعلان۔

☆ 3 مارچ 1924: خلافت عثمانیہ کی طرف سے منعقد خلافت کے دفتروں کا خاتمہ۔

☆ 25 نومبر 1925: ٹوپی ولباس کی تبدیلی۔

☆ 5 نومبر 1925: مذہبی خانقاہوں اور درویش گاہوں کی بندی۔

☆ 1 مارچ 1926: نئے پینل قانون کی شروعات۔

☆ 4 اکتوبر 1926: نئے سول کوڈ کی شروعات۔

☆ 1 نومبر 1928: نئے ترکی حروف کو اپنانا۔

☆ 21 جون 1934: خاندانی نام کے قانون کی شروعات۔

☆ 26 نومبر 1934: لقب وتخلص کا خاتمہ۔

☆ 5 دسمبر 1934: عورتوں کو مکمل سیاسی حقوق، ووٹ ڈالنے اور چننے کے۔

شروعاتی ترکی میں صرف ایک سیاسی پارٹی کا رواج تھا۔ پہلی سیاسی پارٹی جو جمہوریت میں قایم ہوئی وہ خواتین کی پارٹی تھی (کادنلار ہلک فرکسی)۔ اس پارٹی کی بنیاد ناظبے محی الدین (Nazihe Muhiddin) اور دیگر خواتین نے رکھی۔ لیکن انکو سیاسی کارکردگی سے روک دیا گیا۔ کیونکہ قانونی عتبار سے خواتین کو سیاست میں حصہ لینے کی ممانعت تھی۔

دوسری جنگ عظیم میں ترکی نے غیر جانبدارانہ کردار ادا کیا، لیکن جنگ کے آخر میں فروری 1945 میں ترکی نے الائیڈ فوج (Allied Forces) سے اتحاد کرلیا۔ جنگ عظیم کی ختم ہونے پر اقوام متحدہ (United Nations) کا قیام ہوا اور 26 جون 1945 میں ترکی اسکا مخصوص رکن بن گیا۔

ترکی میں ایک سیاسی پارٹی کا سلسلہ (Single Party System) 1945 تک چلا۔ اسکے بعد کثیر تعداد پارٹی کا سلسلہ (Multi Party System) شروع ہوا۔ بہرحال ملٹی پارٹی کا دور 1946 سے شروع ہوا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کا الیکشن 1950 میں ہوا اور پہلی بار غیر جمہوریت عوامی پارٹی (جمہوریت ہلک پارتیسی) (Cumhuriyet Halk Partisi) نے جیت حاصل کی۔ عدنان مندریس پہلے ڈیموکریٹک پارٹی (Democratic Party) کے صدر منتخب ہوئے۔ عدنان مندریس (Adnan Menderes) (1950-1960) کی حکومت مشہور و ہر دلعزیز ثابت ہوئی، اس حکومت نے اسلام پر جو پابندی عاید تھی اس میں ڈھیل دیا اور ساتھ ہی ساتھ معیشت میں اچھال لایا۔ لیکن 1950 سے دوسرے حصے میں معیشت میں گراوٹ دیکھی گئی جسکی وجہ سے ڈیموکریٹک پارٹی کی حکومت کا زوال آ گیا۔ مئی 1960 میں فوجی تختہ پلٹ ہوا اور فوجی سپہ سالار جنرل جمال گرسل (General Cemal Gürsel) نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہ عمل صرف مختصر عرصے کے لئے تھا اور اکتوبر 1961 میں پھر سے عوامی اختیار شروع ہوا۔

1960 کے فوجی تختہ پلٹ کے نتیجے میں شکستہ سیاسی نظام ابھر کر آیا، جسکی وجہ سے سلسلہ وار نا مستحکم ملی جلی حکومت بنی۔ 1971 میں فوج نے عوامی حکومت کو تنبیہی میمورنڈم (Memorandum) جاری کیا، جسکی وجہ سے دوسرا فوجی تختہ پلٹ ہوا اور سلیمان دمرل (Sulaiman Demirel) کی حکومت گر گئی، اور اس طرح فوجی تختہ پلٹ کا سلسلہ چلتا رہا۔

اکیسوی صدی کی حالت پر نظر ڈالی جائے تو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ 2002 کے انتخاب میں معیشت اصل مدار رہا اور اس انتخاب میں عدل و ترقی پارٹی (Justice and Development Party) (عدالت وے کلکنما پارتیسی) (Adalet Kalknmave Parts) نے جیت حاصل کی۔ اس پارٹی کے سربراہ استنبول (Instanbul) کی میئر رجب طیب اردوگان (Recep Tayyip Erdogan) تھے وہ صدر منتخب ہو گئے۔ یہ ترکی کی تاریخ کی واحد پارٹی ہے جو مسلسل تین انتخاب میں کامیاب رہی اور اسی پارٹی کی حکومت میں آنے کے بعد سے ترکی میں معیشت مستحکم ہو سکی۔ 2011 میں ملک کا GDP %9 ہو گیا۔

3.4 عراق

عراق ایک مسلمان ملک ہے جو ایشیا میں واقع ہے۔ عراق تیل کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ یہ تیل کی پیداوار کے حوالے سے دنیا میں دوسرا بڑا ملک ہے۔ عراق کے مغرب میں اردن، شمال میں شام، جنوب میں کویت، اور سعودی عرب واقع ہے۔ عراق کا رقبہ تقریباً 438317 مربع کلومیٹر ہے جبکی کل آبادی کا تخمینہ 31234000 افراد تک لگایا گیا ہے۔ عراق کی کرنسی عراقی دینار ہے اور اس ملک کا دارالحکومت بغداد ہے۔

عراق کی سرزمین کو انسانی تہذیب و تمدن کی پہلی آماجگاہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں قدیم ترین انسانوں کی رہائش کے آثار ملے ہیں۔ یہ خطہ اسلام سے قبل دو سو سال تک یونانیوں کے زیر حکومت رہا۔ ان کے بعد ساتویں صدی عیسوی تک یہاں ایرانی حکمران قابض رہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے یہاں فتح حاصل کی اور اسلام کا بول بالا ہوا۔ یہاں مسلمانوں کے عظیم خلیفہ حضرت علی نے حکومت اسلام قائم کی اور کوفہ کو دارالحکومت بنایا۔ حضرت علی کے دور حکومت کے بعد اموی اور عباسی خاندانوں نے عراق پر حکومت کی جبکہ

1258 میں ہلاکو خان اور دیگر منگول اس خطے کے حکمران ٹھہرے۔ پھر جنگ عظیم اول تک عراق پر عثمانی سلطنت قائم رہی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے عراق پر قبضہ کرلیا اور 26 سال تک فرانس اور برطانیہ کی ملی جلی حکومت رہی۔ 1932 میں برطانیہ راج اختتام کو پہنچا اور بادشاہ فیصل کی حکمرانی میں عراق ایک آزاد ریاست کے طور پر ابھرا۔ لیکن 1933 میں شاہ فیصل انتقال کر گیا۔ جس کے بعد اسکے بیٹے غازی نے تخت سنبھالا۔ غازی نے پانچ سال تک عراق پر حکومت کی اور عالمی مقام پر روابط کو غیر معمولی طور پر متعارف کروایا۔ 1939 میں غازی بھی انتقال کر گیا۔ اسکے بعد مسلسل برطانوی حکمرانوں کی ہوس سے بھری نظریں عراق پر رہیں۔ مگر 1954 میں امریکہ نے مداخلت کر کے عراق کو مختلف معاہدات سے بین الاقوامی تعلقات کے دھارے پر لا کھڑا کیا۔ مثلاً 1952 میں عراق، پاکستان، ایران، ترکی اور امریکہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے بغداد معاہدہ کہا گیا جو کہ مصر اور شام کے خلاف ایک محاذ بن گیا۔ اس لئے اسے عالمی برادری میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

1963 میں ایک بعث پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اور اس کا صدر عبدالسلام عارف مقرر ہوا۔ عارف کی وفات کے بعد حسن البکر نیا صدر بنایا گیا جس نے سوویت یونین سے تعلقات بڑھایا۔ تیل کے ذخائر سے بہت زر حاصل کیا گیا اور عراق میں سیاسی رجحان بھی عروج پر پہنچ گیا۔ بالآخر 1979 میں صدر بکر کو گرفتار کرلیا گیا اور صدر صدام حسین نے عراق کا نظام حکومت سنبھال لیا۔ صدام حسین کی حکومت 2003 تک قایم رہی جس کے بعد امریکہ نے عراق پر قبضہ کرلیا۔ صدام کے دور حکومت میں ایران کے ساتھ عراق کی طویل جنگ رہی جس میں امریکہ اور سعودی عرب نے عراق کی حمایت کی۔ بدقسمتی سے مسلمان ممالک میں اس جنگ کے منفی اثرات مرتب ہوئے۔ عراق پر امریکی جارحیت اب تک قایم ہے جس میں امریکہ کی نظریں عراقی وسائل پر لگی ہوئی ہیں۔ اس وقت عراق میں ایک برائے نام حکومت قایم ہے۔ عراق کے تقریباً اٹھارہ صوبے ہیں جو مختلف ضلعوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ عراق کے اہم ترین شہروں میں بغداد، کربلا، نجف اشرف، صلاح الدین، بصرہ، کرکوک اور دھوک وغیرہ شامل ہیں۔

3.5 ایران

ایران کی تاریخ طویل ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ ملک پرشیا (Persia) یعنی فارس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسلامی تاریخ کی شروعات 7 ویں صدی سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے مستقل تعلقات کے وجہ سے یہ ملک شروع میں ہی مسلمان ہوگیا اور اموی وعباسی خلافت کا اہم حصہ بنا رہا۔ سولہوی صدی تک سنی مسلمانوں کا دبدبہ رہا۔ پھر صفوی خاندان ایران پر قابض ہوگیا اور اسکی حکومت قایم ہوگی۔ تاریخ دانوں کے مطابق صفوی دور سے ہی ایران جدیدیت کی طرف بڑھنے لگا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کی صفوی حکمرانوں نے ہر میدان میں کارکنوں کی ہمت افزائی کی، یہی وجہ ہے کی ایران اپنے عروج کو پہنچا۔

ایران کی جدید تاریخ 1921 کے فوجی تختہ پلٹ سے مانی جاتی ہے اس۔ فوجی تختہ پلٹ کے اصل کارکن رضا خان تھے۔ اس کا سبب قاجاری (Qajar) حکومت کی نااہلی تھی۔ کیونکہ بیشتر افسران حکومت کا نظام اپنے حساب سے چلا رہے تھے۔ اس وقت جو وزیر اعلی رضا شاہ تھے انہوں نے قاجاری حکمران کو تخت سے ہٹادیا اور خود تخت نشین ہوگئے۔ رضا شاہ نے پہلوی (Pahlavi) خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ رضا

شاہ اور محمد رضا شاہ یہ دونامور حکمران گزرے۔ رضا شاہ کا دور 1925 سے 1941 تک کا ہے۔ اس دور میں رضا شاہ نے ایران میں جدیدیت کی روح پھونک دی۔ انہوں نے کی معاشرتی و معاشی اصلاحات نافذ کیے۔ فوج کو منظم کیا، سرکاری دفتر کو بہتر بنایا وغیرہ۔ رضا شاہ کے کارنامے تیز رفتار اور دکھاوا ہے کہ کر خوب مذمت ہوئی۔ بالآخر رضا شاہ کا دوران کے انتقال کے ساتھ 1941 میں ختم ہوا اور انکے فرزند محمد رضا شاہ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے حکومت کے کام کاج سے شروع میں دلچسپی نہیں لی۔ جسکی وجہ سے وزیر اور افسران نے خوب بدامنی پھیلادی۔ وزیراعظم محمد مصدق نے سیاسی چال چل کر محمد رضا شاہ کو دستبردار کر دیا اور جلاوطن کر دیا۔

اسی زمانے میں امریکہ اور برطانیہ یہاں کے تیل کے ذخائر میں دلچسپی لینے لگے اور 1953 کے فوجی تختہ پلٹ میں امریکہ و برطانیہ نے وزیراعظم کو دستبردار کیا اور محمد رضا شاہ کو ایک بار پھر حکمران بنادیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کی شاہ ایران مغرب کا حامی ہوگیا۔ ایران کے واشنگٹن (Washington) سے باہمی تعلقات ہوگئے اور امریکہ نے معاشی و فوجی امداد ایران کو دی اور ایران خطے میں طاقتور ملک بن گیا، یہ سلسلہ 1960 کے اخیر تک چلا۔

ملک نے مغربیت کا اثر بڑھتا دیکھا جسکی وجہ سے مذہبی رہنما خفا ہوئے اور اس مغربیت و سیکولر پن کی مذمت کی۔ مذہبی رہنما اور شاہ ایران کے بیچ رسہ کشی کی نوبت آگئی۔ مذہبی رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی (Ayatullah Ruhullah Khomeini) جن کو شاہ نے فرانس جلاوطن کر دیا تھا، نے 1970 کے دور میں علانیہ مخالفت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے مذہبی رہنما کا ساتھ دیا اور آخر کار پہلوی حکومت 1979 کے ایرانی انقلاب کی نذر ہوگئی۔ اور محمد رضا شاہ پہلوی کو جلاوطن کر دیا گیا۔

انقلاب حکومت کا نظریہ عوامی، قومی، اور خاص کر شیعہ تھا۔ اسکا دستور ولایت فقیہ (Velayet-e-Faqih e) پر مبنی تھا۔ اس تصور کو آیت اللہ خمینی نے پیش کیا تھا۔ خمینی نے اعلی ترین لیڈر کا کردار اپنے انتقال 1989 تک ادا کیا۔ اس اسلامی انقلاب نے پوری دنیا میں بڑا اثر پیدا کیا۔ غیر مسلم دنیا میں اسلام کی تصویر بدل گئی۔

ایرانی انقلاب اور جمہوریت ایران کے انعقاد کے بعد ایران کو آٹھ سالہ جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ جنگ 1980 سے 1988 میں ایران و عراق کے درمیان لڑی گی۔ اس وقت عراق میں صدام حسین صدر تھا۔ اس جنگ کا سبب شط العرب (Shatt-al Arab) بحری علاقے کی سرحد کو لیکر اختلاف تھا. اس جنگ میں لگ بھگ 3 لاکھ سے 20 لاکھ لوگوں کی جانیں گئیں۔ سالوں تک ایران کی لیڈرشپ قدامت پسند رہی۔ اسکے برعکس اعتدال پسند لوگوں نے ایران کو جدید بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن قدامت پسند لوگوں نے انکے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔

اکیسوی صدی نیں ایران نے تبدیلی محسوس کی اور 2005 کے صدارتی انتخاب میں محمود احمدی نژاد (Mahmoud Ahmadinejad) نے ایران کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور اس کے دور میں ایران نے نیوکلیئر ہتھیار (NuclearWeapon) تیار کیا اور دیگر نیوکلیئر ہتھیار (Nuclear Weapon) والے ممالک کی صف میں خود کو شامل کر دیا۔ فی الوقت ایران کے صدر حسن روحانی (Hasan Rouhani) ہے جن کا انتخاب 2013 میں ہوا۔

3.6 بوسنیا (Bosnia)

بلقان جزیرہ نما (Balkan Peninsula) میں بوسنیا (Bosnia) و ہرزیگووینا (Herzegovina) ایک تکونی شکل کی جمہوریت ہے۔ بوسنیا (Bosnia) کا علاقہ جنوب میں پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہرزیگووینا (Herzegovina) کے علاقہ کا شمالی حصّہ پتھریلا و میدانی ہے اور ایڈریاٹک (Adriatic) سمندر میں اس کا بحری بندرگاہ ہے جو تقریباً 20 کلومیٹر لمبا ہے۔

اس جمہوریت میں صدارت تین نسلی سیاسی پرٹی خاص کر سرب (Serb)، کروشیائی (Croat) اور بوسنیائی (Bosnian) میں گردش کرتی ہے۔

یہ خطّہ قدیم زمانے میں الليرکم (Illyricum) کے طور پر جانا جاتا تھا، اب یہ بوسنیا (Bosnia) و ہرزیگووینا (Herzegovina) کہلاتا ہے۔ اسکورومیوں (Roman) نے دوسری و پہلی صدی قبل مسیح فتح کیا تھا اور اسکا شمار رومی (Roman) صوبہ دلماتیہ (Dalmatia) میں کرلیا۔ چوتھی و پانچویں صدی عیسوی میں اس پر گوتھوں (Goths) کا قبضہ ہوگیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں بازنطینیوں (Byzantine) کا اس پر قبضہ ہوا۔ سلاو (Slav) نسل کے لوگ اس خطّہ میں ساتویں صدی میں بسے۔ 1200 عیسوی کے قریب بوسنیا (Bosnia) نے ہنگری (Hungary) سے آزادی حاصل کی اور تقریباً 260 سالوں تک آزاد عیسائی ریاست رہی۔

بلقان میں سلطنت عثمانیہ کی توسیع کی وجہ سے تہذیبی، سیاسی، اور مذہبی دائرے کی نئی شروعات ہوئی۔ 1389 کی مشہور کوسوو (Kosovo) کی جنگ میں ترکوں نے سربوں (Serbs) کو شکست دی، اور 1463 میں بوسنیا (Bosnia) کو فتح کرلیا۔ تقریباً 450 سالوں تک بوسنیا (Bosnia) و ہرزیگووینا (Herzegovina) عثمانیوں (Ottomans) کی حکومت میں رہا، جس کی وجہ سے بیشتر عیسائی سلاو (Slav) مسلمان ہوگئے۔ انیسوی صدی میں عثمانی سلطنت دھیرے دھیرے محدود ہونے لگی اور مسلمان پورے بلقان سے ہجرت کرکے بوسنیا میں بسنے لگے اور بوسنیا کی آبادی بوسنی (Bosnian) کے نام سے جانی جانے لگی۔ عثمانی سلطنت کے زوال کے دور میں روسی ترکی جنگ (warTurkish-Russo) ہوئی جس کا اثر یہ ہوا کہ روسیوں (Russians) کا اس خطّہ میں دبدبہ بن گیا۔ 1908 میں یہ علاقہ عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور اسٹرو ہوگاری (Hungarian-Austro) حکومت نے اس کو اپنے قبضے میں لیلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کی سربیا (Serbia) سے جو تعلقات تھے وہ ختم ہوگئے۔ دوسری جنگ عظیم میں سربیا (Serbia) نے اس پر اپنا حق جمایا اور اپنی حکومت قائم کرلی۔ اس طرح نئی بادشاہت قائم ہوئی جس میں سرب (Serbs)، کروشی (Croats)، اور سلوی (Solvenes) شامل ہوئے۔ 1929 میں اسکا نام تبدیل کرکے یوگوسلاویہ (Yugoslavia) کردیا گیا۔ 1941 میں جرمنی (Germany) نے یوگوسلاویہ (Yugoslavia) پر حملہ کردیا جس کی وجہ سے بوسنیا (Bosnia) و ہرزیگووینا (Herzegovina) نازیوں (Nazi) کے اختیار والے کروشیا (Croatia) کا حصّہ بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بوسنیا (Bosnia) و ہرزیگووینا (Herzegovina) پھر سے متحد ہوا اور مارشل ٹیٹو (Tito Marshal) کی صدارت میں یوگوسلاویہ (Yugoslavia) کا حصّہ بنا رہا۔ 1980 تک یعنی کے مارشل ٹیٹو (Tito Marshal) کے انتقال کے وقت تک یوگوسلاویہ (Yugoslavia) نے ترقی کی۔ مگر اس کے بعد یوگوسلاویہ (Yugoslavia) بکھرنے لگا۔

دسمبر 1991 میں بوسنیا و ہرزیگووینا نے یوگوسلاویہ (Yugoslavia) سے اپنی آزادی کا اعلان کردیا اور یوروپی یونین

(Union European) سے اس کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ مارچ 1992 میں ریفرنڈم (Referendum) ہوا اور بوسنیا والوں نے آزادی چنی اور صدر علی جاہ عزت بگوویک (Izetbegovic Alija) نے آزاد ریاست کا اعلان کر دیا۔ بوسنیا میں اس وقت آبادی اس طرح تھی:
مسلمان (Muslims?) (44%)، سرب (Serbs) (31%)، اور کروٹ (Croats) (17%)۔

1992-1995 کے درمیان اس خطہ نے جنگ کا سامنا کیا اور سربیا جو بوسنیا کو واپس اپنی ریاست میں ملانا چاہ رہا تھا، اسکی فوج نے حملہ کر دیا۔ سربیا (Serbia) کے صدر سلوبودان ملوسویک (Slobodan Milosevic) نے نسل کشی کا آرڈر دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1995 میں بوسنیا کے 8000 سے زیادہ مسلمانوں کا سربرینکا (Srebrenica) میں قتل کر دیا گیا۔ بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے یہ جنگ رکی اور سربیا کے صدر ملوسویک (Milosevic) پر ہیگ میں مقدمہ چلا اور اسکو قصوروار ٹھہرایا گیا جس کا فیصلہ 2006 میں آیا۔

3.7 خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ ترکی جہاں عثمانی خلافت نے ایک طویل عرصہ تک حکومت کی، جنگ عظیم میں شکست کے بعد وہاں صورت حال میں بڑی تبدیلی آئی، خلافت کا خاتمہ ہو گیا، مصطفیٰ کمال نے اپنی اصلاحات نافذ کیں، جن کے نتیجہ میں مذہبی آزادی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ترکی کی بڑی سلطنت پھر ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس وقت وہاں پھر صورت حال بدل رہی ہے۔ عراق عرب دنیا کا ایک اہم ملک ہے، انسانی تہذیب کی پہلی آماجگاہ اسے سمجھا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد وہاں برطانیہ نے قبضہ کر لیا تھا، آزادی کے بعد مختلف حکومتیں قائم ہوتی رہیں، صدام حسین کے زمانہ میں ایران کے ساتھ آٹھ برس کی طویل جنگ ہوئی۔ ایران ایک قدیم ملک ہے، اسلام کی طویل تاریخ یہاں رہی ہے۔ پہلوی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہاں اسلامی جمہوریہ قائم کیا گیا، آج ایران ترقی کی راہ پر ہے۔ بوسنیا اپنی تاریخ کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے آزاد ریاست کے طور پر وجود میں آیا، لیکن یہاں اب بھی حالات اطمینان بخش نہیں ہو سکے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بدترین نسل کشی کا سامنا کر چکے ہیں۔

3.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1. ترکی کے جمہوریت میں تبدیل ہونے کے اسباب پر نظر ڈالیں۔
2. مصطفیٰ کمال پاشا کی اصلاحات پر تبصرہ کریں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجئے۔

3. صدام حسین کے دور کے عراق پر مضمون لکھیں۔
4. محمد رضا شاہ پہلوی اور علماء دین کے درمیان تصادم پر بحث کیجئے۔
5. بوسنیا کی تاریخ پر مختصر نوٹ درج کیجئے۔

اکائی 4 :جنوبی ایشیا وجنوب مشرقی ایشیا

اکائی کے اجزاء

4.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے اہم اسلامی ممالک ،ان کے امکانات ،وسائل ،مسائل اور احوال سے بخوبی واقف ہوسکیں گے۔

4.2 تمہید

ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں متعدد اسلامی ممالک آتے ہیں ،اس اکائی میں ان ممالک کا الگ الگ اجمالی مگر جامع تعارف کرایا

جائے گا۔ ان کی حصولیابیوں کا جائزہ لیا جائے گا، ان ممالک میں بعض بے حد مالدار ہیں، اور بعض نے کافی ترقی کی ہے جبکہ بعض بہت پیچھے ہیں۔ چنانچہ ان کے امکانات اور کامیابیوں اور ناکامیوں کو بیان کیا جائے گا اور ان کے اسباب کی طرف بھی اشارے کیے جائیں گے۔

4.3 جنوبی ایشیا و جنوب مشرقی ایشیا: اجمالی تعارف

اس خطہ میں پاکستان ایسا ملک ہے جو کسی لسانی، نسلی یا وطنی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کی بنیاد دو قومی نظریہ پر رکھی گئی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے اس اصرار پر کہ وہ ملک کی اکثریت سے جداگانہ تشخص رکھتے ہیں لہٰذا ان کا الگ آزاد ملک ہونا چاہیے، پاکستان وجود میں آیا۔ اپنے آغاز ہی سے پاکستان میں اسلامی نظام اور سیکولرزم کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے۔ آبادی 12 کروڑ 18 لاکھ 56 ہزار، زبان: اردو، مذہب اسلام، باشندوں کی بڑی اکثریت مسلمان ہے۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو جغرافیائی طور پر اس کے دو حصے تھے، مغربی پاکستان و مشرقی پاکستان، دونوں کے درمیان ایک ہزار کلومیٹر کا جغرافیائی فاصلہ تھا، دوسرے حصہ کی سیاست و معیشت پر مغربی پاکستان کا غلبہ تھا۔ مشرقی پاکستان (یعنی بنگال کا وہ حصہ جو پاکستان میں شامل ہوا تھا) میں رفتہ رفتہ احساس محرومی بڑھنے لگا۔ دونوں خطوں کی زبان اور کلچر میں کافی فرق تھا، مغربی پاکستان میں اردو بولی جاتی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں بنگلہ۔ سیاسی طور پر شروع ہی سے پاکستان میں مختلف نظریات کام کررہے تھے جن کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک چل پڑی۔ اور 24 سال پاکستان کے ساتھ رہنے کے بعد بنگلادیش ایک آزاد ملک بن گیا۔ آبادی تقریباً 14 کروڑ مذہب: اسلام، زبان بنگالہ۔

افغانستان جنوبی ایشیا کا ایک ملک ہے۔ جس کی سرحدیں ایک طرف پاکستان سے، دوسری طرف سے ایران سے ملتی ہیں۔ جبکہ روس بھی اس کا بڑا اہم سایہ ہے۔ افغانستان قرون وسطیٰ میں کئی طاقت ور سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ کسی زمانہ میں ہندوستان بھی افغانوں کے زیر نگیں رہا ہے۔ 1929 سے افغانستان کا دور جدید شروع ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں اس اکائی میں آپ کو بتایا جائے گا۔

مالدیپ جزائر کا مجموعہ ہے۔ یہ جزائر سری لنکا کے جنوب میں چار سو میل کے فاصلہ پر بحر ہند میں واقع ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے ابتدائی دور میں ہی قبول اسلام کرلیا تھا۔ 1518 سے یہ جزائر غیر ملکی اقتدار کے تحت آگئے چنانچہ یہاں پرتگالی، ولندیزی اور پھر انگریزوں نے حکومت کی۔ 1948 میں اندرونی آزادی ملی، خارجی امور ابھی تک برطانیہ کے سپرد تھے۔ مگر 1966 میں مالدیپ مکمل طور پر آزاد ہوگیا اور عوامی استصواب کے بعد 1968 میں اس کو جمہوریہ بنادیا گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے دو ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ جن کا رقبہ کل ایک سو پندرہ مربع میل ہے۔ ان جزیروں میں سے زیادہ تر غیر آباد ہیں صرف 220 جزیرے آباد ہیں۔ باشندے سب مسلمان ہیں زبان سری لنکائی سنہالی زبان سے مشابہ ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ملایشیا دو مسلم اکثریتی ممالک ہیں۔ جن میں انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہ متعدد جزائر پر مشتمل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انڈونیشیا مسلم دنیا کا مطلع خورشید ہے یعنی اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سورج اسی ملک سے طلوع ہوتا ہے۔ پھر اُس کی روشنی دھیرے دھیرے باقی اسلامی ممالک تک پھیلتی جاتی ہے۔ انڈونیشیا اور ملائشیا دونوں ہی

ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت ترقی یافتہ اور دوسرے مسلم ملکوں سے آگے ہیں۔ آبادی :20 کروڑ 4 لاکھ دس ہزار: (1996 کے اعداد وشمار کے مطابق) مذہب :اسلام، عیسائیت زبان: انڈونیشی

انڈونیشیا کے پڑوس میں ملائشیا ہے، جو مسلم دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ صنعتی و معاشی طور پر ملائشیا ایک جانب تو انتہائی ترقی یافتہ ہے، دوسری جانب ملائیشیا کے مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی بھی بہت گہری ہے۔ ملائشیا میں کل تیرہ ریاستیں ہیں۔ جن میں گیارہ جزیرہ نمائے ملایا میں واقع ہیں۔ یہ ملک ایک تکثیری کلچر رکھتا ہے۔ سب سے بڑی کمیونیٹی ''مالے'' ہے جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کمیونیٹی کی اکثریت مسلمان ہے۔ اُنہیں کی مناسبت سے ملائیشیا کا پرانا نام ''ملایا'' رہا ہے۔ ان گیارہ ریاستوں میں سے پانچ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ آبادی: تقریباً 4 کروڑ: مذہب :اسلام، عیسائیت ہندومت، زبان: مالے

برونئی ایک چھوٹے رقبہ اور تھوڑی سی آبادی والا ملک ہے۔ مگر وہ جنوبی ایشیا میں انڈونیشیا کے بعد پیٹرول پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ پیٹرول کی فراوانی نے اُسے دولت مند بنا دیا ہے۔ دولت کی ریل پیل کی وجہ سے برونئی کی فی کس آمدنی ایشیا میں کویت اور متحدہ عرب امارات کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اور اسی وجہ سے اس ملک کو مشرق بعید کا کویت بھی کہا جاتا ہے۔ برونئی مدت دراز تک برطانوی محروسات میں شامل رہا ہے۔ البتہ اب آزاد اسلامی ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ اس ملک میں سعودی عرب کی طرح کئی اسلامی حدود نافذ ہیں اور شراب وقمار پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ آبادی :2 لاکھ 85 ہزار: (1996 کے اعداد وشمار کے مطابق) مذہب :اسلام، زبان: مالے

معلومات کی جانچ:

1- اسلام کا مطلع خورشید کس ملک کو کہتے ہیں؟

2- مشرق بعید کا کویت کس ملک کو اور کیوں کہا جاتا ہے؟

3- ملائیشیا میں تین بڑے مذاہب کون کون سے ہیں؟

4.4 پاکستان

چودہ اگست 1947 کو برصغیر میں پاکستان کے نام سے ایک آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ پاکستان بنانے میں مسلم لیگ اور دوسری کئی مسلم جماعتوں کا کردار اہم رہا ہے۔ اُس کے بانی محمد علی جناح تھے جو اس کے پہلے گورنر جنرل بھی بنے۔ پاکستان بننے کے بعد ملک کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی بازآبادکاری کا تھا، جو تقسیم ملک کے معاً بعد ہندوستان میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجہ میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد پنجاب کے مہاجرین کی تھی۔ نازک فرقہ وارانہ صورت حال کے باعث ہندو پاک دونوں ملکوں نے مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے مسلم وغیر مسلم باشندوں کے تبادلہ پر اتفاق کر لیا۔ لیکن تبادلہ کے اس عمل میں پورا ایک سال لگ گیا۔ جس میں 40 لاکھ ہندو پاکستان سے انڈیا آ گئے اور اس سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں مسلمان پاکستان چلے

گئے ۔لوگوں کی بڑے پیمانہ پر نقل مکانی نے پاکستان کی معیشت کو متاثر کیا۔مہاجرین کے مسئلہ کو پوری طرح حل کرنے میں اگلے 25 سال لگ گئے ۔لیاقت علی خاں (1951-1896) ملک کے پہلے وزیراعظم تھے۔ان کا دورِ حکومت مختصر رہا لیکن ان کے دور میں پاکستان نے سیاسی ،معاشی اور فوجی لحاظ سے قابل لحاظ ترقی کی ۔انہوں نے خارجہ پالیسی میں آزاد رہنے کی کوشش کی ۔امریکہ ،چین اور روس سب سے تعلقات بنائے ۔اسلامی ممالک سے بھی قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے کراچی میں پہلی چوٹی بین الاقوامی کانفرنس طلب کی ۔لیاقت علی خان کے زمانہ میں پاکستان کے آئین کا مسئلہ سلجھایا گیا۔اپنی تشکیل کے وقت پاکستان برطانوی کامن ویلتھ کا ایک حصہ اور نو آبادی تھا اور پاکستانی گورنر جنرل کی حیثیت تاج برطانیہ کے نمائندہ کی ہوتی تھی ۔مگر عوام اور دینی تنظیموں کی جدوجہد سے 12 مارچ 1949 میں ملک کی دستور ساز اسمبلی نے لیاقت علی خان کی پیش کردہ قرارداد مقاصد کو منظور کرلیا،اس قرارداد مقاصد کے مطابق آئینی طور پر اس بات کا عہد کرلیا گیا کہ ملک کے قوانین اسلامی شریعت کے مطابق بنائے جائیں گے ۔یہ قرارداد لیاقت علی خان کے دور کی سیاست کا اہم ترین واقعہ ہے۔

پاکستان بننے کے ایک سال کے اندر ہی بانی پاکستان محمد علی جناح کا انتقال ہوگیا۔16 اکتوبر 1951 میں جبکہ ابھی آئین پاکستان کی تیاری کا کام چل رہا تھا۔راول پنڈی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرنے کے لیے وزیراعظم لیاقت علی خاں کھڑے ہو رہے تھے کہ ایک نامعلوم شخص نے ان کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔اس کے بعد سے پاکستان سیاسی طور پر مسلسل عدم استحکام کا شکار ہوتا چلا گیا۔لیاقت علی خاں کے بعد غلام محمد پاکستان کے گورنر جنرل بنے ،جنہوں نے جوڑ توڑ کی سیاست شروع کی ۔1954 دستور ساز اسمبلی توڑ دی ،ان کی غیر جمہوری کارروائیوں کی وجہ سے ملک کی سیاست میں جوڑ توڑ کا دور شروع ہوگیا۔مسلم لیگ کمزور پڑ گئی،مختلف لوگ اس جماعت سے نکلے اور انہوں نے الگ الگ پارٹیاں بنالیں۔غلام محمد کے جانشین اسکندر مرزا ہوئے ۔1956 میں نیا دستور بنایا گیا،پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔1959 میں عام انتخابات ہونے والے تھے کہ فوج نے بغاوت کر کے آئینی حکومت کا تختہ الٹ دیا' اور ملک میں فوجی حکومت قائم کردی جس کے سربراہ جنرل محمد ایوب خاں تھے۔جنرل محمد ایوب خاں کے زمانہ میں ملک نے صنعتی ترقی کی ،کپڑے ،سیمنٹ اور چمڑے کی صنعتوں میں بڑی ترقی ہوئی ۔تاہم ان ہی کے دور میں ملک میں مارشل لا لگا۔قومی آئین منسوخ کر کے نیا آئین نافذ کیا گیا۔صدر ایوب کے زمانہ میں راول پنڈی کے پاس ایک نیا دارالحکومت اسلام آباد تعمیر کیا گیا۔ان کے عہد میں سندھ طاس کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا جس کی وجہ سے مغربی پاکستان کے بڑے حصہ کو کاشت کاری کے لیے پانی میسر آسکا،اس منصوبہ کی تکمیل میں امریکہ ،برطانیہ ،فرانس اور بھارت کی مدد اور قرض نے بڑا کردار ادا کیا۔صدر ایوب خاں کے زمانہ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی مغربی ملکوں کے زیر اثر آگئی تھی۔البتہ اپنے آخری دور میں انہوں نے اس پالیسی پر نظر ثانی کی ۔ان کے دور میں علاقائی تعاون برائے ترقی نامی تنظیم کا قیام عمل میں آیا۔لیکن ان کے دس سالہ دور حکومت میں جبر واستبداد کی حکومت تھی۔ پریس کی آزادی ختم اور سیاسی پارٹیوں پر پابندی تھی ۔ان کے دور میں صوبائی عصبیتوں اور لسانی اختلافات نے سر ابھارا۔مشرقی پاکستان والوں کے احساس محرومی میں اضافہ ہوگیا۔انہوں نے وہاں کے مقبول لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرلیا تو علیحدگی پسندی کے لیے فضا اور ساز گار ہوگئی۔

1967 میں صدر ایوب خان کے خلاف جمہوریت پسندوں اور مذہبی جماعتوں نے مل کر بحالئی جمہوریت کی مہم شروع کی ،فروری

1969 میں صدر ایوب خاں نے مخالفین سے مذاکرات میں ناکامی کے بعد انتظام حکومت فوج کے کمانڈر انچیف جنرل یحیٰ خان کے سپرد کر دیا۔ جنرل یحیٰ خان کے اقدامات سے مشرقی پاکستان میں مایوسی بڑھتی گئی۔ 1970 میں جو عام انتخابات ہوئے ان میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اکثریت سے جیتی۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کا تناسب 54 فیصد تھا، اس لیے شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کا وزیر اعظم بنایا جانا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تو مشرقی پاکستان میں بغاوت ہوگئی۔ جنرل یحیٰ خان نے وہاں فوجی کارروائی کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت میں ہندوستان نے مداخلت کی اور 1971 میں پاکستانی فوج نے ہندوستانی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دونوں الگ الگ ملک بن گئے۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا۔ ان کے دور میں ملک نے ایٹمی پروگرام شروع کیا۔ اور بھی ترقی کے کام ہوئے مگر ان کے طور طریقے بھی جابرانہ تھے، انہوں نے آئین میں ترمیم کرائی۔ پریس پر پابندی لگائی اور سیاسی قتل ہوئے۔ جب بھٹو کے خلاف عوامی غم و غصہ بڑھنے لگا تو جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977 میں ان کا تختہ پلٹ کر ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ جنرل ضیاء کے دور میں اصلاحات کا عمل شروع ہوا، پاکستان نے افغان جہاد میں حصہ لیا۔ اسلامائزیشن کا کام شروع ہوا۔ مگر ایک ہوائی حادثہ میں ان کی شہادت کے بعد پاکستان سیاسی عدم استحکام کا پھر شکار ہوگیا۔ بے نظیر بھٹو اور ان کے بعد نواز شریف کی حکومتوں میں جمہوریت واپس آئی۔ لیکن ملک میں سیاسی، لسانی اور مسلکی تشدد اور مسلح نزاعات برپا رہے۔ نواز شریف کی جابرانہ جمہوریت کے خلاف جنرل مشرف نے کارروائی کر کے ان کا تختہ پلٹ کر دیا۔ اور ملک میں ایک بار پھر فوجی مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ جنرل مشرف کا دور بڑا نزاعی، پُرتشدد اور اختلافی رہا۔ ان کے اقتدار کے آخر میں وکیلوں اور عدلیہ نے بحالی جمہوریت کی لڑائی لڑی، بے نظیر بھٹو کو اپنی جان کی قیمت دینی پڑی اور جنرل مشرف کو بالآخر اقتدار چھوڑنا پڑا۔ اور ان کے بعد نواز شریف نے انتخابات جیت کر دوبارہ اقتدار سنبھالا۔ جنرل مشرف کے دور میں اسلام آباد کی لال مسجد کا سانحہ، کارگل کی لڑائی (نواز شریف کے پہلے دور میں) ڈرون حملے، مسلکی تشدد اور دہشت گردی میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان کے عہد میں ہندو پاک مذاکرات کا دور بھی شروع ہوا۔ جس میں مزید پیش رفت نہیں ہو سکی۔

پاکستان کی معیشت فی الوقت کافی کمزور ہے۔ ملک میں امن و امان نہ ہونے کی وجہ سے سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ کرنسی خاصی ڈاؤن ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی میں کوئی پیش رفت نہیں ہے۔ عسکری لحاظ سے پاکستان اسلامی دنیا کا سب سے طاقت ور ملک ہے۔ وہ ایک ایٹمی پاور ہے۔ ایٹم بم کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ہیں۔ ملک میں صلاحیتوں کی کمی نہیں مگر امن و امان نہ ہونے کی وجہ سے ملک مجموعی طور پر ترقی نہیں کر رہا ہے۔ پاکستان میں اردو ادب ترقی یافتہ ہے۔ صحافت آزاد اور معیاری ہے۔ جنگ، نوائے وقت اور جسارت بڑے اخبارات ہیں۔ اسلامی علوم میں بڑا کام ہوا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مفتی محمد تقی عثمانی جیسے بڑے علماء وہاں ہوئے ہیں۔ مولانا مودودی، امین احسن اصلاحی، محمود احمد غازی، غلام احمد پرویز، خلیفہ عبدالحکیم اور اشتیاق حسین قریشی جیسے مشاہیر علم و ادب دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ شاعروں میں فیض احمد فیض سب سے مشہور ہوئے ہیں۔ لیکن عمومی تعلیم کی شرح میں پاکستان بہت پیچھے ہے۔ خواندگی کا تناسب بہت کم ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ البتہ اب وہ بھاری صنعت کے میدان میں داخل ہو رہا ہے۔ کراچی، حیدرآباد، ملتان، فیصل آباد اور لاہور بڑے صنعتی مراکز ہیں۔ اسلحہ کے میدان میں پاکستان خود کفیل ہے۔ معدنیات کی کمی ہے، پیٹرول بہت کم نکلتا ہے، البتہ قدرتی گیس بڑی مقدار میں نکلتی ہے۔ زرعی سیکٹر میں بھی وہ پیچھے ہے۔ بلوچستان جو ملک کے نصف رقبہ پر مشتمل ہے، زیادہ تر بنجر ہے، سوتی کپڑے کے معاملہ میں وہ خود کفیل ہے البتہ گیہوں باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔

معلومات کی جانچ:

1- موجودہ دور میں پاکستان کا بڑا مسئلہ کیا ہے؟

2- پاکستان میں زراعت کی صورت حال کیا ہے؟

3- پاکستان کے بڑے اخبارات کون سے ہیں؟

4.5 بنگلہ دیش

1971 میں مشرقی پاکستان الگ ہوکر بنگلادیش کے نام سے معرض وجود میں آیا۔اس کی علیحدگی کے اسباب سیاسی تھے،وہ بنگلہ قومیت کے نام پر وجود میں آیا۔وہاں اردو بولنے والے لوگوں پر قافیہ تنگ کر دیا گیا۔ان میں سے کئی لاکھ آج بھی کس مپرسی کی حالت میں رفیوجی کیمپوں میں رو رہے ہیں۔بنگلہ لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن مسلم لیگ میں شامل تھے مگر وہ بنگلہ قوم پرستی کے نظریہ کے حامل تھے۔1952 میں جب حسین سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی تو وہ اس میں شامل ہو گئے۔اور بہت جلد اس کے جنرل سیکریٹری بن گئے۔وہ ایک بڑے اور پر جوش عوامی مقرر تھے اور سوشلزم اور سیکولرزم کے حامی۔چنانچہ بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد ان کی حکومت نے انہیں بنیادوں پر کام شروع کر دیا۔پٹ سن،کپڑے اور جہاز رانی کی صنعتوں کو قومیا لیا گیا۔نیا آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت بنگلہ دیش کو ایک سوشلسٹ اور جمہوری ملک قرار دیا گیا۔نئی حکومت نے ان تمام لوگوں اور جماعتوں کو کالعدم کر دیا جنہوں نے پاکستان کو متحد رکھنے کے لیے کام کیا تھا۔اس نے ہندوستان سے خصوصی تعلقات قائم کیے۔1974 میں بنگلہ دیش میں زبردست قحط پڑا جس سے نمٹنے میں ناکام رہنے پر ملک میں شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف بے چینی بڑھنے لگی۔انہوں نے ایمرجنسی نافذ کر دی،آئینی حقوق معطل کر دیے،آئین میں نئی ترمیمات کر کے ملک میں صدارتی نظام نافذ کر دیا اور خود اس کے صدر بن گئے۔تاہم بنگلہ نفسیات میں جمہوریت پسندی اور جبر و استبداد سے طبعاً نفرت پائی جاتی ہے۔چنانچہ فوج نے شیخ مجیب سے بغاوت کر کے ان کے سارے خاندان کو 15 اگست 1975 میں قتل کر دیا۔ان کے خاندان میں صرف ان کی بیٹی شیخ حسینہ واجد بچیں جو آج ملک کی وزیر اعظم ہیں۔اور اسلام پسندوں سے سخت انتقام لے رہی ہیں۔3 جون 1978 کو آرمی جنرل ضیاء الرحمٰن نے نیشنل پولیٹیکل فرنٹ کے نام سے ایک محاذ بنا کر انتخاب لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔انہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ کے لیے کوششیں کیں۔دینی مدارس کی سندوں کو تسلیم کیا اور ہر قسم کی سیاسی آزادیاں بحال کر دیں۔اسلام پسندوں پر سے بھی پابندیاں اٹھالیں۔ان کا دور بحیثیت مجموعی ملک کے لیے خوش آئند رہا۔اُس کے بعد سیکولر عناصر نے صدر ضیاء کے خلاف بھی سازش کی اور ان کو بھی قتل کر دیا گیا۔آج ان کی بیوہ خالدہ ضیاء ملک کی سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی BNP کی سربراہ ہیں اور دو بار ملک کی وزیر اعظم رہ چکی ہیں۔ڈھاکہ بنگلہ دیش کا دارالحکومت ہے۔یہاں کی جامع مسجد بیت المکرّم ایک تاریخی اور بڑی مسجد ہے۔

بنگلہ دیش کے معدنی وسائل کم ہیں،خاص پیداوار پٹ سن کی زمین بہت زرخیز ہیں۔رقبہ کم ہے اور آبادی بہت بڑھتی جا رہی ہے۔کہا جاتا ہے کہ جاوا کے بعد بنگلہ دیش دنیا کا سب سے گنجان خطہ ہے۔بارشیں بہت ہوتی ہیں۔دریا اور ندیاں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔مگر سیلابوں اور طوفانوں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر تباہی آتی رہتی ہے۔جس کی وجہ سے اقتصادی مسئلہ درپیش ہے۔سعودی عرب بنگلہ

دیش کی بڑے پیمانہ پر اقتصادی مدد کرتا ہے۔فی الوقت ملک میں اسلامیت اور سیکولرزم کی کشمکش عروج پر ہے۔حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں میں تصادم چل رہا ہے۔ ہڑتالوں اور بائکاٹوں اور احتجاجوں کا سلسلہ جاری ہے جن سے حکومت بڑی سختی سے نمٹ رہی ہے۔

4.6 افغانستان

افغانستان میں انیسویں صدی میں بارک زئی خاندان کا اقتدار قائم ہوا جس میں چھ حکمران ہوئے۔ان میں آخری حکمراں عنایت اللہ خان تھے۔جنوری 1929 میں ان کا اقتدار ختم ہوگیا،اور بارک زئی خاندان کو زوال ہوا۔ان کے بعد بچہ سقہ (حبیب اللہ) کی چند مہینوں کی حکومت کے بعد یحیٰ خیل خاندان کا اقتدار شروع ہوا جس میں نادر شاہ اور ظاہر شاہ دو حکمران ہوئے۔ 1933 سے 1972 تک بادشاہت ختم ہونے کے بعد جمہوری دور شروع ہوا۔جس میں چار صدور مملکت سردار داؤد خاں،نور محمد ترہ کئی،حفیظ اللہ امین اور صدر ببرک کارمل ہوئے۔ببرک کارمل کمیونسٹ تھے اور صدر حفیظ اللہ امین اور ان کے حامیوں کو قتل کروا کر اقتدار میں آئے تھے۔حفیظ اللہ امین اور ان سے پہلے ترہ کئی بھی کمیونسٹ تھے اور روس کے اشاروں پر چلتے تھے۔عوام ان تمام حکومتوں سے نالاں تھے اور انہوں نے کمیونسٹ اقتدار کے خلاف جدوجہد شروع کردی تھی۔جب ببرک کارمل کی حکومت حریت پسندوں کو کچلنے میں ناکام رہی تو اس حکومت نے 1979 میں ہوئے روس سے دوستی کے معاہدہ کے تحت فوجی مدد طلب کرلی۔روس نے افغانستان میں فوجی مداخلت کی۔جس کے خلاف پورے افغانستان میں مسلح جہاد شروع ہوگیا۔عرب ممالک،پاکستان اور امریکی تعاون سے بالآخر کئی سال کی جدوجہد اور زبردست قربانیوں کے بعد روس نے افغانستان سے پسپائی اختیار کی۔افغان مجاہدین نے کابل پر قبضہ کرکے ببرک کارمل کو سولی پر لٹکا دیا۔

تاہم روس کے انخلاء اور کمیونسٹ حکومت کے خاتمہ کے بعد مجاہدین کی مختلف تنظیمیں باہمی اختلافات کا شکار ہوگئیں اور کوئی متحدہ حکومت قائم نہ ہوسکی۔پروفیسر برہان ربانی،صبغت اللہ مجددی،انجینئر گلبدین حکمت یار،احمد شاہ مسعود اور عبدالرب رسول سیاف مجاہدین کے ممتاز رہنما تھے۔لیکن یہ سب آپس میں اپنے اختلافات حل نہ کرسکے۔کافی عرصہ گزرنے کے بعد ایک نیا گروپ طالبان کا اچانک نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ملاعمر کی قیادت میں ملک کے 80 فیصد حصہ پر قبضہ کرکے اپنی ایک سخت گیر حکومت قائم کردی۔طالبان بنیادی طور پر پاکستان کی سرحد پر واقع اسلامی مدارس میں تعلیم وتربیت کے مراحل سے گزرنے تھے،ان کا سرپرست کون تھا؟اس بارے میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ان کی حکومت امن وامان قائم کرنے میں تو کامیاب ہوگئی مگر جلد ہی اپنے کئی نزاعی اقدامات،مثلاً بامیان کے مجسموں کی تباہی،لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی اور شریعت کے سختی سے نفاذ کی وجہ سے جلد ہی دنیا بھر میں متنازعہ فیہ بن گئی۔اکثر ممالک نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔اُس کے بعد 2001 میں امریکہ کے اندر گیارہ ستمبر کا وحشتناک واقعہ پیش آیا جس کے ماسٹر مائنڈ ہونے کا الزام اسامہ بن لادن پر لگایا گیا جو طالبان کے افغانستان میں مہمان تھا۔اسی بہانہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان کو تاراج کردیا۔طالبان اقتدار کا خاتمہ ہوا۔اور امریکہ کے زیر سایہ حامد کرزئی کی حکومت قائم ہوگئی۔اب 2014 میں صدارتی انتخابات کے بعد حامد کرزئی کی جگہ اشرف غنی اکثریت سے منتخب ہوکر افغانستان کے نئے صدر بن گئے ہیں۔

افغانستان میں یہ نسلیں ہیں: پختون،ازبک،تاجک۔مسلکی لحاظ سے اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے لیکن شیعہ بھی موجود ہیں۔

افغانستان اسلامی دنیا کا سب سے پس ماندہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔حالانکہ قدرتی وسائل خاص کر گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں مگران سے ابھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا ہے۔کئی دہائیوں سے یہ ملک جنگ کی مار جھیلتا آرہا ہے۔ریلوے لائن ابھی تک نہیں بچھائی گئی ہے۔تعلیم مفت ہے مگر عام نہیں ہوئی ہے۔خواندہ لوگوں کی تعداد محض 15 فیصد سے کچھ ہی زیادہ ہے۔کابل یونیورسٹی کے علاوہ جلال آباد میں بھی ایک یونیورسٹی قائم ہے۔افغانستان میں معدنیات کی دریافت کا کام ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔وہاں قدرتی گیس اور پیٹرول کے وسیع ذخائر بتائے جاتے ہیں،کوئلہ اور لوہا بھی بڑی مقدار میں ہے۔سرکاری زبان پشتو ہے'ملک کے بڑے حصہ میں فارسی بولی اور سمجھی جاتی ہے،دفتروں میں زیادہ کام فارسی میں ہی ہوتا ہے،پختہ سڑکوں کا جال پورے ملک میں پھیلایا جارہا ہے۔صحافت ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔

4.7 مالدیپ

26 جولائی 1965 میں مالدیپ کو کامل آزادی ملی ۔اس کے بعد استصواب رائے ہوا جس میں 80 فیصد لوگوں نے حصہ لیا اور جمہوریت کے حق میں رائے دی' چنانچہ اس میمورنڈم کے بعد 11 نومبر 1968 کو مالدیپ کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔جمہوریہ بننے کے بعد مالدیپ کے بادشاہ سلطان امیر محمد فرید دیدی تخت سے دست بردار ہوگئے اور سابق وزیر اعظم امیر ابراہیم ناصر کو صدر جمہوریہ بنایا گیا۔ 1975 میں وزیر اعظم احمد زکی پر بعض الزامات لگے اوران کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔اب وزارت عظمی بھی امیر ناصر نے سنبھال لی۔ 1978 میں مامون عبدالقیوم ملک کے صدر بنے جو ایک لمبے عرصہ تک صدر رہے۔ان کے بعد محمد نشید نے انتخابات جیت کر صدارت کا عہدہ حاصل کیا جن کا رجحان غیر اسلامی عناصر کی طرف زیادہ تھا۔کرپشن کے الزامات بھی لگے۔جس کی وجہ سے ان کے خلاف تحریک چلی اور اب وہ اقتدار سے باہر ہیں۔نئے صدر عبداللہ یامین عبدالقیوم ہیں جو سابق صدر مامون عبدالقیوم کے بھائی ہیں، یہ 2013 میں منتخب ہوئے ہیں۔مالدیپ کا دارالحکومت مالے شہر ہے جس کی آبادی 80 ہزار ہے۔باشندے سب مسلمان ہیں۔ماہی گیری خاص پیشہ ہے۔ناریل کی پیداوار یہاں زیادہ ہوتی ہے۔سیاحت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ہوائی اور بحری جہازوں سے سفر کیا جاتا ہے۔روفیہ یہاں کی کرنسی ہے۔مالے سے دو روزنامے شائع ہوتے ہیں۔خواندگی کی شرح 93 فیصد ہے۔مالدیپ اقوام متحدہ اور مسلم ممالک کی تنظیم او آئی سی کا رکن ہے۔

معلومات کی جانچ

1- طالبان کی حکومت کیوں ختم کردی گئی؟

2- افغانستان میں کون سی زبان زیادہ بولی جاتی ہے؟

3- افغانستان کے کن شہروں میں یونیورسٹیاں ہیں؟

4.8 انڈونیشیا

انڈونیشیا متعدد جزائر پر مشتمل ہے ۔یہاں صدیوں پہلے بودھ مذہب اور ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے بادشاہوں کا اقتدار رہا ہے۔چھٹی صدی ہجری یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام کی آمد کا سراغ ملتا ہے۔ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے علاوہ

یمن اور مشرقی افریقہ سے بھی مسلمان تاجر اور مبلغ یہاں آئے۔ان میں سے اکثر اپنے مقامی اثرات بھی لے کر آئے مثلاً شافعی مسلک یمنی علما اور تاجروں کے ذریعہ پہنچا۔اسی طرح تصوف ہندوستانی اثرات کے ساتھ پہنچا۔مقامی بودھ اور ہندو رسم ورواج بھی مسلمانوں میں درآئے۔یہاں قبول اسلام کا عمل تین سو سال تک جاری رہا اور سولھویں صدی تک یہاں اسلام اکثریت کا مذہب بن چکا تھا۔سولھویں صدی میں یہاں ڈچ لوگوں (ہالینڈ کے باشندے) اور فوجیوں کی آمد شروع ہوئی اور جلد ہی انہوں نے انڈونیشیا پر قبضہ کرلیا جو تین سو سال تک جاری رہا۔جنوب مشرقی ایشیا کے اِس ملک انڈونیشیا میں 1942 تک ولندیزیوں کا قبضہ رہا۔انہوں نے اپنے دور میں عیسائیت کی خوب تبلیغ کی جس کی وجہ سے انڈونیشیا کے کئی حصوں میں عیسائیوں کی بڑی تعداد ہوگئی۔یہاں تک کہ ملک کے ایک صوبہ مشرقی تیمور کو عیسائیوں نے انڈونیشیا سے الگ ایک خودمختار ملک اقوام متحدہ کی مداخلت کے ذریعہ بنوادیا۔انڈونیشیا اور چینی تاجروں کے درمیان پرانے زمانے سے ہی تعلقات تھے،رفتہ رفتہ چینی تاجر انڈونیشیا کی تجارت پر چھاگئے۔

انڈونیشیا کو آغاز میں سیاسی آزادی جاپان کے تعاون سے ملی۔جاپان نے اس ملک پر 1942 پر قبضہ کیا تھا اور یہ قبضہ 1945 تک جاری رہا۔جاپانیوں نے سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد رکھی لیکن مذہبی اور اصلاحی تنظیموں کو کام کرنے دیا۔انڈونیشا کی مذہبی جماعتوں جمعیۃ محمدیہ ،شرکت اسلام وغیرہ نے جاپانیوں کا خیر مقدم کیا تھا۔جاپان نے بھی انڈونیشیا کو آزاد کرنے کا وعدہ کرلیا۔14 اگست 1945 میں جنگ عظیم دوم میں جاپان نے اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے کیونکہ امریکہ نے جاپان کے دو شہر ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گراکران کو نیست ونابود کردیا تھا۔تاہم اپنے وعدہ کو انہوں نے پورا کیا اور 17 اگست 1945 کو جاپانی امیر البحر کے مکان پر انڈونیشی لیڈر احمد سوئکارنو اور ڈاکٹر محمد حتا نے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کردیا۔جاپانیوں نے انڈونیشیا کے رضاکاروں پر مشتمل ایک فوج بھی بنائی تھی اور انہوں نے انڈونیشیائی فوج کو اسلحہ بھی فراہم کیا۔تاہم برطانیہ اور ولندیزیوں نے انڈونیشیا کی اس آزادی کو تسلیم نہیں کیا۔قومی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔جو جیل سے باہر تھے انہوں نے آزادی کی یہ جدوجہد جاری رکھی۔ولندیزی اور برطانوی فوجوں سے ان کی جنگ بھی ہوئی۔بالآخر آزادی کی یہ جدوجہد کامیاب ہوئی،اقوام متحدہ نے اس کو تسلیم کرکے ہالینڈ پر زور ڈالا کہ وہ انڈونیشیا کے قومی رہنماؤں کو رہا کردے اور ملک کا اقتدار ان کے حوالہ کردے۔چنانچہ اس طرح 25 دسمبر 1949 کو انڈونیشیا کو ایک آزاد ملک دنیا نے تسلیم کرلیا جس کے پہلے صدر احمد سوئکارنو بنائے گئے۔

احمد سوئکارنو نے انڈونیشیا کے ان حصوں کو بھی ملک میں شامل کرایا جن کو ولندیزیوں نے آزاد نہیں کیا تھا۔انہوں نے ملک کو اپنے پنچ شیلا قانون کے مطابق چلایا،جس میں پانچ اجزاء تھے:خدا کا اقرار،قوم پرستی،جمہوریت،انسان پروری اور معاشرتی انصاف۔سوئکارنو اگرچہ محب وطن تھے مگر وہ جمہوری انداز میں حکومت نہ چلاسکے اور آمرانہ طرز عمل اختیار کرلیا۔ان کے خلاف فوجی بغاوت ہوئی جس کو انہوں نے سختی سے کچل دیا۔اس کے بعد وہ اپنی غیر جانب دارانہ پالیسی کو برقرار نہ رکھ سکے انہوں نے انڈونیشیا کو مغربی ممالک سے کاٹ کر اُسے روس کے اشتراکی حلقہ میں شامل کردیا۔ان کی اس پالیسی سے ملک کی معیشت گرنے لگی،کرنسی ڈاؤن ہوگئی اور ملک میں عام بے چینی ان کے خلاف پھیل گئی۔کمیونسٹوں نے بغاوت کرکے ملک پر قبضہ کرنا چاہا اور کئی فوجی جنرلوں کو مار ڈالا۔مگر عوام کمیونزم کے نظریہ سے شدید اختلاف رکھتے تھے اس لیے تمام لوگ ان کی بغاوت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ملک میں سول وار چھڑگئی جس میں چار لاکھ انسان مارے گئے۔حالات قابو سے باہر ہوتے ہوئے دیکھ کر انڈونیشیا کے ایک جنرل سوہارتو نے اپنی فوجی بٹالین لیکر دارالحکومت کا رخ کیا اور کمیونسٹ بغاوت کو کچل دیا۔چونکہ

صدر سوئیکارنو نے ہی کمیونسٹوں کو بڑھاوا دیا تھا اس لیے ملک میں 1966 میں ان کے خلاف طلبہ تحریک شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1967 میں وہ معزول کر دیے گئے اور ملک کی مشاورتی کانگریس نے جنرل سوہارتو کو انڈونیشیا کا صدر منتخب کر لیا۔

جنرل سوہارتو اگلے 30 سال تک ملک کے صدر رہے۔ انہوں نے ملک کو معاشی بحران سے باہر نکالا، اقتصادی ترقی کی طرف گامزن کیا، مغربی ممالک سے تعلقات بحال کیے۔ افراط زر پر قابو پایا، شکر کی صنعت بحال ہوئی، پیٹرول بھی بڑے پیمانہ پر نکلا۔ لیکن رفتہ رفتہ سوہارتو نے بھی اپنے نامزد کردہ ارکان پارلیمنٹ کے ذریعہ اُس پر اپنی گرفت اتنی مضبوط کر لی کہ ہر پانچ سال بعد ہونے والے صدارتی انتخاب میں وہ بلا مقابلہ جیت جاتے۔ ان کے آمرانہ طرز عمل، افرادِ خاندان کی رشوت ستانی اور سرکاری مشینری میں پھیلے عام کرپشن اور اپنے سیاسی مخالفین کے بے محابہ قتل عام کے باعث نوے کی دہائی میں سوہارتو کے خلاف بھی ایک عوامی تحریک چلی اور عوام نے ان کو دھکے مار کر اقتدار سے باہر کر دیا۔ اس کے بعد سے ملک میں جمہوری طور پر انتخابات ہوتے ہیں اور حکومت بنتی آ رہی ہے اور آمرانہ عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

تعلیم میں انڈونیشیا بہت آگے بڑھا ہے، ملک میں سرکاری اور نجی یونیورسٹیوں کی تعداد پچاس سے زاید ہے۔ صحافت بھی ترقی یافتہ ہے۔ کئی روزناموں کی اشاعت لاکھوں میں ہوتی ہے۔ خاص کر روزنامہ کومپاس تین لاکھ کی تعداد میں نکلتا ہے۔ جکارتا ملک کا دارالحکومت اور اس کا سب سے بڑا تعلیمی، صحافتی، تمدنی اور صنعتی مرکز ہے۔ یہ قاہرہ کے بعد مسلم دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ جکارتا کی جامع مسجد حرمین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ جس کی تعمیر آزادی کے بعد ہوئی ہے۔ انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا اور رقبہ کے حساب سے چوتھا بڑا ملک ہے۔ یہاں معدنی اور زرعی وسائل کی بہتات ہے' بارش بہت ہوتی ہے۔ قدرتی وسائل مسلم دنیا میں سب سے زیادہ اسی کے حصہ میں آتے ہیں۔ ملک کے دو تہائی حصہ میں گھنے جنگل ہیں، چاول، گنے، ناریل کی کاشت ہوتی ہے، گرم مصالحے، ربڑ، کونین' پیٹرول، ٹین اور میگنیز سب بڑی مقدار میں نکلتے ہیں۔

معلومات کی جانچ:

1- صدر سوئیکارنو کے عہد کے مثبت و منفی اثرات کیا ہیں؟

2- انڈونیشیا کی تعلیم و ترقی اور صحافت کس پیمانہ کی ہے؟

3- معدنی اور زرعی وسائل کے اعتبار سے انڈونیشیا کا مقام کیا ہے؟

4.9 ملائشیا

ملائشیا انڈونیشیا کے شمال میں واقع ہے۔ ملائشیا جنوب مشرق کے ان ممالک میں سے ہے جو برسوں تک برطانوی استعمار کے شکنجہ میں رہا۔ 1957 میں برصغیر کی آزادی کے بھی کئی سال بعد وہ آزاد ہوا۔ اس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے، جن میں 55 فیصد ملائی، 30.4 فیصد چینی اور دس فیصد ہندنژاد باشندے شامل ہیں۔ آزادی کے بعد بھی وہ غربت وافلاس اور بے روزگاری میں ہندوستان، پاکستان اور اپنے ہم سایوں انڈونیشیا و فلپائن سے زیادہ نچلے درجہ پر تھا۔ چالیس فیصد لوگ خط غربت سے نیچے کی زندگی گزار رہے تھے، ٹین، ربر اور خام تیل کی

برامد ملکی معیشت کا ذریعہ تھی۔اس کی دو ریاستوں کی سرحدیں انڈونیشیا سے متصل ہیں،باقی گیارہ ریاستیں جزیرہ نمائے ملایا میں واقع ہیں۔ 1909 میں انگریزوں نے ملایا پر قبضہ کرلیا اور بہت بڑی تعداد میں چینی باشندوں کو مزدور اور کاشتکار کی حیثیت سے لے کر آئے۔اب ملایئشیا ایسا ملک ہے جہاں تین نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔48 فیصد سے کچھ زاید ''ملے'' ہیں جو سب مسلمان ہیں۔ایک تہائی آبادی چینی باشندوں کی ہے۔پاک وہند سے گئے ہوئے لوگوں کی تعداد دس فیصد ہے۔جن میں مسلمان ،ہندو اور سکھ سبھی شامل ہیں۔ملے باشندوں کو آئینی تحفظات حاصل ہیں۔ملے اور چینی باشندوں میں کافی کشمکش پائی جاتی ہے۔چینی کمیونسٹوں نے دوسری عالمی جنگ کے دوران گوریلا کارروائیاں شروع کردی تھیں۔ 1957 میں ملائشیا کو آزادی ملی اور تنکو عبدالرحمٰن پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ 1965 اس وفاق میں تین ریاستیں سنگاپور، ساراواک اور صباح بھی شامل ہوگئیں؛ مگر سنگاپور جس میں چینی باشندوں کی اکثریت تھی جلد ہی اس وفاق سے الگ ہوگیا۔کیونکہ چینیوں کو ملے باشندوں کا غلبہ گوارانہ تھا۔وفاق ملایئشیا کی تیرہ ریاستوں میں سے ہر ریاست کا اپنا جھنڈا ہے،اپنا آئین ہے اور اپنی مجلس قانون ساز ہے۔شروع میں انڈونیشیا و فلپائین سے ملائشیا کو خطرہ تھا،اس کے دو علاقوں پر یہ دونوں ملک اپنا حق جتاتے تھے۔چنانچہ ملائشیا نے برطانیہ اور آسٹریلیا کی مدد سے جلد ہی بری، بحری اور فضائی قوتوں کو منظم کرلیا اور خاصا مضبوط ملک بن گیا۔اب ملائشیا میں سیاسی استحکام ہے۔پہلے وزیر اعظم تنکو عبدالرحمٰن کے بعد تنکو عبدالرزاق اور ان کے بعد واتک حسین عون وزیر اعظم رہے۔

1981 میں مہاتیر بن محمد انتخابات جیت کر وزیر اعظم بنے اور لگاتار اس عہدہ پر فائز رہے۔آتر محمد کا نام تن مہاتیر بن محمد ہے۔وہ 10 ر جولائی 1925ء کو آلور استار کیدہ نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ 1964 میں آتر ملکی سیاست میں داخل ہوگئے اور انتخاب جیت کر ممبر آف پارلیمان بنے۔ 1975ء میں وزیر تعلیم رہے نیز 1978 میں نائب وزیر اعظم اور جب آتر محمد رخصت ہوا تو صرف خام مال پیدا کرنے والا ملیشیا الیکٹرانکس، کمپیوٹر ٹکنالوجی اور سروس انڈسٹری کے ذریعہ ایک سو بلین ڈالر کی برآمدات کررہا تھا۔ جو پاکستان کے عالمی بینکوں سے لیے گئے کل قرض کا تین گنا ہے۔آتر محمد کے برسراقتدار آنے کے وقت ملیشیا کی فی کس آمدنی 2300 ڈالر ہوا کرتی تھی جو 2003 میں بڑھ کر نو ہزار ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔خواندگی کی شرح 92 فیصد ہے۔آتر محمد ملائشیا کے چوتھے وزیر اعظم تھے۔البتہ 13 اکتوبر 2013 کو انہوں نے یہ منصب رضا کارانہ اپنے نائب عبداللہ بداوی کو سونپ دیا۔دوسری بڑی شخصیت حزب اختلاف کے قائد انور ابراہیم کی ہے جو آتر کی حکومت میں نائب وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں۔

ملائشیا میں شہروں میں چینی زیادہ ہیں او وہ تجارت ،طب و انجینیرنگ اور قانون کے شعبوں میں چھائے ہوئے ہیں۔جبکہ سیاست اور فوج میں ملے باشندوں کو تفوق حاصل ہے۔اور یہ چیز دونوں قوموں میں مستقل کشیدگی کا سبب ہے۔آدھے غیر مسلم باشندوں کی وجہ سے ملائشیا میں سرکاری مذہب اسلام ہونے کے باوجود وہاں اسلام کے نفاذ میں بڑی دشواری ہے۔اس لیے ایک تکثیری معاشرہ کے لیے مہاتیر محمد نے سیکولرزم اور اسلام کی ترکیب سے ایک مخصوص نظام سیاست متعارف کرایا ہے جو اور ممالک کے لیے بھی ماڈل بن سکتا ہے۔یعنی انہوں نے ملک میں شرعی قوانین متعارف کرائے لیکن ان کا اطلاق صرف مسلمانوں پر کیا۔اس کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے لیے سیکولر قوانین بدستور موجود رہے۔یعنی اسلامی اور سیکولر قوانین متوازی چلتے رہے۔مہاتیر نے ''اسلام حضاری'' یعنی مہذب اسلام کا تصور بھی پیش کیا۔جس میں توحید،تقوی ،عدل ،منصفانہ حکومت ،تعلیم ،معاشی ترقی ،اچھا معیار زندگی ،اقلیتوں اور خواتین کے حقوق ،اخلاقیات اور ماحول کی حفاظت جیسی بنیادی قدروں پر زور دیا گیا۔ملے زبان عربی اور رومن دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔انگریزی، چینی اور ملے

تینوں زبانوں میں بڑے بڑے اخبارات نکلتے ہیں جو کوالالمپور سے نکلتے ہیں۔

ملائشیا اسلامی دنیا کے کثیرالوسائل اور خوشحال ملکوں میں سے ہے، بارشیں خوب ہوتی ہیں۔اس لیے چپہ چپہ شاداب ہے، ملک کا بڑا حصہ جنگلوں سے پٹاپڑا ہے۔خام لوہا یہاں سب سے زیادہ نکالا جاتا ہے، ٹین، ناریل، چاول، ربڑ اور عمارتی لکڑی کی کثرت ہے۔پیٹرول بھی پیدا ہوتا ہے۔سب سے زیادہ پیداوار ربڑ کی ہے۔ملائشیا کا معیار زندگی جنوبی ایشیا میں سب سے بلند ہے۔پورا ملک ہائی ٹیک ہے ابتدائی تعلیم یہاں لازمی اور مفت ہے۔مہا تیر بن محمد کا شمار دنیائے اسلام کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔

4.10 برونئی

برونئی چھوٹا سا ملک ہے جس میں ملئے نسل کے باشندوں کی اکثریت ہے۔قدیم زمانہ سے ہی بادشاہت چلی آرہی ہے۔اس وقت سلطان حسن البلقیہ معزالدین والدولۃ دہائیوں سے حکمراں چلے آرہے ہیں۔نوجوانوں میں جمہوریت کے لیے بے چینی پائی جاتی ہے۔ملے مسلمانوں نے ایک بار بغاوت کر کے ملائیشیا وفاق میں شامل ہونا بھی چاہا مگر سلطان نے فوج کی مدد سے اس تحریک کو دبا دیا اور اس کے قائد ایم اے زہیری کو ملائیشیا میں پناہ لینی پڑی۔ان کی تحریک کالعدم قرار دی گئی۔سلطان حسن البلقیہ دنیا کے چند بڑے امیروں کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں۔وہ ملک کی دولت کو جدید اسلحہ خریدنے، پُرتعیش ہوٹل اور جدید طرز کے محلات کی تعمیر میں خرچ کر رہے ہیں۔انہوں نے جدید بندرگاہ، چوڑی سڑکیں اور شفاخانے بھی تعمیر کیے ہیں۔دارالحکومت سیری بگاوَن کو ایک جدید شہر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔یہاں کا بین الاقوامی ہوائی اڈا دنیا کے تین خوبصورت اڈوں میں شمار کیا جاتا ہے۔برونئی میں قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ہے۔دولت کو باشندوں کی تعلیم، صحت اور خوش حالی پر خرچ کیا جارہا ہے، برونئی کا خطرات سے دفاع کے لیے برطانیہ سے معاہدہ ہے۔ہر ہزار کی آبادی کے لیے ایک ڈاکٹر کی سہولت ہے۔اسکولوں اور کالجوں کی بڑی تعداد ہے۔تیل کی کمپنی میں حکومت اور رائل ڈچ اسٹیل کمپنی شریک کار ہیں۔ساتھ میں تیل اور گیس کی کمپنیوں میں مقامی لوگوں کو بھی حصہ دیا جارہا ہے۔

برونئی کی آبادی میں تین چوتھائی ملئے نسل کے مسلمان ہیں چینی بھی بڑی تعداد میں ہیں، 50 ہزار سے کچھ زیادہ ان کی تعداد ہے۔چھے مقامی قبائل پر مشتمل باشندے بھی 30 ہزار کے لگ بھگ ہیں۔نوجوان نسل میں بادشاہت کے خلاف رجحان پایا جاتا ہے۔وہ چاہتے ہیں کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ دیا جائے، مگر سلطان حسن البلقیہ جو ایک آرمی جنرل بھی ہیں آہنی ہاتھوں سے اس چھوٹے سے ملک کو کنٹرول میں لیے ہوئے ہیں اور بیرونی قوتوں خاص کر برطانیہ کی حمایت بھی ان کو حاصل ہے۔اس لیے ابھی ملک میں جمہوریت کا پودا برگ وبار لاتا دکھائی نہیں دیتا۔عوام کی خوشحالی نے بھی ان کو آرام طلب بنا دیا ہے۔

معلومات کی جانچ:

-1 کیا ملائشیا کو مختلف نسلوں اور مذاہب کا گہوارہ کہا جا سکتا ہے؟

-2 مہاتیر بن محمد نے ملک کی تعمیر و ترقی میں کیا رول ادا کیا؟

-3 برونئی کو جنوب مشرقی ایشیا کا کویت کیوں کہا جاتا ہے؟

4.11 خلاصہ

جنوب ایشیا میں پاکستان ایک ملک ہے جو کسی لسانی ،نسلی یا وطنی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کی بنیاد دوقومی نظریہ پر رکھی گئی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے اس اصرار پر کہ وہ ملک کی اکثریت سے جداگانہ تشخص رکھتے ہیں لہٰذا ان کا الگ آزاد ملک ہونا چاہیے، پاکستان وجود میں آیا۔محمد علی جناح جن پاکستان کے بانی ہیں۔اپنے آغاز ہی سے پاکستان میں اسلامی نظام اور سیکولرزم کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے۔ یہاں مسلکی تشدد بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے آئے دن خون خرابہ ہوتا رہتا ہے۔اور اس کے اثرات ملکی کی بین الاقوامی شبیہ اور اس کی معیشت پر منفی پڑ رہے ہیں۔اس کی کرنسی بھی کافی گر گئی ہے۔حالانکہ اس کی صحافت اور زبان وادب کافی ترقی یافتہ ہے۔

پاکستان کی معیشت فی الوقت کافی کمزور ہے۔ملک میں امن وامان نہ ہونے کی وجہ سے سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔کرنسی خاصی ڈاؤن ہے۔سائنس وٹیکنالوجی میں کوئی پیش رفت نہیں ہے۔عسکری لحاظ سے پاکستان اسلامی دنیا کا سب سے طاقت ور ملک ہے۔وہ ایک ایٹمی پاور ہے۔ایٹم بن کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خاں ہیں۔ملک میں صلاحیتوں کی کمی نہیں مگر امن وامان نہ ہونے کی وجہ سے ملک مجموعی طور پر تنزلی کی طرف جارہا ہے۔خواندگی کا تناسب بہت کم ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔البتہ بھاری صنعت کے میدان میں داخل ہورہا ہے۔کراچی ،حیدرآباد، ملتان ،فیصل آباد اور لاہور بڑے صنعتی مراکز ہیں۔اسلحہ کے میدان میں پاکستان خودکفیل ہے۔ معدنیات کی کمی ہے، پیٹرول بہت کم نکلتا ہے،البتہ قدرتی گیس بڑی مقدار میں نکلتی ہے۔زرعی سیکٹر میں بھی پیچھے یہ ہے۔فوجی انقلابات پاکستان میں برابر آتے رہے ہیں۔ پاکستان کی آرمی بہت مضبوط ہے اور ملک کے معاملات میں خاصی حد تک دخیل ۔البتہ فی الحال پاکستان میں جمہوری حکومت چل رہی ہے۔

جب پاکستان وجود میں آیا تو جغرافیائی طور پر اس کے دو حصے تھے ،مغربی پاکستان ومشرقی پاکستان ،دونوں کے درمیان ایک ہزار کلومیٹر کا جغرافیائی فاصلہ تھا، دوسرے ملک کی سیاست ومعیشت پر مغربی پاکستان کا غلبہ تھا۔مشرقی پاکستان (یعنی بنگال کا وہ حصہ جو پاکستان میں شامل ہوا تھا) میں رفتہ رفتہ احساس محرومی بڑھنے لگا۔دونوں خطوں کی زبان اور کلچر میں کافی فرق تھا،مغربی پاکستان میں اردو بولی جاتی تھی جبکہ مشرقی پاکستان میں بنگلہ۔سیاسی طور پر شروع ہی سے پاکستان میں مختلف نظریات کام کررہے تھے جن کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی تحریک چل پڑی اور 24 سال پاکستان کے ساتھ رہنے کے بعد بنگلادیش ایک آزاد ملک بن گیا۔معاشی طور پر بنگلہ دیش ایک کمزور ملک ہے حالانکہ زراعت نے کافی ترقی کی ہے ۔پٹ سن یہاں کی خاص پیداوار ہے ۔ جاوا کے بعد بنگلہ دیش دنیا کا سب سے گنجان خطہ ہے۔بارشیں بہت ہوتی ہیں۔دریا اور ندیاں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔سمندری طوفانوں کی زد میں یہ ملک آتا رہتا ہے۔اس کی وجہ سے معیشت کمزور ہے لیکن عرب ملکوں خاص کر سعودی عرب کی امداد سے معیشت کو بہتر بنایا جارہا ہے۔تعلیم میں بنگلہ دیش آگے بڑھا ہے۔آج کل بنگلہ دیش میں بھی اسلامیت اور سیکولرزم قوتوں کے درمیان تصادم چل رہا ہے۔

افغانستان جنوبی ایشیا کا ایک ملک ہے' جس کی سرحدیں ایک طرف پاکستان سے ،دوسری طرف سے ایران سے ملتی ہیں۔جبکہ روس بھی اس کا بڑا اہم سایہ ہے۔افغانستان قرون وسطی' میں کئی طاقت ور سلطنتوں کا مرکز رہا ہے۔ 1929 سے افغانستان کا دور جدید شروع

ہوتا ہے۔ افغانستان دہائیوں سے جنگ کا میدان بنا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے سیاسی عدم استحکام ہے۔ ملک میں موجودہ حکومت اور طالبان کے درمیان تصادم ہے۔ معیشت و تعلیم میں یہ ملک بہت پس ماندہ ہے۔ تعلیم اور صحافت بھی بہت کمزور ہے اور مجموعی طور پر ترقی سے کافی دور ہے۔

مالدیپ جزائر کا مجموعہ ہے۔ یہ جزائر سری لنکا کے جنوب میں چار سو میل کے فاصلہ پر بحر ہند میں واقع ہیں۔ یہاں کے باشندوں نے اسلام ابتدائی دور میں ہی قبول کر لیا تھا۔ 1518 سے یہ جزائر غیر ملکی اقتدار کے تحت آ گئے چنانچہ یہاں پرتگالی، ولندیزی اور پھر انگریزوں نے حکومت کی۔ 1948 میں اندرونی آزادی ملی، خارجی امور برطانیہ کے سپرد تھے۔ مگر 1966 میں مالدیپ مکمل طور پر آزاد ہو گیا اور عوامی استصواب کے بعد 1968 میں اس کو جمہوریہ بنا دیا گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے دو ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ جن کا رقبہ کل ایک سو پندرہ مربع میل ہے۔ ان جزیروں میں سے زیادہ تر غیر آباد ہیں صرف 220 جزیرے آباد ہیں۔ باشندے سب مسلمان ہیں۔ زبان سری لنکائی سنہائی زبان سے مشابہ ہے۔ مچھلی یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ نظام سیاسی صدارتی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ملائیشیا دو مسلم اکثریتی ممالک ہیں۔ جن میں انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا ملک ہے۔ یہ متعدد جزائر پر مشتمل ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انڈونیشیا مسلم دنیا کا مطلع خورشید ہے یعنی اسلامی دنیا میں سب سے پہلے سورج اسی ملک سے طلوع ہوتا ہے۔ جکارتا ملک کا دارالحکومت اور اس کا سب سے بڑا تعلیمی، صحافتی، تمدنی اور صنعتی مرکز ہے۔ یہ قاہرہ کے بعد مسلم دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ جکارتا کی جامع مسجد حرمین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ جس کی تعمیر آزادی کے بعد ہوئی ہے۔ انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے عالم اسلام کا سب سے بڑا اور رقبہ کے حساب سے چوتھا بڑا ملک ہے۔ یہاں معدنی اور زرعی وسائل کی بہتات ہے بارش بہت ہوتی ہے۔ قدرتی وسائل مسلم دنیا میں سب سے زیادہ اسی کے حصہ میں آتے ہیں۔ ملک کے دو تہائی حصہ میں گھنے جنگل ہیں، چاول، گنے، ناریل کی کاشت ہوتی ہے، گرم مصالحے، ربڑ، کونین، پیٹرول، ٹین اور میگنیز سب بڑی مقدار میں نکلتے ہیں۔ آزادی کے بعد یہ ملک بھی مختلف سیاسی اتار چڑھاؤ سے گزرا ہے۔ فی الوقت جمہوری حکومت ہے اور سیاسی استحکام قائم ہو گیا ہے۔ تاہم ملک کے مسلمانوں، عیسائیوں اور چینی نسل کے لوگوں میں تصادمات ہوتے رہتے ہیں۔

انڈونیشیا کے پڑوس میں ملائشیا ہے، جو مسلم دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ صنعتی و معاشی طور پر ملائشیا ایک جانب تو انتہائی ترقی یافتہ ہے، دوسری جانب ملائیشیا کے مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی بھی بہت گہری ہے۔ ملائشیا میں کل تیرہ ریاستیں ہیں۔ جن میں گیارہ جزیرہ نمائے ملایا میں واقع ہیں۔ یہ ملک ایک تکثیری کلچر رکھتا ہے۔ سب سے بڑی کمیونیٹی ''مالے'' ہے جو مقامی لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس کمیونیٹی کی اکثریت مسلمان ہے۔ اُنہیں کی مناسبت سے ملائیشیا کا پرانا نام ''ملایا'' رہا ہے۔ ان گیارہ ریاستوں میں سے پانچ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے۔ ملک میں سیاسی استحکام ہے۔ ربڑ خاص پیداوار ہے، پورا ملک ہائی ٹیک ہے سیاسی طور پر مستحکم، اپنے اسلام حضاری کے تصور پر عامل اور اس سلسلہ میں مسلم دنیا کے دوسرے ممالک کے لیے ماڈل ہے۔

برونئی ایک چھوٹے رقبہ اور تھوڑی سی آبادی والا ملک ہے۔ گروہ جنوبی ایشیا میں انڈونیشیا کے بعد پیٹرول پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ پیٹرول کی فراوانی نے اُسے دولت مند بنا دیا ہے۔ دولت کی ریل پیل کی وجہ سے برونئی کی فی کس آمدنی ایشیا میں کویت اور متحدہ عرب امارات کے بعد سب سے زیادہ ہے۔ اور اسی وجہ سے اس ملک کو مشرق بعید کا کویت بھی کہا جاتا ہے۔ برونئی مدت دراز

تک برطانوی محروسات میں شامل رہا ہے۔ البتہ اب آزاد اسلامی ملکوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے۔ اس ملک میں سعودی عرب کی طرح کئی اسلامی حدود نافذ ہیں اور شراب وقمار پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ مگر ملک میں سلطانی اور بادشاہت ہے جو جمہوریت کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ عوام خوش حالی کی وجہ سے آرام طلب ہیں، اس لیے بظاہر ملک کی سیاست میں کسی بدلاؤ کے آثار نہیں ہیں۔

4.12 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے:

-1 جنوبی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیا کا ایک جامع تعارف کرائیے

-2 انڈونیشیا کے مسلمانوں کے احوال پر روشنی ڈالیے۔

-3 ایک تکثیری معاشرہ کے لیے ملائشیا کس طرح ماڈل بن سکتا ہے، وضاحت کیجیے

حسب ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

-1 برونئی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

-2 پاکستان میں اسلام علوم پر کافی کام ہو رہا ہے۔ وضاحت کیجیے۔

-3 افغانستان کی مجموعی پس ماندگی کے اسباب سے بحث کیجیے

4.13 فرہنگ اصطلاحات

زیر نگیں — ماتحت

استصواب رائے — رائے معلوم کرنا

تکثیری کلچر — وہ تہذیب جس میں بہت سارے مذاہب ونظریات کے لوگ مل جل کر رہتے ہوں۔

مارشل لا — فوجی قانون جس میں ہنگامی صورت حال نافذ کردی جاتی ہے اور لوگوں کی معمولی کی آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں۔

جبر واستبداد — ظلم وزیادتی

جابرانہ — ظالمانہ

اسلامائزیشن — اسلامیانا' چیزوں کو اسلام کے قالب میں ڈھالنا

معروض وجود — وجود میں لانا

قافیہ تنگ کرنا — پریشان کرنا

کس مپرسی — کوئی پوچھنے والا نہ ہو، بے بسی

قومیانا — یعنی حکومت کی گرفت میں لے لینا اور نجی و پرائیویٹ اختیار نہ رہنا

کالعدم — منسوخ کرنا ختم کر دینا

متنازعہ فیہ	جس میں اختلاف اور دورائے ہو جائے
تاراج کرنا	برباد کر دینا
ولندیزی	ہالینڈ کے رہنے والے، ڈچ
امیرالبحر	بحری فوج کا کمانڈر
آمرانہ	اپنی چلانا دوسرے کی نہ سننا
اسلام حضاری	تہذیبی اسلام یعنی تمدنی زندگی میں ترقی یافتہ ہونا
رفتہ رفتہ	آہستہ آہستہ
ہائی ٹیک	جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ
تنزلی	نیچے گرنا، نیچے جانا
گنجان وکثیف	بہت گھنا اور تنگ جگہ میں زیادہ مقدار میں ہونا
بے محابا	بے روک ٹوک
مائع	سیال، رقیق

4.14 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- محمود تیمور، التاریخ الاسلامی (آخری جلد)

2- کیرن آرم اسٹرانگ: A Short History of Islam ,USA

3- ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ سوم، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

4- مبشر نذیر، پروگرام علوم اسلامیہ، ماڈیول CS06 (سیاسی، عسکری، دعوتی اور فکری تحریکیں) (انٹرنیٹ پر دستیاب) خاص کر باب 3 باب 5

اکائی 5: افریقہ: شمالی افریقہ کے ممالک۔ مغربی افریقہ کے ممالک

اکائی کے اجزاء

5.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کو افریقہ کے دونوں مسلم خطوں شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کے بارے میں اجمالی معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ وہ ان کے امکانات ووسائل، مسائل اور احوال سے باخبر ہو سکیں گے۔

5.2 تمہید

شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ میں بہت سارے اسلامی ممالک واقع ہیں۔ ان میں سے بعض ممالک مثال کے طور پر مصر، مراکش اور الجزائر جیسے ملک ہیں جنہوں نے اسلامی تاریخ میں بڑا زبردست کردار ادا کیا ہے۔ اور مصر آج بھی عالم عرب کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ، موثر اور اہم ترین ملک ہے۔ اس اکائی میں ہم ان تمام ملکوں کے بارے میں پڑھیں گے اور کوشش کی جائے گی کہ ان کے سلسلہ میں تازہ ترین معلومات طلبہ کو دی جاسکے۔

5.3 شمالی افریقہ وجنوبی افریقہ کے اہم مسلم ملکوں کا اجمالی تعارف

مصر: مصر آبادی اور اپنے وسائل کے لحاظ سے عرب دنیا کا سب سے بڑا اور معاشی، فکری، عقلی وتمدنی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس میں کوئی نظریہ یا تحریک اٹھتی ہے تو اُس کے اثرات ساری دنیائے عرب میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ مصر عربوں اور عربی زبان کی نشاۃ ثانیہ کا بھی مرکز ہے۔ سب سے پہلے جدید بیداری یہیں آئی تھی۔ اس کے بعد اس کے شعلے دوسرے عرب ملکوں میں پہنچے۔ اُسی طرح مذہبی ودینی بیداری کا نقیب بھی مصر ہی مسلم دنیا اور خاص عرب ملکوں میں رہا ہے۔ مصر اسلامی تاریخ میں بھی ایک زبردست کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آبادی سات کروڑ سے زیادہ ہے۔ عربی یہاں کی زبان ہے اور سرکاری مذہب اسلام۔ ویسے دوسری اقلیتیں خاص کر قبطی عیسائی معاشی وسیاسی طور پر بہت مضبوط ہیں۔

سوڈان: سوڈان قدیم زمانہ میں نوبیہ کہلاتا تھا۔ یہ بھی دنیا کے قدیم ملکوں میں سے ہے۔ مصر کا مشہور دریائے نیل سوڈان کو بھی سیراب کرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں سوڈان مصر کی حکومت میں شامل رہا ہے۔ اسلام سے پہلے سوڈان میں عیسائیت پہنچی اور ملک کے شمال میں آبادی کے بڑے حصہ نے مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمان نوبیہ پر حملہ کر چکے تھے۔ لیکن وہ آٹھویں صدی میں یہاں پہنچے۔ بہت سے عرب قبائل بحیرہ احمر کے راستہ مشرقی سوڈان میں پہنچ کر یہیں آباد ہو گئے۔ سنار کے علاقہ میں ان کی اکثریت ہو گئی اور پندرہویں صدی تک شمالی سوڈان میں مسلمانوں کی سلطنتیں قائم ہو گئیں۔ سوڈان کا رقبہ بہت بڑا ہے، آبادی 4 کروڑ سے زیادہ ہے۔ قدیم قبائلی زبانوں کے علاوہ عربی اصل زبان ہے۔ اسلام مذہب ہے۔ عیسائی اور مظاہر پرست بھی ہیں۔

تیونس: شمالی افریقہ کا اہم ملک ہے۔ وہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ دوسری صدی ہجری تک مرکز خلافت کے تحت رہا۔ اُس کے بعد یہاں الگ الگ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جن میں اغلبی، بنو فاطمہ، صنہاجی خاندانوں کی اور بعد میں موحدین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ تیونس کا سب سے مشہور علمی وتمدنی شہر قیروان تھا اور امام فلسفۂ تاریخ ابن خلدون کا تعلق بھی تیونس

سے تھا۔ 1534 میں اس پر عثمانی ترکوں نے قبضہ کرلیا۔ انیسویں صدی میں مغربی استعمار کی تاخت کا شکار دوسرے عرب اور مسلم ملکوں کی طرح تیونس بھی ہوا۔ اور 1881 میں اس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔ تیونس کا رقبہ 63 ہزار 378 مربع میل ہے، آبادی تقریباً ایک کروڑ۔ عربی یہاں کی بھی زبان ہے۔ اور فرنچ بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مذہب اسلام ہے۔

لیبیا: بحیثیت ملک لیبیا کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اُس کا قیام گزشتہ صدی میں ہوا ہے۔ پہلے اس ملک کے مشرقی حصہ کو وادی برقہ کے نام سے جانا جاتا تھا، جو مصر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ مغربی حصہ طرابلس کا علاقہ تھا جو تیونس کی حکومت کے تحت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد طرابلس پر اسپین نے قبضہ کرلیا تھا۔ 1551 میں عثمانی ترکوں نے طرابلس اور بنغازی کو نیز جنوبی صحرائے اعظم فزان سب کو اپنے مقبوضات میں شامل کرلیا۔ عثمانی سلطنت میں اس پورے علاقہ کو طرابلس کے نام سے پکارتے تھے۔ جب اس پر اٹلی نے قبضہ کیا اور پھر آزادی کی تحریکوں کے بعد یہ خطہ آزاد ہوا تو اس کو لیبیا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ لیبیا کا رقبہ 6 لاکھ 79 ہزار 359 مربع میل ہے، آبادی لگ بھگ ایک کروڑ ہے زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔

الجزائر: شمالی افریقہ کا ایک اہم ملک الجزائر ہے۔ جو المغرب العربی میں آتا ہے۔ شمالی افریقہ کے پہلے مسلمان فاتح اور شہر قیروان کے بانی عقبہ بن نافع کا مزار بسقرہ شہر میں ہے۔ تاریخی طور پر یہ صوبہ اغالبہ، فاطمی خلافت اور موحدین کی سلطنتوں میں شامل رہا ہے۔ کبھی کبھی یہاں الگ الگ مقامی سلطنتیں بھی قائم ہوجاتی تھیں۔ 1553 میں مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس کو فتح کر کے خلافت عثمانیہ میں شامل کردیا۔ اس علاقہ کا صدر مقام شہر الجزائر تھا اس لیے پورے ملک کو الجزائر کہنے لگے۔ 1830 میں فرانس نے اس پر تاخت کی اور چند سالوں میں اس پر قبضہ کرلیا۔ فرانس سے مزاحمت کرنے والے مجاہدین میں سب سے مشہور امیر عبدالقادر الجزائری ہوئے۔ جنہوں نے اخیر میں فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اُس کے بعد فرانس نے اس کو اپنا صوبہ بنادیا۔ الجزائر کا رقبہ کافی وسیع یعنی 9 لاکھ 19 ہزار 595 مربع میل ہے۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے۔ زبان عربی، صدر مقام الجیریا شہر ہے۔ مذہب اسلام ہے۔

مراکش: مراکش اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کو عہد قدیم میں مغرب اقصی اور آج کل المغرب کہتے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اندلس کے بعد مراکش بھی دوسری صدی ہجری میں ہی خلافت عباسیہ سے الگ ہوگیا تھا۔ اِس پر بالترتیب ادریسیوں، فاطمیوں، مرابطین، موحدین اور بنو مرین نے حکومت کی۔ یہاں جامع ازہر مصر کی طرح جامع قرویین کا قیام ہوا جو شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے لیے آج بھی سب سے بڑی دینی دانش گاہ ہے۔ فاس، مکناس، رباط اور دار بیضاء (کیسابلانکا) اس کے مشہور شہر ہیں۔ اسلامی تاریخ کی نامی گرامی شخصیات میں قاضی عیاض، جغرافیہ داں ادریسی، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے فلسفی، طبیب ابن زہر اور سیاح ابن بطوطہ اسی خطہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مراکش کا رقبہ 1 لاکھ 77 ہزار مربع میل ہے۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔

نائجیریا: مغربی افریقہ کے ممالک میں نائجیریا رقبہ میں تو نہیں لیکن آبادی میں بہت بڑا ملک ہے۔ اسے افریقہ کا دیو بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک نیا نام اور نیا ملک ہے۔ یہ قدیم زمانہ کی مملکت کانم کا ایک حصہ ہے۔ آج نائجیریا ایک وفاق ہے جس میں بارہ ریاستیں ہیں۔ بعض ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بعض میں عیسائیوں کی اور بعض میں مظاہر پرستوں کی۔ ویسے اسلام تیزی سے

مقبولیت حاصل کر رہا ہے ۔ پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی نصف سے زیادہ ہے لیکن حکومت ان کی نہیں بلکہ سیکولر اور جمہوری ہے۔ نائجیر یا دراصل دریائے نائجر کی نسبت سے کہا جاتا ہے ۔ یہ نام اس کو انگریزوں نے دیا ہے۔ دارالحکومت کا نام لاگوس ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے، رقبہ 3 لاکھ 56 ہزار 669 مربع میل اور آبادی 14 کروڑ سے زاید ہے۔

موریتانیہ :المغرب العربی کا چوتھا ملک ہے ۔ ماضی میں مراکش کا حصہ رہا۔ اور مراکش کی ثقافت وتہذیب کا اس پر گہرا اثر پڑا ہے۔ وہ مراکش کے جنوب میں واقع ہے۔ قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو شنقیط کہتے تھے۔ بعض علما کے ناموں میں جو شنقیطی آتا ہے وہ اسی نسبت سے آتا ہے۔ موریتانیہ دراصل بربر نسل کے باشندے ہیں جنھوں نے صدیوں سے عربوں سے اختلاط اور شادی بیاہ کے نتیجہ میں عرب حیثیت اختیار کرلی ہے۔ آج اس ملک کے 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں۔ 20 فیصد باشندے جونیگرو ہیں وہ مختلف قبائلی زبانیں بولتے ہیں۔ دارالحکومت کا نام نواکشوط ہے ۔ رقبہ 3 لاکھ 98 ہزار مربع میل ، آبادی لگ بھگ 40 لاکھ۔ اکثریت مسلمان اور سب دیندار ہیں۔ موریتانیہ نے حال ہی میں اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے۔

جمہوریہ مالی: مالی کا علاقہ دراصل دریائے نائجر کی وسطی وادیوں اوران کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے ۔ اس کی سرحدیں سینی گال ،موریتانیہ ،الجزائر اور نائجر سے ملتی ہیں ۔ اسلام یہاں بارہویں صدی میں پھیل گیا تھا۔ چودھویں صدی میں منسی اموسی کے عہد میں مالی کی سلطنت عروج پر تھی۔ سونا پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے مالی بہت مشہور تھا۔ 1893 میں فرانس نے اس پر قبضہ کرلیا تھا اور یہ نوآبادیاتی دور 65 سال تک جاری رہا۔ فرانس نے اس کو فرانسیسی سوڈان کا نام دیا۔ 21 جون 1960 میں مالی نے فرانس سے مکمل آزادی حاصل کی اور ایک وفاق تشکیل دیا جس کا نام جمہوریہ مالی رکھا گیا۔ مالی میں معاشی وسائل کافی ہیں۔ تعلیم مفت ہے مگر خواندگی کا تناسب محض 30 فیصد ہے۔ مالی میں مسلمانوں کا تناسب نوے فیصد ہے۔ رقبہ 4 لاکھ 82 ہزار 77 مربع میل ہے۔ آبادی تقریباً ایک کروڑ۔

معلومات کی جانچ

1- عرب دنیا کا عقلی وتمدنی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کون سا ہے؟

2- قیروان کہاں واقع ہے، اس کا بانی کون تھا؟

3- جامع قرووین کس ملک میں ہے اور اس کی دینی اہمیت کیا ہے؟

4- مراکش سے اسلامی تاریخ کی کون سی نامی گرامی شخصیتوں کا تعلق رہا ہے؟

5- فلسفۂ تاریخ کے امام ابن خلدون کس ملک سے تعلق رکھتے تھے؟

5.4 مصر

مصر کی جدید تاریخ اس کے خدیو والی محمد علی پاشا سے شروع ہوتی ہے۔ جو خلافت عثمانیہ کی طرف سے 1805 میں مصر کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ البتہ بعض جدید اصلاحات فرانسیسیوں نے اپنے دور میں شروع کر دی تھیں جن کو محمد علی نے جاری رکھا۔ رفتہ رفتہ محمد علی نے

خاصی طاقت حاصل کر کے اپنی بادشاہت قائم کرلی، تاہم آئینی طور پر اُس نے عثمانی خلافت کی بالادستی قبول کیے رکھی۔ محمد علی نے نئی تعلیم کے اسکول کھولے، فوجی ٹریننگ کے ادارے کھولے، بعض طلبہ کو گورنمنٹ کے خرچ پر فرانس اعلی تعلیم کے لیے بھیجا۔ اخبارات شروع کرائے۔ فرانس والوں کے قائم کردہ مطابع کو ترقی دی، زرعی اصلاحات کیں وغیرہ۔ اس کی اولاد 1882 تک حکمراں رہی۔ اس کے بعد مصر پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا جس نے بادشاہت کو برقرار رکھا لیکن ملک کے اصل اختیارات اس کے ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ برطانوی تسلط 1922 تک جاری رہا۔ برطانیہ نے بھی اپنے کپڑے کے کارخانوں کے لیے خام مال پیدا کرنے کے لیے مصر میں زرعی ترقی پر زور دیا۔ اسوان ڈیم نیل پر تعمیر کرایا، نہر سوئز بنائی گئی جو مصر کی معیشت میں بڑا رول ادا کرتی ہے۔ روئی اور گنے کی کاشت پر توجہ دی گئی۔ صحافت اور جدید ادب میں ارتقا ہوا۔ جدید عربی ادب کے ارکان اربعہ محمود سامی بارودی، احمد شوقی، حافظ ابراہیم بک، مطران خلیل اسی دور میں تھے۔ برطانوی دور میں سوڈان جو محمد علی کے زمانہ میں مصر کا ہی حصہ تھا، الگ ملک بن گیا۔ اسی زمانہ میں مصر میں انگریزوں نے قبطی عیسائیوں کو بہت آگے بڑھایا وہ آج بھی مصر میں تعلیمی واقتصادی میدان میں اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔

اسی زمانہ میں مصر کے اندر سیاسی ودینی بیداری آئی۔ سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگرد مفتی محمد عبدہ نے مصر کے کلچر اور دینی شعور پر گہرا اثر ڈالا۔ محمد عبدہ کے شاگردوں مصطفیٰ کمال، سعد زغلول، قاسم امین، رشید رضا، طٰہٰ حسین، فرید وجدی وغیرہم نے اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ سعد زغلول نے وفد پارٹی قائم کی جو حکومت میں شامل ہوئی۔ عرابی پاشا نے انگریزوں سے آزادی کی مہم شروع کی جس میں وفد پارٹی نے بھی اپنا رول ادا کیا۔ سعد زغلول کئی مرتبہ قید کیے گئے۔ مگر ملک میں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو عمومی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ مارچ 1922 کو برطانیہ نے مصر کو آزادی دی۔ جنوری 1924 میں مصری پارلیمنٹ کے پہلے انتخابات ہوئے جس میں وفد پارٹی کو زبردست کامیابی ملی اور سعد زغلول ملک کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔ مصر میں ابھی تک روایتی بادشاہت قائم تھی، جس کے آخری بادشاہ شاہ فاروق تھے۔ ان بادشاہوں کے طور طریق آمرانہ تھے، یہ اصلاحات میں روڑے اٹکاتے تھے۔ پھر مصر میں تعلیم اور جدید کلچر کی وجہ سے اب لوگوں میں جمہوری شعور بیدار ہو چکا تھا اس لیے حکمراں وفد پارٹی اور شاہ فاروق کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

اسی درمیان ایک دینی اصلاحی تنظیم الاخوان المسلمون تیزی سے اٹھی اور اپنے انقلابی لب ولہجہ سے مصر کے عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ اس تحریک کو امام حسن البنا شہید نے 1928 میں مصر کے شہر اسماعیلیہ میں قائم کیا تھا۔ حسن البنا ایک روحانی آدمی تھے انہوں نے اس تحریک میں دعوت وتبلیغ اور تصوف وشریعت، سلفیت وسیاست سب کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی یہ تحریک بڑے پیمانہ پر رفاہی سرگرمیاں انجام دیتی تھی۔ اس کا ہدف مصر میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ فلسطین میں اپنے جہاد اور غریبوں وناداروں کی خدمت کی بدولت اور اپنے پر کشش نعروں کی وجہ سے جلد ہی یہ تحریک پورے مصر میں پھیل گئی۔ اور وہاں سے نکل کر مشرق میں فلسطین، شام، اردن، اور مغربی افریقہ میں الجزائر ومراکش اور جنوب میں سوڈان کی جانب پھیلنے لگی۔ جلد ہی اس کے اثرات عالمی ہو گئے۔ 1930 کے عشرہ میں اخوان نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی درمیان تقسیم فلسطین کا المیہ پیش آیا، مصر میں برطانوی فوجیں ابھی تک موجود تھیں۔ اور برطانیہ کی یہود نواز پالیسیوں کی وجہ سے عوام میں سخت اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ مصری سیاست ڈانواڈول تھی۔ معیشت کا برا حال تھا۔ ان حالات کے رد عمل میں 1952 میں مصر کے اندر جنرل نجیب کی قیادت میں ایک فوجی انقلاب آ گیا اور مصر کا ایک بالکل نیا دور شروع ہو گیا۔

اس فوجی انقلاب کا ساتھ اخوان المسلمون نے بھی دیا تھا۔انقلاب کے بعد شاہ فاروق کو معزول کر دیا گیا' وہ سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔بظاہر انقلاب کی قیادت جنرل نجیب نے کی تھی لیکن اُس کے اصل محرک جنرل جمال عبدالناصر تھے جنہوں نے موقع ملتے ہی جنرل نجیب کو کنارہ کر دیا اور حکومت کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔انہوں نے شروع میں اخوان کو اپنے ایجنڈے کے لیے راضی کرنا چاہا' جب اخوان کی طرف سے مزاحمت ہوئی تو اُن کو سختی سے کچل دیا۔ان کے دور میں اخوان المسلمون پر بے پناہ مظالم کیے گئے ،سید قطب ،عبدالقادر عودہ اور دوسروں کو پھانسیاں دی گئیں۔اخوان کالعدم قرار دی گئی ۔جائیدادیں ضبط،اور اس کے ہزار ہا افراد و کارکنوں کو جیلوں میں سڑا دیا گیا۔صدر جمال عبدالناصر نے یمن اور شام و مصر کو ملا کر ایک متحدہ ملک بنانا چاہا۔وہ قومیت عربیہ یا عرب نیشنل ازم کے علمبردار بن کر ابھرے۔اپنی جوشیلی تقریروں اور بیانات سے بہت جلد عرب دنیا کے ہیرو بن گئے۔انہوں نے 1967 میں اسرائیل سے جنگ کی۔لیکن اس چھ روزہ جنگ میں عربوں اور خاص کر مصر کو اپنی تاریخ کی سب سے بدترین شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

عرب فوج کئی ممالک اردن ،شام ،مصر ،مراکش وعراق کی متحدہ فوج تھی جسے روس کی حمایت حاصل تھی۔صدر ناصر کو اپنے اوپر بڑا زعم تھا،مگر چھ روزہ جنگ شروع ہوتے ہی اسرائیل کا فضائی حملہ اتنا سخت تھا کہ مصری فوج کا سارا فضائی بیڑا جو 420 جہازوں پر مشتمل تھا وہ پرواز بھی نہ کر سکا اور سارا کا سارا رن وے پر ہی تباہ کر دیا گیا۔اس شکست سے مصری فوج کی بھی کمر ٹوٹ گئی اور جمال ناصر کا بت بھی ٹوٹ گیا۔سینا کا 42 ہزار مربع میل کا وسیع علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں آ گیا۔نہر سوئز سے جہاز رانی بند ہونے سے مصری معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔1970 میں صدر جمال ناصر کا انتقال ہو گیا۔ان کے بعد ان کے قریبی ساتھی انور سادات مصر کے صدر بنے۔انور سادات کے زمانہ میں کئی اصلاحی کام ہوئے۔سب سے پہلے انہوں نے ملک کے اندر سے جبر واستبداد کا خاتمہ کیا۔اخوانیوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔6 اکتوبر 1973 کو مصر نے اسرائیل سے پھر جنگ کی اور اسرائیلی فوج کو اپنے مشرقی ساحل سے بے دخل کر دیا' اس طرح جزوی طور پر 67 کی شرمناک شکست کی تلافی ہوئی۔سادات کے زمانہ میں اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوا جس کے ردعمل میں فوج کے ایک جذباتی نوجوان نے صدر انور سادات کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔سادات کے بعد حسنی مبارک مصر کے صدر بنے جو اگلے 30 سالوں تک آہنی پنجوں کے ساتھ ملک پر مسلط رہے۔2011 سے عالم عربی میں جو عوامی انقلاب الربیع العربی یا بہار عرب کے نام سے شروع ہوا، جس کی ابتداء تونس سے ہوئی تھی، اس کا دوسرا پڑاؤ مصر بنا اور فوج نے عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا۔تحریر چوک سے شروع ہوئے اس انقلاب میں حسنی مبارک کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔پھر آزادانہ انتخابات کے نتیجہ میں اخوان المسلمون کی سیاسی پارٹی کے اہم رہنما ڈاکٹر محمد مرسی عہدہ صدارت پر فائز ہوئے۔ایک سال بعد ان کی حکومت کے خلاف بھی عوامی شورش ہوئی اور فوج نے ایک بار پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔اب جنرل عبدالفتاح السیسی ملک کے صدر ہیں،اخوان دوبارہ کالعدم قرار دی جا چکی ہے۔جنرل سیسی پورے آمرانہ استبداد کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔جن کے خلاف عوامی مظاہرے ہوتے رہتے ہیں۔

تعمیر و ترقی :مصر اسلامی دنیا کا بڑا ملک ہے ،لیکن ملک کا بیشتر حصہ قابل کاشت نہیں۔جو قابل کاشت ہے وہ نہایت زرخیز ہے اور پورا دریائے نیل سے سیراب ہوتا ہے۔قاہرہ عرب دنیا کا سب سے بڑا اور ترقی یافتہ شہر ہے۔مصری صحافت بھی اسلامی دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔اخبارات لاکھوں کی تعداد میں نکلتے ہیں۔پٹرول ،لوہا، فاسفیٹ نکلتے ہیں اور روئی کی پیداوار بھی سب سے زیادہ ہے۔اس

فرانس نے تونس پر قبضہ کر کے وہاں کے مقامی حکمران 'بے' کو برقرار رکھا لیکن اصل اختیارات فرنچ ریزیڈینٹ جنرل کے ہاتھ میں رہے۔ فرانس نے تونس میں اصلاحات بھی کیں، انتظامی اور مالی ڈھانچہ میں مفید تبدیلیاں لائی گئیں۔ ریلوے، عام سڑکیں، بندرگاہیں تعمیر کیں، جدید تعلیم کو پھیلایا۔ اسکول اور اسپتال قائم کیے۔ باغبانی اور کاشت پر توجہ کی' کان کنی کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ لیکن انگریزوں کے برخلاف فرانسیسیوں نے بڑی تعداد میں اپنے شہریوں کو تونس میں لا لا کر بسایا۔ اپنی زبان اور کلچر کو سختی سے نافذ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تونس حقیقی معنی میں ایک فرانسیسی نوآبادی بن گیا۔ 1907 سے تونس میں قومی تحریک آزادی شروع ہوئی جس میں مذہبی طبقہ، مغربیت پسند طبقہ اور نوجوان طلبہ سب شامل تھے۔ مذہبی علما میں شیخ عبدالعزیز الثعالبی جو جامع زیتونہ کے فارغ تھے، قابل ذکر ہیں۔ دوسری بڑی پارٹی حزب الدستور تھی جس میں فرانسیسی کالجوں کے پڑھے ہوئے تونسی طلبہ تھے۔ تاہم جوں جوں آزادی کی منزل قریب آئی قدیم وجدید طبقہ کے درمیان کشمکش بھی بڑھی اور 1939 میں تیز طرار جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ایک گروپ نے علما اور حزب دستور دونوں سے الگ ہو کر حزب دستور جدید کے نام سے ایک الگ جماعت بنائی جس کے قائد حبیب بورقیبہ تھے۔ تعلیم کے حصول کے بعد ان کی زیادہ تر زندگی جیل کے اندر جلاوطنی اور آزادی کی لڑائی لڑتے گزری۔ آزادی کی لڑائی پورے ملک میں پھیل گئی، احتجاج، مظاہرے اور ہنگامے سالوں تک جاری رہے۔ 1955 میں بورقیبہ وطن واپس آئے۔ 20 مارچ 1956 میں تونس آزاد ہوا حزب دستور جدید نے حکومت بنائی اور حبیب بورقیبہ پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

جب تونس جمہوریہ بنا اور اس نے امریکی طرز کا صدارتی نظام منتخب کیا تو وہ صدر بن گئے۔ اور اگلے 31 سال تک مسلسل صدر منتخب ہوتے رہے۔ وہ سوشلسٹ، مغرب نواز، مادیت پسند اور مذہبی عقائد میں تجدد پسندی کی طرف مائل تھے، انہوں نے رمضان کے روزوں پر بھی اعتراض کیا تھا کہ روزہ رکھ کر انسان کی قوت کار گھٹ جاتی ہے۔ خود میڈیا پر آ کر جوس پی کر روزہ توڑا۔ حجاب پر پابندی عائد کی، عربی کی بجائے فرنچ کو سرکاری زبان قرار دیا۔ اور مذہبی تحریکوں کو کچلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے طویل عہد میں جو اصلاحات کیں وہ کمال اتاترک سے مشابہ تھیں۔ 1987 میں جنرل زین العابدین بن علی نے حبیب بورقیبہ کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ دو تین سال بن علی نے مذہبیت کا مظاہرہ کیا۔ اسلام پسندوں کو کچھ آزادیاں بھی دیں مگر اس کے بعد اس نے بھی اپنا اصل رنگ دکھایا اور پوری آمریت کے ساتھ حکومت شروع کر دی۔ 2011 تک بن علی ملک پر مسلط رہا۔ اس کے لمبے اقتدار میں ملک کے اندر بے روزگاری اور معاشی بے کاری اتنی بڑھی کہ 2011 میں ایک نوجوان ریڑھی والے البوعزیزی کے خودسوزی کے واقعہ کے بعد ہزاروں نوجوانوں نے دفعۃً انقلاب شروع کر دیا۔ بہار عرب کا پہلا شرارہ یہیں سے پھوٹا۔ چند دنوں کے بعد بن علی نے ملک چھوڑ دیا۔ اس کے بعد ملک میں ایک جمہوری نظام قائم کیا گیا جس میں اسلام پسند النہضہ پارٹی بھی اقتدار میں شریک ہے۔

النہضہ کے قائد شیخ راشد الغنوشی مشہور اسلام پسند مصلح ہیں۔ انہوں نے روایتی وجدید تعلیم حاصل کی ہے۔ اعلی تعلیم کے لیے فرانس میں رہے اور وہاں رہ کر قریب سے مغربی تہذیب کا مشاہدہ کیا۔ انہوں نے ماضی قریب کی اسلامی تحریکات کا مطالعہ کر کے ان کے نتائج سے سبق سیکھ کر اپنے ملک کے لیے مخصوص حالات کے تحت حکمت عملی وضع کی۔ انہوں نے اعتدال پسند اپروچ اپنائی۔ اسلامی سیاسیات میں انہوں نے قابل ذکر اضافہ کیا ہے۔ شروع میں غنوشی کی تحریک ایک غیر سیاسی، دعوتی وتبلیغی تحریک رہی اس لیے حکومت نے اس سے تعرض نہیں کیا۔ 1979 میں انقلاب ایران کے اثرات دوسرے ملکوں پر بھی پڑے۔ تونس میں حکومت اور مزدوروں میں زبردست ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔

پولیس کی وحشیانہ فائرنگ سے بہت سے مزدور ہلاک ہوگئے۔اس کے بعد غنوشی نے مظلوموں کی حمایت کے لیے باقاعدہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کرلیا۔انہوں نے میوزیم اسلام کی جگہ زندہ اسلام کا تصور پیش کیا اور مزدوروں کے حقوق،ملازموں کے حقوق،تنخواہ،غربت،مغرب زدگی اور سیاسی آزادیوں پر لکھا۔ان کی جماعت نے مزدوروں کی تحریک سے قریبی روابط قائم کیے۔انہوں نے بائیں بازو کی تنظیموں کا مقابلہ بھی شروع کیا۔ان کی طلبہ تنظیم جلد ہی کالجوں اور اسکولوں میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔

حکومت نے غنوشی اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کرلیا لیکن راشد غنوشی نے اپنی جماعت کو مکمل طور پر پرامن رکھا۔ان کا کہنا تھا کہ ''اسلام اوپر سے مسلط ہونے کی بجائے نیچے سے آئے گا''۔1984 میں ملک بھر میں ہنگامے ہوئے جن کے نتیجہ میں حکومت نے غنوشی کو رہا کردیا لیکن تقریر وتحریر پر پابندی لگادی۔1987 میں حبیب بورقیبہ نے غنوشی اور ان کی جماعت کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ان پر پھر پابندی لگادی اور ان کی جماعت کے تین ہزار کارکنوں کو گرفتار کرلیا۔خود غنوشی کو عمر قید با مشقت کی سزا دی گئی۔اس کے بعد بن علی نے بغاوت کرکے بورقیبہ کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔شروع میں مذہبی جماعتوں کو آزادیاں دی گئیں۔عوام کے لیے مذہبی فرائض ادا کرنے پر ساری پابندیاں ختم کردی گئیں۔جامع زیتونہ کو کھول دیا گیا۔غنوشی کی جماعت کو اپنا رسالہ نکالنے کی اجازت دینے کا وعدہ بھی کیا۔غنوشی نے اب اپنی جماعت کا نام بدل کر النہضہ کردیا۔1989 میں بن علی تمام وعدوں سے مکر گئے اور النہضہ کی زبردست دارو گیر شروع کردی،غنوشی کو بھی لندن میں پناہ لینی پڑی۔پارٹی کے بہت سے رہنماؤں کو جلاوطن کردیا گیا۔تاہم نئے انقلاب کے بعد غنوشی اور دوسرے رہنما ملک لوٹ آئے۔انتخابات میں شامل ہوئے،ان کی پارٹی النہضہ اکثریت سے جیتی اور اس نے حکومت بنائی۔انہوں نے سب کو ساتھ لیکر چلنے کی کوشش کی لیکن بائیں بازو کے سیکولر عناصر کی سازشوں سے ان کی حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔دوسرے انتخابات میں ان کی پارٹی دوسرے نمبر رہی اور اور اب وہ نئی حکومت میں شریک ہے۔

تونس کا بڑا حصہ ریگستان ہے۔لیکن قابل کاشت زمین بھی کوئی 75 لاکھ ایکڑ ہے۔معدنیات بھی خوب نکلتی ہیں۔لوہا،سیسہ،فاسفیٹ کے علاوہ پٹرول اور قدرتی گیس بھی پائی جاتی ہے۔سیمنٹ اور فولاد سازی کے کارخانے ہیں۔سیاحت بھی ملکی آمدنی کا اچھا ذریعہ ہے۔تعلیم کے میدان میں تونس نے ترقی کی ہے۔مذہبی اور غیر مذہبی تعلیم کا فرق وہاں ختم کردیا گیا ہے۔اور جامع زیتونہ کو اب تونس یونیورسٹی سے ملحق کردیا گیا ہے۔ابتدائی مرحلہ سے یونیورسٹی تک تعلیم مفت ہے۔صدر مقام تونس شہر ہے۔جس میں عرب لیگ کا دفتر بھی ہے۔خواندگی کی شرح تقریبا 70 فیصد ہے،باشندے تمام مسلمان ہیں اور عرب وبربر نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔زبان عربی ہے۔دینار یہاں کی کرنسی ہے۔تونس اقوام متحدہ،او آئی سی اور عرب لیگ کا رکن ہے۔

معلومات کی جانچ

1- سوڈان میں آزادی کے بعد کتنے فوجی انقلابات آئے؟

2- جنرل عمر البشیر نے ملک میں کیا اصلاحات کیں،ان کے دور کے اہم مسئلے کیا تھے؟

3- حبیب بورقیبہ کے عہد کے مثبت و منفی پہلو کیا ہیں؟

4- تونس کا کون سا نوجوان بہار عرب کا محرک ثابت ہوا؟

5.7 لیبیا

لیبیا سنوسی صوفی تحریک کا گہوارہ ہے۔اس تحریک کے پیروؤں نے اپنے ملک پر حملہ آور فرانسیسیوں اوران کے بعد اطالوی استعمار سے دہائیوں تک مزاحمت کی ۔ان سے جہاد کرتے ہوئے اس صوفی سلسلہ کے مجاہد سنوسی رہنما سیدی عمر مختار نے شہادت پائی۔سید محمد ابن علی سنوسی ،ان کے بیٹے سید مہدی اورایک دوسرے قائد سید احمد شریف نے جغبوب وکفرہ میں اپنے مراکز قائم کیے تھے،جو زاویے کہلاتے تھے۔سنوسی ایک ہی وقت میں مبلغ،کسان ،معلم اور مجاہد سبھی کچھ ہوتے تھے۔اطالیہ نے وادی برقہ پر قبضہ کر کے لیبیا کو اپنی نوآبادی بنادیا،اس میں معاشی واقتصادی اصلاحات کیں۔لیکن وہاں لاکھوں اطالوی باشندوں کو بھی آباد کر دیا۔جنگ عظیم دوم میں سنوسیوں کے رہنما سید محمد ادریس نے برطانیہ سے تعاون کیا اور جب جنگ میں محوری طاقتوں،جرمنی اوراٹلی کو شکست ہوگئی تو فرانس اور برطانیہ نے لیبیا کے اپنے اپنے زیر انتظام علاقے سید محمد ادریس کے حوالے کر دیے۔سید محمد ادریس ملک کے دستوری بادشاہ قرار دیے گئے ۔آزادی کے ابتدائی سالوں میں ترقیاتی کاموں کی رفتار سست تھی ملک کے وسائل بھی اس وقت محدود تھے۔1969 میں جب شاہ ادریس غیر ملکی دورے پر تھے فوج نے بغاوت کر کے شاہی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔اب جنرل معمر قذافی لیبیا کے صدر بنے۔اس زمانہ میں پیٹرول کی آمدنی اتنی بڑھی کہ لیبیا مسلم دنیا کا آٹھواں سب سے بڑا تیل پیدا کرنے والا ملک بن گیا۔صدر قذافی نے داخلی وخارجی سطح پر جرأت مندانہ اقدامات کیے،لیبیا کو امریکہ اور برطانیہ کے اثرات سے آزاد کرایا۔عرب دنیا سے اتحاد کی کوششیں کیں۔اُس میں کامیابی نہ ملی تو افریقن اتحاد کی مہم چلائی ۔انہوں نے مختلف ممالک میں آزادی کی تحریکوں اورانقلابیوں کی تائید کی ۔اپنی کتاب ،"کتاب اخضر" کو مملکت کا دستور بنایا جو اسلام اور سوشلزم کا ملغوبہ ہے۔معمر قذافی کا دامن اخلاقی کمزوریوں سے پاک تھا لیکن مزاج میں آمریت ،تلون ،خودسری اور جلد بازی تھی۔جن کی وجہ سے ان کے اقدامات اکثر ناعاقبت اندیشانہ ہوکر رہ جاتے تھے۔

قذافی نے اپنے زمانہ میں اخوان المسلمون کو بری طرح کچل دیا،وہ ان کو ارہابی (دہشت پسند) قرار دیتے تھے۔قذافی نام اسلام کا لیتے تھے لیکن انہوں نے اسلام کے مقابلہ میں اپنے نظریات ومفادات کو زیادہ اہمیت دی۔لیبیا میں جو انقلاب آیا وہ قرآن وسنت کی بنیاد پر نہیں بلکہ قذافی کے ذاتی نظریات پر تھا۔لیبیا کی یہ نئی حکومت ایک عوامی ریاست بن گئی جس میں عوامی کمیٹیوں نے حکومتی دفاتر، اسکولوں، میڈیا،کاروباری اداروں،سفارت خانوں اور مساجد کا انتظام سنبھالنا شروع کردیا۔یہ سوشلسٹ تجربہ 1978 میں شروع ہوا جس میں جاگیرداری کا خاتمہ کردیا گیا۔لیبیا میں ایک مکان سے زیادہ جائداد ممنوع قرار پائی۔پرائیویٹ تجارت پر پابندی لگادی گئی،فیکٹری ورکرز کو حق دیا گیا کہ وہ اپنی فیکٹریوں پر قبضہ کرلیں۔اس طرح کارکنان راتوں رات اپنی کمپنیوں کے مالک بن گئے۔

اگرچہ ان کے عہد میں ملک کے اندر امن وامان کی صورت حال مثالی تھی۔لیبیا مختلف طریقوں سے اسلامی ملکوں نیز دنیا کے غریبوں کی امداد کرتا تھا۔تاہم اپنے 40 سالہ عہد میں جنرل معمر قذافی نے عوامی آزادیوں کو بری طرح پامال کیا تھا۔انہوں نے ہر تنقیدی آواز کو سختی سے دبادیا۔استبدادی قوانین کو لوگوں پر اتنی سختی سے نافذ کیا کہ سبھی عاجز آگئے ۔ملکی صحافت ،ذرائع ابلاغ وغیرہ سب پر شدید پابندیاں تھیں۔ 2011 میں جو بہار عرب چلی تو لیبیا میں قذافی کے خلاف برسوں سے پکنے والا لاوا پھوٹ پڑا۔شدید بغاوت شروع ہوگئی جس کی مغربی ملکوں نے حمایت کی اور آخر کار دو سال کی جدوجہد کے بعد قذافی کے پنجوں سے ملک کو آزاد کروالیا گیا۔تاہم قذافی کے

خاتمہ کے بعد سے ملک ابھی تک سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے۔

تاہم قذافی کے عہد میں لیبیا میں شراب پر پابندی تھی،خواتین کے لیے ستر ڈھانپنا لازمی تھا۔زکوۃ کا سرکاری نظم ہوتا۔جہاد فنڈ قائم کیا گیا۔ابتدائی تعلیم لازمی تھی۔قذافی حکومت نے ریلوے،شفاخانے،عمدہ سڑکیں،یونیورسٹیاں،کارخانے ہوائی اڈے وغیرہ قائم کیے اور لیبیا کو ایک جدید وترقی یافتہ ملک بنادیا۔آبادی تمام تر مسلمان ہے اور عرب وبربر نسلوں کے باشندوں پر مشتمل ہے۔خواندگی کی شرح 90 فیصد تھی۔لیبیا اوپیک ممالک،اقوام متحدہ،اوآئی سی اور عرب لیگ کا رکن ہے۔

5.8 الجزائر

الجزائر پر فرانسی استعمار پورے سو سال حکمراں رہا۔اس دوران اس نے کافی ترقیاتی کام بھی کیے۔مثلاً لاکھوں ایکڑ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنایا گیا،ہزاروں میل لمبی سڑکیں اور ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔شہروں کی تعمیر جدید طرز پر کی گئی۔لیکن الجزائر میں ان ترقیاتی کاموں میں افسوس کا پہلو یہ تھا کہ ان کے سارے فائدے نئے فرنچ باشندے اٹھاتے تھے اور الجزائر کے باشندے ان سے محروم تھے۔ملک کی تمام زرخیز زمینیں نوآبادکار فرانسیسیوں کے ہاتھ میں تھیں۔عبدالقادر الجزائری کے بعد بھی کئی بار آزادی کی تحریکیں اٹھیں جن کو سختی سے کچل دیا گیا۔1924 میں ایک مزدور رہنما مسالی حج نے ایک مزدور تنظیم قائم کی۔اُن کے بعد اور بھی کئی تنظیمیں مثلاً فرحت عباس کی حزب منشور الجزائر،علما کی تنظیم جمعیۃ العلما الجزائر،الجزائری محاذ برائے دفاع وحریت وغیرہ میدان میں آگئیں۔شیخ عبدالحمید بن بادیس قرآن کا درس دیتے تھے جو بہت مشہور ہوگیا تھا۔یہ جمعیۃ دینی ومعاشرتی اصلاح کے ساتھ آزادی کے جذبات کی آبیاری بھی کرتی تھی اور اپنا پیغام ہفت روزہ ''البصائر'' کے ذریعہ عام کرتی تھی۔اس تنظیم کا نعرہ تھا:''اسلام میرا دین ہے،عربی میری زبان ہے اور الجیریا میرا وطن ہے''۔یہ تمام پارٹیاں برسرِعمل تھیں اسی دوران انقلاب پسند نوجوانوں نے احمد بن باللہ کی قیادت میں 1947 میں ایک خفیہ تنظیم (SQ) قائم کرلی جس نے ایک آزاد فوج تشکیل دی۔1958 میں مختلف تنظیموں کا ایک قومی محاذ بھی قائم ہوا اور اُس نے الجزائر کی عارضی حکومت بھی قائم کرلی۔

سات برس تک جنگ آزادی چلتی رہی جس کے دوران کئی لاکھ الجزائری مسلمان مارے گئے۔بالآخر فرانس الجزائر میں استصواب رائے کرانے کے لیے تیار ہوگیا۔اور اس استصواب میں ملک کے تمام باشندوں نے آزادی کے حق میں رائے دی۔3 جولائی 1962 میں الجزائر نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔اور تحریک آزادی کے سب سے بڑے لیڈر احمد بن باللہ کو ستمبر 1962 میں وزیراعظم منتخب کرلیا گیا۔1965 میں بن باللہ کے ہی ایک رفیق حواری بومدین نے ان کا تختہ پلٹ دیا اور فوجی انقلابی کونسل کے ذریعہ حکومت شروع کی۔1979 تک وہ ملک کے صدر رہے۔ان کے انتقال کے بعد انقلابی کونسل نے شاذلی بن جدید کو صدر منتخب کیا۔انہوں نے زراعت پر توجہ دی،سیاسی قیدیوں کو آزاد کیا۔مذکورہ بالا سارے رہنما سوشلسٹ تھے،انہوں نے اپنی جماعت کے علاوہ سب کی زبان بندی کررکھی تھی۔علما اور اسلامی فکر رکھنے والوں کا قافیہ تنگ کیا جاتا تھا۔حالانکہ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے،عربی سرکاری زبان ہے وزارت مذہبی امور بھی قائم ہے۔مگر اسلام پسندوں کو سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔ملک میں خراب معیشت اور بے روزگاری عام ہونے کی وجہ سے اور دوسرے اسباب سے اسلامی تحریک نے سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔اس موقع پر اسلام پسند گروپوں نے مل کر اسلامی سالویشن فرنٹ تشکیل دیا جس

کومختصراً FIS کہا جاتا ہے۔ اس کی قیادت شیخ علی عباسی مدنی کر رہے تھے جو کہ ایک اعتدال پسند مذہبی اور مغربی تعلیم یافتہ رہنما تھے۔ مدنی نے تعلیم کے میدان میں برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کیا تھا اور الجزائر یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ مدنی اسلامی جمہوریت کے قائل تھے۔ معاشی اعتبار سے بھی فرنٹ نے اسلامی بنیادوں پر قائم ایک منصفانہ نظام کا وعدہ کیا۔

اسلام پسندوں کے اس متحدہ محاذ نے 1990 کے بلدیاتی انتخابات جیتے اور اس کے بعد 1991 کے عمومی انتخابات میں بھی پہلے مرحلہ کے انتخاب میں واضح طور پر دوسری پارٹیوں پر سبقت حاصل کر لی۔ مگر فوج نے ان کا راستہ روکنے کے لیے مداخلت کردی، دوسرے مرحلہ کے انتخابات نہیں ہوئے۔ نتائج کو منسوخ کر کے محاذ کے تمام رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ فرنٹ پر پابندی لگادی، اور کئی اخبارات کو بند کر دیا۔ اور جمہوریت کا پودا جڑ پکڑنے سے پہلے ہی کاٹ ڈالا گیا۔ ردعمل میں بعض شدت پسند مذہبی نوجوانوں کے بہت سارے گروپ بن گئے اور انہوں نے سیاسی عمل کی بجائے گوریلا جنگ شروع کردی۔ بعد میں بعد از خرابی بسیار صدر عبدالعزیز بوتفلیقہ اور اسلام پسندوں کے درمیان مذاکرات ہوئے اور اس صورت حال کا خاتمہ ہوا۔

الجزائر قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ پیٹرول، فاسفیٹ، لوہے اور سوئی گیس کے ذخائر ہیں۔ ملک کا نوے فیصد حصہ ریگستانی ہے مگر ساحلی میدان بہت زرخیز ہیں اور بارش بھی وافر مقدار میں ہوتی ہے۔ ملک کا تعلیمی نظام فرانسیسی ہے، کئی یونیورسٹیاں ہیں۔ صحافت کا معیار بھی بلند ہے۔ بڑے اخبار عربی اور فرنچ میں نکلتے ہیں۔ 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں اور 20 فیصد بربری۔ الجزائر اقوام متحدہ، عرب لیگ، او آئی سی اور اوپیک کا رکن ہے۔ مشہور عرب مفکر مالک بن نبی کا تعلق بھی الجزائر سے تھا۔

معلومات کی جانچ

1- کرنل قذافی کے دور میں لیبیا نے کیا ترقی کی؟

2- قذافی کا دور ہنگامہ خیز کیوں رہا؟

3- الجزائر کی تحریک آزادی میں علما نے کیا کردار ادا کیا؟

4- الجزائر میں فرنچ استعمار نے کیا ترقیاتی کام کیے؟

5.9 مراکش

مراکش کے شریف حکمران خاندان کو مولائی یا مولائے کہا جاتا ہے۔ یہ قدیم فلالی خاندان ہے۔ شمالی افریقہ کے ملکوں میں فرانس نے مراکش پر 1912 میں قبضہ کرلیا لیکن اس نے ملک کے اندر بادشاہی نظام کو برقرار رکھا، البتہ نظام حکومت فرنچ ریزیڈنٹ حکام چلایا کرتے تھے۔ مراکش کا شمالی حصہ ریف اسپین کے تسلط میں تھا۔ عوام نے ان قبضہ گیر قوتوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے، تاہم فرانس نے جلد ہی اس انقلاب کو کچل دیا اور پھر پورے 44 سال فرانسیسی استعمار مراکش پر راج کرتا رہا۔ فرانس نے دوسرے ملکوں کی طرح مراکش میں بھی ترقیاتی کام کیے۔ البتہ اس نے عربی زبان وادب اور کلچر کو دبا کر فرنچ زبان و کلچر کو رواج دیا۔ اسی طرح عربوں اور بربروں میں نزاع پیدا کی اور ان

کولڑانے کی کوشش کی۔جس کے ردعمل میں ریف میں پہلی عوامی مزاحمت شروع ہوئی۔جس کی قیادت غازی عبدالکریم خطابی کرر ہے تھے۔انہوں نے اسپین کی فوج کو شکست دے کر ریف میں ایک آزاد مملکت جمہوریہ ریف قائم کرلی تھی۔مگر 1925 فرانس اوراسپین کی مشترکہ فوج نے جس کی تعداد تین لاکھ تھی اس چھوٹی سی مملکت پر حملہ کردیا،اس بڑی فوج کا مقابلہ ممکن نہ تھااس لیے غازی عبدالکریم نے 27 مئی 1926 میں ہتھیارڈال دیے۔

تاہم دوسرے قومی رہنماؤں علال الفاسی،احمد بالافرج اور محمد حسن الوزانی نے خفیہ طور پرقومی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ان کی تحریک سیاسی تھی اور مسلح جدوجہدنہ تھی۔علال الفاسی نے مراکش کےروایتی سلطان محمد خامس سے بھی ملاقات کی اوران کوبھی قومی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ کرلیا۔1943 میں حزب استقلال قائم ہوئی۔ریف کے باشندوں نے پھر بغاوت کردی۔آخرکار فرانس نے 2مارچ 1956 کومراکش کی آزادی تسلیم کرلی۔اسپین بھی ریف سے دست بردار ہوگیا۔مراکش میں دستوری بادشاہت برقرار رکھی گئی۔سلطان محمد خامس کا 1961 میں انتقال ہوگیا'ان کی جگہ مولائے حسن ثانی تخت پر بیٹھے۔اس وقت مراکش میں آئینی بادشاہت ہے اور بادشاہ کووسیع اختیارات حاصل ہیں۔ساتھ ہی ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود ہے،سیاسی پارٹیاں آزاد ہیں۔جن میں حزب الحرکۃ الشعبیہ الدستوریہ،جمعیۃ العدل والاحسان اورحزب العدالۃ والتنمیۃ ہے۔شاہ حسن ہردل عزیز حکمراں ہیں،ان کے کئی اقدامات قوم کی بھلائی کے لیے یادگار ہیں مثلاً انہوں نے فرنچ اوراسپین کے آبادکاروں سے واپس لی ہوئی پانچ لاکھ ایکڑ زمین اپنے غریب کسانوں میں تقسیم کردی۔اسرائیل کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے۔مسجد اقصیٰ کوصیہونی خطرات سے بچانے کے لیےاوراس میں آگ زنی کے حادثہ کے بعد رباط میں انہوں نے ہی پہلی مؤتمر اسلامی بلائی اور وہیں اوآئی سی کی تاسیس ہوئی۔انہوں نے ہسپانوی صحراءکوحاصل کرنے کی بھی کامیاب کوشش کی۔شاہ حسن نے اپنے لیے'امیرالمومنین' کا لقب بھی اختیار کررکھا ہے۔یہاں کی اکثریت مالکی مسلک سے تعلق رکھنے والے اہل سنت پر مشتمل ہے۔

زراعت اورکان کنی مراکش کی معیشت کی بنیاد ہیں۔معدنیات بھی خاصی ہیں۔لوہا،کوئلہ،سیسہ،جست اور فاسفیٹ کے علاوہ یورانیم اور پیٹرول بھی نکالا جارہا ہے۔صنعت کوترقی دی جارہی ہے۔سیاحت کے امکانات بھی وسیع ہیں۔مسلم دنیا میں ملائشیا کے بعد مراکش میں سب سے زیادہ سیاح آتے ہیں۔ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔فاس میں جامعۃ القرویین ہے۔مراکش میں کتب خانے اور مخطوطات بھی بہت ہیں۔صحافت عربی میں ہوتی ہے،خواندگی کی شرح 50 فیصد سے زیادہ ہے۔کرنسی درہم ہے۔مراکش اقوام متحدہ،اوآئی سی اورعرب لیگ کا رکن ہے۔محمد الفاسی،عبداللہ کنون،اورعبدالرحیم غنیمہ یہاں کی علمی شخصیات میں ہیں۔دارالحکومت رباط ہے۔کیسابلانکا(دارالبیضاء)مراکش،فاس، مکناس اورطنجہ قدیم اور بڑے اورتاریخی شہر ہیں۔مراکش کے گرم ساحل اورمعتدل موسم عرب دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

5.10 نائجیریا

1903 میں انگریزوں نے پورے نائجیریا کواپنے تسلط میں لے لیا۔انہوں نے بعض حصوں کوراست اپنے انتظام میں لیااور بعض میں مقامی حکومتوں کو برقرار رکھا۔شمال میں یہ حکومتیں متعدد تھیں اور سب مسلمان تھیں۔1946 میں ملک کے تینوں حصوں میں علاقائی اسمبلیاں اور مرکز میں مجلس قانون ساز قائم ہوئی۔نائجیریا میں سیاسی اورقومی جدوجہد علاقائی اورقبائلی اورنسلی بنیاد پر ہوئی۔اس لیے اسلام کے

نام پر مسلمانوں نے بھی کوئی مہم نہیں چلائی۔ البتہ شمال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے شمال کی سیاست اور مسلمانوں کی سیاست مترادف ہی مانی جاتی تھیں۔ 1957 میں نائجیریا میں وفاقی نظام قائم کیا گیا جس میں شمال کے رہنما ابوبکر تفادا بلیوا نائجیریا کے پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ ان کی قیادت میں 1960 میں ملک کو برطانیہ سے مکمل آزادی مل گئی۔ نیا آئین بنایا گیا۔ نائجیریا کو جمہوریہ قرار دیا گیا۔ نائجیریا میں چھوٹے بڑے قبیلوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے، تقریباً اتنی ہی ان کی بولیاں ہیں۔ ان قبیلوں میں پانچ قبیلے بہت بڑے ہیں۔ ان کی تعداد پورے ملک کی دو تہائی کے برابر ہے۔ ان میں بھی ہاؤسا اور ایبو سب سے بڑے قبیلے ہیں۔ جن میں ہاؤسا مسلمان اور ایبو کی اکثریت عیسائی ہے۔ ملک میں مسیحی مشنری سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ اگر چہ مظاہر پرست قبائل بڑی تعداد میں اسلام بھی قبول کر رہے ہیں۔ چونکہ مجموعی طور پر سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر مسیحی برتر پوزیشن میں ہیں اس لیے مظاہر پرستوں کو وہ بآسانی اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ ایبو باشندوں کو فوج میں بھی غلبہ حاصل تھا۔ اس لیے انہوں نے جنرل آئرونسی کی قیادت میں 1996 میں فوجی بغاوت کر کے آئینی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور مسلم رہنماؤں احمد وبلو اور ابوبکر تفادا کو قتل کر دیا۔ اور وفاق کو ختم کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کر دی۔ لیکن وہ مستحکم ثابت نہیں ہوئی اور جواب میں ہاؤسا سپاہیوں نے بغاوت کر کے جنرل آئیرونسی کو قتل کر دیا۔ تبھی سے مسیحی مسلم تصادم ہوتے چلے آرہے ہیں۔ فوجی انقلابات بھی آتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر نائجیریا کے وفاق میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہے اسی لیے ایبو وزراء نے مسلم آبادی کی مخالفت کے باوجود اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ اب نائجیریا میں صدارتی آئین ہے اس کے تحت ایوان نمائندگان ہے۔ اور 95 ممبران پر مشتمل سینیٹ ہے۔

نائجیریا زرعی اور معدنی ملک ہے۔ کوئلہ، لوہا، سیسہ، ٹین اور جست کے ذخیروں کے علاوہ بڑے پیمانہ پر پیٹرول بھی نکل رہا ہے اور قدرتی گیس بھی۔ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ خواندگی کا تناسب 51 فیصد ہے۔ صحافت بھی ترقی یافتہ ہے۔ سرکاری زبان انگریزی ہے۔ مقامی زبانوں میں ہاؤسا ہے جو عربی و رومن دونوں میں لکھی جاتی ہے۔ فاترا یہاں کا سکہ ہے۔ نائجیریا اقوام متحدہ، اوپیک اور دولت مشترکہ کا رکن ہے۔

معلومات کی جانچ:

1- مراکش کے حکمراں تاریخ میں کس لقب سے مشہور ہیں؟

2- مراکش کے کس شہر میں مسلم ممالک کی پہلی مؤتمر منعقد ہوئی؟

3- نائجیریا کے دو بڑے قبیلے کون سے ہیں؟

4- نائجیریا میں کون سے معدنیات زیادہ ہوتے ہیں؟

5.11 موریتانیہ

موریتانیہ پر فرانس نے 1903 میں استیلاء حاصل کیا تھا۔ جب موریتانیہ میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو لوگوں کے تین رجحان

سامنے آئے۔شمالی موریتانیہ کی جماعت النہضۃ الوطنیہ مراکش کے ساتھ اس کے الحاق کی حامی تھی۔جبکہ دوسری جماعت نیشنل موریتانیا جنوب کے نیگرو باشندوں پر مشتمل تھی اور مالی کے ساتھ وفاق بنانے کی حامی تھی۔ان دونوں رجحانوں کے بیچ ایک تیسرا خیال عام باشندوں کا ایک الگ خود مختار ملک بنانے کا تھا۔ملک کی آزادی سے متعلق ان مختلف نظریات کی کشمکش کی وجہ سے ہی جب 25 نومبر 1960 کو فرانس نے موریتانیہ کو مکمل آزادی دیدی تو عرب ملکوں میں سے تونس کو چھوڑ کر کسی نے بھی اس تسلیم نہیں کیا۔وہ سب اس کو مراکش کا ہی ایک حصہ سمجھتے تھے۔تاہم موریتانیہ نے ایک الگ اور آزاد جمہوری اسلامی ملک ہونے کا اعلان کر دیا۔اسمبلی کے انتخابات میں متحدہ محاذ نے تمام نشستیں جیت لیں اور مختار الدادہ پہلے وزیراعظم بنائے گئے۔9جون 1970 میں موریتانیہ اور مراکش میں بھی دوستی کا معاہدہ ہوگیا،مراکش نے اس کو آزاد ملک مان لیا تو اور عرب ملکوں نے بھی اسے تسلیم کر لیا اور 1973 میں موریتانیہ کو عرب لیگ کا رکن بنالیا گیا۔

موریتانیہ کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا پیشہ ہے۔زراعت بھی ہوتی ہے۔معدنی وسائل کم ہیں۔تاہم لوہے اور تانبے کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔عرب ملکوں کی مدد سے مختلف منصوبوں پر کام ہو رہا ہے۔سڑکیں تعمیر کی جارہی ہیں،تعلیم پر توجہ دی جارہی ہے۔خواندگی بہت کم ہے۔بربر،نیگرو اور عرب تین طرح کے باشندے ہیں۔عربی اور فرنچ لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔عائلی معاملات میں اسلامی قوانین نافذ ہیں۔اب دوسرے اجتماعی معاملات میں بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کا مطالبہ بڑھ رہا ہے۔آبادی پوری مسلمان ہے،مساجد کی کثرت ہے۔دینی مدارس بھی بڑی تعداد میں ہیں۔سرکاری زبان عربی ہے۔موریتانیہ کی کرنسی اوقیہ ہے۔وہ اقوام متحدہ،او آئی سی اور عرب لیگ کا ممبر ہے۔

5.12 جمہوریہ مالی

مالی پر فرانس کا قبضہ 65 سال رہا۔وہ مالی کو فرانسیسی سوڈان کہتا تھا۔اس درمیان فرانس نے یہاں بھی ترقی کے کام کیے ،سڑکیں بنائیں،ریلوے کی پٹریاں بچھائیں،تار اور ٹیلی گراف کے سلسلے قائم کیے۔مالی میں آبپاشی کے نظام کو ترقی دی۔لیکن فرنچ حکومت کے ان ترقیاتی کاموں کا ایک تاریک پہلو یہ تھا کہ وہ شہری حقوق صرف ان لوگوں کو دیتی تھی جو فرنچ زبان اور کلچر کو اختیار کر لیتے تھے۔اس کے علاوہ فرانس نے جن جن ملکوں پر قبضہ کیا وہاں اپنے مفاد میں ایک الیٹ طبقہ پیدا کرنے میں مدد دی۔یہ طبقہ زبان و کلچر کے اعتبار سے مغربی تھا اور اس نے قدیم روایات سے تعلق تقریبا توڑ لیا تھا۔لیکن اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے قوم کی قیادت یہی طبقہ کر رہا تھا۔جب مالی آزاد ہوا اور اس نے اپنا نام جمہوریہ مالی رکھا تو اس کے پہلے صدر مودیبو کیتا ایسے ہی ایک فرد تھے وہ طبقہ اعلی سے تعلق رکھتے اور اپنے کلچر کے اعتبار سے فرنچ اور خیالات میں سوشلسٹ تھے۔چنانچہ انہوں نے 1959 کے انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے اپنی پارٹی (سابق مغربی سوڈانی یونین) کے علاوہ بقیہ سبھی پارٹیوں کو ختم کر دیا۔جمہوریہ مالی کو ایک جمہوری،سیکولر اور سوشلسٹ جمہوریہ قرار دیا۔انہوں نے ملک میں روس اور چین کے طرز کا سوشلزم اختیار کیا اور ملک میں اجتماعی کاشت کا پروگرام شروع کیا،کثیر تعداد میں چینیوں کو نیا نظام چلانے کے لیے اپنے ملک بلایا۔اسی طرح انہوں نے مالی کو فرنچ بلاک سے بھی الگ کر دیا۔ان کا طرز حکومت آمرانہ تھا۔جس کی وجہ سے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔19 نومبر 1968 کو لیفٹیننٹ موسی تراورے نے مودیبو کیتا کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔نئی حکومت نے نجی کاروبار اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی۔مالی کے اقتصادی وسائل اچھے ہیں۔نصف ملک کی زمین زرخیز ہے‘ پانی وافر مقدار میں موجود ہے۔مویشی پالنے کے

امکانات بھی وسیع ہیں۔ میگنیز، پیٹرول اور یورینیم کی تلاش جاری ہے۔ دارالحکومت بماکو ہے۔ ٹمبکٹو کا تاریخی بندرگاہ بھی مالی میں ہی پڑتا ہے۔ خواندگی کا تناسب قریباً 30 فیصد ہے۔ یہاں کا سکہ فرانک ہے۔ مالی اقوام متحدہ اور او آئی سی کا رکن ہے۔

معلومات کی جانچ:

1- موریتانیہ کی معیشت کا انحصار کن چیزوں پر ہے؟

2- آزادی کے بعد موریتانیہ کو عرب ملکوں نے کیوں تسلیم نہیں کیا؟

3- فرانس نے مالی اور دوسرے ملکوں میں کس طبقہ کو پروان چڑھایا؟

4- جمہوریہ مالی کے اقتصادی وسائل کیسے ہیں؟

5.13 خلاصہ

مصر آبادی اور اپنے وسائل کے لحاظ سے عرب دنیا کا سب سے بڑا اور معاشی، فکری، عقلی و تمدنی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔ مصر عربوں اور عربی زبان کی نشأۃ ثانیہ کا بھی مرکز ہے۔ سب سے پہلے جدید بیداری یہیں آئی تھی۔ اس کے بعد اس کے شعلے دوسرے عرب ملکوں میں پہنچے۔ اُسی طرح مذہبی و دینی بیداری کا نقیب بھی مصر ہی مسلم دنیا اور خاص عرب ملکوں میں رہا ہے۔ مصر اسلامی تاریخ میں بھی ایک زبردست کردار ادا کرتا رہا ہے۔ آبادی سات کروڑ سے زیادہ ہے۔ عربی یہاں کی زبان ہے اور سرکاری مذہب اسلام۔ سے عالم عربی میں جو عوامی انقلاب الربیع العربی یا بہار عرب کے نام سے شروع ہوا، جس کی ابتداء تونس سے ہوئی تھی، اس کا دوسرا پڑاؤ مصر بنا اور فوج نے عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا۔ تحریر چوک سے شروع ہوئے اس انقلاب میں حسنی مبارک کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔

پھر آزادانہ انتخابات کے نتیجہ میں اخوان المسلمون کی سیاسی پارٹی کے اہم رہنما ڈاکٹر محمد مرسی عہدۂ صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک سال بعد ان کی حکومت کے خلاف بھی عوامی شورش ہوئی اور فوج نے ایک بار پھر موقع سے فائدہ اٹھا کر منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ مصری صحافت اسلامی دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ہے۔ اخبارات لاکھوں کی تعداد میں نکلتے ہیں۔ پیٹرول، لوہا، فاسفیٹ نکلتے ہیں اور روئی کی پیداوار بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مصر سیاست کا بھی اہم مقام ہے یہاں کے اہرام مشہورِ عالم ہیں۔ مصر کے اندر تعلیم مفت ہے اور متعدد یونیورسٹیاں ہیں۔

سوڈان قدیم زمانہ میں نوبیہ کہلاتا تھا یہ بھی دنیا کے قدیم ملکوں میں سے ہے۔ اسلام سے پہلے سوڈان میں عیسائیت پہنچی اور ملک کے شمال میں آبادی کے بڑے حصہ نے مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں مسلمان نوبیہ پر حملہ کر چکے تھے۔ لیکن وہ آٹھویں صدی میں یہاں پہنچے۔ سوڈان کا رقبہ بہت بڑا ہے یعنی 9 لاکھ 66 ہزار مربع میل، آبادی 4 کروڑ سے زیادہ ہے۔ قدیم قبائلی زبانوں کے علاوہ عربی اصل زبان ہے۔ اسلام مذہب ہے۔ عیسائی اور مظاہر پرست بھی ہیں۔

شمالی افریقہ کا تیونس بھی اہم ملک ہے۔ وہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تھا۔ دوسری صدی ہجری تک مرکز خلافت کے تحت رہا۔ اُس کے بعد یہاں الگ الگ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔ جن میں اغلبی، بنوفاطمہ، صنہاجی خاندانوں کی اور بعد میں موحدین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ تیونس کا سب سے مشہور علمی وتمدنی شہر قیروان تھا اور امام فلسفۂ تاریخ ابن خلدون کا تعلق بھی تیونس سے تھا۔ 1534 میں اس پر عثمانی ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ انیسویں صدی میں مغربی استعمار کی تاخت کا شکار دوسرے عرب اور مسلم ملکوں کی طرح تیونس بھی ہوا۔ اور 1881 میں اس کو فرانس کا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا گیا۔ عربی زبان یہاں کی بھی زبان ہے۔ اور فرنچ بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مذہب اسلام ہے۔ فی الوقت جمہوری وسیکولر قوتوں کی حکومت ہے جس میں اسلام پسند النہضہ پارٹی شامل ہے۔

بحیثیت ملک لیبیا کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اُس کا قیام گزشتہ صدی میں ہوا ہے۔ پہلے اس ملک کے مشرقی حصہ کو وادی برقہ کے نام سے جانا جاتا تھا، جو مصر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ مغربی حصہ طرابلس کا علاقہ تھا جو تیونس کی حکومت کے تحت ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد طرابلس پر اسپین نے قبضہ کر لیا تھا۔ 1551 میں عثمانی ترکوں نے طرابلس اور بنغازی کو نیز جنوبی صحرائے اعظم فزان سب کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ عثمانی سلطنت میں اس پورے علاقہ کو طرابلس کے نام سے پکارتے تھے۔ جب اس پر اٹلی نے قبضہ کیا اور پھر آزادی کی تحریکوں کے بعد یہ خطہ آزاد ہوا تو اس کو لیبیا کے نام سے پکارا جانے لگا۔

شمالی افریقہ کا ایک اہم ملک الجزائر ہے۔ جو المغرب العربی میں آتا ہے۔ شمالی افریقہ کے پہلے مسلمان فاتح اور شہر قیروان کے بانی عقبہ بن نافع کا مزار بسقرہ شہر میں ہے۔ تاریخی طور پر یہ صوبہ اغالبہ، فاطمی خلافت اور موحدین کی سلطنتوں میں شامل رہا ہے۔ کبھی کبھی یہاں الگ الگ مقامی سلطنتیں بھی قائم ہو جاتی تھیں۔ 1553 میں مشہور ترک امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس کو فتح کر کے خلافت عثمانیہ میں شامل کر دیا۔ اس علاقہ کا صدر مقام شہر الجزائر تھا اس لیے پورے ملک کو الجزائر کہنے لگے۔ 1830 میں فرانس نے اس پر تاخت کی اور چند سالوں میں اس پر قبضہ کر لیا۔ فرانس سے مزاحمت کرنے والے مجاہدین میں سب سے مشہور امیر عبدالقادر الجزائری ہوئے۔ جنہوں نے اخیر میں فرانس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اُس کے بعد فرانس نے اس کو اپنا صوبہ بنا دیا۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے۔ زبان عربی، صدر مقام الجیریا شہر ہے۔ مذہب اسلام ہے۔

مراکش اسلامی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کو عہد قدیم میں مغرب اقصی اور آج کل المغرب کہتے ہیں۔ یہ اسلامی تہذیب وتمدن کا شمالی افریقہ میں سب سے بڑا مرکز رہا ہے۔ اندلس کے بعد مراکش بھی دوسری صدی ہجری میں ہی خلافت عباسیہ سے الگ ہو گیا تھا۔ اِس پر بالترتیب ادریسیوں، فاطمیوں، مرابطین، موحدین اور بنومرین نے حکومت کی۔ یہاں جامع ازہر مصر کی طرح جامع قرویین کا قیام ہوا جو شمالی افریقہ کے مسلم ممالک کے لیے آج بھی سب سے بڑی دینی دانش گاہ ہے۔ فاس، مکناس، رباط اور دار بیضاء (کیسابلانکا) اس کے مشہور شہر ہیں۔ اسلامی تاریخ کی نامی گرامی شخصیات میں قاضی عیاض، جغرافیہ داں ادریسی، ابن طفیل اور ابن رشد جیسے فلسفی، طبیب ابن زہر اور سیاح ابن بطوطہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آبادی تین کروڑ سے زاید ہے۔ زبان عربی اور مذہب اسلام ہے۔ اس وقت مراکش میں آئینی بادشاہت ہے اور بادشاہ کو وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ ساتھ ہی ملک میں پارلیمانی نظام بھی موجود ہے،

مغربی افریقہ کے ممالک میں نائجیریا رقبہ میں تو نہیں لیکن آبادی میں بہت بڑا ملک ہے۔ اسے افریقہ کا دیو بھی کہتے ہیں۔ آج

نائجیریا ایک وفاق ہے جس میں بارہ ریاستیں ہیں ۔بعض ریاستوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بعض میں عیسائیوں کی اور بعض میں مظاہر پرستوں کی ۔ پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی نصف سے زیادہ ہے لیکن حکومت ان کی نہیں بلکہ سیکولر اور جمہوری ہے ۔ دارالحکومت کا نام لاگوس ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے ۔ آبادی دس کروڑ ہے ۔ المغرب العربی کا چوتھا ملک موریتانیہ ہے ۔ یہ ماضی میں مراکش کا حصہ رہا ۔ اور مراکش کی ثقافت وتہذیب کا اِس پر گہرا اثر پڑا ہے ۔ وہ مراکش کے جنوب میں واقع ہے ۔قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو شنقیط کہتے تھے ۔ موریتانیہ دراصل بربرنسل کے باشندے ہیں جنھوں نے صدیوں سے عربوں سے اختلاط اور شادی بیاہ کے نتیجہ میں عرب حیثیت اختیار کرلی ہے ۔ آج اِس ملک کے 80 فیصد لوگ عربی بولتے ہیں 20 فیصد باشندے جو نیگرو ہیں وہ مختلف قبائلی زبانیں بولتے ہیں ۔ دارالحکومت کا نام نواکشوط ہے ۔ آبادی لگ بھگ 40 لاکھ ۔ اکثریت مسلمان اور سب دیندار ہیں ۔ موریتانیہ نے حال ہی میں اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا ہے ۔

جمہوریہ مالی کا علاقہ دراصل دریائے نائجر کی وسطی وادیوں اور ان کے ملحقہ علاقوں پر مشتمل ہے ۔اس کی سرحدیں سینی گال ،موریتانیہ، الجزائر اور نائجر سے ملتی ہیں ۔ اسلام یہاں بارہویں صدی میں پھیل گیا تھا ۔ چودھویں صدی میں منسی موسی کے عہد میں مالی کی سلطنت عروج پر تھی ۔ سونا پیدا کرنے والے ملک کی حیثیت سے مالی بہت مشہور تھا ۔ 1893 میں فرانس نے اس پر قبضہ کرلیا تھا اور یہ نوآبادیاتی دور 65 سال تک جاری رہا ۔ فرانس نے اس کو فرانسیسی سوڈان کا نام دیا ۔ 21 جون 1960 میں مالی نے فرانس سے مکمل آزادی حاصل کی اور ایک وفاق تشکیل دیا جس کا نام جمہوریہ مالی رکھا گیا ۔ مالی میں معاشی وسائل کافی ہیں ۔تعلیم مفت ہے مگر خواندگی کا تناسب محض 30 فیصد ہے ۔ مالی میں مسلمانوں کا تناسب نوے فیصد ہے ۔ فی الوقت جمہوری نظام حکومت چل رہا ہے ۔

5.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے

1- مصر کی جدید بیداری کے عوامل کا جائزہ لیجیے

2- سوڈان میں سیاسی عدم استحکام کا اہم سبب فوجی انقلابات ہیں ۔ وضاحت کریں

3- لیبیا قبائلی دور سے ایک جدید مملکت میں کس طرح تبدیل ہوا؟

حسب ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیں

1- مصر عالم عرب کا فکری رہنما ہے، کیوں؟ وضاحت کریں

2- الجزائر میں حکومت اور اسلام پسندوں میں تصادم کیسے شروع ہوا؟

3- موجودہ بہار عرب کس ملک سے شروع ہوئی، اور اس کے کیا اسباب رہے ۔

4.15 فرہنگ اصطلاحات

نقیب — علمبردار، اگوا، اعلان کرنے والا

استعمار — نوآبادی، سامراج

تاخت	حملہ کرنا برباد کرنا
صحرائے اعظم	بہت بڑا ریگستان
المغرب العربی	شمالی افریقہ کا وہ عرب علاقہ جو اس براعظم کے مغرب میں پڑتا ہے۔
مزاحمت	مقابلہ
دانش گاہ	جہاں علم سکھایا جائے، یونیورسٹی
المغرب	مراکش کا عربی نام
وفاق	کئی ریاستوں کا اتحاد جن کا مرکز حکومت ایک ہو
ثقافت	کلچر، رہنے سہنے کے انداز و اطوار کا مجموعہ
اختلاط	باہمی میل جول شادی بیاہ
قومیت عربیہ	عربی نیشنل ازم، عرب قوم کے ایک ہونے کا ہونے کا نظریہ
عائلی معاملات	معاشرت سے متعلق مسائل
الیٹ طبقہ	اونچا طبقہ
حزب الاتحاد الدیموقراطی	متحدہ جمہوری پارٹی
مظاہر پرست	فطری مظاہر آگ ہوا پانی پہاڑ شجر وحجر وغیرہ کی پوجا کرنے والا
حزب دستور جدید	نئی آئینی پارٹی
شرارہ	چنگاری شعلہ
ملحق	متعلق
کتاب اخضر	گرین بک، قذافی کی کتاب سبز
ریف	مراکش کا وہ دیہی علاقہ جو اسپین سے متصل ہے
دست بردار	چھوڑ دینے والا
مخطوطات	manuscript ہاتھ کا لکھا نسخہ
انحصار	دار و مدار
نشأۃ ثانیہ	دوبارہ احیاء یا بیداری

4.15 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- محمود تیمور، التاریخ الاسلامی (آخری جلد)

2- کیرن آرم اسٹرانگ: ISlam a Short History ,USA

3- ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ چہارم، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

4- مبشر نذیر، پروگرام علوم اسلامیہ، ماڈیول CS06 (سیاسی، عسکری، دعوتی اور فکری تحریکیں) (انٹرنیٹ پر دستیاب) خاص کر باب 3 باب 5

5- ملف الربیع العربی، الجزیرہ عربی ویب سائٹ

اکائی 6: مسئلہ فلسطین

اکائی کے اجزاء

6.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھ کر طلبہ عالم اسلام کے ایک اہم مسئلہ، مسئلہ فلسطین سے بخوبی واقف ہو جائیں گے۔ اس کے پس منظر اور تفصیلات سے ان کو آگاہی حاصل ہوگی۔

6.2 تمہید

یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس سے فلسطین کے مسلمان عرب تقریباً پون صدی سے زائد سے جوجھ رہے ہیں۔ پوری عرب دنیا اس سے راست متاثر ہے۔ اسی طرح مسلمانان عالم کی نفسیات پر بھی مسئلہ فلسطین نے بڑا اثر ڈالا ہے۔ اس اکائی میں مسئلہ کی تفصیل سے طلبہ کو آسان زبان میں واقف کرادینا مقصود ہے۔ فلسطین کا رقبہ، اسرائیل کا قیام، فلسطینی تحریکات، شخصیات اور انتفاضہ سبھی اس میں زیر بحث آئیں گے۔

6.3 مسئلہ فلسطین کا اجمالی تعارف

گزشتہ 6 دہائیوں سے عالم عرب میں خاص کر اور مسلم دنیا میں عام طور پر جس مسئلہ پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے وہ بلاشبہ مسئلہ فلسطین ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ مغربی دنیا خصوصاً برطانیہ و اقوام متحدہ کا پیدا کردہ ہے۔ برطانیہ نے بنیادی طور پر اس مسئلہ کو پیدا کیا۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے نصف سے زیادہ حصہ یہودیوں کو دیدیا جنہوں نے اس پر اسرائیل کی مملکت قائم کر دی۔ اور بتدریج ماقبی فلسطین پر بھی قبضہ کرلیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہودی صدیوں تک عیسائیوں کے ہاتھوں انتہائی وحشتناک مظالم برداشت کرتے رہے۔ عیسائی پادری یورپ کے طول و عرض میں گھوم گھوم کر انہیں کافر قرار دیتے تھے۔ اندلس کے انکویزیشن کی تاریخ بڑی بھیانک ہے۔ اس کا شکار جہاں مفتوح و بے بس مسلمان تھے وہیں یہودی بھی شدید مظالم کا تختہ مشق بنائے جاتے تھے۔ موجودہ دور میں جرمنی ان کے ساتھ ناروا سلوک کرنے میں سب سے آگے بڑھ گیا جس نے نازی ہٹلر کے زمانہ میں ان کا بدترین قتل عام کیا۔ یورپ میں ان کو الگ باڑوں (Ghettos) میں رکھا جاتا۔ یہ مسلمانوں کی رواداری اور رعایت تھی کہ جب یورپ میں انہیں جادو کے الزام میں زندہ جلانا ایک عام بات ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت ان کو مسلمانوں کے ہاں پناہ ملتی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مسلم خلفاء اور سلاطین نے ان کو عزت دی، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر کھول دیے اور انہیں بلند عہدے دیے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں بمقام باسل 29 اگست 1897 میں تمام یہودی دماغ ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا۔ صہیونیت کے معمار اول ڈاکٹر ہرتزل نے اپنی کتاب Jewish state لکھی اور ریاست اسرائیل کے خدوخال اس میں پیش کیے۔ پہلے پہل یہودیوں نے لیبیا، وادی برقہ، یوگانڈا، لائبریا اور ارجنٹائنیا کا بھی جائزہ لیا اور وہاں یہودی ریاست کے قیام کے امکانات کو تلاش کیا گیا۔ لیکن کافی غور وخوض کے بعد انہوں نے فلسطین کی سرزمین کو اس کے لیے منتخب کیا۔ اس کے بعد فلسطین کی واپسی کا نعرہ ایجاد کیا گیا۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں جرمنی میں اپنی مظلومیت کے بہانے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فلسطین میں اپنی مجوزہ ریاست کا پروپیگنڈہ کیا۔ فلسطین کو یہودی مذہبی طور پر ارض موعود سمجھتے تھے اور ہزاروں سال سے یروشلم جا کر دیوار گریہ کے سامنے رونا اور اپنی آبائی سرزمین کی واپسی کے لیے دعا کرنا یہودی عبادت کا حصہ تھا۔ فلسطین اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ تھے، ترکی یورپ کا مرد بیمار بن چکا تھا۔ خلافت سخت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ہرتزل سالوں تک عثمانی خلیفہ کو رام کرنے کی کوششیں کرتا رہا اور اپنے مقاصد کے لیے فلسطین کی سودے بازی پر اُسے راضی کرنا چاہا۔ لیکن غیور خلیفہ نے ٹکا سا جواب دیا اور فلسطین کی بالشت بھر زمین بھی ان کو دینے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ کا سقوط بھی صہیونی ایجنڈا کا حصہ بن گیا جس کے لیے ترکی کے دونمہ یہودیوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔

ترکوں سے مایوس ہو کر یہودی زعمانے دولت برطانیہ کا رخ کیا۔ برطانیہ اس وقت کی سب سے بڑی طاقت تھا، عالم اسلام کے بیشتر حصوں اور ملکوں پر اس کا قبضہ تھا۔ فلسطین بھی اس کے انتداب mandate کے تحت تھا۔ اس کے علاوہ کئی کلیدی عہدوں پر یہودی وہاں فائز تھے، مثال کے طور پر برطانوی وزیر خارجہ سر جمیس آرتھر بالفور ایک یہودی تھا، ہربرٹ سیموئیل برطانیہ کی وزارت میں وزیر نوآبادیات تھا جس کو فلسطین میں برطانیہ کا ہائی کمیشنر بھی متعین کیا گیا۔ نائب وزیر جنگ مارکس سائکس بھی متعصب یہودی تھا۔ برطانوی حکومت نے صہیونی لیڈروں سے بات چیت کے بعد اُسی کو نامزد کیا تھا۔ اس کے علاوہ لائڈ جارج 1916 میں وزیر اعظم کے عہدہ تک جا پہنچا تھا وہ بھی یہودیوں سے قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ چنانچہ یہودی ساہوکاروں کی دولت کے لالچ صلیبی تعصب اور خلافت عثمانیہ کو ختم کر ڈالنے کی خواہش نے انگریزوں کو صہیونی تحریک سے سودا کرنے پر آسانی سے آمادہ کر دیا۔ اور اسی سودے بازی کے تحت 2 نومبر 1917 کو برطانوی وزیر خارجہ بالفور نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن بنانے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد ترکی میں انقلاب آ گیا، ترک قوم پرستوں نے خلافت کو ختم کر دیا۔ اتحادی قوتوں نے عرب ممالک کے حصے بخرے کر کے ان کو آپس میں بانٹ لیا۔ فلسطین میں دولت مند یہودیوں نے نہایت مہنگے داموں عرب کسانوں سے ان کی زمینیں خریدنی شروع کر دیں۔ اس بے چارے سادہ لوح دیہاتیوں کو کیا معلوم تھا کہ ان کے ذریعہ سے ان کے ہی وطن کے خلاف کیا زبردست سازش عملی جامہ پہن رہی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں کے ریلے کے ریلے فلسطین آنے لگے۔ اب خلافت عثمانیہ ان کو روکنے کے لیے موجود نہ تھی۔ فلسطین میں برطانوی mandate نوآبادکار یہودیوں کی زبردست مدد کر رہا تھا۔ جب ان کی تعداد بڑھی تو انہوں نے ہاگاناہ وغیرہ کے نام سے دہشت گرد گروپ تشکیل دیے جن کے ممبران عربوں کے گاؤں پر حملے کرتے ان کو لوٹتے قتل عام کرتے اور ان کو خوف زدہ کرتے اور وہاں دہشت پھیلاتے تھے۔ انہوں نے اپنی آبادیوں اور قلعوں کی حفاظت کے لیے نجی فوجیں بنالیں۔ وہ یہودی فوجی جو اتحادیوں کے ساتھ مختلف محاذوں پر لڑتے رہے تھے وہ بھی فلسطین پہنچنے لگے۔ فلسطینی عربوں کی کوئی ایسی مرکزی قیادت نہ تھی جو ان کو بروقت سر پر منڈلاتے خطرات سے آگاہ کرتی۔ مفتی امین الحسینی اکیلے ہی بھاگ دوڑ کر رہے تھے، وہ مختلف عرب اور اسلامی ملکوں میں فلسطین اور قدس کی حفاظت کے لیے بیداری پیدا کرنے کے لیے دورے، جلسے اور کانفرنسیں کر رہے تھے۔ ان کی کوششوں سے فلسطینی عرب اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھے۔ ان کی تحریک مزاحمت کی قیادت مفتی امین الحسینی کر رہے تھے۔ یہ مزاحمت 1936 سے شروع ہوئی۔ اور کئی سال تک جاری رہی۔ لیکن ان کو مدد کہیں سے نہیں مل رہی تھی اور دو دو دشمنوں کا سامنا تھا۔ ایک طرف یہودی دہشت گردوں کا سامنا تھا، دوسری طرف خود برطانوی گورنمنٹ ان کو دہشت گرد قرار دے کر اپنی پولیس اور فوج سے انہیں مروا رہی تھی۔ کئی سال اسی کشمکش میں گزرے یہودی دن بدن اور زیادہ طاقت ور ہوتے جا رہے تھے۔ 1943 میں عرب مزاحمت پھر شروع ہوئی۔ یہ مزاحمت 1946 تک جاری رہی۔ اس دوران یہودیوں نے خود برطانوی حکام کو بھی نشانہ بنایا۔ جس کا بہانہ لے کر انگریزوں نے مسئلہ اقوام متحدہ کے حوالہ کر دیا۔ اور اس پر دباؤ ڈالا کہ ان کے فلسطین سے رخصت ہونے سے پہلے ہی مسئلہ کو حل کر دیا جائے۔ مسئلہ تو اصل میں کوئی تھا ہی نہیں وہ تو انہیں طاقتوں نے پیدا کیا تھا۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کی نمائندگی کے لیے کوئی نہ تھا عرب لیڈر اپنے ہی مقامی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ اپنے مختلف کمیشنوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر اور مغربی ملکوں کے اشارہ پر بالآخر اقوام متحدہ نے 29 نومبر 1947 میں فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ جو 5339 مربع میل پر مشتمل تھا، یہودیوں کو دیا گیا جس پر انہوں نے اسرائیل کے نام سے اپنی ریاست قائم کر لی۔ جس نے مئی 1948 میں ہاگاناہ اور دوسری مسلح

تنظیموں اور فوجوں کو باقاعدہ اسرائیلی ڈیفینس فورس IDF میں تبدیل کر دیا۔ ایک سال بعد مئی 1949 میں اس کو اقوام متحدہ کا رکن بھی بنا لیا گیا۔ دوسری طرف فلسطینیوں کو ساڑھے چار ہزار مربع میل پر مشتمل جو علاقہ ملا اس پر فوراً ایک آزاد فلسطینی ریاست قائم کرنے کے بجائے اس کے ایک حصہ کو اردن نے اپنے ساتھ ملا لیا اور دوسرے حصہ کو مصر نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ فلسطینی قیادت مختلف ملکوں میں منتشر کر دی گئی۔ امریکہ اور روس دونوں نے چند منٹوں کے اندر ہی اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ لیکن عرب ملکوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ تیسرے حصہ کو یعنی بیت المقدس اور گرد و نواح کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جاتا تھا۔ جس پر کچھ عرصہ بعد اسرائیل نے قبضہ کر لیا اور آج بھی اسی کا قبضہ ہے۔ اقوام متحدہ نے اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔

پھر اسرائیل اور عرب ملکوں کے درمیان چار جنگیں 1948، 56، 67 اور 73 میں ہوئیں۔ جن میں اسرائیل کو زبردست فتح ملی اور وہ پہلے سے کئی گنا طاقت ور بھی ہو گیا اور بچے کچھے فلسطین پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد پی ایل او، الفتح، حماس اور دوسری فلسطینی تنظیمیں وجود میں آئیں اور انہوں نے آزادی کی لڑائی لڑنی شروع کر دی۔ یاسر عرفات اور شیخ احمد یاسین اور دوسروں نے قربانیاں دیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد فلسطینیوں کو نیم آزاد اور چھوٹی سی ریاست فلسطینی مقتدرہ کی شکل میں غزہ پٹی اور مغربی کنارہ پر مشتمل بنائی گئی ہے۔ جس کو ابھی باضابطہ خود مختار اور آزاد ریاست کا درجہ ملنا باقی ہے۔ اور جس پر اسرائیل جارحیت کرتا رہتا ہے۔ بیت المقدس اور خاص کر شہر کا مشرقی حصہ اس مسئلہ کا اہم جزء ہے۔ فلسطینی اُسے اپنی ریاست کا دارالحکومت بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ اسرائیل پورے یروشلم کو اپنی ابدی راجدھانی قرار دیتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں اسرائیل نے بیت المقدس کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ آج قدیم یروشلم کی جگہ ایک مکمل طور پر جدید یہودی شہر وجود میں آ گیا ہے۔ قدیم اسلامی آثار و علامات مٹا دیے گئے ہیں، عرب آبادی بہت گھٹ گئی ہے اور عربی محلے اجاڑ دیے گئے ہیں۔ پورے شہر کو یہودیایا جا رہا ہے۔ یہی کل ملا کر مسئلہ فلسطین کا اجمالی تعارف ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ فلسطین کی تقسیم میں اقوام متحدہ اور مغربی ممالک نے کیا کردار ادا کیا؟

2۔ اقوام متحدہ نے اپنی تقسیم میں فلسطین کو نصف سے کچھ کم حصہ دیا تھا وہ کہاں گیا؟

3۔ قدس (بیت المقدس) کو کیا بڑا خطرہ درپیش ہے؟

6.4 فلسطین کی تاریخ

قدیم تاریخ میں فلسطین ملک شام کا ایک صوبہ تھا۔ موجودہ زمانے میں وہ شام کے جنوب میں واقع ہے اور عالم عربی کے ایشیائی اور افریقی دونوں حلقوں کو ملاتا ہے۔ اس کے شمال میں لبنان اور سیریا، جنوب میں مصر کا سیناء اور خلیج عقبہ پڑتے ہیں۔ مشرق میں اس کی سرحد اردن سے ملتی ہے۔ اور مغربی سمت میں بحر متوسط نے اس کو گھیر رکھا ہے۔ طول و عرض میں فلسطین کا رقبہ تقریباً 10,162 میل ہے۔ جس میں نصف سے زائد پر آج اسرائیل قائم ہے۔ اس کے شمالی حصہ کو رفح کہتے ہیں جو مصر سے ملتا ہے۔ دریائے اردن شمال سے جنوب کی سمت بہتا ہے۔ آبی علاقوں میں طبریہ کا تالاب اور بحر مردار خاص ہیں۔

فلسطین کی قدیم تاریخ: سامی عرب یہاں حضرت مسیح کی پیدائش سے کوئی چھ ہزار سال پہلے سے پائے جاتے ہیں۔اس کے بعد کنعانی عرب 3ق م میں آباد ہوئے۔اسی وجہ سے اس کوارض کنعان بھی کہتے تھے۔یہ سرزمین مختلف قوموں کی یورش وتاخت کا نشانہ بنتی رہی۔چنانچہ عموری، کنعانی، یبوسی اور جرجاشی عرب اور عمالقہ یہاں سن 3000ق م سے 2500ق م کے مابین آتے رہے۔اس کے بعد فرعونوں، فرزی ،اور رفائی قوموں نے اس پر تاخت کی۔آشوری، بابلی، ایرانی اور یونانی اقتدار بھی یہاں قائم ہوا۔1800ق م میں یہاں حتی قوم قابض ہوئی ۔اس کے بعد حوریون، پلستیوں نے 199ق م میں اس پر حملہ کیا۔بنی اسرائیل کا تعلق اس سے 120ق م میں ہوا،اس کے بعد ان کا کوئی تعلق اس سرزمین سے نہیں رہا۔پھر 63ق م اس پر رومیوں نے یلغار کی اور اس کے بعد 539ء سے لیکر 636ء تک بازنطینی اس پر قابض رہے جو اس کو عیسائی سلطنت کے ماتحت لے آئے۔636ء مطابق 150 ہجری میں عرب مسلمانوں نے اس کو فتح کیا اور خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ نے یہاں کا سفر کیا اور بیت المقدس کے باشندوں کو وہ معاہدہ لکھ کر دیا جس کو المعاہدۃ العمریہ کہا جاتا ہے۔اسی وقت سے یہاں اسلامی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

القدس: (یروشلم) جس کو اردو میں بیت المقدس کہتے ہیں،فلسطین کا سب سے بڑا سب سے اہم اور تاریخی شہر ہے۔مسلمانوں کی تیسری مقدس مسجد،مسجد اقصی اسی میں واقع ہے۔یہ شہر تینوں آسمانی مذاہب اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے نزدیک مقدس ہے،آج کل اسرائیل کا اس پر قبضہ ہے۔فلسطین کا دوسرا بڑا اور تاریخی شہر الخلیل یا حبرون ہے جہاں سے ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تھا۔الخلیل میں ہی ابراہیم، اسحاق اور ہاجرہ علیہم السلام کی قبریں ہیں۔تیسرا بڑا شہر غزہ ہے، جو آج کل حماس کا مستقر اور اسرائیل کے خلاف فلسطینی مزاحمت کا بڑا مرکز ہے۔اس کے بعد عکہ بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔یہ شہر فلسطین پر صلیبیوں اور فرانسیسیوں کے حملے روکنے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔نابلس میں اسلامی تاریخ کی کئی علمی شخصیات ہوئی ہیں۔رملہ کو اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے بنوایا تھا،فلسطینی اتھارٹی کا ہیڈ کوارٹر یہیں ہے۔ان کے علاوہ بیت لحم، جنین اور تلکرم وغیرہ بھی مشہور شہر ہیں۔

فلسطین ارض انبیا: فلسطین کو بجا طور پر نبیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔حضرت ابراہیم واسحاق علیہما السلام نے مل کر یہاں مسجد اقصی کی تعمیر کی۔حضرت موسی کی ارض موعود بھی یہیں سرزمین تھی۔داؤد اور سلیمان نے جو عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی اس کا مرکز بھی یہی سرزمین تھی۔حضرت سلیمان نے مسجد اقصی کو دوبارہ تعمیر کیا اس کو یہودی ہیکل سلیمانی بولتے ہیں۔حضرت عیسیٰ کا مرکز دعوت بھی یہی علاقہ رہا۔ان کی یاد میں یہاں عیسائیوں کے دو بڑے گرجے کنیسۃ القیامۃ اور بیت لحم ہیں ۔ان کے علاوہ اس خطہ کی تاریخ میں ایوب ، ذوالکفل ،داؤد، زکریا، یحیٰ علیہم السلام کے نام بھی آتے ہیں۔نبی اکرم ﷺ کے سفر اسراء ومعراج کی پہلی منزل بھی مسجد اقصی تھی جہاں آپ ﷺ نے نبیوں کی امامت کی تھی۔مشہور روایت کے مطابق ہجرت مدینہ کے بعد مسلمانوں نے کئی ماہ تک مسجد اقصی کو قبلہ بھی بنایا۔کئی جلیل القدر صحابہ ؓ مثلاً حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اسی کی خاک میں آسودہ ہیں۔اسلامی تاریخ میں فلسطین ارض شہدا بھی رہا اور اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز بھی ۔یہاں علمی وتصنیفی سرگرمیاں جاری رہیں۔بیت المقدس، رملہ ، نابلس ،عسقلان وغیرہ بڑے مردم خیز شہر رہے ہیں۔غزہ میں امام شافعی پیدا ہوئے ،عسقلان کی خاک سے مشہور محدث حافظ ابن حجر عسقلانی اٹھے، حنبلی فقیہ ابن قدامہ المقدسی النابلسی بھی نابلس کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد المقدسی کا تعلق بھی بیت المقدس سے رہا۔احمد بن حسن الرملی، محمد بن احمد السفارینی، فاتح اندلس موسی

بن نصیراور مشہور تابعی رجاء بن حیوۃ کندی اور عربی نثر نگار عبدالحمید الکاتب وغیرہ یہ سب فلسطین کے مشاہیر میں سے ہیں۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد سے فلسطین خلافت بنوامیہ اور پھر خلافت بنوعباس کے عہد عروج یعنی ساڑھے چار سو سال تک اسلامی قلمرو کا حصہ رہا۔ یہاں کی تہذیب عربی تہذیب ہوگئی۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر خلافت عباسیہ کا عروج جاتا رہا اور خلفا محض دعا گو بن کررہ گئے۔ اصل اقتدار کبھی اہل فارس، کبھی ترک غلاموں اور کبھی آل بویہ کے ہاتھ میں آتا رہا۔ مصر و شام دونوں عباسیوں کے اقتدار سے نکل گئے اور یہاں فاطمی خلافت قائم ہوگئی۔ صوبوں کے مسلم حکمرانوں اور مختلف اقالیم کے والیوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ تب سنی سلجوقی خاندان نے عروج پایا اور اس خاندان کے دو اولوالعزم حکمرانوں الپ ارسلان اور ملک شاہ نے خلافت عباسیہ کی مدافعت کی اور بیرونی خطرات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور مختلف داخلی سازشی تحریکوں کی بیخ کنی کی۔ مشرقی یوروپ سے مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والے آرتھوڈکس عیسائیت کے طوفان کو روکا۔ مگر ان دونوں حکمرانوں کے بعد سلجوقی حکومت کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ مسلمانوں کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر عیسائی بازنطینی سلطنت اور رومن کیتھولک چرچ نے ہاتھ ملالیا اور عالم اسلام کے خلاف پہلا صلیبی حملہ (1096-99) میں ہوا۔ اس پہلے حملہ میں عیسائی پادریوں، پاپائے اعظم وغیرہ نے عیسائی امراء اور بادشاہوں کو خطوط لکھے، پادریوں نے یوروپ میں گھوم گھوم کر رضا کاروں کی فوج تیار کی اور اس طرح 1096 میں صلیبی لشکر نے سلجوقیوں پر حملہ کیا۔ ان کے پہلے حملہ کو سلجوقیوں نے شجاعت سے کام لیکر پسپا کردیا مگر اس کے بعد صلیبیوں نے مزید تیاریوں کے ساتھ ایک ٹڈی دل لشکر سے جو تین لاکھ فوجوں پر مشتمل تھا سلجوقی دارالحکومت قونیہ پر دوبارہ حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ سلجوقی کمزور بھی تھے اور منتشر بھی اور ان کو مسلم ملکوں میں سے کہیں سے کوئی مدد بھی نہیں ملی۔ اس طرح یکے بعد دیگرے شمالی شام سے لیکر انطاکیہ، اور دوسرے شہروں میں تباہی مچاتے ہوئے صلیبی فوج 1099 میں بیت المقدس پر قابض ہوگئی۔ یہاں مؤرخین کے نزدیک انہوں نے 70 ہزار مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ اور شام و فلسطین کے ایک بڑے حصہ پر ان کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ مسلمان اس دور میں اتنے کمزور تھے کہ تقریباً 30 سال تک انہوں نے صلیبی مظالم، حملوں اور دراندازیوں کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس درمیان علماء کی اصلاحی سرگرمیوں اور دعوت جہاد کے نتیجہ میں 1127 میں عراق کے شہر موصل کے والی عمادالدین زنگی صلیبیوں سے جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور ان سے حلب، حماۃ اور الرہا آزاد کروائے۔ اسی درمیان ایک باطنی نے خفیہ طریقہ پر سلطان پر حملہ کیا اور عمادالدین زنگی کو شہید کردیا۔ ادھر یوروپ میں ایک بار پھر مسلمانوں کے خلاف جنگ کا بگل بجایا گیا اور 1147 میں پوپ ایوجین سوم کی اس مہم کے نتیجہ میں جرمنی کے بادشاہ کونراڈ سوم اور فرانس کے فرمانروا لوئس ہفتم کی قیادت میں 70 صلیبی جنگ جوؤں نے دمشق پر حملہ کردیا۔

عمادالدین زنگی کے بیٹے سلطان نورالدین زنگی نے بڑی جرأت و شجاعت سے دشمن کا سامنا کیا۔ ان کی فوج کے دو شہسواروں اسدالدین شیرکوہ اور ان کے بھائی نجم الدین ایوب نے مناسب حربی تدبیروں سے پہلے دشمن کے پانی کی سپلائی لائن کاٹ دی۔ اُس کے بعد ان کو گھیرے میں لیکر حملے شروع کیے۔ اور اس طرح یہ دوسری صلیبی جنگ پوری طرح ناکام ہوگئی۔ نجم الدین ایوب کے نوجوان بیٹے صلاح الدین ایوبی اور ان کے چچا اسدالدین شیرکوہ کو مصر 1164 میں روانہ کیا گیا۔ فاطمی خلیفہ عاضد نے اپنے وزیروں اور کمانڈروں کی سازشوں سے تنگ آکر خود زنگی سے مدد مانگی تھی۔ چنانچہ کئی سال کی جدوجہد کے بعد جب بیمار خلیفہ عاضد کا 1172 میں انتقال ہوگیا تو مصر میں

دوبارہ عباسی خلیفہ کا نام خطبہ میں پڑھا گیا۔اور سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس کا نظم ونسق سنبھال لیا۔15 مئی 1174 میں سلطان نورالدین زنگی نے انتقال کیا اور ان کے بیت المقدس کو صلیبیوں کے ہاتھوں سے واپس لینے کے خواب کو صلاح الدین ایوبی نے پورا کیا۔

غازی ومجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی مشرق ومغرب دنوں میں نہایت محترم نام ہے۔مشرق میں اس کی شہرت ایک غازی ،مجاہد اور محبوب سلطان کی ہے۔تو مغرب میں Saladin ایک افسانوی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔سلطان ایوبی کئی اعتبار سے صحابی جلیل اور فاتح شام حضرت خالد بن الولیدؓ سے مشابہ ہے۔سلطان ایوبی میدان جنگ کا ماہر، جاسوسی اور سراغ رسانی کا مخترع تھا،اور کامیاب جنگی منصوبے بناتا اور چھوٹی سے چھوٹی فوج سے دشمن کی بڑی سے بڑی فوج کے دانت کھٹے کردیا کرتا تھا۔سلطان نے علماوصلحا کو اپنے ساتھ ملایا۔چھوٹی چھوٹی کمزور مسلم ریاستوں کو فتح کر کے ایک بڑی اور مضبوط ریاست بنائی۔اپنے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی اسٹریٹیجک حکمت عملی اختیار کی اور بیت المقدس کی بازیابی کے لیے کوششیں شروع کردیں۔سلطان ایوبی نے مصر پر 24 سال اور شام پر 19 سال حکومت کی مگر اس شہسوار نے پورے 16 سال میدان جنگ میں گھوڑوں کی پیٹھ پر گزار دیے۔سیاسی تدبیروں،عیسائی حکومتوں میں اپنے وسیع جاسوسی نیٹ ورک اور برق رفتار چھاپہ مار کارروائیوں کے ذریعہ ہی شام طبریہ کے پاس حطین کے میدان جنگ میں جولائی 1187 کو سلطان نے ایک چھوٹی سی فوج سے عیسائیوں کے متحدہ لشکر جرار کو زبردست شکست دی۔جس میں چار چار عیسائی حکمراں گرفتار ہوئے۔ان میں سے کرک کے شریر اور گستاخ حکمراں ارناط کو سلطان ایوبی نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا،باقیوں کو امان دی۔حطین کے بعد سلطان ایوبی نے یکے بعد دیگرے تمام شہروں کو فتح کرلیا اور 12 اکتوبر 1187 کو بیت المقدس بھی فتح کرلیا۔پورے سو سال بعد مسجد اقصی میں جمعہ کی نماز پڑھی گئی ۔ وہاں نورالدین زنگی کا بنوایا ہوا منبر نصب کیا گیا جو تاریخ میں منبر صلاح الدین ایوبی کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں القدس پر قبضہ کے لیے پورے یوروپ نے برطانیہ کے بادشاہ رچرڈ لائن ہارٹ (شیر دل) کی کمان میں 1189 میں فلسطین پر ایک اور بڑا حملہ کیا۔جو تاریخ میں تیسری صلیبی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔لاکھوں کے صلیبی لشکر نے سالوں تک عکہ شہر کا محاصرہ کیا۔اور بالآخر اس کو فتح کرلیا۔اس جنگ میں سلطان ایوبی کی آدھی فوج شہید ہوگئی تھی مگر اس نے مزاحمت کی لازوال داستان بھی رقم کی۔ یہ جنگ رچرڈ اور سلطان کے درمیان ایک صلح پر ختم ہوئی۔

اس کے بعد شام وفلسطین مملوکوں اور عثمانی ترکوں کے زیرنگیں رہے۔شام کے علاقہ عین جالوت میں مصر کے بہادر مملوک سلطان امیر قطز اور اس کے کمانڈر امیر بیبرس نے تاتاریوں کی فوج کو عبرت ناک شکست دی اور ان کا رخ موڑ دیا تھا۔1923 میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا تو عربوں کی بغاوت کے نتیجہ میں خلیج سے لیکر شام وفلسطین تک کا پورا خطہ فرانس اور برطانیہ کے انتداب میں آ گیا۔اور بالآخر یہودیوں کی قومی تحریک صہیونیت نے برطانیہ کی ملی بھگت سے فلسطین میں اپنی قومی ریاست اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار کرلی۔

معلومات کی جانچ:

1- فلسطین پر تینوں صلیبی حملے کب کب ہوئے؟

2- تینوں آسمانی مذاہب اسلام عیسائیت اور یہودیت میں القدس کی کیا اہمیت ہے؟

3- سلطان صلاح الدین ایوبی کس صحابیؓ سے مشابہت رکھتے ہیں؟

6.5 اسرائیل کا قیام

بیسویں صدی کی ابتدا میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد یہودیوں کے لیے اپنے قومی وطن کا قیام بہت آسان ہوگیا۔خلافت عثمانیہ سے عربوں کی بغاوت کی قیادت شریف حسین آف مکہ کررہا تھا۔شریف اور انگریز عہدہ دار ہنری میک میہن کے درمیان اس بابت جو مراسلت ہوئی اس کے مطابق اتحادیوں (یعنی انگریزوں) نے ترکوں کی شکست کے بعد شریف حسین کی قیادت میں ایک متحدہ عرب بادشاہت کے قیام کا وعدہ کیا تھا۔لیکن عرب لیڈروں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ اسی درمیان دو اور خفیہ معاہدے بھی ہو چکے ہیں۔ایک معاہدہ برطانیہ اور فرانس کے بیچ ہوا تھا جس کو 1916 کا sykes Picot pact کہا جاتا ہے۔اس کے مطابق عرب دنیا کے مختلف علاقوں کی برطانیہ اور فرانس کے درمیان بندر بانٹ ہونی تھی،اور جو ہوئی۔اس کے علاوہ ایک معاہدہ برطانوی وزیر خارجہ سرآرتھر جیمس بالفورڈ اور یہودی کھرب پتی روتھ شیلڈ کے درمیان ہوا۔یہ دراصل ایک خط تھا جو بالفورڈ نے روتھ شیلڈ کے نام لکھا تھا۔خط 2 نومبر 1917 میں لکھا گیا،اس میں واضح طور پر سلطنت برطانیہ کا یہ عندیہ بتایا گیا تھا کہ وہ یہودیوں کے لیے فلسطین میں ایک قومی وطن بنانے کے عہد کی پابند ہے۔جنگ عظیم اول اور معاہدہ سائکس پیکوٹ کے مطابق برطانیہ نے فلسطین پر قبضہ کرلیا،جس کو لیگ آف نیشنز (اقوام متحدہ کی پیش رو انجمن اقوام) کے ذریعہ مینڈیٹ (منظوری) دیا گیا۔بظاہر اس مینڈیٹ کا مقصد یہ بتایا گیا کہ سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے آزاد ہوئے ممالک کو ترقی کرنے میں مدد دی جائے گی۔لیکن اصل میں ہوا کیا ایک مصنف اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وعدہ بلفور کے مطابق برطانیہ نے اپنی نگرانی میں پوری دنیا بطور خاص یورپ سے یہودیوں کو لاکر فلسطین میں بسانا شروع کیا۔اس وقت کی بعض مردم شماریاں بتاتی ہیں کہ 1922 میں اس شہر (یروشلم) کی آبادی جہاں 52000 تھی وہ 1948 میں بڑھ کر 165000 ہوگئی۔برطانیہ کی سربراہی میں یہودیوں کی اس بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے کو مسلمان دیکھ رہے تھے۔جو کسی سیلاب کی طرح ان کے گھروں میں گھس رہا تھا......اور اس کے بعد برطانیہ نے یہودیوں کے لیے نئی کالونیاں بنا کر ان کی آبادی کا منظم اور مستقل انتظام کیا۔ساتھ ہی برطانیہ نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کو نہتا کرنا شروع کیا،ان سے ہر طرح کے ہتھیار چھینے،وہیں اس نے یہودیوں کو ہتھیار سپلائی جاری رکھا اور انہیں پوری طرح مسلح کیا۔(ابوتراب ندوی،انقلاب شام،صفحہ 109)۔ایک اور مؤرخ نے لکھا کہ ''پہلے یہودی صرف 55 ہزار دونم (ایکڑ کے مشابہ ایک پیمانہ) زمین کے مالک تھے،1936 میں وہ نو لاکھ دونم زمین کے مالک ہوگئے'' (ثروت صولت،ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ سوم،صفحہ 378) اور یوں صرف'' 1931 تک 29 فیصد عرب اپنی زمینوں سے محروم ہو چکے تھے اور 1936 تک یہودیوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی''۔(ایضا) جبکہ چند سال پہلے تک وہ صرف چند ہزار تھے۔

یوں برطانوی حکومت کے زیر سایہ یہودیوں کو یورپ سے لا لا کر کثیر تعداد میں فلسطین میں آباد کردیا گیا۔ان کو مسلح کر کے ان کی پوزیشن بھی پوری طرح محفوظ کردی گئی۔اتنا ہی نہیں 1938 میں خود برطانوی حکومت نے باقاعدہ فلسطین کی تقسیم کی تجویز بھی پیش کردی۔اس تجویز کے تحت فلسطین کے تین حصے کیے جانے تھے،ساحل کے زرخیز خطہ پر مشتمل نصف سے کچھ زاید حصہ یہودیوں کو دیا جانا تھا،دوسرا حصہ جو صحرائے نجب پر مشتمل تھا وہ عربوں کو ملنا تھا اور بیت المقدس اور گردونواح کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جانا تھا۔29 نومبر 1947 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تقسیم فلسطین کی یہ تجویز منظور کرلی۔جنرل اسمبلی میں اس قرارداد کے حق میں دوتہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔جو

یہودیوں کے اثر ونفوذ کی مظہر ہے اور اس عالمی فورم میں عربوں کی کلی ناکامی کو بتاتا ہے۔تاہم عربوں نے اس تجویز کو کلی طور پر مسترد کر دیا۔معاملہ کے ایک فریق کے کلی طور پر اس تجویز سے متفق نہ ہونے کی صورت میں اقوام متحدہ کو اس تجویز پر نظر ثانی کرنی چاہیے تھی مگر چونکہ سب کام دھاندلی سے ہو رہے تھے اس لیے ایسا نہیں ہوا۔برطانیہ نے ہوشیاری سے اس مسئلہ سے پلہ جھاڑ لیا اور اپنی فوجوں کا انخلا فلسطین سے شروع کر دیا۔ساتھ ہی عربوں اور یہودیوں میں تصادم شروع ہو گئے۔مگر عرب کمزور تھے جبکہ یہودی زبردست طاقت حاصل کر چکے تھے۔ 15-14 مئی 1948 کی شب کو بارہ بجے برطانوی انتداب ختم ہو گیا۔عرب مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔اسی رات یہودیوں نے اپنی نئی ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا۔تل ابیب کو صدر مقام قرار دیا۔فوری طور پر اسرائیل ڈیفینس فورس کی تشکیل کی گئی۔امریکہ اور روس نے چند منٹوں کے اندر اس کو تسلیم کر لیا۔

فلسطینی پناہ گزین:

جب اسرائیل کا قیام ہوا تو اس کی حدود میں 5 لاکھ یہودی اور 5 لاکھ چھ ہزار عرب تھے۔مگر عربوں کا جبری انخلاء اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ وہ چند سال میں چند ہزار تک سمٹ گئے۔آج بھی چار ملین فلسطینی ہم سایہ عرب ممالک میں پناہ گزیں ہیں۔ان رفیوجیوں کی تین تین نسلیں انہیں کیمپوں میں گزر گئیں۔آج اسرائیل ان کی وطن واپسی سے بھی انکار کرتا ہے۔اور اقوام متحدہ ان کے حق میں اپنی دسیوں قراردادوں کے باوجود کچھ نہیں کر پاتا۔

معلومات کی جانچ

1- یہودی اسرائیل کے قیام میں کیوں کامیاب ہو سکے؟

2- فلسطینی عرب اپنے وطن کو بچانے میں کامیاب کیوں نہ ہو سکے؟

3- قیام اسرائیل میں اقوام متحدہ اور برطانیہ کے رول کا جائزہ لیجیے۔

6.6 عرب اسرائیل جنگیں

پہلی عرب اسرائیل جنگ 1948: چونکہ عربوں نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور نہیں کی تھی یعنی اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا تھا۔اس لیے یہودیوں کو غاصب تصور کرتے ہوئے اور عربوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے تین عرب ملکوں مصر، عراق اور اردن کی فوجیں 15 مئی کی صبح ہی فلسطین میں داخل ہونا شروع ہو گئیں۔تاہم ان میں سے مصر اور عراق معاہدہ کے تحت برطانیہ سے اسلحہ لیتے تھے جبکہ اردن کے عرب لیجن کی تنخواہ بھی برطانیہ ادا کرتا تھا۔بعد میں خلیج عرب نیز مراکش سے بھی ایک دستہ اس متحدہ فوج میں آ شامل ہوا۔اور شام ولبنان بھی شریک ہوئے۔مگر اس عرب فوج کی کوئی متحدہ کمان نہ تھی، اس کے اہداف بھی متعین نہ تھے۔سارے عرب حکمراں الگ الگ مقاصد رکھتے تھے۔اس لیے اس فوج کو اسرائیلی فوج کے مقابلہ میں کوئی خاص کامیابی نہ ملی۔جنگ کا عملاً نتیجہ صرف یہ نکلا کہ اردن کے عرب لیجن نے، جس کا کمانڈر ایک انگریز گلوب پاشا تھا، وسطی فلسطین (مغربی اردن) اور بیت المقدس کو اسرائیل کے قبضہ میں جانے سے بچا لیا۔اور مصری فوج نے

غزہ اوراس کے اطراف پر قبضہ کرلیا۔یوں فلسطینیوں کی جس علاقہ پرحکومت بنی چاہیے تھی وہ مصراوراردن کے درمیان بنٹ گیا۔11 جون 1948 میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی مداخلت پر طرفین نے جنگ بندکردی ۔جدیدعربی لٹریچر میں اس جنگ کونکبہ (بڑی مصیبت) کہاجاتا ہے۔

دوسری جنگ:اسرائیل کے مقاصد میں گریٹر اسرائیل کا قیام تھا جس کی سرحدیں نیل سے فرات تک (یعنی مصر،شام عراق کے علاوہ حجاز تک) وسیع تھیں ۔اسرائیل کا قیام ہوتے ہی یہودیوں نے بڑے پیمانہ پرعربوں کا جبری انخلاء شروع کردیا۔عربوں کی بستیاں برباد کردی گئیں ۔ان کی زمینیں چھین لی گئیں،فصلیں تلف کی گئیں۔اورعرب کسانوں اوردیہاتیوں کا قتل عام شروع کیا گیا۔فلسطینی لاکھوں کی تعداد میں اسرائیل سے (جس کووہ 48 کا مقبوضہ کہتے ہیں) اردن،شام ومصراور لبنان میں پناہ گزیں ہوگئے۔امریکہ،فرانس اور برطانیہ اسرائیل کوفوجی واقتصادی مدددے کر مضبوط بناتے رہے۔اس دوران مصر میں صدر جمال عبدالناصر نے اقتدار پر قبضہ کرلیا،ان کا میلان روس کی جانب تھا۔انہوں نے نہرسوئز کوقومیانے کا اعلان کردیا جوعالمی بحری تجارت کی بڑی گزرگاہ ہے۔اور یہ نہرفرانس وبرطانیہ کی ایک مشترکہ کمپنی کی ملکیت تھی ۔اس لیے مصر کے اس اقدام سے بوکھلا کرفرانس اور برطانیہ دونوں نے مداخلت کی۔ 1956 میں پورٹ سعید میں اپنی فوجیں اتاردیں۔اسرائیل بھی موقع کی تلاش میں تھا،اس نے 29 اکتوبر کومصر پرحملہ کردیا اورایک ہفتہ کے اندراندرپورے جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کرلیا جوتقریباً 42 ہزار مربع میل پر مشتمل ہے۔تاہم روس اورکئی دوسرے مغربی ممالک کے شدید دباؤ کے پیش نظران تینوں جارح ممالک کواپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ملی۔فرانس اور برطانیہ نے اپنے فوجی واپس بلالیے اوراسرائیل نے بھی سینا خالی کردیا۔اقوام متحدہ نے ایک سوستر میل لمبی سرحدتک اپنی ہنگامی فوج مصراوراسرائیل کے درمیان تعینات کردی۔

تیسری عرب اسرائیل جنگ: 1956 کے بعدروس نے مصرکووسیع پیمانہ پرفوجی امدادفراہم کی ۔صدرناصراوران سے بھی زیادہ سیریا کے وزیردفاع نصیری حافظ الاسد نے اسرائیل کونیل میں اوربحرروم میں ڈبودینے کے بلندبانگ دعوے شروع کردیے۔اسرائیل اورمصر کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔صدرناصر کے مطالبہ پر 19 مئی 1967 کواقوام متحدہ نے اپنی ہنگامی فوج بھی واپس بلالی۔مصری فوج نے شرم الشیخ کی بلندیوں پر قبضہ کرلیا۔آبنائے طیران کے راستہ اسرائیل کے بحری جہازوں کی آمدورفت بندکردی۔شام اوراردن نے بھی مصر کا ساتھ دینے کا اعلان کردیا۔عراق نے جنگی طیاروں کے ساتھ تعاون کیا۔سیریا اورمصر اسرائیل کے خلاف زبان بازیوں اور لفاظیوں میں مصروف تھے کہ اسرائیل نے مصر کی ان حرکتوں کا بہانہ بنا کرنہایت خاموشی کے ساتھ اپنی پوری فضائی قوت کا استعمال کرتے ہوئے مصر کے ایربیس پر کھڑے ہوئے اس کے 420 جنگی طیارے تباہ کردیے،یہ جنگی طیارے اڑان بھی نہ بھرسکے۔مصرکواس کی خبربھی نہ ہوئی اوراس کی کمرپوری طرح ٹوٹ گئی۔اس کے بعددوسرے عرب ممالک میدان میں کودے اور ہزاروں عرب رضا کاراس ہاری ہوئی جنگ میں شامل ہوئے۔

اگروقت رہتے اردن کی درخواست پرعمل کرتے ہوئے مصر سے لوٹ رہے اسرائیل کے فائٹرطیاروں پرحملہ کیا جاتا توان کی تباہی یقینی تھی ۔اسی طرح اسرائیلی ایربیس کوبھی تباہ کیا جاسکتا تھا۔مگرمتحدہ عرب فوج اپنا جوابی آپریشن وقت پرشروع نہیں کرپائی۔نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر کی فضائیہ برباد ہوئی بلکہ سینا پربھی اسرائیل کا قبضہ ہوگیا اورجولان کا وسیع پہاڑی سلسلہ جودنیا کے چندمضبوط ترین قدرتی قلعوں میں شمار ہوتا ہے اورجونا قابل تسخیر مانا جاتا تھا،صرف 48 گھنٹے میں اسرائیل نے اس پربھی قبضہ کرلیا۔کیونکہ سیریا جنگ شروع ہونے

کے پورے 22 گھنٹے بعد اس جنگ میں شامل ہوا تھا۔ اور شامل بھی اس طرح ہوا کہ بجائے اسرائیل فوج پر حملہ کرنے کے اسرائیل کی تین خالی اور سنسان پڑی کالونیوں پر بمباری شروع کر دی۔ جب اُس کی فوج اس طرح وقت ضائع کر رہی تھی اس بیچ میں اسرائیل فوج گولان میں داخل ہوگئی۔ 1967 کی اس جنگ میں اسرائیل بیت المقدس، مغربی کنارہ، سینا اور گولان سب پر قابض ہوگیا۔ یہ چھ روزہ جنگ عرب ادبیات میں نکستہ (صدمہ) کے نام سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ مسلمانوں اور عربوں کی تاریخ میں ایک عظیم سانحہ بن گئی اور اس کے صدمہ سے عرب آج تک نہیں نکل پائے۔ جبکہ اسرائیل ایک نا قابل تسخیر قوت بن گیا۔

چوتھی عرب اسرائیل جنگ: مصر میں صدر جمال عبدالناصر کے انتقال کے بعد انور سادات صدر بنائے گئے۔ جنہوں نے اسرائیل کو یہ پیش کش کی کہ اگر اسرائیلی نہر سوئز کے مشرقی ساحل سے واپس ہو جائیں تو نہر سوئز کھول دی جائے۔ جدید دور میں مصر کی معیشت کے لیے نہر سوئز کی اہمیت بنیادی ہے۔ جو 1967 سے بند پڑی ہوئی تھی۔ لیکن انور سادات صلح کے ساتھ جو مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے اس میں ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ کوئی اور چارہ نہ پا کر مصری فوج نے نہر سوئز کو پار کر کے اسرائیلی فوج پر حملہ کر دیا اور اس کو اپنے مشرقی ساحل سے بے دخل کر دیا۔ اسرائیلی فوج نے جوابی حملہ میں مصر کے کچھ علاقہ پر قبضہ کر لیا مگر اس کے بعد 24 اکتوبر کو جنگ بندی ہوگئی اور مذاکرات کی میز پر مصر کو بڑی کامیابی ملی کہ 1975 میں ایک معاہدہ کے تحت اسرائیل کو سینا کا ڈھائی ہزار مربع میل کا علاقہ چھوڑنا پڑا۔ جس میں شرم الشیخ، تیل کے کنویں اور مطلا اور گدی کے درے شامل تھے۔ اس طرح مصر نے 27 سال بعد جزوی طور پر اسرائیل کے مقابلہ میں ایسی کامیابی حاصل کی جس نے 1967 کی شرمناک شکست کی جزوی طور پر تلافی کر دی۔ اس لیے مصر میں 6 اکتوبر کو قومی دن منایا جاتا ہے۔ اس سے قبل 23 جولائی 1952 کو منایا جاتا تھا۔ یہ دن وہ تھا جب فوجی انقلاب نے شاہ فاروق کا تختہ پلٹ کر انقلابی حکومت تشکیل دی تھی۔

امن مذاکرات: عرب فریق مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لیے برابر کوشاں رہا۔ اس سلسلہ میں جنگوں کے علاوہ مذاکرات کا بھی سہارا لیا گیا چنانچہ یہ امن مذاکرات کبھی فلسطینیوں اور اسرائیل کے درمیان کسی تیسرے فریق مثلاً امریکہ، اقوام متحدہ یا مصر کی ثالثی میں ہوئے اور کبھی براہ راست اسرائیل اور فلسطینیوں کے مابین ہوئے۔ کبھی مصر و اسرائیل کے بیچ تو کبھی پی ایل او اور امریکہ کے درمیان۔ پہلے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ 1978 میں مصر و اسرائیل کے درمیان مذاکرات ہوئے تو دوسرے کیمپ ڈیوڈ میں یروشلم کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ 12 مئی 1949 میں لوزان معاہدہ ہوا جس میں اسرائیل یروشلم کو عالمی علاقہ قرار دینے پر راضی ہو گیا تھا۔ 30 اکتوبر 1991 میں امریکہ کی ثالثی میں میڈرڈ میں اسی مسئلہ پر امن کانفرنس ہوئی اور پھر 13 ستمبر 1993 کو بالآخر فلسطین و اسرائیل کے درمیان اوسلو ایکارڈ (معاہدہ) ہوا۔ جس کا ایجنڈا ابھی تک شرمندہ تکمیل ہے۔ کیونکہ اس بنیادی معاہدہ کی رو سے دس سال کے اندر فلسطینی ریاست کا قیام ہو جانا تھا جو نہیں ہوا اور اس کی ساری ذمہ داری یک طرفہ طور پر اسرائیل کی ہے۔ کیونکہ وہ عرب زمینوں پر ناجائز یہودی بستیاں تعمیر کرتا چلا جا رہا ہے۔ مذاکرات اس کے بعد بھی وقفہ وقفہ سے ہوتے رہے کبھی معطل ہوئے مگر ہنوز مسئلہ کے حتمی حل کی جانب کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ دراصل اپنے طویل مدتی مقاصد کے حصول، دنیا میں اپنی شبیہ بہتر بنانے اور عرب مارکیٹ کو Capture کرنے کے لیے اسرائیل نے فلسطینیوں کے ساتھ امن مذاکرات کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی نیت درست نہ تھی وہ جانتا تھا کہ مذاکرات یوں ہی بے نتیجہ لمبی مدت تک چلتے رہیں گے وہ اپنے مقاصد حاصل کرتا رہے گا۔ بے خانماں فلسطینی کچھ مل جانے کی چاہت میں امن کے سراب کے پیچھے بھاگتے رہیں گے، دوسرے اس سے فلسطینیوں کی صفوں میں (جواب تک تقریباً

متحد تھے) انتشار پھیلے گا اور واقعتاً ایسا ہی ہوا۔

معلومات کی جانچ

1- عرب اسرائیل جنگیں کتنی ہو چکیں ہیں؟

2- متحدہ عرب فوجوں کے اسرائیل سے شکست کھا جانے کے اسباب کیا تھے؟

3- امن مذاکرات کامیاب کیوں نہیں ہو سکے؟

6.7 انتفاضہ (پہلا، دوسرا)

انتفاضہ عربی زبان میں اٹھنے، پر پھڑ پھڑانے اور بیدار ہونے کو کہتے ہیں۔ اسرائیل کے خلاف فلسطینی عوام کی عام تحریکوں کو انتفاضہ کہا جاتا ہے۔ ابھی تک دو انتفاضے برپا ہو چکے ہیں۔ جن میں سے پہلے کو ثورۃ المساجد یا انتفاضہ اولی کہتے ہیں اور دوسرے کو انتفاضۃ الاقصی۔

پہلا انتفاضہ: اس وقت شروع ہوا جب اسرائیلی غلبہ و تسلط کو پورے 40 سال ہو گئے۔ عرب حکومتیں اور پی ایل او اراضی مقدسہ کو اور 1967 کے مقبوضہ علاقوں کو اسرائیل سے واپس لینے میں ناکام رہے۔ امریکہ اور عرب حکومتوں کو یقین ہو گیا کہ اب فلسطین کی آزادی کی تحریک دم توڑ جائے گی۔ اچانک مسجدوں سے اسرائیلی فوجیوں پر پتھر پھینکتے ہوئے فلسطینی بچے نمودار ہوئے، ان کی زبانوں پر تکبیر کے نعرے، ہاتھوں میں پتھر اور آنکھوں میں بجلی کے شرارے تھے۔ 8 دسمبر 1987 کو غزہ سے انتفاضہ کا پہلا شرارہ پھوٹا اور جلد ہی مغربی کنارہ تک پھیل گیا۔ 1948 کے بعد اب پہلی بار اس احتجاجی تحریک کی رہنمائی پوری طرح اسلام پسندوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہیں سے حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ (حماس) کا آغاز ہوا جس کی قیادت ایک نحیف و نزار بوڑھا احمد یسین (شہادت 22 مارچ 2004) کر رہا تھا۔

دوسرا انتفاضہ: اُس وقت شروع ہوا جب اسرائیلی وزیر داخلہ ایریل شیرون ستمبر 2000 میں جوتوں سمیت اپنے فوجی دستہ کے ساتھ مسجد اقصی میں گھس آیا۔ اقصی کے محافظوں نے شیرون اور اس کے ساتھ شدت پسند مذہبی یہودیوں کو روکا تو اسرائیلی پولیس نے ان پر گولیاں چلا دیں۔ پولیس کی اس فائرنگ میں ایک چھوٹا فلسطینی بچہ محمد الدرۃ بھی شہید ہو گیا۔ اس اسرائیلی جارحیت کے نتیجہ میں قدس کا انقلاب جلد ہی پورے فلسطین میں پھیل گیا، فلسطینی نوجوانوں اور اسرائیلی آرمی کے درمیان وسیع پیمانہ پر جھڑپیں ہوئیں۔ اس انتفاضہ کو انتفاضۃ الاقصی کہا جاتا ہے۔

6.8 فلسطین کی آزادی کے لیے سرگرم تنظیمیں

1- پی ایل او: فلسطین میں ہم سایہ عرب ملکوں کی مکمل ناکامی کے بعد فلسطین کے لوگوں میں ان حکومتوں کی طرف سے مایوسی پیدا ہو گئی اور یہ احساس شدت سے ابھرا کہ ہمیں عرب ملکوں پر انحصار کے بجائے خود اپنے حقوق کی لڑائی لڑنی چاہیے۔ چنانچہ 1948 کے پورے سولہ سال

بعد القدس میں فلسطینی مسلمانوں کی ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس میں تنظیم آزادی فلسطین کی تشکیل کا خیال سامنے آیا۔ جو تمام فلسطینیوں کی نمائندگی کرے۔ اس میں یہ تجویز بھی پاس کی گئی کہ ہر صحت مند فلسطینی کے لیے فوجی تربیت ضروری ہوگی۔ 2 جون 1964 میں اس تنظیم کے باقاعدہ قیام کا اعلان کیا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ فلسطینیوں کے منظم فوجی دستے تشکیل دیے جائیں گے۔ بہت جلد یہ تنظیم ساڑھے چوالیس لاکھ فلسطینیوں کی امیدوں کا مرکز بن گئی۔ یہ ایک umbrela body تھی جس کے نام کا مخفف پی ایل او تھا اور دنیا میں اس کی شہرت اسی نام سے ہوئی۔ یاسر عرفات اس کے چیرمین تھے۔ الفتح اس تنظیم کا سب سے سرگرم حصہ تھا۔ جو جہادی سرگرمیوں میں یقین رکھتا تھا۔ الفتح کے چھاپہ مار گروپ العاصفۃ نے اسرائیل کے خلاف کامیاب گوریلا آپریشن کیے۔ الفتح میں مذہبی نوجوانوں کی اکثریت تھی۔ 1960 میں یاسر عرفات نے اپنے اردن کے ٹھکانوں سے اسرائیل کے خلاف گوریلا کارروائیاں شروع کیں۔ معرکۃ الکرامہ جس میں جس کل 300 فلسطینی نوجوانوں نے بہت بڑی اسرائیلی آرمی کے دانت کھٹے کر دیے تھے، اس کو دنیا بھر میں مشہور کر دیا۔ فتح گروپ کے زیادہ تر وابستگان اسلامی جذبہ جہاد و حریت سے سرشار تھے۔ یہ جان ہتھیلی پر رکھے پھرتے اور دین و وطن کے سلسلہ میں کسی طرح کی قربانیوں میں کوئی دریغ نہ کرتے تھے۔ اردن کے گاؤں الکرامہ میں (جیسا کہ اوپر گزرا) یاسر عرفات چند سو جانبازوں کے ساتھ ہزاروں اسرائیلی فوجوں کے سامنے ڈٹے رہے اور ان کو پسپا کر دیا تھا۔ بعد میں جب اور بھی کئی فلسطینی تحریکات آزادی، تنظیم آزادی فلسطین کی متحدہ چھتری تلے آگئیں تو الفتح گروپ پی ایل او کے عسکری بازو کے بطور معروف ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ پوری تنظیم آزادی فلسطین پر الفتح گروپ کے اثرات بہت زیادہ پڑے ہیں۔ بسا اوقات دونوں ایک دوسرے کے مترادف سمجھے جانے لگے۔

مگر عرب ملکوں کی داخلی سیاست اور اختلافات کے باعث پہلے اردن سے پھر لبنان سے بھی پی ایل او کو اپنے ہیڈ کوارٹر منتقل کرنے پڑے۔ اسی درمیان بیروت کے آس پاس صبرا و شاتیلہ کیمپوں میں فلسطینی پناہ گزینوں کا عیسائی و شیعہ ملیشیاؤں اور اسرائیلی فوج نے قتل عام کیا۔ 1974 میں پی ایل او کو عرب لیگ کا بھی رکن بنا لیا گیا۔

یاسر عرفات کی سربراہی میں پی ایل او نے جہدوجہد آزادی کا لمبا سفر طے کیا۔ اس تنظیم کی ابتدا جہادی اور سرفروشانہ کارروائیوں کے ساتھ ہوئی تھی اور عرب اور مسلم دنیا میں چیرمین یاسر عرفات سب سے مقبول رہنما تھے۔ فلسطینی کمیٹی کا ممبر ہونا اعزاز کی بات سمجھی جاتی۔ بعد میں یاسر عرفات نے زیادہ pragmatic رخ اپنالیا۔ 14 دسمبر 1988 میں امریکہ اور پی ایل او میں مذاکرات کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں 13 ستمبر 1993 کو اسرائیل فلسطین اعلامیہ جاری ہوا اور اوسلو معاہدہ عمل میں آیا۔ اس معاہدہ کی رو سے پی ایل او نے اسرائیل کا وجود تسلیم کر لیا۔ اپنے منشور سے اسرائیل کو مٹا دینے والی شق خارج کر دی۔ اپنا مطمح نظر 1967 کی مقبوضہ فلسطینی اراضی کی بازیابی اور اس پر ایک آزاد و جمہوری سیکولر فلسطینی ریاست کا قیام بنالیا۔

اس معاہدہ کی رو سے دس سال کے اندر فلسطینی ریاست کا قیام ہو جانا تھا مگر اسرائیل کی یک طرفہ خلاف ورزی کی وجہ سے ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔ اور مکمل آزاد فلسطینی ریاست ہنوز ایک خواب ہے۔ البتہ 15 نومبر 1988 کو فلسطینی اتھارٹی یا مقتدرہ قائم ہوئی جس کے تحت مغربی کنارہ و غزہ کی پٹی اور رام اللہ جیسے شہروں پر مشتمل علاقہ دیدیا گیا۔ جس میں انتخابات ہوتے ہیں، سربراہ اتھارٹی کو صدر کہا جاتا ہے۔ وزیر اعظم کا عہدہ بھی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ابھی یہ مقتدرہ مکمل ریاست کے درجہ سے بہت دور ہے۔ اس کے پاس بنیادی انفرا اسٹرکچر بھی

نہیں ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ اسرائیل غزہ پر بار بار حملے کرتا رہتا ہے اور اپنی جارحانہ کاروائیوں سے وہاں تباہی پھیلاتا رہتا ہے۔خود فلسطینیوں کی صفوں میں انتشار ہے اور غزہ کی پٹی حماس کے زیر کنٹرول ہے تو مغربی کنارہ پر الفتح حکمراں ہے۔دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں مگر ابھی دونوں کا کوئی متحدہ ومشترکہ محاذ نہیں بن سکا ہے۔

حماس: جیسا کہ آپ نے اس سے قبل بھی پڑھا کہ 8 دسمبر 1987 کو غزہ میں مساجد سے انتفاضہ شروع ہوا جو بہت جلد پورے فلسطین میں پھیل گیا۔اسی کے بطن سے حماس (تحریک اسلامی مزاحمت) نے جنم لیا۔یہ انتفاضہ 1994 تک چلتا رہا تھا۔اس میں بنیادی کردار معذور مجاہد شیخ احمد یٰسین اور سابق خطیب مسجد اقصیٰ شیخ احمد صیام نے ادا کیا۔اس میں فلسطینی بچے اسرائیلی توپوں اور ٹینکوں کا مقابلہ پتھروں اور غلیلوں سے کررہے تھے۔اس لیے ان کو جیل الحجارہ (پتھروں کی نسل) سے تعبیر کیا گیا۔15 دسمبر 1987 کو حماس نے پہلا بیان جاری کیا۔حماس دستوری طور پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی اور سارے فلسطین کی بازیابی کا ہدف رکھتی ہے۔شیخ احمد یاسین کی شہادت کے بعد اب حماس کے سینئر قائد الاستاد خالد مشعل ہیں، جن کو اسرائیل کے ایجنٹوں نے دمشق میں زہر دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچ گئے۔اب وہ قطر میں مقیم ہیں۔حماس الاخوان المسلمون کی فکر سے ہم آہنگ ہے۔فلسطینی اتھارٹی کے قائم ہوجانے کے بعد اُس نے جمہوری جدوجہد بھی کی اور انتخاب میں حصہ لیا جس میں الفتح کے مقابلہ میں حماس کو واضح طور پر کامیابی حاصل ہوئی اور اتھارٹی کے علاقوں پر اس نے حکومت بنائی ۔جس کے رہنما اسماعیل ہنیہ تھے۔مگر امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے اور اسرائیل نے حماس کی اس جیت کو تسلیم نہیں کیا اور ایک سال بعد ہی الفتح کے ذریعہ بغاوت ہوگئی۔

الجہاد الاسلامی: شیخ عبداللہ نمر درویش نے ایک جہادی تنظیم اسرۃ الجہاد قائم کی تھی۔نمر درویش کے بعد اس کی قیادت دو متحرک وباصلاحیت شخصیتوں ڈاکٹر فتحی شقاقی اور شیخ عبدالعزیز العودہ کے ہاتھ میں آگئی۔انہوں نے اس کا نام الجہاد الاسلامی کردیا۔یہ دونوں لوگ بھی پہلے اخوان المسلمون سے وابستہ تھے بعد میں کچھ اختلافات کی وجہ سے اس سے الگ ہوگئے۔الجہاد الاسلامی مسئلہ فلسطین کو ایک مقامی یا عربی مسئلہ سمجھنے کی بجائے اُسے اسلامی مسئلہ سمجھتی ہے۔وہ جہادی سرگرمیوں کے ساتھ ہی سیاسی حکمت عملی اختیار کرنے پر بھی یقین رکھتی ہے۔الفتح اور الجہاد الاسلامی میں گہرے روابط تھے اور یاسر عرفات سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ان کے علاوہ اور بھی تقریباً ایک درجن تنظیمیں فلسطینیوں کی ہیں۔بعض کمیونزم کی طرف مائل ہیں بعض مسیحی ہیں اور بعض دوسرے عرب ملکوں شام ومصر وغیرہ کی آلہ کار ہیں۔

تین اہم شخصیات: آزادی فلسطین کی تحریکات کی بات مکمل نہ ہوگی جب تک فلسطین کی تین اہم شخصیات کا تعارف نہیں کرایا جاتا۔یہ شخصیات ہیں: مفتی امین الحسینی، یاسر عرفات اور شیخ احمد یاسین۔

مفتی امین الحسینی

امین الحسینی 1897 میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے۔وہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ازہر مصر چلے گئے۔انہوں نے فوجی تعلیم بھی حاصل کی۔اور جنگ عظیم اول میں ترکی فوج میں شامل رہے۔انہوں نے فلسطین پر منڈلا رہے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے مسلم ممالک کا دورہ کیا اور ان کی کوششوں سے 1931 میں بیت المقدس میں مسلمانوں کی پہلی بین الاقوامی مؤتمر ہوئی جس میں برصغیر سے اقبالؒ اور مولانا شوکت علی نے شرکت کی۔1936 میں فلسطین کے مسلمانوں کی تحریک مزاحمت کی قیادت بھی

مفتی صاحب ہی نے کی ۔ یہ انقلاب چھ مہینہ تک جاری رہا۔ بعدازاں برطانیہ نے ان کے فلسطین میں داخلہ پر پابندی لگادی ۔ وہ مختلف ملکوں میں رہے ۔ جنگ عظیم دوم میں انہوں نے جرمنی سے تعاون کیا، جرمنی کی شکست کے بعد فرانس نے ان کو گرفتار کرلیا۔ لیکن وہ اس کی جیل سے فرار ہوگئے اور مصر پہنچ گئے جہاں شاہ فاروق نے ان کا زبردست استقبال کیا۔ 1947 میں انہوں نے جیش الجہاد کی تشکیل کی ۔ اسرائیل کے قیام کے بعد مفتی صاحب کا موقف یہ تھا کہ عرب ممالک اس جنگ میں خود نہ کودیں بلکہ وہ فلسطینیوں کی فوج تشکیل دے کر اس کی مدد کریں اور اس کے ذریعہ فلسطین کو آزاد کرایا جائے ۔ جنگ میں عربوں کی ناکامی کے بعد بھی مفتی صاحب نے عالمی سطح پر اس مسئلہ کو زندہ رکھا اور بار بار اسلامی کانفرنسیں بلائیں ۔ 1959 وہ قاہرہ میں رہے ۔ اُس کے بعد جمال عبدالناصر کے رویہ سے دل برداشتہ ہوکر وہ بیروت چلے گئے جہاں چار جولائی 1974 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

یاسرعرفات

فلسطین کی آزادی کا خواب دل میں لیے پچاس برسوں سے غاصب اسرائیل کے خلاف برسرپیکار جانباز فلسطینی رہنما اور فلسطینی اتھارٹی کے صدر، امن کے سپاہی یاسرعرفات کی وفات مشرق وسطیٰ کی تاریخ میں ایک دور کا خاتمہ ہے۔ امن کا یہ سپاہی زندگی بھر لڑتا رہا اور چودہ روز پیرس کے ملٹری پرسی اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر دس اور گیارہ نومبر 2004ء کی رات میں دنیا کو خیر باد کہہ گیا۔ 4 اگست 1929ء کو یاسرعرفات کی پیدائش ہوئی ۔ ان کی ماں فلسطینی تھیں اور باپ ایک بڑے عرب تاجر تھے جن کا قیام قاہرہ میں رہتا تھا۔ ان کا تعلق بیت المقدس کے مشہور حسینی خانوادہ سے تھا۔ اور پورا نام تھا محمد یاسر عبدالرؤف قدوہ الحسینی، ان کی کنیت ابوعمار تھی، لیکن دنیا بھر میں یاسرعرفات کے نام سے مشہور ہوئے ۔ چار سال کی عمر میں والدہ کے انتقال کے بعد ان کی بڑی بہن نے پرورش کے فرائض نبھائے ۔ ابتدائی تعلیم وتربیت غزہ میں ہوئی اس کے بعد دوسرے ساتھیوں کی طرح یاسر بھی تعلیم کی تکمیل کے لیے مصر چلے گئے ۔ وہاں انہوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور فوجی ٹریننگ بھی لی۔ چند ماہ مصری فوج میں بھی ایک عہدہ پر رہے۔ تعلیم کے دوران ہی فلسطین کی آزادی کے لیے فلسطینی طلبہ میں شعور وتحریک پیدا کرنے کے لیے فلسطینی گریجویٹ ایسوسی ایشن کی تاسیس کی جس کے رابطہ میں ہزاروں فلسطینی طلبہ آگئے ۔ حتیٰ کہ دوسری عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر جب مصر نے سوئز کنال بند کردیا اور اس کے جواب میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل تینوں سامراجی قوتوں نے عربوں پر متحدہ یلغار کردی تو عرب فوجوں کے شانہ بشانہ مجاہدین میں اخوان المسلمون اور دوسری تنظیموں کے ساتھ یاسرعرفات کے ساتھیوں نے بھی رضا کارانہ حصہ لیا تھا۔ انجینئرنگ کی تکمیل کے بعد انہوں نے کچھ دنوں تک کویت میں ملازمت بھی کی، لیکن اسرائیل کی بڑھتی جارحیت، امریکہ اور دوسری عالمی قوتوں کی طرف سے اس کی بھرپور حمایت، اقوام متحدہ کی بے انصافی، عالمی رائے عامہ کی بے حسی، مسلمانان عالم کی بے بسی اور عربوں کے باہمی انتشار اور عرب قیادتوں کی غداریوں کے باعث جلد ہی انہیں میدان میں نکلنا پڑا۔

یاسرعرفات اور ان کے ساتھیوں صلاح خلف خلیل الوزیر (ابو جہاد) اور دوسروں نے مل کر گوریلا گروپ تشکیل دیے اور اسرائیل کے خلاف چھاپہ مار کارروائیاں شروع کردیں۔ ان کارروائیوں کے دوران ان کا مستقر کبھی مصر ہوتا، کبھی شام اور کبھی مغربی اردن، گوریلا کارروائیوں کی کامیابی کے باعث ان لوگوں کی شہرت تمام فلسطین اور عرب ملکوں میں پھیل گئی۔ تمام متحرک بیدار اور پرجوش نوجوان ان کے گرد جمع ہونے لگے جنہوں نے مل کر الفتح گروپ تشکیل دیا۔ فلسطینی کاز کی طرف متوجہ کرنے اور دنیا کو معاملہ کی اصل نوعیت سے آگاہ کرنے

کے لیے عرفات نے Our Palestine کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ الجزائر، جو اس وقت خود بھی فرانسیسی سامراج سے نبرد آزما تھا اور حریت پسند قوتیں وہاں بھی جہاد کر رہی تھیں، نے ان سے تعاون کیا۔ چنانچہ الجیریا میں 1965ء میں پی ایل او کا دفتر کھولا گیا۔

یاسر عرفات اور عرب حکمرانوں میں تصادم بھی ہوا۔ مصر نے ان کا ناطقہ بند کیا۔ اردن کی فوج نے فلسطینی پناہ گزین کیمپوں پر حملہ کیا اور پی ایل او کے دفاتر تباہ کر دیے۔ کالے ستمبر کے اس تصادم کے بعد جس میں ہزاروں فلسطینی مارے گئے وہ لبنان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لبنان میں ان پر مسلح عیسائی ملیشیاؤں نے حملے کیے جن کا تعاون اسرائیل نے بھی کیا۔ اس وقت یاسر عرفات کو تنظیم کا باضابطہ سربراہ اعلیٰ منتخب کر لیا گیا تھا۔ 1978ء میں اسرائیل نے لبنان پر ایک بڑا حملہ کیا۔ امریکہ نے ثالثی کر کے پی ایل او اور دیگر فلسطینی تنظیموں کو لبنان سے انخلا اور دوسرے عرب ملکوں میں پناہ گزیں ہو جانے پر رضامند کر لیا۔ اس سمجھوتہ میں یہ ضمانت دی گئی تھی کہ لبنان میں موجود فلسطینی پناہ گزینوں کی حفاظت کی جائے گی لیکن پی ایل او کے وہاں سے ہٹتے ہی اسرائیلی فوج اور اس کی حمایت یافتہ لبنانی عیسائی ملیشیا نے صبرا و شاتیلہ کیمپوں میں بے رحمی سے ہزاروں فلسطینیوں کو شہید کر دیا۔ بعد میں شواہد نے ثابت کر دیا کہ سابق اسرائیلی وزیر اعظم ایریل شیرون (جو اس وقت وزیر دفاع تھا) نے ہی صبرا و شاتیلہ کے قتل عام کی پلاننگ کی تھی۔

یاسر عرفات اور ان کے ساتھیوں نے دنیا کے سامنے صحیح صورت حال رکھنے، اسرائیل کی بہیمانہ کارروائیوں سے واقف کرانے اور عالمی رائے عامہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی انتھک جدوجہد کی۔ اس صورت حال نے یاسر عرفات کو مثالیت پسندی سے مایوس کر کے عملیت پسند بنا دیا اور انہوں نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ پی ایل او کے منشور سے اسرائیل کے وجود کو تباہ کر دینے والی دفعات نکال دیں اور تاریخی فلسطین سے اپنا دعویٰ ساقط کر کے صرف 1967 کے ماقبل کے علاقہ تک اپنا مطالبہ محدود کر لیا۔ نومبر 1988ء میں فلسطینی قومی شوریٰ نے فلسطین کو ایک جلا وطن آزاد ریاست اور بیت المقدس کو اس کی راجدھانی بنانے کی قرارداد پاس کی۔ اپریل 1989ء میں فلسطینی مرکزی کونسل نے عرفات کو اس مجوزہ ریاست کا صدر منتخب کر لیا۔ اس کے بعد امریکہ اور دوسری طاقتوں نے یاسر عرفات کو رام کرنے کی کوششیں کیں۔ اسرائیلی اور فلسطینیوں میں ملاقاتیں کروائی گئیں۔ 1991ء میں میڈرڈ میں اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے مابین امن پر بات چیت شروع ہوئی اور مختلف مراحل اور ضمنی گفتگوؤں کے بعد 1993ء میں ناروے میں مذاکرات ہوئے جنہیں خفیہ رکھا گیا اور نتیجہ میں اوسلو معاہدہ پر فریقین نے دستخط کر دیے۔ اسی سال 1993 میں عرفات کو اسرائیلی وزیر اعظم یتزاک رابن کے ساتھ امن نوبل انعام بھی دیا گیا۔

شیخ احمد یاسین: شیخ احمد یاسین 1938 میں غزہ شہر کے جنوب میں جورہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ سیدہ سعدہ نے ان کی پرورش کی۔ 1948 کے المیہ کے بعد وہ مخیم الشاطی میں پناہ گزیں ہوئے۔ یہیں تعلیم شروع ہوئی۔ 1958 تک انہوں نے ثانوی تک تعلیم مکمل کر لی تھی۔ یہیں وہ اخوان المسلمون کے طلبائی پروگراموں میں شامل ہونے لگے۔ جسمانی ورزش کے ایک پروگرام میں احمد یاسین سر کے بل گر پڑے جس سے گردن کی ہڈیاں منتشر ہو گئیں اور پورا جسم فالج سے متاثر ہو گیا۔ پھر بھی کسی طرح وہ قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ گرچہ بگڑی ہوئی صحت کے پیش نظر مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ شیخ احمد یاسین UNRAWA کے ایک اسکول میں ماسٹر ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے طلبہ میں اور مساجد کے درسوں میں روح جہاد پھونکنی شروع کر دی۔ ارض فلسطین کو آزاد کرنے کا جوش و ولولہ نوجوانوں میں جگایا۔ انہیں کی قیادت میں پہلا اور دوسرا انتفاضہ شروع ہوا۔ تحریک حماس

وجود میں آئی۔ بالآخر 22 مارچ 2004 کو جب شیخ احمد یاسین غزہ کی ایک مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہے تھے کہ اسرائیل نے ان کی وھیل چیئر پر تین میزائیل داغے اور وہ موقع پر ہی اپنے ایک بیٹے کے ساتھ شہید ہو گئے۔

معلومات کی جانچ:

1- کتنے انتفاضے اب تک ہو چکے ہیں؟

2- فلسطین کی آزادی کی رہنما شخصیات کون کون ہیں؟

3- فلسطین کی آزادی کے لیے سرگرم اہم تنظیموں کے نام بتایئے۔

6.9 خلاصہ

اب تک آپ نے اس اکائی میں جو کچھ پڑھا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ 6 دہائیوں سے عالم عرب میں خاص کر اور مسلم دنیا میں عام طور پر جس مسئلہ پر سب سے زیادہ لکھا گیا ہے وہ بلا شبہ مسئلہ فلسطین ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ مغربی دنیا خصوصاً برطانیہ واقوام متحدہ کا پیدا کردہ ہے۔ برطانیہ نے بنیادی طور پر اس مسئلہ کو پیدا کیا۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے نصف سے زیادہ حصہ یہودیوں کو دیدیا جنھوں نے اس پر اسرائیل کی مملکت قائم کر دی۔ اور بتدریج باقی فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا۔ فلسطین پر قبضہ کرنے اور اسرائیل کے قیام میں سب سے اہم رول یہودیوں کی قومی تحریک صہیونیت نے ادا کیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں بمقام باسل 29 اگست 1897 میں تمام یہودی دماغ ایک جگہ جمع ہوئے تھے اور انہوں نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا۔ صہیونیت کے معمار اول ڈاکٹر ہرٹزل نے اپنی کتاب Jewish state لکھی اور ریاست اسرائیل کے خدوخال اس میں پیش کیے۔ پہلے پہل یہودیوں نے لیبیا، وادی برقہ ، یوگانڈا، لائبریا اور ارجنٹائنا کا بھی جائزہ لیا اور وہاں یہودی ریاست کے قیام کے امکانات کو تلاش کیا گیا۔ لیکن کافی غور وخوض کے بعد انہوں نے فلسطین کی سرزمین کو اس کے لیے منتخب کیا۔

اس کے بعد فلسطین کی واپسی کا نعرہ ایجاد کیا گیا۔ عالمی ذرائع ابلاغ میں جرمنی میں اپنی مظلومیت کے نام پر رائے عام کو اپنے حق میں ہموار کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے بعد انہوں نے فلسطین میں اپنی مجوزہ ریاست کا پروپیگنڈہ کیا۔ فلسطین کو یہودی مذہبی طور پر ارض موعود سمجھتے تھے اور ہزاروں سال سے یروشلم جا کر دیوار گریہ کے سامنے رونا اور اپنی آبائی سرزمین کی واپسی کے لیے دعا کرنا یہودی عبادت کا حصہ تھا۔ فلسطین اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا۔ سلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ تھے، ترکی یورپ کا مرد بیمار بن چکا تھا۔ خلافت سخت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ہرٹزل سالوں تک عثمانی خلیفہ کو رام کرنے کی کوششیں کرتا رہا اور اپنے مقاصد کے لیے فلسطین کی سودے بازی پر اُسے راضی کرنا چاہا۔ لیکن غیور خلیفہ نے فلسطین کی بالشت بھر زمین بھی ان کو دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد خلافت عثمانیہ کا سقوط بھی صہیونی ایجنڈا کا حصہ بن گیا جس کے لیے ترکی کے دونمہ یہودیوں نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔

ترکوں سے مایوس ہوکر یہودی زعمانے دولت برطانیہ کا رخ کیا۔ برطانیہ اس وقت کی سب سے بڑی طاقت تھا، عالم اسلام کے بیشتر حصوں اور ملکوں پر اس کا قبضہ تھا۔ فلسطین بھی اس کے انتداب mandate کے تحت تھا۔اس کے علاوہ کئی کلیدی عہدوں پر یہودی وہاں فائز تھے مثال کے طور پر برطانوی وزیرخارجہ سرجمیس آرتھر بالفور ایک یہودی تھا۔اس کے علاوہ اور بھی کئی یہودی کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔چنانچہ 2 نومبر 1917 برطانوی وزیرخارجہ بالفور نے فلسطین میں یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن بنانے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد ترکی میں انقلاب آ گیا، ترک قوم پرستوں نے خلافت کو ختم کر دیا۔اتحادی قوتوں نے عرب ممالک کے حصے بخرے کر کے ان کو آپس بانٹ لیا۔ فلسطین میں دولت مند یہودیوں نے نہایت مہنگے داموں عرب کسانوں سے ان کی زمینیں خریدنی شروع کر دیں۔دنیا کے مختلف ممالک سے یہودیوں کے ریلے کے ریلے فلسطین آنے لگے۔انہوں نے اپنی آبادیوں اور قلعوں کی حفاظت کے لیے نجی فوجیں بنالیں۔وہ یہودی فوجی جو اتحادیوں کے ساتھ مختلف محاذوں پر لڑتے رہے تھے وہ بھی فلسطین پہنچنے لگے۔ فلسطینی عربوں کی کوئی ایسی مرکزی قیادت نہ تھی۔مفتی امین الحسینی کی کوششوں سے فلسطینی عرب اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھے۔ان کی تحریک مزاحمت کی قیادت مفتی امین الحسینی کر رہے تھے۔

یہ مزاحمت 1936 سے شروع ہوئی۔اور کئی سال تک جاری رہی۔1943 میں عرب مزاحمت پھر شروع ہوئی۔یہ مزاحمت 1946 تک جاری رہی۔اس دوران یہودیوں نے خود برطانوی حکام کو بھی نشانہ بنایا۔جس کا بہانہ لے کر انگریزوں نے مسئلہ اقوام متحدہ کے حوالہ کر دیا۔اور اس پر دباؤ ڈالا کہ ان کے فلسطین سے رخصت ہونے سے پہلے ہی مسئلہ کو حل کر دیا جائے۔اقوام متحدہ میں فلسطین کی نمائندگی کے لیے کوئی نہ تھا عرب لیڈر اپنے ہی مقامی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔اپنے مختلف کمیشنوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر اور مغربی ملکوں کے اشارہ پر بالآخر اقوام متحدہ نے 29 نومبر 1947 میں تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ایک حصہ جو 5339 مربع میل پر مشتمل تھا یہودیوں کو دیا گیا جس پر انہوں نے اسرائیل کے نام سے اپنی ریاست قائم کر لی۔جس نے مئی 1948 میں ہاگاناہ اور دوسری مسلح تنظیموں اور فوجوں کو باقاعدہ اسرائیلی ڈیفینس فورس IDF میں تبدیل کر دیا۔ایک سال بعد مئی 1949 میں اس کو اقوام متحدہ کا رکن بھی بنالیا گیا۔دوسری طرف فلسطینیوں کو ساڑھے چار ہزار مربع میل پر مشتمل جو علاقہ ملا اس پر فوراً ایک آزاد فلسطینی ریاست قائم کرنے کے بجائے اس کے ایک حصہ کو اردن نے اپنے ساتھ ملالیا اور دوسرے حصہ کو مصر نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ فلسطینی قیادت مختلف ملکوں میں منتشر کر دی گئی۔امریکہ اور روس دونوں نے چند منٹوں کے اندر ہی اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔لیکن عرب ملکوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔تیسرے حصہ کو یعنی بیت المقدس اور گردونواح کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا جانا تھا، جس پر کچھ دن اسرائیل نے قبضہ کر لیا اور آج بھی اسی کا قبضہ ہے۔اقوام متحدہ نے اس پر آج تک کوئی ایکشن نہیں لیا۔

پھر اسرائیل اور عرب ملکوں کے درمیان چار جنگیں 1948، 56، 67 اور 73 میں ہوئیں۔جن میں اسرائیل کو زبردست فتح ملی اور وہ پہلے سے کئی گنا طاقت ور بھی ہو گیا اور بچے کچھے فلسطین پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔اس کے بعد پی ایل او، الفتح، حماس اور دوسری فلسطینی تنظیمیں وجود میں آئیں اور انہوں نے آزادی کی لڑائی لڑنی شروع کر دی۔یاسر عرفات اور شیخ احمد یاسین اور دوسروں نے قربانیاں دیں۔بڑی جدوجہد کے بعد فلسطینیوں کو نیم آزاد اور چھوٹی سی ریاست فلسطینی مقتدرہ کی شکل میں غازہ پٹی اور مغربی کنارہ پر مشتمل بنائی گئی ہے۔جس کو ابھی

باضابطہ خود مختار اور آزاد ریاست کا درجہ ملنا باقی ہے۔ بیت المقدس اور خاص کر شہر کا مشرقی حصہ اس مسئلہ کا اہم جزء ہے۔ فلسطینی اُسے اپنی ریاست کا دارالحکومت بنانا چاہتے ہیں۔ جبکہ اسرائیل پورے یروشلم کو اپنی ابدی راجدھانی قرار دیتا ہے۔ موجودہ صورت حال میں اسرائیل نے بیت المقدس کا نقشہ مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ آج قدیم یروشلم کی جگہ ایک مکمل طور جدید یہودی شہر وجود میں آ گیا ہے۔ قدیم اسلامی آثار و علائم مٹا دیے گئے ہیں ،عرب آبادی بہت گھٹ گئی ہے اور عربی محلے اجاڑ دیے گئے ہیں۔ پورے شہر کو یہودیا یا جا رہا ہے۔ فلسطینیوں کو اوسلو معاہدے کی رو سے ایک الگ آزاد ریاست ابھی تک نہیں ملی۔ ان کی ایک اتھارٹی ضرور قائم ہو گئی ہے۔ جس کے تحت مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی آتے ہیں۔ ان دونوں علاقوں میں ہی اس وقت فلسطینیوں کی کثیف آبادی ہے۔ اور ان میں سے غزہ پر اسرائیل کئی بار کیونکہ غزہ حماس کا گڑھ ہے جو اسرائیل سے مزاحمت جاری رکھے ہوئے ہے۔ مغربی کنارہ میں فلسطینی اتھارٹی رملہ شہر میں قائم ہے ، جو اسرائیل کو تسلیم کر چکی ہے اور اس کے ساتھ مذاکرات کی کوشش کر رہی ہے۔

6.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1- فلسطین میں اسرائیل کو بنانے میں برطانیہ اور اقوام متحدہ کا بنیادی رول ہے، وضاحت کریں۔

2- فلسطینی عرب اور دوسرے عرب ممالک فلسطین کی حفاظت کیوں نہ کر سکے؟

3- فلسطین کی قدیم اور اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں۔

حسب ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں دیں۔

1- پی ایل او اور یاسر عرفات کے کردار سے بحث کیجئے۔

2- حماس کی ابتداء کیسے ہوئی، بانی کون تھے اور خاص محرکات کیا تھے؟

3- القدس مسلمانان عالم کا مسئلہ ہے؟ وضاحت کیجئے

6.11 فرہنگ اصطلاحات

صہیونیت	یروشلم کے ایک ٹیلہ صہیون کی طرف منسوب یہودیوں کی قومی تحریک
ارض موعود	وہ زمین جس کا وعدہ کیا گیا ہو
انتداب	mandate منظوری
ہیکل سلیمانی	مسجد اقصی کی تعمیر جو حضرت سلیمان نے کی تھی، اسی کو یہودی ہیکل سلیمانی کہتے ہیں
جلیل القدر	بڑا اہم، محترم بزرگ
اولوالعزم	اونچی ہمت والا، حوصلہ والا بہت بڑا
مردم خیز	جہاں بڑے لوگ پیدا ہوئے ہوں

بیخ کنی	جڑ کاٹنا اکھاڑنا
پارہ پارہ ہونا	ختم ہو جانا منتشر ہو جانا
ٹڈی دل	بہت بڑا، بہت زیادہ
بگل بجانا	نقارہ بجانا اعلان کر دینا
بازیابی	دوبارہ حاصل کرنا
مسترد کرنا	انکار کر دینا
اہداف	نشانے
انخلاء	نکلنا چھوڑنا
عرب لیجن	عرب لشکر فوج
ائیر بیس	ہوائی اڈا
آپریشن	کارروائی
ناقابل تسخیر	جس کو فتح نہ کیا جا سکے، جیتا نہ جا سکے
گولان یا جولان	شام کا وہ پہاڑی سلسلہ جس کی محل وقوع کی وجہ سے بڑی اہمیت ہے۔
انتفاضہ	اٹھنا پر پھڑ پھڑانا، فلسطینی عوامی شورش
ثورۃ المساجد	مسجدوں سے اٹھا انقلاب
تسلط	قبضہ و استیلا
العاصفہ	طوفان خیز، الفتح کا چھاپہ مار دستہ
گوریلا کارروائی	چھاپہ ماری
ملیشیا	نجی یا غیر سرکاری مسلح ٹولی، فوج
مطمح نظر	مقصد
جیش الجہاد	جہاد کے لیے تیار کردہ فوج
دل برداشتہ	رنجیدہ و مایوس
مخیم الشاطی	پناہ گزیں کیمپ کا نام
مالہ و ماعلیہ	مسئلہ سے متعلقہ سبھی مثبت و منفی پہلو
ماقبی	باقی بچا ہوا
لشکر جرار	بہت بڑا لشکر
ثالثی	بیچ بچاؤ، درمیانی آدمی کا کردار ادا کرنا
اتحادی	جدید تاریخ میں اتحادی فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے بشمول ان مغربی قوتوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے محوری

طاقتوں یعنی جرمنی اور اٹلی اور ان کے حلیفوں کے خلاف جنگ عظیم دوم لڑی۔ اس جنگ میں اتحادی جیتے تھے اور محوری قوتوں کو شکست ہوئی تھی ،ترکی بھی محوری قوتوں کے ساتھ تھا۔

6.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- Tanya Reinhart Israel/Palestine left word

2- Zafarul-Islami Khan,Palestine Ducuments

3- ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ سوم مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی

4- القدس قضیۃ کل مسلم، یوسف القرضاوی، مکتبۃ الاعلام العربی، اردو ترجمہ، غطریف شہباز ندوی، بیت المقدس مسلمانان عالم کا مسئلہ، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

5- مصطفی محمدطحان ،فلسطين والمؤامرة الكبرى الكويت

6- غطریف شہباز ندوی، فلسطین کا معذور مجاہد، شیخ احمد یاسین، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

7- ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی، عالم اسلام کے مشاہیر، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

8- ماہنامہ افکار ملی نئی دہلی کا فلسطین نمبر

9- سہ روزہ دعوت دہلی کا فلسطین نمبر

بلاک: 2 عالمی گاؤں

فہرست

اکائی 7 : مسلمان یوروپ میں

اکائی کے اجزاء

7.1 مقصد

اس اکائی میں ہم پہلے مختصراً یہ بتائیں گے کہ آغاز اسلام سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات کیسے رہے ہیں اور کس طرح زمانۂ وسطی میں اسلام اور یوروپ کے درمیان صلیبی جنگیں شروع ہوگئیں۔ اس کے بعد اجمالاً یہ بتائیں گے کہ کس طرح یوروپی استعماری طاقتوں نے مسلم دنیا کے بڑے حصے پر براہ راست یا بالواسطہ غلبہ حاصل کیا اور پھر کیسے اسی عہد میں مسلمان بتدریج یوروپ خصوصاً مغربی یوروپی ممالک فرانس، جرمنی، برطانیہ، اسپین اور انگلینڈ میں آباد ہونا شروع ہوئے اور آج ان کے حالات کیسے ہیں۔

7.2 تمہید

اس اکائی میں ہم یوروپ کے پانچ اہم ممالک-فرانس، جرمنی، برطانیہ، اسپین اور اٹلی میں مسلمانوں کی موجودگی اور ان کے احوال وکوائف پر روشنی ڈالیں گے۔ ہر ملک میں مسلمانوں کی آمد پر مختصراً روشنی ڈالتے ہوئے، ان کی موجودہ صورتحال کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا۔ اخیر میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ یوروپ میں مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے۔

7.3 اسلام اور یوروپ کا مختصر تعارف

اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعلقات کا آغاز اسلام کی آمد کے وقت ہی ہوگیا تھا۔ خود قرآن مجید میں کئی مقامات پر عیسائیوں کے عقائد سے بحث کی گئی ہے۔ اسلام نہ تثلیث کا قائل ہے اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ پیغمبر تھے جو یہودیوں اور دوسرے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔

جب نبیؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو مسلمانوں کا سابقہ نہ صرف یہودیوں بلکہ عیسائیوں سے بھی پڑا۔ فتح مکہ کے بعد نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں حاضر ہو کر ایک باقاعدہ رسمی معاہدہ کیا۔ جزیرہ نمائے عرب سے ملحق شام میں رومی موجود تھے جو عیسائیت کے پیروکار تھے۔ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں نبیؐ اور صحابہ کرام کو خدشہ لاحق رہتا تھا کہ کہیں نوخیز اسلامی ریاست کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے رومی مدینہ پر حملہ نہ کردیں۔ ایسے کسی بھی خطرے کی پیش بندی کے لیے نبیؐ اقدامی فیصلہ کرتے ہوئے ایک بڑی فوج لے کر تبوک گئے جہاں اگرچہ رومیوں سے لڑائی تو نہیں ہوئی لیکن اس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ مصر و شام کے عیسائی اسلام کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ سرد و گرم جنگ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں ہی شروع ہوگئی جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار میں بھی جاری رہی۔

حضرت عمرؓ کے دور میں شام اور مصر عیسائی رومی حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے زیر اقتدار آگئے اور بعد میں بازنطینی سلطنت پر وہ ضرب کاری لگی کہ وہ اس کے صدمے سے کبھی نکل نہ پائی۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے دور میں جو اسلامی سلطنت قائم ہوئی، اس میں عیسائی بڑی تعداد میں موجود تھے جنہیں اہل کتاب ہونے کا درجہ حاصل تھا جس کی وجہ سے انہیں بعض مراعات حاصل تھیں۔ یہ مراعات انہیں اس وقت بھی حاصل رہیں جب کہ دوسری جگہوں پر ان کے ہم مذہبوں سے لڑائیاں جاری تھیں۔ دراصل عیسائیوں سے جنگوں کا سلسلہ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ، بنو عباس اور عثمانی ترکوں کے دور میں بھی جاری رہا۔

گیارہویں اور بارہویں صدی میں یوروپی عیسائیوں نے جوابی حملہ کیا جسے صلیبی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان صلیبی جنگوں میں مغربی یوروپ کے شہزادوں، سورماؤں اور عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، صلیبی جنگیں بڑی خونخوار تھیں اور مغربی یوروپ کے عیسائیوں نے فتح یروشلم کے بعد ہزاروں مسلمانوں، یہاں تک کہ عیسائیوں کو بھی تہہ تیغ کردیا تھا۔

صلیبی فوجیوں کو ان کے عیسائی رہنماؤں نے کافی گمراہ کر رکھا تھا، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کے اذہان کو مسموم کردیا گیا تھا۔ لیکن سقوط یروشلم کے بعد جب ایک عیسائی حکومت قائم ہوگئی، حالات ذرا نارمل ہوئے اور عیسائیوں کا مسلمانوں سے ربط وضبط میں اضافہ ہوا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ان کے دشمن ان سے کہیں زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا بلکہ مسلمانوں کے کئی عادات واطوار کو اختیار بھی کرلیا۔

صلیبی جنگوں میں ابتداً عیسائیوں کو بڑی کامیابیاں ملیں۔ مگر کچھ عرصے بعد مسلمانوں نے اپنی بکھری ہوئی طاقت کو جمع کرنا شروع کیا اور بالآخر صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں یروشلم کو عیسائی قبضے سے آزاد کرالیا۔ کچھ اور عرصے بعد عثمانی ترکوں نے یوروپ پر پلٹ کر زبردست حملہ کیا اور یونان سمیت یوروپ کے کئی ملکوں پر قبضہ کرلیا۔ قسطنطنیہ کو پندرہویں صدی میں فتح کرنے کے بعد اس کا نام استنبول رکھ دیا۔ مشرقی یوروپ سے نکل کر ترک سینٹرل یوروپ میں بھی گھس گئے اور دوبار 'ویانا' کا محاصرہ کیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اگر اس وقت ویانا فتح ہوجاتا تو مغربی یوروپ کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھل گئے ہوتے۔ بہرحال ان فتوحات کی وجہ سے یوروپ پر عثمانی ترکوں کا دبدبہ 18 ویں اور کسی حد تک 19 ویں صدی تک قائم رہا۔

صلیبی جنگوں میں ناکامی اور یوروپ پر عثمانی ترکوں کے دبدبے کے بعد عیسائی حکمرانوں اور مذہبی رہنماؤں نے ایک طویل المدتی حکمت عملی اختیار کر کے مسلمانوں کو شکست دینا شروع کیا اور بالآخر 19 ویں اور بیسویں صدی میں عالم اسلام کے کئی ملکوں پر براہ راست یا بالواسطہ غلبہ حاصل کر کے وہاں ظالمانہ استعماری نظام قائم کیا۔ انہوں نے صرف میدان جنگ میں مسلمانوں کو شکست نہیں دی بلکہ کھلم کھلا شرعی امور میں بھی مداخلت کی اور عظیم الشان نظام شریعت کو ختم کر کے اپنے قوانین نافذ کردیے۔ دور استعمار میں اسلام اور مسلمانوں کی شکل کچھ اس طرح مسخ کی گئی کہ آج تک وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو پائی ہے۔ سچ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں جو اس وقت عام کی گئیں، وہ آج تک قائم ہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے۔

مسلمان غلامی پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ ہر جگہ، ہر ملک میں انہوں نے استعماری قبضے کے خلاف جنگ چھیڑ دی یا جدوجہد شروع کردی، یہ کوششیں بالآخر بیسویں صدی کے وسط میں کامیاب ہونا شروع ہوئیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد جن عرب علاقوں پر برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کرلیا تھا، وہ جزئی یا مکمل طور پر جنگ عظیم دوم سے پہلے ہی آزاد ہوگئے تھے اور جنگ عظیم دوم نے برطانیہ وفرانس کو کچھ اس طرح کمزور کردیا تھا کہ ان کے لیے اپنی کالونیوں کو قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ 1950 اور 1960 کے عشروں میں اکثر کالونیاں آزاد ہوگئیں۔

1960 اور 1970 کی دہائیاں مغربی یوروپ میں معاشی خوشحالی لے کر آئیں۔ برطانیہ اور فرانس کی فیکٹریاں نہ صرف ملکی ضرورتوں کو پورا کر رہی تھیں بلکہ اضافی پیداوار کے ذریعے دوسرے خصوصاً نوآزاد ملکوں کی ضروریات کی تکمیل بھی کر رہی تھیں۔ ان فیکٹریوں کو اضافی اور سستے مزدوروں/کارکنوں کی ضرورت تھی جو سابقہ کالونیوں سے حاصل کیے گئے۔ ابتداً یہ لوگ مہمان کی طرح رہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان کے خاندان بھی وہاں آکر بس گئے اور کئی دیگر مسائل کے ساتھ تعلیمی وثقافتی مسئلوں نے سر اٹھانا شروع کردیا۔ آج کئی مغربی یوروپی ممالک میں مسلمان بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جنہیں نظرانداز کرنا بہت مشکل ہے۔

معلومات کی جانچ

1- مسلمانوں کو نوآبادیاتی نظام سے آزادی کب ملنا شروع ہوئی۔

2- یوروپی ممالک نے مسلم ممالک کو اپنی کالونی بنانا کب شروع کیا۔

3- صلیبی حملوں کے جواب میں مسلمانوں نے کیا کیا۔

7.4 مسلمان فرانس میں

فرانس سے اسلام کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اسپین فتح کرنے کے بعد مسلمان جنوبی فرانس کے بعض علاقوں پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ موسیٰ بن نصیر تو فرانس فتح کرتے ہوئے پورے یوروپ کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر خلیفۂ وقت نے بوجوہ انہیں روک دیا تھا۔ ساتویں صدی سے نویں صدی تک کئی بار مسلمان فرانس میں داخل ہوئے اور بعض علاقوں رشہروں پر قبضہ بھی کر لیا مگر یہ لمبے عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ 11 ویں اور بارہویں صدی میں فرانس کے لوگوں نے صلیبی جنگوں میں بھی حصہ لیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں سے فرانس کا حربی رشتہ بہت پرانا ہے۔

لیکن یہاں ہم جدید فرانس میں مسلمانوں کی آمد و رہائش سے بحث کریں گے۔ فرانس میں آج اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازے لگائے گئے ہیں۔ اندازے اس لیے لگائے گئے ہیں کہ فرانس کی سیکولر حکومت مذہبی بنیاد پر مردم شماری نہیں کراتی۔ لیکن فرانس کا قانون نجی اداروں کو ''مذہبی مردم شماری'' سے منع نہیں کرتا۔ چنانچہ مختلف ریسرچ کرنے والے افراد اور ادارے فرانس میں مسلمانوں کی صحیح تعداد کا پتہ لگانے کے لیے مطالعات کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان مطالعات کی Methodology ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اس لیے ہر مطالعے کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ بہرحال ان سارے اندازوں سے پتہ لگتا ہے کہ فرانس میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا 5 سے 10 فیصد ہے۔ مغربی یوروپی ممالک میں فرانس میں مسلمان سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور انہیں بہت سارے مسائل کا سامنا بھی ہے۔ فرانس کے مسلمانوں کی اکثریت الجزائر، مراکش اور تیونیشیا سے آ کر آباد ہوئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ مسلمان بھی کافی تعداد میں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ کے قریب لگایا گیا ہے۔

اکتوبر 2010 میں فرانس کے دو قابل اعتنا اداروں نے اپنے مطالعوں میں یہ نتیجہ نکالا تھا کہ مسلمان فرانس میں 21 لاکھ ہیں جن میں 70000 سے 110000 کے قریب وہ مسلمان بھی ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے یعنی مہاجر نہیں بلکہ فرانسیسی ہیں۔ ان کی عمروں کا اندازہ بھی لگایا گیا ہے یعنی وہ 18 سے 50 کے بیچ میں ہیں۔ مگر یہ شاید ان مسلمانوں کی تعداد ہے جو باعمل یعنی جنھیں Practicing Muslims کہا جاتا ہے۔ خود فرانس کی حکومت کے ایک تخمینے کے مطابق ملک میں مسلمانوں کی تعداد 5 سے 6 ملین کے درمیان ہے۔ دراصل فرانس میں مذہبی بنیاد پر مردم شماری نہیں ہوتی لیکن لوگوں کی جغرافیائی اصل کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد معلوم کرنے کا حکومت نے یہ طریقہ نکالا کہ ان سارے لوگوں کو مسلمان تسلیم کر لیا جو مسلم اکثریتی ممالک مثلاً مراکش، الجزائر اور تیونس وغیرہ سے آ کر فرانس میں آباد ہو گئے ہیں۔ حکومت نے یہ بھی معلوم کیا کہ کتنے مسلمان Practicing Muslims ہیں۔ ایسے لوگ 33% فیصد ہیں یعنی وہی لگ بھگ 21-20 لاکھ۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ یا وزارت خارجہ کے تخمینہ کے مطابق فرانس میں تقریباً دس فیصد مسلمان رہتے ہیں۔ سی آئی اے کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد 10%-5% کے درمیان ہے۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمان جنوبی فرانس میں 8 ویں صدی میں ہی پہنچ گئے تھے اور دسویں صدی تک وہاں موجود

رہے۔سولہویں صدی میں عثمانی ترکوں کی بھی موجودگی نظر آتی ہے۔اسی طرح جب 17ویں صدی کے آغاز میں اسپین سے مسلمانوں کو بالکلیہ نکالا گیا تو پچاس ہزار کے قریب مسلمان فرانس میں بھی داخل ہوئے۔وہ کہاں گئے یا ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا، اس کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

عصر جدید میں دوسرے مغربی یوروپی ممالک کی طرح مسلمان بڑی تعداد میں فرانس میں بھی1960 اور1970 کی دہائیوں میں الجزائر اور دوسرے شمالی افریقی ممالک سے آکر آباد ہوئے۔ویسے ابتدا اور پہلے ہی ہوگئی تھی۔بہت سے مسلمان جو فرانسیسی فوج میں شامل تھے اور جنگ عظیم اول میں بڑی قربانیاں دی تھیں، آکر پیرس میں آباد ہوگئے تھے۔ان لوگوں نے1922 میں پیرس کی عظیم الشان جامع مسجد کی تعمیر کی جو آج بھی آب وتاب کے ساتھ قائم ہے۔

فرانس کا سیکولرازم ہندوستان کے سیکولرازم کے برعکس مذہب مخالف ہے۔خاص طور سے جب معاملہ مسلمانوں اور اسلام کا ہو، تو فرانس کا سیکولرازم کچھ زیادہ ہی سرگرمی سے مذہب کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے۔ہندوستان کا سیکولرازم ہر مذہب کی یکساں عزت کرنا سکھاتا ہے۔اس کے برعکس فرانس کا سیکولرازم اسلام اور مسلمانوں کے معاملات میں مداخلت بیجا کا قائل نظر آتا ہے۔2002 میں اس وقت وزیر داخلہ، جو بعد میں فرانس کے صدر بھی ہوئے، نکولس سرکوزی نے فرنچ کونسل آف دی مسلم فیتھ نامی تنظیم بنانے کا آغاز کیا۔اہل فرانس نے اس کی زبردست مخالفت کی اور پریس میں اس تحریک کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ اس سے مسلم فرقہ پرستی کو فروغ ملے گا۔یہ تنظیم جس کا شارٹ فارم ہے CFCM، غیر رسمی طور پر حکومت کے ذریعے تسلیم کی گئی ہے۔اگرچہ اس کا کوئی سماجی وقانونی status نہیں ہے۔اس کے صدر بہرحال پیرس کی جامع مسجد کے امام ابوبکر ہیں جنہوں نے 2005 میں ہوئے نسلی فسادات کی بڑی سخت تنقید کی تھی۔CFCM کی اہل فرانس نے چاہے جتنی بھی تنقید کی ہو، فرانسیسی مسلمانوں پر اس کے اثرات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

فرانس میں آج بھی اچھی خاصی تعداد ان مسلمانوں کی ہے جو یہاں کام کرنے کے لیے آئے تھے۔ان کا آبائی وطن، الجزائر، تیونس یا مراکش ہے۔یہ لوگ آج بھی اپنے وطن سے محبت رکھتے ہیں اگرچہ نوکری کے دوران یا ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن جانے کے بجائے فرانس میں ہی رہنا پسند کیا۔ان میں بعضوں نے فرانس میں ہی شادیاں کرلیں لیکن اکثریت نے اپنے خاندانوں کو الجزائر وغیرہ سے یہاں بلا لیا اور ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہوکر رہ گئے۔یہ لوگ بالعموم فرانس کے شہروں کے مضافات میں رہتے ہیں یعنی اصل فرانسیسی آبادی سے علیحدہ جہاں شہری سہولیات برائے نام ہیں۔یہی وجہ ہے کہ یہ اکثر قومی دھارے سے الگ رہتے ہیں یا انہیں الگ رکھا جاتا ہے۔بہت سے ماہرین سماجیات کا ماننا ہے کہ قومی دھارے سے ان کا الگ رہنا مسائل کو جنم دیتا ہے۔2005 کے پیرس فسادات کی ایک وجہ اسے بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسلمان اصل پیرس شہر کے بجائے اس کے مضافات میں دوسرے درجے کے شہریوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن آج فرانس میں ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جو یا تو اپنے خاندانوں کے ساتھ بچپن میں یہاں آگئے تھے یا پھر یہیں پیدا ہوئے۔ان لوگوں کی پرورش وپرداخت فرانس میں ہوئی ہے۔یہیں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے اور یہ لوگ فرنچ بولتے ہیں۔ان لوگوں کو الجزائر وغیرہ سے اتنی محبت نہیں جتنی ان کے والدین کو ہے۔ان میں سے بہتوں کو اپنے مذہب اور کلچر سے لگاؤ ہے۔لیکن ایسے بھی ہیں جو بس نام کے مسلمان ہیں۔اپنے والدین کی طرح یہ لوگ بھی ثقافتی طور سے اصل فرانس سے کٹے ہوئے ہیں۔بلاشبہ ان میں سے اکثر کو آج فرانسیسی

شہریت حاصل ہے لیکن معاشی وثقافتی طور پر تو آج بھی اصل قومی دھارے کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ پہلے انہیں شہریت محض اس بنیاد پر مل جاتی تھی کہ وہ فرانس کی سرزمین پر پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اب ایک نئے قانون کے تحت بالغ ہونے پر انھیں فرانسیسی شہریت کے لیے درخواست دینی پڑتی ہے۔ فرانس کے عوام اور میڈیا بالعموم فرانسیسی مسلمانوں کو ''مغربی اصلیت'' والے شہری یا مہاجرین کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو الجزائر، مراکش یا تیونس سے آئے جنہیں عرب تاریخ نویس مغرب کا نام دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فرانس کے مسلمان قومی دھارے سے الگ کیوں ہیں۔ یہ ان کی پسند نہیں بلکہ یہ ان پر تھوپی گئی مصیبت ہے۔

فرانسیسی مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے مذہب پر عمل پیرا ہے۔ وہ نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں۔ اکثریت شراب سے پرہیز کرتی اور خنزیر کے گوشت کو حرام سمجھتی ہے۔ ملک کی سیکولر روایت کے مطابق بہت سے مسلمانوں کے لیے مذہب ایک شخصی مسئلہ ہے لیکن اسلامی اجتماعیت کا تصور بھی بتدریج اجاگر ہو رہا ہے۔

فرانسیسی مسلمان کئی مسائل سے بھی دوچار ہیں۔ تعلیم سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ فرانس سیکولر ملک ہے، اس لیے سرکاری اسکولوں میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ملک کے کیتھولک اسکولوں میں اسلامی تعلیم کا نظام مسلمان بچوں کے لیے ممکن ہے جس کا فائدہ وہاں کے مسلمان اٹھا رہے ہیں۔ یہ کیتھولک اسکول کافی سستے بھی ہیں اور ان کی فیس کم ہوتی ہے کیونکہ اکثر ان کے اساتذہ کی تنخواہیں حکومت کی طرف سے ادا کی جاتی ہیں۔ اکا دکا مسلمانوں کے اپنے اسکول بھی منظرِ عام پر آئے ہیں لیکن اب بھی ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے سیکولر یونیورسٹیوں کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں لیکن باہر سے آکر بسنے والے مسلمانوں کی تعداد ان جدید درسگاہوں میں کم ہے۔ پیرس کے آس پاس رہنے والے مسلمانوں میں بہر حال تعلیم کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ یہاں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مذہبی مسلمان کافی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

فرانس میں اگرچہ حالیہ دنوں میں بعض مسائل کو کچھ اس طرح اچھالا گیا جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید وہاں مسلمانوں اور فرانسیسیوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ لیکن صورتحال اس سے مختلف ہے۔ اکثر مسلمان خود کو فرانسیسی کہتے ہیں۔ ملک سے محبت اور وفاداری کا جذبہ رکھتے ہیں۔ قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ اہل فرانس کی اکثریت بھی مسلمانوں اور اسلام کو اپنے جدید معاشرے کے لیے خطرہ تصور نہیں کرتی۔ لیکن ایک طبقہ بہر حال ہے جو تعداد میں کم ہے مگر وہ مسلمانوں کے تئیں منفی خیالات وجذبات رکھتا ہے۔

دوسرے یوروپی ملکوں کی طرح فرانس میں بھی اسلاموفوبیا موجود ہے۔ یعنی بعض لوگ مسلمانوں اور اسلام کو منظم انداز میں خطرے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس کا منفی اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ 2010 میں ایک سروے میں پایا گیا کہ عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نوکری کے لیے ایک صلاحیت اور ڈگری رکھنے والے عیسائی اور مسلمان درخواست دیں تو امکان غالب ہے کہ نوکری عیسائی کو ملے گی۔ انتہا پسند قومیت کے علمبردار بھی گاہے بگاہے مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز کارروائیاں کرتے ہیں مثلاً ان کی عبادتگاہوں یا قبروں کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ حکومت اور ملک کے عوام کی اکثریت انتہا پسندانہ خیالات کی مذمت کرتی ہے۔

2005 میں فرانس میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔ ان فسادات میں مسلمان نوجوان آگے آگے تھے۔ ابتداً ان فسادات کو

فرانسیسی سوسائٹی کی ناکامی کے طور پر دیکھا گیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ چونکہ مسلمانوں کو وہاں کا سماج اپنا حصہ نہیں مانتا، اس لیے یہ لوگ سڑکوں پر اتر کر فساد کرنے لگے ہیں۔ لیکن اب زیادہ سنجیدہ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فسادات خود بھڑک اٹھے تھے اور ان کے پیچھے کوئی سیاسی گروہ تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی نظریہ۔ لوگ کم معاشی مواقع، کھلے امتیاز اور اپنی سیاسی و معاشی بے وزنی کی وجہ سے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ یہ انتہا پسند تھے اور نہ مجرمانہ ریکارڈ رکھنے والے لوگ اس لیے اب یہ نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ چونکہ ان مسلمانوں کی کوئی سیاسی لیڈرشپ نہیں ہے جو ان کی آواز اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا سکے، اس لیے وہ غیر منظم انداز میں سڑکوں پر کاریں وغیرہ جلانے لگے۔ بعض ماہرین سماجیات کہتے ہیں کہ جن حالات میں مسلمان رہ رہے ہیں، اگر ویسے حالات میں دوسرے لوگ رہیں تو وہ بھی سڑکوں پہ کاریں جلاتے نظر آئیں گے۔

فرانس کے مسلمانوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ حجاب کا ہے جس پر سرکار نے پابندی لگا دی ہے۔ یہ مسئلہ کافی پرانا ہے اور اس پر سیاست بھی خوب کھیلی جاتی رہی ہے۔ خود مسلمان بھی دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اچھے خاصے جو اپنے مذہب کا گہرا مطالعہ اور شعور نہیں رکھتے، حجاب کی مخالفت کرتے ہیں۔ بعض اہل قلم نے کتابیں لکھ کر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآنی آیات سے حجاب کا حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مذہب پر عمل پیرا مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن وحدیث دونوں سے حجاب کرنا ثابت ہے۔

فرانس میں حجاب کا مسئلہ تقریباً تین دہائی پرانا ہے۔ سب سے پہلے 1989 میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا مسلمان بچیاں سرکاری اسکولوں میں حجاب کا استعمال کر سکتی یا سروں پر اسکارف باندھ سکتی ہیں۔ بعض لوگوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اگر چند لڑکیوں کو اسکارف کی اجازت دی گئی تو اس سے دوسری مسلمان بچیوں پر، جو اسکارف نہیں پہنتیں، دباؤ پڑے گا۔ اسکارف کی مخالفت کرنے والوں کی تاہم اصل دلیل یہ تھی اور ہے کہ ایک سیکولر ملک میں عوامی طور پر خصوصاً سرکاری اسکولوں اور دفاتر میں مذہبی علامتوں کا استعمال غیر مطلوب ہے کیونکہ فرانس کا دستور پورے طور پر سیکولر ہے۔

جب بعض مسلمانوں نے یہ دلیل دی کہ عیسائی اور یہودی مذہبی علامتیں اسکولوں اور دفاتر میں استعمال کرتے ہیں تو حکومت نے ان کے پر بھی کترنے کی کوشش کی۔ مسئلہ اس وقت سنگین ہو گیا جب 2003 میں اس وقت کے فرانسیسی صدر جیک شیراک نے حجاب کی مخالفت کی، کیونکہ ان کے بقول یہ چرچ اور ریاست کی علیحدگی کے اصول کے خلاف ہے۔ مختلف سروے سے یہ بھی پتہ چلا کہ فرانس کے عوام کی اکثریت بھی حجاب مخالف ہے۔

صدر شیراک سے پہلے اسکول وغیرہ حجاب مخالف فیصلے لے رہے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ مسئلہ سب سے پہلے 1989 میں سامنے آیا۔ اس وقت بعض مسلمان بچیوں نے کسی اسکول میں اسکارف اتارنے سے انکار کر دیا تھا۔ اکتوبر 1989 میں ایک اسکول نے اسکارف پہننے کے جرم میں تین بچیوں کو اسکول سے خارج کر دیا۔ اسی سال نومبر میں ایک سرکاری سرکلر کے ذریعے یہ بات کہی گئی کہ اسکارف فرانس کے اسکول کی روایات کے خلاف ہے اور دسمبر 1989 میں ایک وزارتی حکمنامہ شائع ہوا جس کے مطابق اساتذہ کو خود ہر کیس کی نوعیت کے مطابق فیصلہ لینے کی آزادی دی گئی تھی۔ چنانچہ پیرس کے شمال میں واقع ایک اسکول سے 1990 میں تین بچیوں کو اسکارف پہننے کے جرم میں نکال دیا گیا۔ نکالی گئی ایک بچی کے والدین نے اساتذہ کے خلاف مقدمہ کر دیا جس کی وجہ سے ٹیچرس اسٹرائک پر چلے گئے۔ اکتوبر 1990 میں دوسرا وزارتی سرکلر شائع کر کے لوگوں سے اپیل کی گئی کہ اسکولوں اور دفاتر وغیرہ سیکولر اقدار کا احترام کریں۔

ستمبر 1994 میں حکومت نے ایک تیسرا سرکلر جاری کیا جس کے مطابق اسکولوں میں لوگ نمایاں مذہبی علامات کے ساتھ نہیں آسکتے۔ نمایاں مذہبی علامات میں حجاب، لمبی صلیب وغیرہ شامل تھیں۔ ان پابندیوں کے خلاف کچھ مسلمانوں نے احتجاج کیا اور مذہبی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد 24 لڑکیوں کو اسکارف پہننے کے جرم میں سرکاری اسکولوں سے نکال دیا گیا۔ جلد ہی نکالی گئی لڑکیوں کی تعداد 100 سے تجاوز کر گئی۔ بعضوں نے کورٹ میں مقدمے کیے اور جیت بھی گئے۔

فرانس کا حجاب پر پابندی کا مسئلہ اس وقت ایک بین الاقوامی بحران میں تبدیل ہو گیا جب عراق میں بعض لوگوں نے دو فرانسیسی صحافیوں کو یرغمال بنا کر فرانس میں حجاب پر عائد پابندی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن دونوں صحافی بعد میں بحفاظت رہا کر دیے گئے۔

2009 میں اس وقت کے فرانسیسی صدر نے پورے جسم کو ڈھکنے والے برقعے کو ظلم کی علامت قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی عائد کر دی۔ اب مسلمان عورتیں قانوناً پبلک مقامات پر برقع نہیں پہن سکتیں اور اب یہ صرف فرانس کا مسئلہ نہیں رہا۔ دوسرے یوروپی ممالک میں بھی برقعے یا حجاب و اسکارف کے خلاف آواز اٹھنے لگی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں طرف لوگوں نے انتہا پسندانہ موقف اختیار کر لیا ہے۔ سوچنا چاہیے کہ اسلام صرف برقع یا حجاب نہیں ہے۔ اس لیے حجاب پر پابندی مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کے برابر ہے لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس کی وجہ سے فرانس میں اسلام ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح حکومت فرانس اور عوام اپنی اس سوچ میں غلط ہیں کہ حجاب سے فرانسیسی سیکولرازم یا ملٹی کلچرل سوسائٹی کو خطرہ ہے۔

7.5 اسلام جرمنی میں

مغربی یوروپ کے دوسرے ممالک کی طرح جرمنی میں بھی مسلمان 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں بڑی تعداد میں آئے۔ لیکن تاریخی طور پر جرمنی میں مسلمان بہت پہلے سے موجود ہیں۔ تاریخ داں کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مسلمان جرمنی میں 18 ویں صدی میں آئے جب سلطنت عثمانیہ کے سفراء اور افسران یہاں تشریف لائے۔ بعض مسلمان سپاہیوں اور افسروں نے جرمن فوج کے ساتھ 18 ویں صدی کے آغاز میں کام بھی کیا۔ 1745 میں جرمن فوج میں باقاعدہ ایک مسلم یونٹ بھی قائم کی گئی جسے Muslim Rider کا نام دیا گیا تھا۔ اس یونٹ کے سپاہی بوسنیائی، البانوی اور تاتاری تھے۔ 1760 میں بوسنیائی مسلمانوں پر مشتمل Bosniak Corps قائم کی گئی تھی جس میں 1000 سپاہی تھے۔ چونکہ یہ کافی بڑی تعداد تھی، اسی لیے اسلامی طریقے سے ان کی تدفین کے لیے 1798 میں برلن میں ایک قبرستان بنایا گیا تھا جسے بعد میں یعنی 1866 میں کہیں اور منتقل کر دیا گیا اور وہ آج تک موجود ہے۔

ایک تخمینے کے مطابق 1932 میں جرمنی میں صرف 3000 مسلمان تھے جن میں سے تقریباً 300 جرمن نسل کے تھے۔ صحیح طور پر یہ قیاس لگایا جاتا ہے کہ جنگ عظیم دوم کے پہلے اور فوراً بعد اس تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد 1961 کے بعد بڑھنا شروع ہوئی جب جرمن حکومت نے غیر ملکیوں کو ملک میں کام کرنے کی اجازت دی۔ جرمنی میں سب سے زیادہ مسلمان ترکی سے آئے اور وہ بھی ترکی کے اناطولیہ سے۔ پاکستان اور ایران سے بھی لوگ آئے مگر ان کی تعداد کم ہے۔ بہرحال مسلمان جرمنی میں بڑی تعداد میں آج موجود ہیں۔

2011 میں حکومت نے مردم شماری کرائی تو پتہ چلا کہ 1.9% لوگوں نے خود کو مسلمان کہا یعنی تقریباً 15 لاکھ لوگوں نے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ جرمن قانون کے مطابق عین ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں نے اپنے مذہب کے بارے میں نہ بتانا مناسب سمجھا ہو۔ 2009 میں ایک مطالعے کے ذریعے اندازہ لگایا تھا کہ جرمنی میں مسلمان 43 لاکھ ہیں یعنی کل آبادی کا 5.4% جس میں سے 19 لاکھ یعنی 2.4% جرمن شہری ہیں۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا تھا کہ جرمن نسل کے مسلمان یعنی جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے، ان کی تعداد اس وقت 15000 تھی۔ اس طرح مسلمان جرمنی کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، جرمن مسلمانوں کی بڑی اکثریت یعنی 63.2% ترکی النسل ہے۔ اس کے بعد پاکستان نژاد مسلمان ہیں۔ یوگوسلاویہ، عرب ممالک، ایران اور افغانستان کے مسلمان بھی نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر مسلمان برلن اور مغربی جرمنی کے دوسرے بڑے شہروں میں رہتے ہیں۔ سابق مشرقی جرمنی کے شہروں میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ بعض مسلمان جرمنی کے دیہاتوں میں بھی قیام پذیر ہیں حالانکہ مغربی یوروپ کے کسی اور ملک میں ایسا نہیں ہے تقریباً 75% جرمن مسلمان سنی ہیں۔ شیعہ صرف 7% ہیں جو ایران سے آئے ہیں، ایک فیصد کے قریب قادیانی بھی ہیں جنہیں عام جرمن مسلمان ہی تصور کرتے ہیں حالانکہ سنی مسلمان انہیں اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ ترک نسل کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت سنی ہے۔ کچھ علوی بھی ہیں جسے شیعوں کا ایک علیحدہ مذہبی و ثقافتی گروپ کہا جاسکتا ہے۔ واضح رہے کہ خود ترکی میں علویوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

مغرب یوروپ کے دوسرے ملکوں کی طرح جرمنی میں بھی مسلمانوں کی بڑھتی آبادی سے بعض تنازعات نے جنم لیا ہے۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ ثقافتی و سیاسی تنازعات اصل میں اسلامی انتہا پسندی کا نتیجہ ہیں لیکن دوسرے ماہرین کے خیال میں یہ تنازعات کثیر مذہبی سماج کی پیداوار ہیں۔

حجاب جرمنی میں بھی ایک مسئلہ ہے۔ قانوناً اسکولوں کی مسلمان خواتین ٹیچرس کے حجاب یا اسکارف پہننے پر پابندی ہے۔ لیکن مسلمان بچیوں کے اسکارف پہننے پر پابندی نہیں ہے۔ جرمن مسلمان خواتین کو شکایت ہے کہ اسکارف پر پابندی عائد کرکے جرمن حکومت نے ان کی مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کی کوشش کی ہے جو فطری انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ حکومت کے ذریعے چلائے جارہے اسکولوں میں عیسائیت اور کسی حد تک یہودیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسلمانوں سے مذاکرات ہورہے ہیں کہ اسلام کو بھی ان اسکولوں میں پڑھایا جائے جن میں مسلم طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ لوگ ایک قابل قبول حل کی امید کرتے ہیں۔

عام جرمنوں میں اسلام یا مسلمانوں کے تئیں معاندانہ رویہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن کبھی کبھی تنازعات جنم لیتے ہیں۔ ایک دو مقامات پر مقامی لوگوں نے مسجد یا اسلامک سینٹر کی تعمیر پر اعتراض کیا ہے لیکن یہ بس ایک مقامی رجحان ہے نہ کہ ملکی۔ لیکن بعض لوگ ملکی سطح پر اسلامی بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کرنے میں ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہوا کھڑا کرنے والے سیکولر ذہن کے مبصرین بھی ہیں اور عیسائی مذہبی گروپ بھی۔ سیکولر مبصرین کا کہنا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی انسانی حقوق کے خلاف ہے جب کہ عیسائی مذہبی گروہ کہتے ہیں کہ جرمنی سیکولر ہونے کے باوجود ایک ایسا سماج ہے جو عیسائیت کی اقدار پر قائم ہے جسے اسلامی بنیاد پرستی سے خطرہ ہے۔ 2012 میں ایک سروے سے پتہ چلا کہ 72 فیصد ترک مسلمان یہ یقین رکھتے ہیں کہ صرف اسلام ہی دین حق ہے اور تقریباً 46 فیصد کی یہ خواہش ہے کہ ایک دن مسلمان جرمنی میں عیسائیوں

سے تعداد میں بڑھ جائیں گے۔ ایک اور سروے کے مطابق 2001 میں امریکہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد جرمنی میں اسلام کے تئیں لوگوں کے رویوں میں زبردست تبدیلی آئی ہے اور جرمنوں کی اکثریت یہ یقین رکھتی ہے کہ اسلام جرمن اقدار سے میل نہیں کھاتا۔ جرمنی میں انتہا پسند عیسائیوں کا بھی ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو مسلمانوں سمیت تمام ''مہاجرین'' کا مخالف ہے۔ حکومت بھی ادھر ان تنظیموں کے خلاف سرگرم ہوگئی ہے جو جرمنی سے باہر سرگرم مسلم جماعتوں کی مدد کرتے ہیں۔ جرمن حکومت خاص سے حماس کی مدد کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرتی ہے جسے اسرائیل کا غیر ضروری دباؤ مانا جارہا ہے۔

جرمنی کے مسلمان نوجوانوں میں مذہبی بیداری سے بھی جرمن سماج کو فکر لاحق ہے۔ 35 فیصد مسلم نوجوان نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ بوڑھی پیڑھی میں مذہبی رجحان کم ہے۔ ایک سروے کے مطابق 41 فیصد مسلم لڑکے اور 52 فیصد مسلم لڑکیاں یا تو کبھی کبھی یا پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح 64 فیصد مسلمان لڑکوں اور 76 فیصد مسلمان لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم ضرور دلائیں گی۔ بدقسمتی سے موجودہ جرمنی میں یہ اسلام پسندی خطرہ تصور کی جارہی ہے جب کہ جنگ عظیم دوم سے پہلے اور بعد کے زمانے میں بھی عام جرمنوں میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کسی قسم کے جذبات نہیں پائے جاتے تھے بلکہ بہت سے لوگ انہیں اپنا دوست تصور کرتے تھے۔

معلومات کی جانچ

1- فرانس میں مسئلۂ حجاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں۔

2- جرمنی کے مسلمانوں کے مسائل سے بحث کریں۔

3- جرمنی اور فرانس کے مسلمانوں کو درپیش تعلیمی مسائل سے بحث کریں۔

7.6 مسلمان برطانیہ میں

برطانیہ میں بھی مسلمان 18 ویں صدی میں آنا شروع ہوئے۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے لیے بنگال میں بڑے پیمانے پر موجود تھی بلکہ 1757 میں اس نے سراج الدولہ کو شکست دے کر اقتدار پر قبضہ بھی کرلیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے جہازوں پر کام کرنے کے لیے بہت سے بنگالیوں کا تقرر کیا جن میں مسلمان بھی تھے، یہی مسلمان سب سے پہلے برطانیہ آئے اور متوقع طور پر ساحلی شہروں میں آباد ہوئے۔ ان میں سے اکثر نے یہیں شادیاں کرلیں اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان بنگالی مسلمانوں میں سے ایک شیخ دین محمد کافی مشہور ہوئے۔ وہ ایک برطانوی جہاز کے کپتان تھے۔ انہوں نے 1810 میں سب سے پہلے انڈین ہوٹل کھولا جس کا نام ''ہندوستانی کافی ہاؤس'' تھا۔ یہ مشہور ہے کہ انگلینڈ میں شیمپو کو سب سے پہلے انہوں نے ہی متعارف کرایا۔

1889 میں Woking میں سب سے پہلی مسجد بنی جس کا نام شاہ جہاں مسجد تھا، اسی سال عبداللہ قلیم نے لیور پول میں ایک مکان کی چھت پر مسجد بنائی۔ لندن میں سب سے پہلے جو مسجد بنی وہ مسجد فضل تھی جسے 1924 میں تعمیر کیا گیا۔ عام طور سے اسے London Mosque کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2007 میں برطانیہ میں چھوٹی بڑی 1500 مساجد تھیں۔

ایک سروے کے مطابق برطانیہ میں سب سے تیزی سے لادینیت پھیل رہی ہے یعنی زیادہ تر لوگ مذہب سے بیزار ہو کر اسے چھوڑ رہے ہیں۔ مذاہب میں سب سے تیزی سے اسلام پھیل رہا ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق برطانیہ میں کل 2786635 مسلمان تھے یعنی کل آبادی کا 4.4%۔ مردم شماری سے یہ بھی پتہ چلا کہ برطانوی نسل کے مسلمانوں کی تعداد 100000 ہے یعنی 2001 کی بہ نسبت 40 ہزار زیادہ۔ ان ایک لاکھ برطانوی مسلمانوں میں 66 ہزار عورتیں تھیں۔ برطانوی مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے اور سب سے بڑا نسلی گروپ پاکستانی مسلمانوں کا ہے یعنی 38 فیصد۔

مغربی یوروپ کے دوسرے ملکوں کی طرح برطانیہ میں بھی بڑی تعداد میں مسلمان 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں آنا شروع ہوئے۔ مردم شماری کا ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ 1950 کی دہائی سے مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس میں زیادہ بڑی تعداد تارکین وطن کی ہے جو اپنے ملکوں کو چھوڑ کر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اچھی خاصی تعداد ان مسلمانوں کی بھی ہے جو برطانوی نسل کے ہیں۔ برطانیہ کے کئی شہروں میں بعض محلے ایسے ہیں جہاں مسلمان یا تو اکثریت میں ہیں یا بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ بڑے شہروں میں سب سے زیادہ مسلمان لندن میں رہتے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق شہر لندن میں کل 1012823 یعنی 12.4% مسلمان تھے۔ لندن کے مسلمانوں کی آبادی ایک طرح سے مسلم دنیا کا آئینہ نظر آتی ہے۔ تمام ہی مسلم ممالک سے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ یہاں عربوں کی خاصی تعداد ہے جو یمن، شام، عراق، لبنان، اردن اور فلسطین سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ زیادہ تر سنی عرب ہیں۔ لیکن شیعہ بھی پائے جاتے ہیں، سارے عرب مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو نسلاً تو عرب ہیں لیکن مذہباً عیسائی ہیں۔ ویسے مسلمانوں میں سب سے بڑا گروپ پاکستانی مسلمانوں کا ہے۔ میر پور خاص سے مسلمان یہاں 1930 سے آنے لگے اور خاص طور سے برمنگھم اور کارڈن میں آباد ہوئے۔ ان کے علاوہ پنجاب کے مختلف شہروں نے بھی مسلمان آئے مثلاً سیالکوٹ اور جہلم وغیرہ سے۔ سرحد اور سندھ سے بھی مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ بہت سے وہ پاکستانی مسلمان بھی ہیں جو پہلے کینیا اور یوگنڈا میں تھے اور وہاں سے یہاں برطانیہ میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔

پاکستان کے بعد دوسرے نمبر پر مسلمان بنگلہ دیش سے یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ مسلمانوں میں بنگلہ دیشیوں کی تعداد 16.8% ہے جو لندن، برمنگھم کے علاوہ دوسرے بڑے شہروں میں بھی خوب آباد ہیں۔

برطانیہ میں مساجد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ آغاز میں مسلمان گھروں میں نماز پڑھتے یا کسی فلیٹ کو مسجد میں تبدیل کر دیتے۔ مگر اب باقاعدہ مساجد بنائی جا رہی ہیں۔ مساجد بنانے میں پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمان سب سے آگے ہیں۔

پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کے بعد تیسرا بڑا گروپ یوروپی مسلمانوں کا ہے۔ یہ سفید فام مسلمان کہلاتے ہیں۔ 2001 کی مردم شماری کے مطابق یوروپی نسل کے مسلمانوں کی تعداد 179733 تھی، ان میں برطانوی نسل کے علاوہ بوسنیا، کوسووہ، چیچنیا، البانیہ، ترکی، بلغاریہ اور یونان وغیرہ سے آئے ہوئے مسلمان شامل ہیں۔

ہندوستان سے آتے ہوئے مسلمان بھی یہاں آباد ہیں اور برطانیہ کی مسلم آبادی میں 8% ہیں۔ نائیجیریا اور شمالی افریقی ممالک کے مسلمان بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح صومالیہ اور ترکی سے بھی کافی تعداد میں مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔

برطانیہ کے مسلمان بھی کافی بیدار ہیں اور ان سے بھی کہیں زیادہ ان کے بارے میں برطانوی حکومت بیدار نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی مسلمانوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا جارہا ہے۔ حکومت کو صرف یہ علم نہیں ہے کہ کتنے سنی اور کتنے شیعہ مسلمان ہیں بلکہ وہ مسلکی اختلافات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ یہ تک پتہ لگایا گیا ہے کہ کون مسجد کس ملک کے لوگوں کی ہے۔ 2010 کے ایک سروے کے مطابق برطانیہ کی 46.6% مسجدیں دیوبندیوں اور 28.2% بریلویوں کے کنٹرول میں تھیں۔ سلفیوں کے انتظام میں 5.8% مساجد تھیں جب کہ جماعت اسلامی کے کنٹرول میں 2.8% مساجد تھیں۔ شیعوں کے کنٹرول میں 4.2% مساجد ہیں۔ چند ایسی مساجد بھی ہیں جن کا انتظام ترکوں، عربوں اور صومالی باشندوں کے پاس تھا۔

برطانیہ میں شیعہ مسلمانوں کی تعداد 4 لاکھ ہے جو ایران، عراق، پاکستان، ترکی اور دوسرے ملکوں سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھنے والے شیعہ حضرات 50000 کے قریب ہیں جو کافی منظم ہیں۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برطانوی مسلمان ملکوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ حالیہ دنوں میں مسلمانوں نے برطانوی سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کیا ہے اور کئی ممبران پارلیامنٹ مسلمان ہیں۔ برطانوی مسلمانوں کی اکثریت لیبر پارٹی کو ووٹ کرتی رہی ہے لیکن ادھر چند سالوں میں قدامت پسند ٹوری پارٹی نے بھی مسلمانوں اور دوسرے نسلی گروپوں میں اثر ورسوخ بڑھانے کی کوشش کی ہے جس کا گزشتہ عام انتخابات میں انہیں کافی فائدہ بھی ہوا ہے۔

مسلمانوں کے تشخص کو لے کر برطانیہ میں بحث ہوتی رہتی ہے، 2006 میں اس ضمن میں ایک سروے کیا گیا تھا جس کے نتائج چونکا دینے والے تھے۔ اس سروے کے نتائج کا قدرے تفصیلی ذکر یہاں مناسب ہوگا۔ 81 فیصد مسلمان خود کو پہلے مسلمان (Muslim First) مانتے ہیں۔ مگر ایسا صرف برطانیہ میں نہیں ہے۔ مسلم اکثریت والے ملکوں کے مسلمان بھی خود کو پہلے مسلمان (Muslim First) مانتے ہیں۔ مثلاً 87 فیصد پاکستانی پہلے خود کو مسلمان اور بعد میں پاکستانی کہتے ہیں، برطانیہ کے 83 فیصد مسلمانوں کو اس امر پر فخر ہے کہ وہ وہاں کے شہری ہیں جب کہ عام برطانویوں میں سے صرف 79 فیصد لوگ ہی اپنے برطانوی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ تقریباً 77 فیصد مسلمان خود کو بڑی شدت سے برطانوی مانتے ہیں جب کہ عام پبلک میں ایسے لوگوں کی تعداد صرف 50 فیصد ہے 86.4 فیصد مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ وہ برطانوی سرزمین کے وفادار ہیں جب کہ عام پبلک میں سے صرف 85.9 فیصد لوگ ہی ایسا سوچتے ہیں۔ یعنی عیسائی برطانیہ کے اتنے وفادار نہیں جتنے مسلمان ہیں۔

2013 میں بھی ایک سروے کیا گیا تھا جس کے مطابق اور نسلی گروہوں کی بہ نسبت مسلمان برطانوی سماج میں گھلنے ملنے سے کتراتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ایسی مجلسوں میں شراب خوری کا جائز ہونا ہے۔ بعض سروے میں یہ بھی معلوم کیا گیا کہ کتنے مسلمان مذہبی اور کتنے غیر روایتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ واقعی دنیائے اسلام کا آئینہ ہے۔

برطانوی مسلمانوں کو بعض مسائل کا بھی سامنا ہے۔ بعض برطانوی شکایت کرتے ہیں کہ مسلمان برطانیہ کو مسلم ملک بنانا چاہتے ہیں۔ خود 28 فیصد نوجوان مسلمان بھی سوچتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن برطانیہ ایک مسلمان ملک بن جائے گا۔ لیکن مسلمانوں کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ اس طرح کے مسائل اس لیے بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے اصل مسائل سے توجہ ہٹائی جاسکے۔ برطانیہ کی

عدالتیں مدت سے بلکہ صدیوں سے بعض مقدمات کے فیصلے اسلامی شریعت کے مطابق کرتی ہیں۔اب اس کو بنیاد بنا کر بعض برطانوی یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ مسلمان یہاں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

سچائی یہ ہے کہ مسلمانوں کو برطانیہ میں کئی طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔برطانوی میڈیا پر بجا طور پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف برطانوی مسلمانوں کی منفی امیج پیش کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف امتیاز اور تعصب کو ہوا دیتا ہے۔اوپر ایک سروے کے نتائج کا ذکر ہو چکا ہے۔جس کے مطابق برطانوی مسلمان خود کو برطانوی شہری ہونے پر فخر کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود برطانوی میڈیا نے بعض وزراء کے بیانات کو ہوا دے کر مسلمانوں پر یہ الزام لگایا کہ وہ برطانوی سماج میں ضم نہیں ہونا چاہتے۔ایسا 2006 سے مسلسل ہو رہا ہے حالانکہ اسی سال ایک سروے میں پایا گیا کہ مسلم نوجوان تو وہاں کے سماج میں ضم ہونا چاہتے ہیں جبکہ سفید فام نوجوان اس کے خلاف ہیں۔سفید فام نوجوانوں میں سروے کے مطابق عدم برداشت intolerance زیادہ پائی جاتی ہے۔2009 گیلپ (Galmp) نے اپنے ایک سروے میں پایا کہ برطانوی مسلمان سفید فاموں کی بہ نسبت زیادہ قوم پرست ہیں۔مگر اس کے باوجود سفید فاموں کے درمیان مسلمانوں کے بارے میں نہ صرف غلط فہمیاں ہیں بلکہ ان کا رویہ معاندانہ اور مخالفانہ ہے۔سفید فام نہیں چاہتے کہ ان کے علاقوں میں رہنے والے مسلمان اپنے لیے مساجد تعمیر کریں جب کہ چرچ کے قیام کو وہ بالعموم welcome کرتے ہیں چاہے عبادت کے لیے اس میں جائیں یا نہ جائیں۔حالیہ دنوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید پروپیگنڈہ کیا گیا جس میں میڈیا اور حکومت کے بعض عناصر شامل تھے۔ 21ویں صدی میں یہ مسلم مخالف پروپیگنڈہ اتنا ہی شدید ہے جتنا 20ویں صدی کے شروع میں یہودی مخالف پروپیگنڈہ تھا۔

حالیہ دنوں میں برطانیہ میں اسلاموفوبیا میں کافی اضافہ ہوا ہے۔مسلمانوں کو دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ایک آدھ ان پر قاتلانہ حملے ہوئے ہیں اور ہلکے پھلکے حملوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔بالعموم لوگوں کو یا تو گالیاں دی جاتی ہیں یا حملے کیے جاتے ہیں یا مار دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔کبھی کوئی مسلمان کسی سفید فام پر چڑھ دوڑے تو اسے بہانہ بنا کر اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں جن کے برے نتائج ظاہر بھی ہونے لگے ہیں۔

میڈیا اور بعض سیاستداں مسلمانوں پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ وہ غیر مسلموں خصوصاً ہندوؤں اور سکھوں کو زبردستی مسلمان بناتے ہیں۔خاص طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندو اور سکھ لڑکیوں سے محبت کرتے اور پھر ان سے شادی کرنے کے لیے ان کے مسلمان ہونے کی شرط لگا دیتے ہیں۔اس پروپیگنڈے کی ہوا اس وقت نکل گئی جب دس ممتاز ہندو اسکالرس نے سر ایان بلیئر کو ایک کھلا خط لکھا جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ زبردستی مسلمان بنانے کے الزام میں ذرا بھی سچائی نہیں ہے۔ان ہندو اسکالرس نے دعویٰ کیا کہ اس الزام تراشی کے پیچھے انتہا پسند ہندو تنظیموں کا ہاتھ ہے۔برطانیہ کی مسلم تنظیموں نے بھی اس الزام کی سختی سے تردید کی ہے۔

مسلمانوں پر Love Jihad کا بھی الزام لگایا گیا۔یعنی برطانوی یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے مسلمان نوجوان سکھ لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنساتے اور پھر ان سے شادی کر لیتے ہیں۔بہت شدت سے یہ پروپیگنڈہ کیا گیا لیکن جب بعض انصاف پسند صحافیوں نے مسئلے کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ Love Jihad کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ انہوں نے فلاں سے اور انہوں نے کسی اور فلاں سے سنا تھا۔کبھی کوئی شخص سامنے آ کر یہ نہیں بولا کہ اس کی بیٹی یا بہن Love Jihad کے ذریعے جبراً یا بہلا پھسلا کر مسلمان

بنایا گیا۔

2005 میں لندن میں بڑے پیمانے پر وہاں کے ٹرانسپورٹ نظام پر دہشت گردانہ حملے ہوئے تھے جن میں 52 لوگ مارے گئے تھے۔ چاروں حملہ آور خودکش بمبار تھے، سو وہ بھی مارے گئے۔ ان میں سے تین پاکستانی نسل کے اور ایک کا تعلق جمائیکا سے تھا۔ یہ چاروں مسلمان برطانوی شہری تھے اور تحقیق سے پتہ چلا کہ وہ عراق جنگ میں برطانیہ کی شمولیت کے خلاف تھے اور اسی مخالفت کی وجہ سے یہ حملے کیے تھے۔ متوقع طور پر ان حملوں کے بعد مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ ہوا۔ مسلم قیادت نے بہرحال اپنے ہوش وحواس قائم رکھے اور خودکش حملوں کی نہ صرف مذمت کی بلکہ انہیں حرام قرار دیتے ہوئے مسلم نوجوانوں کو ایسی سرگرمیوں سے دور رہنے کی تلقین کی۔

مسلم دنیا میں ہو رہی شورشوں میں یا مشرق وسطیٰ کے مسائل کے حل کو لے کر برطانیہ کی مختلف جنگوں میں شمولیت کی وجہ سے چند مسلم نوجوان غصے میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ بہت سے مسلمان اور غیر مسلم بھی اس برطانوی پالیسی کے خلاف ہیں۔ بعضوں پر الزام ہے کہ وہ برطانیہ چھوڑ کر شام یا عراق چلے گئے ہیں جہاں وہ اسلامی خلافت کے قیام کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان پر یہ الزام بھی ہے کہ انہوں نے امریکی و برطانوی شہریوں کے سر قلم کیے اور ان کی ویڈیو بنا کر Facebook پر ڈال دی ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا کہ برطانیہ کے مسلمان ان دنوں ذرا سخت حالات سے گزر رہے ہیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ سارے منفی پروپیگنڈے کے باوجود برطانیہ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔

7.7 مسلمان اسپین میں

اسپین سے اسلام اور مسلمانوں کا تعلق بہت پرانا ہے۔ 30 اپریل 711 کو طارق بن زیاد اپنی مختصر فوج کے ساتھ اسپین میں فاتحانہ داخل ہوا۔ بعد میں موسیٰ بن نصیر جو افریقیہ کے اموی گورنر تھے، وہ بھی اس فوجی مہم میں شامل ہو گئے اور دونوں نے مل کر موجودہ اسپین اور پرتگال کے بیشتر حصوں پر قبضہ کر لیا۔ جنوبی فرانس کے ایک چھوٹے حصے پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تھا مگر بہت مختصر وقفے کے لیے۔ اہل فرانس نے جوابی حملے میں مسلمانوں کی ایک مختصر فوج کو ہرا کر اپنا علاقہ مسلمانوں سے واگزار کر لیا تھا۔ اسپین اور پرتگال یا اندلس میں مسلمانوں کی حکومت یوں تو 781 سال رہی لیکن ان کے کنٹرول والے علاقے کا حجم گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ چنانچہ بعض پرتگالی اور فرانسیسی علاقوں پر مسلمانوں کی حکومت صرف 28 سال قائم رہی جب کہ غرناطہ اور آس پاس کے علاقوں پر انہوں نے 1492 یعنی 781 سالوں تک حکومت کی۔ اندلس میں مسلمانوں کی حکومت پرامن بھی رہی اور شورشوں اور جنگوں سے گھری ہوئی بھی۔ ایسے دور بھی آئے جب مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں نے ایک کثیر مذہبی معاشرے کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ پرامن اور خوشحال زندگی گزاری اور سب کی محنتوں سے ایک زبردست صنعتی و زراعتی معیشت نے جنم لیا اور اس وقت اندلس ایک بہت بڑا برآمدی ملک بن گیا تھا۔ لیکن بہرحال پرتگال کے پہاڑی علاقوں کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جب بھی موقع ملا بغاوت کی اور بالآخر انہیں 15 ویں صدی میں نکال باہر کیا۔

1492 میں آخری مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد خصوصاً سولہویں صدی میں عیسائیوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ یا تو انہیں جلاوطن کر دیا گیا یا زبردستی عیسائی بنا لیا گیا۔ جو عیسائی ہو گئے تھے، ان کی نیتوں پر مدتوں شبہ کیا جاتا رہا اور ایک ایک کر کے مسلمانوں

کے آثار کو مٹایا گیا۔ مساجد کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا۔ آج قدیم مساجد میں سے صرف مسجد قرطبہ کے آثار باقی ہیں جس کے ایک حصے کو چرچ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جدید اسپین میں تقریباً 5 سو سال بعد پہلی مسجد 1982 میں تعمیر کی گئی۔

یوروپ کے دوسرے ملکوں کی طرح اسپین میں بھی مسلمان بیسویں صدی میں آنا شروع ہوئے۔ آج اسپین میں مسلمان ایک ملین یا دس لاکھ ہیں۔ آج اسپینی مسلمانوں کی بڑی اکثریت مراکش سے آکر یہاں آباد ہوئی ہے۔ اسپینی نسل کے لوگ بھی ہیں لیکن کم ہیں۔ شام، عراق، لبنان اور ایران سے بھی مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے ہیں، تھوڑے بہت ہندوستانی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 20 ہزار سے 50 ہزار تک وہ مسلمان ہیں جنھوں نے حالیہ برسوں میں اسلام قبول کیا ہے۔ یہ کافی منظم ہیں اور جنوبی اندلس میں انہوں نے بہت سے اسکول اور ادارے کھولے ہیں جہاں لوگ دور دراز سے تحصیل علم کے لیے آتے ہیں۔ یہ زائرین یا طلبہ تمام ہی یوروپی ممالک، کناڈا اور امریکہ سے آتے ہیں۔ مسلم ممالک کے طلبہ کی توجہ شاید ابھی ادھر نہیں گئی ہے۔ اسپین کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت سنی ہے۔ شیعہ بہت کم ہیں جن کی اکثریت ایران سے یہاں آکر آباد ہوئی ہے۔

7.8 اسلام اٹلی میں

اسپین کی طرح اٹلی سے بھی مسلمانوں اور اسلام کا تعلق کافی پرانا ہے۔ سسلی یا صقلیہ اور شمالی افریقہ کے درمیان میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جسے آج Pantelleria کہتے ہیں۔ اس جزیرے کو عربوں نے 700 میں فتح کر لیا تھا۔ یہ پہلا اطالوی علاقہ تھا جسے مسلمانوں نے فتح کیا۔ پاس کا بڑا جزیرہ صقلیہ ساتویں صدی میں رومن قبضے میں تھا اور یہاں ان کا بڑا بحری بیڑہ تھا جس سے شام کے مسلمانوں کو خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اس جزیرے پر مسلمانوں نے 652، 667 اور آٹھویں صدی میں 720 میں حملے کیے مگر انہیں کامیابی نہیں ملی۔ 708 میں جزیرے کے ایک چھوٹے حصے پر مسلمان قابض ہو گئے تھے اور 740 میں انہوں نے ایک بڑا حملہ کیا جو ناکام رہا کیونکہ شمالی افریقہ میں مسلم امراء باہم برسر پیکار ہو گئے تھے، آپس کی لڑائی یا بغاوتوں کی وجہ سے جو 771 تک جاری رہیں، مسلمان صقلیہ پر قبضہ نہیں کر پائے بلکہ کوئی بڑا حملہ بھی نہیں کر پائے جب کہ انہیں احساس تھا کہ اس بحری اڈے پر ان کا قبضہ بہت اہم اور ضروری ہے۔

صقلیہ پر مسلمانوں کو فتح نویں اور دسویں صدی میں نصیب ہوئی۔ بازنطینی فوجوں نے ہر قدم پر جم کر مقابلہ کیا اور اس طرح جزیرے کو فتح کرنے میں مسلمانوں کو بڑی دقت پیش آئی۔ مسلمانوں کی دقت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ خود شمالی افریقہ یا افریقیہ میں اکثر بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں، ایک تجزیے کے مطابق اغلبی حکمراں زیادۃ اللہ نے ان بغاوتوں سے نجات پانے کے لیے ان عربوں، بربروں اور اندلسیوں پر مشتمل ایک فوج کو صقلیہ فتح کرنے کی ذمہ داری دی تا کہ وہ سکون سے افریقیہ پر حکومت کر سکے۔ مشہور محدث اسد بن فرات کی قیادت میں سب سے پہلے 827 میں صقلیہ پر حملہ کیا گیا۔ 830 اور 875 میں بڑے حملے کیے گئے۔ 831 میں Palermo پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ 843 میں Messina پر قبضہ ہو گیا اور 878 میں Syracuse پر اسلامی پرچم لہرا دیا گیا۔ 902 میں بھی مسلمانوں نے ایک بڑا حملہ کیا اور پھر 918 اور 964 میں بھی بڑی فوجی کارروائیاں کی گئیں جن کے نتیجے میں جزیرہ صقلیہ پر مسلمانوں کو مکمل فتح حاصل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی بعض فوجی ٹکڑیاں اٹلی میں بھی داخل ہو گئی تھیں۔ جب مسلمانوں نے صقلیہ کو فتح کیا تو وہاں کے عیسائیوں کو اہل کتاب کا درجہ دیا اور ملک کی زراعت کو بالکل اندلس کی طرح ترقی دی جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی آبادی نے کھل کر حصہ لیا۔ بہت جلد صقلیہ ایک برآمد

کرنے والا ملک بن گیا۔ مسلمانوں نے شہری زندگی کو فروغ دیا۔ بہترین شہر بسائے یا پرانے شہروں کو ہی خوب ترقی دی۔ Palermo ان کا دارالحکومت تھا۔ اس کی آبادی 3 لاکھ تھی جو جرمنی کے تمام شہروں کی مجموعی آبادی سے زیادہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ یوروپ 8 ویں اور 9 ویں صدی میں ایک پسماندہ دیہاتی علاقہ تھا۔

اہل کتاب کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے صقلیہ کے عیسائیوں کو جزیہ دینا پڑتا تھا لیکن زکوٰۃ جیسا بھاری ٹیکس انہیں نہیں دینا پڑتا تھا اور جزیہ بھی انہیں نہیں دینا پڑتا تھا اگر وہ مسلم فوج میں شامل ہوجاتے یا اسلام قبول کر لیتے۔ مسلم حکومت کی وجہ سے جزیرے پر نہ صرف امن قائم ہوا بلکہ زراعت اور باغبانی پر مبنی معیشت اور تجارت نے کافی ترقی کی۔ معاشی خوشحالی کا سبھی کو فائدہ پہنچا۔ سچائی یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو مسلمانوں ہی کی طرح تجارت وزراعت کی کھلی آزادی حاصل تھی۔ جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

صقلیہ پر قبضے کے بعد مسلمانوں نے اٹلی کے کئی شہروں پر حملے کیے۔ بعض اطالوی امرا یا حکمراں باہم برسرپیکار تھے اور ان میں سے بعض نے مسلمانوں کی مدد حاصل کی۔ خود روم کی فتح کے لیے بھی مسلمانوں نے کئی حملے کیے مگر ناکام رہے۔ بہر حال صقلیہ اور اٹلی کے بعض ساحلی شہروں پر قبضے کی وجہ سے مدت تک مسلمان سمندری تجارت پر قابض رہے۔

مسلمان صقلیہ پر 11 ویں صدی تک قابض رہے۔ اس دوران وہ آپس میں بھی لڑتے رہے اور عیسائیوں سے بھی، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بعض مسلم امراء عیسائیوں سے مدد چاہتے یا عیسائی حکمراں اپنے عیسائی مخالفین کے خلاف مسلمانوں سے مدد مانگتے۔ یہ سلسلہ صقلیہ پر نارمنوں کی فتح تک جاری رہا۔ نارمن جنوبی اٹلی سے 1059 میں نکلے اور بہت جلد پورے صقلیہ پر قبضہ کر لیا۔ پہلے تو نارمنوں نے مسلمانوں کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا لیکن بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ صقلیہ کی خوشحالی مسلمانوں کی وجہ سے ہے، سو انہوں نے انہیں جزیرے سے بے دخل کرنے کے بجائے ان کا تعاون حاصل کیا تاکہ معاشی خوشحالی قائم رہے۔

اغلبیوں اور فاطمیوں کے علاوہ عثمانی ترکوں نے بھی پندرہویں اور سولہویں صدی میں اٹلی کو فتح کرنے کی بار بار کوشش کی۔ کبھی انہیں جزئی کامیابی ملی تو کبھی نہیں ملی۔ بہرحال تاریخی سچ یہی ہے کہ بہت سے عیسائیوں کے تعاون کے باوجود اٹلی کبھی فتح نہیں ہوا۔

جدید یا آج کے اٹلی میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 2 فیصد ہے۔ اسپین ہی جیسا اٹلی میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ نویں صدی سے تیرہویں صدی تک اٹلی کے مختلف جزیروں اور علاقوں میں مسلمان کبھی زبردست تو کبھی کمزور طاقت کے طور پر موجود تھے۔ پندرہویں-سولہویں صدی میں عثمانی ترکوں کو یہاں وہاں جزئی کامیابیاں ملیں لیکن مسلمان اس ملک پر کبھی اس طرح قابض نہیں ہو سکے جس طرح وہ اسپین میں تھے۔ آج اٹلی میں جو مسلمان پائے جاتے ہیں، ان کی اکثریت مہاجرین پر مشتمل ہے۔ 2011 میں لگائے گئے اندازے کے مطابق مسلمان اٹلی میں بس دو فیصد ہیں۔ بیسویں صدی میں رفتہ رفتہ مسلمان صومالیہ سے آکر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔ حالیہ دنوں میں بہت سے مسلمان البانیہ، مصر، مراکش اور تیونس سے بھی آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔

اگرچہ اٹلی میں مسلمان دو فیصد ہیں لیکن اسلام یہاں تسلیم شدہ مذہب نہیں ہے۔ دراصل کیتھولک عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذاہب کو قانونی طریقے سے تسلیم شدہ قرار پانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت انہیں تسلیم کرے۔ طریقہ یہ ہے کہ اٹلی میں رہنے والے کسی بھی مذہب کے ماننے والے حکومت سے ایک تحریری معاہدہ کرتے ہیں جس کے بعد وہاں کی وزارتِ داخلہ صدر جمہوریہ سے درخواست کرتی ہے

کہ سرکار کی طرف سے ان کے مذہب کو تسلیم کیا جائے۔ سرکار یا حکومت کسی مذہب کو محض اس بنیاد پر تسلیم نہیں کرتی کہ اٹلی میں اس کے ماننے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں بلکہ وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ اس مذہب کی تعلیمات اٹلی کے دستور کے منافی تو نہیں ہیں۔ جن مذاہب کو سرکار تسلیم کرتی ہے، انہیں حکومت کی طرف سے اس فنڈ سے مدد اور رعایات ملتی ہیں جو 'مذہب ٹیکس' کے ذریعہ بنایا گیا ہے، اس ٹیکس کو Eight per Thousand یعنی ''ہزار پر آٹھ'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ کیتھولک عیسائیت کے علاوہ یہودیت اور عیسائیت کے بعض دوسرے فرقے سرکاری طور پر تسلیم شدہ مذاہب ہیں۔ 2005 میں اٹلی کی وزارتِ داخلہ اٹلی کے مسلمانوں کی ایک کونسل بنائی تا کہ اسلام کو بھی سرکاری طور پر تسلیم شدہ مذہب قرار دیا جائے۔ مگر کونسل کے ممبروں کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے اسلام کے سرکاری طور پر تسلیم شدہ مذہب قرار پانے میں تاخیر ہو رہی ہے۔

معلومات کی جانچ

1- اٹلی میں مسلمانوں کی موجودگی (presence) پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

2- موجودہ اسپین اور اٹلی میں مسلمانوں کے حالات پر مختصر مضمون لکھیں۔

3- برطانوی مسلمانوں کو درپیش مسائل سے بحث کریں۔

7.9 خلاصہ

مغربی یوروپ کے جن پانچ ممالک کا یہاں مطالعہ پیش کیا گیا ہے، ان میں سے اٹلی اور اسپین سے اسلام اور مسلمانوں کا تعلق بہت پرانا ہے۔ اسپین میں اسلام آٹھویں صدی کے آغاز میں ہی پہنچ گیا تھا اور تقریباً آٹھ سو سال تک وہاں ایک غالب طاقت کے طور پر موجود رہا۔ اس کے بعد ان کے زوال کی دردناک کہانی بھی ہے جس پر بہر حال روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح اٹلی کے بعض جزیروں اور دوسرے علاقوں پر مسلمان نویں صدی میں قابض ہو گئے تھے۔ صقلیہ پر دو ڈھائی سو سال تک ان کی مضبوط حکومت بھی رہی۔ مگر 13 ویں صدی کے اختتام تک وہ بھی وہاں سے نکال دیے گئے۔ عثمانی ترکوں کو بھی اٹلی کی سرزمین پر کوئی خاص کامیابی نہیں ملی۔ موجودہ دور میں اٹلی اور اسپین میں مسلمان بیسویں صدی میں آئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ اسپین کے کئی ہزار باشندوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان مسلمانوں کو بعض مسائل کا سامنا ہے لیکن وہ وہاں بحیثیت مجموعی سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

برطانیہ، جرمنی اور فرانس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد جنگ عظیم دوم کے بعد خصوصاً 1950 اور 1960 کی دہائیوں کے دوران آ کر آباد ہوئی۔ ان تینوں ملکوں میں آج مسلمان خاصی تعداد میں موجود ہیں بلکہ انہیں کی موجودگی کی وجہ سے یہ ممالک آج مذہبی، ثقافتی و لسانی تکثیریت والے ملک ہیں۔ ان تینوں ہی ممالک میں مسلمانوں کو بہت سے چیلنجز اور مسائل کا سامنا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہاں بالخصوص برطانیہ میں اسلام سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب بھی ہے۔ مسائل کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ مغربی یوروپ میں مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے۔

7.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے

1- اسلاموفوبیا کیا ہے۔ برطانیہ کے خصوصی حوالے سے اس پر ایک مضمون لکھیں۔

2- فرانس کے حوالے سے پردہ اور اس پر عائد پابندی پر ایک تفصیلی وتنقیدی نوٹ لکھیں۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے

3- جرمنی، برطانیہ اور فرانس کے مسلمانوں کو درپیش تعلیمی مسائل سے بحث کریں۔

4- مغربی یوروپ میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور مذہبی وسماجی حالت پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

7.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- ثروت صولت: مسلمان اقلیتیں

2- آباد شاہ پوری: روس میں مسلمان قومیں

3- M. Ali Kettani: Muslim Minorities in the World Today

4- Sulayman Nyang: Islam in the United States of America

5- Yuonne Yezbeck Haddad & Jane I Smith: Muslim Minorities in the West

اکائی 8: مسلمان امریکہ میں

اکائی کے اجزاء

8.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد ریاستہائے متحدہ امریکہ، لاطینی امریکہ اور کناڈا میں مسلمانوں کی تاریخ اور موجودہ حالت کا تفصیلی جائزہ لینا ہے۔ ان تمام ہی ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ ان کی تاریخ بھی کوئی بہت شاندار نہیں ہے جیسا کہ ایشیا و افریقہ میں رہی ہے۔ لیکن موجودہ دنیا کا یہ خطہ جس میں امریکہ جیسا طاقتور ملک موجود ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے اس خطے میں آباد مسلمانوں کی تاریخ اور ان کی موجودہ مذہبی، سماجی، سیاسی اور معاشی حالت کا علم بہت ضروری ہے۔

8.2 تمہید

امریکہ کی دریافت 15 ویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔ بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ امریکہ کوئی غیر آباد سرزمین تھی جسے اسپین اور دوسرے یوروپی ممالک کے لوگوں نے جا کر آباد کیا۔ سچائی یہ ہے کہ یہاں ریڈ انڈین موجود تھے اور جدید امریکہ کی بنیاد انہیں مٹا یا دبا کر رکھی گئی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مقصد ریڈ انڈینس کی تاریخ کا مطالعہ کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ ان ممالک میں مسلمان کب اور کیسے آئے۔ ان کی تاریخ کیا ہے اور یہ کہ ان کی موجودہ صورتحال کیا ہے۔ یہ مضمون تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ریاستہائے متحدہ

امریکہ کے مسلمانوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں اور باقی دو حصوں میں لاطینی امریکہ اور کناڈا کے مسلمانوں سے بحث کی گئی ہے۔

8.3 مسلمان امریکہ میں

امریکہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ یا شمالی امریکہ میں مسلمان تقریباً ایک فیصد ہیں۔ 2010 کے ایک تخمینے کے مطابق امریکی آبادی میں مسلمانوں کا فیصد 0.9 تھا۔ اس طرح اسلام عیسائیت، یہودیت اور بدھ ازم کے بعد چوتھا بڑا مذہب ہے۔

امریکہ میں آباد مسلمان یہاں مختلف ملکوں اور براعظموں سے آئے ہیں۔ تقریباً ایک چوتھائی سیاہ فام مسلمان ہیں، جنہیں امریکن افریقن مسلم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ان غلاموں کی اولاد ہیں جو 18 ویں اور انیسویں صدی میں افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ ان سیاہ فام مسلمانوں میں بھی اکثریت ان کی ہے جنہوں نے گزشتہ آٹھ دہائیوں میں اسلام قبول کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی تعداد ان سیاہ فام مسلمانوں کی بھی ہے جو یہاں غلام بنا کر نہیں لائے گئے تھے بلکہ وہ خود سیاح، ملاح اور تاجر کی حیثیت سے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔

ہندوستان میں مغل ایمپائر کے خاتمے کے بعد بھی کچھ مسلمان 1880 کی دہائی میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اسی طرح جنگ عظیم اول کے بعد سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد بہت سے مسلمان یہاں آئے۔ یہ لازمی طور پر ترک نہیں تھے بلکہ عرب اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔

بیسویں صدی میں مسلمانوں کی تعداد کافی تیزی سے بڑھی۔ یہ زیادہ تر پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور عرب ممالک سے آئے۔ ان تارکین وطن کی دوسری نسل آج امریکہ میں کافی کامیاب ہے۔ یہ امریکہ میں کل مسلم آبادی کا 70 فیصد سے زیادہ ہیں۔ امریکہ کے عالمی تجارتی ٹاورس پر حملہ سے پہلے ان عرب اور پاکستانی مسلمانوں میں یہ بات عام تھی کہ وہ یہاں بہتر مستقبل کے لیے آئے ہیں اور ایک نہ ایک دن اپنے وطن لوٹ جائیں گے۔ لیکن وطن واپسی کا یہ اسطورہ Myth of Return ٹوٹ چکا ہے اور زیادہ تر لوگ وہاں کی شہریت یا تو لے چکے یا لے رہے ہیں۔ 2005 میں 96000 اور 2009 میں 115000 مسلمانوں نے امریکی شہریت حاصل کی یا قانونی طور پر امریکی شہری ہو گئے۔

حالیہ دنوں میں امریکہ میں مسلمانوں کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پرانے ریکارڈوں پر نظر ڈالنے سے بعض دلچسپ معلومات سامنے آئی ہیں۔ اس طرح کے ریکارڈوں کے مطابق امریکی سرزمین پر قدم رکھنے والا سب سے پہلا مسلمان ایک مراکشی غلام تھا۔ یہ اسپینیوں کا غلام تھا اور اس کا نام بھی spanish ناموں جیسا تھا یعنی Estevanico۔ ٹیکسس میں ایک جگہ ہے Galveston۔ یہیں کہیں 1528 میں اسپین کا ایک جہاز ڈوب گیا تھا۔ چار اسپینیوں کے ساتھ Estevanico بھی کسی طرح بچ نکلا تھا اور ایک طویل مسافت کے بعد یہ لوگ میکسیکو پہنچ سکے تھے۔ ایک تاریخ داں N. Brent Kennedy نے تحقیق سے پتہ لگایا ہے کہ 1567 سے 1587 کے دوران ترک اور دوسرے مسلمان اس جگہ لا کر بسائے گئے تھے جہاں آج North Carolina ہے۔ ان لوگوں نے یہاں کی مقامی عورتوں سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں اس کمیونٹی نے جنم لیا جنہیں آج Melungeon کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سترہویں صدی کی بعض دستاویز سے بھی امریکہ کے بعض دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔1682 کی ورجینیا کی ایک قانونی دستاویز میں لکھا ہوا ہے کہ "نیگرو" ترک (Moors) Molatoes اور دوسرے لوگ جو غیر عیسائی ہیں اور غیر عیسائی، اصنام پرست اور محمدی یا اسلامی ممالک سے آئے ہیں، انہیں خریدا جا سکتا ہے، حاصل کیا جا سکتا ہے یا دوسرے طریقوں سے غلام بنایا جا سکتا ہے۔ایسی ہی ایک دوسری دستاویز میں ایک مسلمان کا ذکر ملتا ہے جس کے ماں باپ ترک اور ڈچ تھے۔یہ ایک بڑا تاجر اور زمیندار تھا اور وہ New Netherlands یعنی موجودہ نیو یارک میں کہیں آباد تھا۔یہ سترہویں صدی کا واقعہ ہے۔انیسویں صدی کے اواخر میں آ کر آباد ہونے والے ایک نصر الدین کا بھی ذکر ملتا ہے۔جو مصر سے یہاں آیا تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک مقامی ریڈ انڈین سردار سے دوستی کر لی۔ اس کے بعد اس نے سردار کی بیٹی سے شادی رچانی چاہی تو اس نے منع کر دیا۔نصر الدین نے اسے زہر دے کر مار دیا۔سردار کے آدمیوں نے اسے پکڑ کر زندہ جلا دیا۔

امریکہ کی جنگ آزادی کی تاریخ میں مسلمانوں کا بھی حصہ تھا جس کا وہاں کے تاریخ داں اعتراف کرتے ہیں۔جنگ آزادی میں شامل دو Heroes کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ایک یوسف بن علی اور دوسرا بامپیٹ محمد کا۔اسی طرح ایک پٹر سلیم کا ذکر آتا ہے۔جنہیں War Hero یا بڑے مجاہد آزادی کے طور پر یاد کیا گیا ہے۔1787 میں دستخط کیا ہوا جارج واشنگٹن کا ایک خط بھی ملتا ہے جو اس نے محمد بن عبداللہ کو لکھا تھا اور امریکی صدر نے اس میں Treaty of Peace & Friendship کی تعریف کی تھی۔فلاڈلفیا میوزیم آف آرٹ میں چارلس ولسن پیلے کی 1819 میں بنائی ہوئی ایک Portrait ملتی ہے جو ایک مسلم ہیرو کی ہے جن کا نام محمد یاروتھا۔یہ بات اہم ہے کہ امریکہ کو بطور آزاد ملک تسلیم کرنے کا کریڈٹ مراکش کو جاتا ہے۔1777 میں مراکش کے امیر محمد بن عبداللہ نے نہ صرف امریکہ کی جنگ آزادی کی حمایت کی تھی بلکہ اسے ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم بھی کیا تھا۔دس سال بعد امریکہ نے مراکش سے ایک معاہدہ بھی کیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔تیونس دوسرا مسلم ملک ہے جس نے امریکہ سے سفارتی تعلق 19ویں صدی کے آغاز میں قائم کر لیا تھا۔تیونس کے سفیر سلیمان کے اکرام میں صدر تھامس جیفرسن کے ذریعے دی گئی ایک افطار پارٹی کا ذکر بھی ملتا ہے۔19ویں صدی کے اوائل ہی کے ایک اور واقعے کی تفصیلات بھی ملی ہیں۔بلالی محمد کا تعلق موجودہ Guinea Conakry سے تھا۔وہ 1803 میں امریکہ آئے یا غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ان کا قیام Sapelo Island پر تھا جہاں 80 دوسرے مسلمان غلام بھی تھے۔بلالی محمد تعلیم یافتہ تھے اور فوراً مسلم کمیونٹی کے امام چن لیے گئے۔ 1812 کی جنگ کے دوران برطانیہ کی ایک فوجی ٹکڑی نے Sapelo Island پر حملہ کیا۔80 مسلمان غلاموں کے ساتھ اپنے آقا کی پراپرٹی یا مال واسباب کی بلالی نے حفاظت کی۔بلالی صوم وصلوٰۃ کے پابند مسلمان تھے۔وہ روزے رکھتے، پانچوں وقت کی نماز پڑھتے اور امامت بھی کرتے۔وہ علماء کی طرح ترکی ٹوپی پہنتے اور دوسروں سے نمایاں نظر آتے۔1829 میں انہوں نے عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا جس میں عقیدۂ اسلامی کی تشریح کی گئی تھی۔اذان، نماز پڑھنے اور وضو کرنے کے طریقے کا بھی ذکر تھا۔یہ کتاب یونیورسٹی آف جارجیا کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے۔

ایک دوسرے شمالی افریقی مسلم ملک الجزائر سے امریکہ کے رشتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔1785 اور 1815 کے درمیانی وقفے میں سو سے زیادہ امریکی ملاحوں کو الجیئرس میں قیدی بنا لیا گیا تھا اور تاوان کا مطالبہ کیا گیا۔یہ الجزائری حکومت کے سپاہی نہیں تھے۔آزاد گروپ تھے

جنہیں امریکی اور یوروپی اہل قلم بحری قزاق کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ حالانکہ نئی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تجارتی گروپ تھے جن کے مفادات یوروپی ممالک کے مفادات سے ٹکراتے تھے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے یہ یوروپی جہازوں پر حملے کرتے۔ ایسے ہی کسی حملے میں انہوں نے امریکی جہاز کو پکڑ کے اس کے ملاحوں کو قیدی بنالیا۔ صدر جیفرسن اور صدر میڈیسن نے امریکی بحری بیڑہ بھیج کر امریکی قیدیوں کو آزاد کرایا۔ امریکی تاریخ میں اسے پہلی بربری جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنگ ایک معاہدے پر ختم ہوئی۔ معاہدے پر گفتگو کے دوران امریکی سفیروں نے یہ واضح کیا کہ امریکہ کسی بھی مسلم ملک کے خلاف معاندانہ جذبہ نہیں رکھتا۔ لیکن آزاد کیے گئے قیدیوں نے جو خطوط لکھے یا اپنی آزادی کے بعد بیانات دیے ان میں مسلمانوں کی بالعموم منفی تصویر پیش کی گئی۔

امریکی خانہ جنگی میں 290 مسلمان فوجیوں کی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر سپاہی تھے۔ کیپٹن موسیٰ عثمان غالباً سب سے اونچی رینک والے افسر تھے۔ نکولس سعید دوسرے مسلمان تھے جو 1860 میں امریکہ آئے اور 1863 میں امریکی فوج میں شامل ہوگئے۔ وہ ترقی پاکر سارجنٹ ہوگئے تھے۔ بعد میں ان کا ٹرانسفر ایک ملٹری اسپتال میں ہوگیا تھا جہاں انہوں نے طب کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ان کا انتقال 1882 میں ہوا۔ خانہ جنگی کے دوران ایک اور سپاہی، میکس حسان کا ذکر ملتا ہے جو سیاہ فام تھے اور فوج میں پورٹر تھے۔ اسی طرح حاجی علی کا ذکر ملتا ہے جن کی خدمات امریکی فوج نے 1856 میں حاصل کی تھیں۔ یہ کیلی فورنیا اور ارائزونا میں فوج کے اونٹوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کا انتقال 1903 میں ہوا۔

خانہ جنگی کے دوران شمال یعنی شمالی امریکہ کی پالیسی کافی وحشیانہ تھی۔ یعنی سرکاری پالیسی یہ تھی کہ سب کچھ جلا دیا جائے خاص طور سے چرچ، اسکول، لائبریری، کالج اور زراعتی فارموں کو نشانہ بنایا گیا۔ یونیورسٹیوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ 4 اپریل 1865 کو جب خانہ جنگی ختم ہونے کے قریب تھی، امریکی فیڈرلزم کی علمبردار فوجوں نے یونیورسٹی آف الاباما پر قبضہ کرلیا۔ فوج لائبریری جلانے والی تھی کہ اس کے انچارج نے کہا کہ یہ جنوب کی سب سے اچھی یونیورسٹی اور لائبریری ہے، اسے بخش دیا جائے۔ فوج کا کمانڈر ذرا ہمدرد ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو خط لکھا کہ لائبریری کو نہ جلایا جائے لیکن ہیڈ کوارٹر نے اسے حکم دیا کہ لائبریری بھی جلادی جائے۔ کمانڈر نے ایسا ہی کیا البتہ اتنی رعایت دی کہ لائبریرین کوئی ایک کتاب Momento کے طور پر بچا سکتا ہے۔ لائبریرین نے جس کتاب کو بچایا وہ قرآن مجید کی ایک نایاب کاپی تھی۔

19 ویں صدی کے امریکہ کے مسلمانوں کی تاریخ میں بعض ان لوگوں کا بھی ذکر آتا ہے جنہوں نے عیسائیت ترک کے اسلام قبول کرلیا تھا۔ الیگزنڈر رسل ویب مشہور اینگلو امریکن تھے جنہوں نے 1888 میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ 1893 میں منعقد ہوئی مذاہب عالم کی پارلیامنٹ میں وہ واحد مسلمان تھے۔ روس میں پیدا ہوئے احمد عبداللہ (1881-1945) 19 ویں اور 20 ویں صدی کے دوسرے ممتاز اسلامی اسکالر تھے۔

جب امریکہ برطانیہ کی کالونی تھا، تو غلاموں کی تجارت شباب پر تھی۔ برطانیہ سرخ ہندوستانیوں کو ختم کرکے ان کی زمینوں پر قبضہ کرتا اور ان پر کام کرنے کے لیے افریقہ سے غلام پکڑ کر لاتا۔ بدقسمتی سے اس گھناونے کام میں بعض مقامی لوگ بشمول عرب مسلمان بھی شامل ہوگئے تھے۔ جو لوگ زبردستی غلام بنائے گئے ان میں ایک اندازے کے مطابق 15 سے 30 فیصد تک مسلمان تھے۔ غلاموں میں مسلمان

عورتیں بھی تھیں مگر ان کی تعداد مسلمان غلاموں کی نصف تھی۔ مسلمان غلام اکثر باشعور، پڑھے لکھے اور مہذب تھے۔ انہیں اپنی عزت نفس کا خیال تھا۔ وہ غلامی کی لعنتوں کو جانتے تھے۔ اس لیے دوسرے سیاہ فام غلاموں کی بہ نسبت یہ بے عزتی کم برداشت کرتے اور مظالم کے خلاف عزم وارادہ کی پختگی کا ثبوت دیتے۔

امریکہ میں کوئی پانچ لاکھ سیاہ فام غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ ان میں سے تقریباً 50 فیصد سینیغال اور گامبیا کے علاقے سے پکڑے گئے تھے جہاں اسلام کے اثرات پائے جاتے تھے۔ اس لیے پکڑے گئے لوگوں میں بعض مسلمان بھی تھے۔ 17 ویں صدی اور 18 ویں صدی مین فلانی قبیلے کے لوگوں نے سینیغال اور گامبیا کے علاقوں میں اپنی تبلیغی اور جہادی سرگرمیوں سے بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا لیکن پھر بھی بعض لوگ امریکیوں یا ان کے مقامی ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ گئے اور غلام بنا کر امریکہ بھیج دیے گئے۔ یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ بہت سے غیر مسلم غلام اگر چہ انہوں نے اسلام نہیں قبول کیا تھا، مگر اسلامی رسوم وعبادات سے واقف تھے جس کی وجہ سے وہ مسلمان غلاموں کے ساتھ ہی رہنا پسند کرتے اور غالباً بیسویں صدی میں یہی لوگ بڑی تعداد میں مسلمان بھی ہو گئے۔

18 ویں صدی میں جب امریکہ کا فیڈرل دستور بن رہا تھا تو بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ دستور میں پروٹسٹنٹ عیسائیت کو دوسرے مذاہب پر برتری حاصل ہو۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی کیتھولک کبھی امریکہ کا صدر بنے۔ اسی طرح اس وقت کی عثمانی سلطنت کا ہوا دکھا کر مسلمانوں سے بھی ڈرایا گیا کہ کسی دن کوئی مسلمان بھی صدر ہو سکتا ہے۔ لیکن دستور سازوں کی بڑی اکثریت نے ان خدشات کو نظر انداز کرتے ہوئے موجودہ دستور امریکہ پاس کیا جس میں تمام مذاہب کو یکساں آزادی ملی ہوئی ہے۔ دراصل جنگ آزادی میں کم تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کے مثبت رول کی وجہ سے امریکی لیڈر اور دستور ساز خوش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بے جا خدشات کو نظر انداز ہوئے دستور سازوں نے امریکہ کو ایک سیکولر فیڈرل دستور دیا۔

آزاد (یعنی غیر غلام) مسلمان 1840 کی دہائی سے امریکہ میں آنا شروع ہوئے۔ یہ یمنی عرب اور ترک تھے۔ ان کی تعداد کم تھی اور ان کی ہجرت جنگ عظیم اول تک جاری رہی۔ یہ عرب اور خاص طور سے ترک عثمانی سلطنت کے عرب علاقوں رصوبوں سے آئے تھے اور ان کا مقصد کم وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا اور گھر واپس جانا تھا۔ لیکن 19 ویں صدی کا امریکہ وہ معاشی مواقع نہیں رکھتا تھا جو آج وہاں حاصل ہیں۔ ان اولین تارکین وطن کو مایوسی ہوئی اور حالات نے کچھ یوں کروٹ لی کہ وہ گھر واپس جانے کے بجائے یہیں امریکہ کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں مسلمانوں نے North Dakota میں شاید سب سے پہلی امریکی مسجد تعمیر کی تھی۔ ان کا اپنا قبرستان بھی تھا۔ مگر یہ مسجد درمیان میں غیر آباد ہو گئی تھی۔ اسے دوبارہ 1970 کی دہائی میں آباد کیا گیا اور 2005 میں اسے شہید کر کے اس کی جگہ پر ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ 1906 میں امریکہ میں مقیم بوسنیائی مسلمانوں نے شکاگو میں ایک سماجی تنظیم الجامعۃ الخیریہ کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد بوسنیائی مسلمانوں کی مدد کرنا تھا اور یہ غالباً مسلمانوں کی سب سے پرانی خیراتی تنظیم ہے۔ بوسنیائی مسلمان بوسنیا کے لوگوں کے ذریعے چل رہے کافی ہاؤسز میں ملاقات کرتے اور باہمی مسائل پر غور وخوض کرتے۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک سنڈے اسکول کھولا جس کا اپنا نصاب اور کتابیں بھی تھیں۔ بوسنیا سے تعلق رکھنے والے ایک اسکالر، اکمل اَودِک جنہوں نے جامعہ ازہر سے تعلیم حاصل کی تھی، اس خیراتی انجمن کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ایک کتاب بھی تحریر کی تھی جس کا نام (Survey of Islamic Docrines) تھا۔

پولینڈ سے ترکِ وطن کر کے آنے والے مسلمان نیویارک میں آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے 1907 میں امریکن محمڈن سوسائٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جو نیویارک میں تھی۔ یہاں وہ ثقافتی و مذہبی ضرورتیں پوری کرتے۔ لیکن پہلی مسجد شاید 1915 میں البانوی مسلمانوں نے قائم کی۔ یہ Biddeford میں بنائی گئی تھی۔ مسجد کے ساتھ قبرستان بھی تھا۔ یہ قبرستان آج بھی پایا جاتا ہے مگر مسجد کے آثار مٹ چکے ہیں۔ 1920 میں قادیانیوں نے ایک مسجد الصادق کے نام سے تعمیر کی۔ مگر قادیانیوں کو اب خارج از اسلام قرار دے دیا گیا ہے۔ نارتھ ڈکوٹا میں 1929 میں شامی مسلمانوں نے ایک مسجد تعمیر کی جسے راس مسجد کہتے ہیں۔ اس کے قریب ایک قبرستان تھا جو آج بھی ہے۔ Iroa کے Cedar Rapids میں 1934 میں ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی جو آج تک ہے۔ بعض لوگ اسی کو امریکہ کی پہلی باقاعدہ مسجد کہتے ہیں۔ Michigan کے Dearborn میں 1945 میں ایک مسجد ہوتی تھی جسے عرب مسلمانوں نے تعمیر کیا تھا۔ واضح رہے Michigan میں عرب مسلمان کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ اس کے بعد مختلف جگہوں پر کئی مساجد تعمیر کی گئیں اور 1952 تک پورے امریکہ میں 20 سے زائد مساجد تھیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں بہت سی مساجد تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ مساجد بڑی کشادہ ہیں اور ان کا انتظام یا نظم و نسق بہت اچھا ہے۔

یہاں ان کوششوں کا ذکر مناسب ہوگا جو سیاہ فاموں کو اسلام سے قریب لانے کے لیے کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے بعض جماعتوں نے بڑی محنت کی۔ قادیانی، جنہیں خارج از اسلام قرار دے دیا گیا ہے بھی سیاہ فاموں میں کافی سرگرم ہیں اور بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے ہیں، وہ دراصل قادیانی ہیں۔ 1913 میں بعض سیاہ فام مسلمانوں نے ڈریو علی کی قیادت میں ایک انجمن بنائی جس کا نام تھا: Moorish Science Temple of America۔ اس انجمن کے ذمہ داروں اور حامیوں کا ماننا ہے کہ جو سیاہ فام افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے، وہ اصلاً مسلمان تھے جن کی مسلم شخصیت ان سے بتدریج چھن گئی کیونکہ انہیں دوسروں سے الگ رکھا جاتا تھا۔ مذکورہ سوسائٹی ایسے تمام سیاہ فام مسلمانوں کو دوبارہ اسلام کے دامن میں پناہ لینے کی اپیل کرتی ہے۔ ان کی کوششوں سے بہت سے سیاہ فاموں نے اسلام قبول بھی کیا ہے۔

مذکورہ بالا سوسائٹی کے زیر اثر ایک نئی تنظیم ابھری جس کا نام نیشن آف اسلام ہے۔ اس تنظیم کو ویلیس محمد نے 1930 میں قائم کیا تھا۔ اس تنظیم کے ماننے والے خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کا نظریہ ذرا عجیب تھا۔ یہ سیاہ فاموں کی برتری کے قائل تھے۔ عام طور سے وہ اپنا عقیدہ یوں بیان کرتے کہ خدا اللہ تعالیٰ ہے، سفید فام شیطان ہیں اور نگر وایشیا کے سیاہ فام ہیں جو زمین کا نمک یا cream ہیں۔ 1934 میں ایلیجا (علیجاہ) محمد اس تنظیم کے سربراہ ہوئے۔ انہوں نے ویلیس (wallace) محمد کو خدا کا اوتار قرار دیا اور اپنے پیغمبر ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایلیجا (علیجاہ) محمد کی تعلیمات سے سفید فاموں میں ہی ہلچل نہیں مچی بلکہ عام مسلمانوں میں بھی ناگواری پیدا ہوئی۔ لیکن سیاہ فاموں نے ان کے پیغام کو بڑھ کر قبول کیا۔ ان پر ''ایمان'' لانے والے زیادہ تر غریب سیاہ فام تھے لیکن بعض طلبہ اور پروفیشنلس بھی ان کے اطاعت گزار ہو گئے۔ یہاں دو لوگوں کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ یعنی مالکم ایکس اور محمد علی کلے کا۔ محمد علی کو ابتداء میں نیشن آف اسلام میں شامل نہیں کیا گیا لیکن جب وہ ہیوی ویٹ باکسنگ کے چمپئن ہو گئے تو انہیں گروپ میں شامل کر لیا گیا۔ مالکم ایکس بڑے اسکالر تھے۔ انہوں نے میڈیا میں اور کتابوں کے ذریعہ نیشن آف اسلام کی تعلیمات کو عام کیا۔ وہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ سیاہ فاموں کو سفید فاموں سے بالکل علیحدہ رہنا چاہیے۔ بعد میں بعض اختلافات کی وجہ سے وہ نیشن آف اسلام سے الگ ہو گئے اور مسلم ماسک انک (Muslim Mosque Inc.) اور

افریکن۔امریکن اتحاد تنظیم کی بنیاد ڈالی۔اس کے بعد وہ حج کے لیے مکہ گئے جہاں انہوں نے سنی اسلام کو قبول کیا اور نیشن آف اسلام کی سیاہ فاموں پر برتری اور ایسے دوسرے خیالات وافکار سے دستبردار ہو گئے۔ان کے زیر اثر بہت سے سیاہ فاموں نے سنی اسلام کی طرف مراجعت کی ہے۔

نیشن آف اسلام کے ہزاروں ممبر ہیں۔ان میں بڑا اتحاد اور ڈسپلن پایا جاتا ہے۔اپنے حقوق کی حصولیابی کے لیے اس نے 1995 میں ایک زبردست مظاہرہ کیا جسے Million Man March کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ 2000 میں بھی ایک بڑے مظاہرے میں صرف سیاہ فام نہیں بلکہ دوسرے امریکی بھی شامل تھے۔آج نیشن آف اسلام ثقافت،اعلیٰ تعلیم،معاشی آزادی اور شخصی وسماجی ذمہ داریوں جیسے اہم اصولوں کو فروغ دے رہی ہے۔اگر چہ اب نیشن آف اسلام سفید فاموں کی کٹر مخالف نہیں رہی لیکن سفید فام امریکی اب بھی ان کی سخت تنقید کرتے ہیں۔سیاہ فام اور سفید فام مسلمانوں میں غیر مقلدین کی تعداد حالیہ دنوں میں کافی بڑی ہے۔ برصغیر ہندو پاک سے امریکہ جانے والے مسلمان بالعموم دیوبندی وبریلوی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔غیر مقلد وہ ہوتا ہے جو فقہ کے چاروں اماموں میں سے کسی ایک کی پیروی کے بجائے قرآن وحدیث پہ غور کر کے اپنا راستہ خود نکالتے ہیں۔اس طرح کے غیر مقلد مسلمانوں کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ان کی تعداد 15 فیصد ہے۔

* بیسویں صدی کے اواخر میں ایک قرآنی تحریک کے بارے میں بھی سنا گیا۔اس تحریک کا نام تھا United Submitters International۔اس قرآنی تحریک کے بانی رشاد خلیفہ تھے ان کا نعرہ تھا۔قرآن، پورا قرآن، کچھ اور نہیں بس قرآن۔ابتداً بہت سے لوگ اس تحریک کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جب انہوں نے پیغمبریت جیسی ہیئت اختیار کی تو لوگ ان سے دور ہوتے گئے۔ 1990 میں انہیں قتل کر دیا گیا۔

مغرب کے اور ملکوں کی طرح امریکہ میں بھی اصلاً مسلمانوں کے اب دو ہی فرقے ہیں۔شیعہ مسلمان ہیں جن کے پاس اس وقت شمالی امریکہ کی سب سے بڑی مسجد، اسلامک سنٹر آف امریکہ کا انتظام ہے۔حسان قزوانی یہاں کے امام اور لیڈر ہیں۔ان کے خطبے شیعہ مسلمانوں میں بڑے مقبول ہیں۔ان کے خطبے بالعموم online فراہم ہوتے ہیں۔دوسرے گروپ بھی اب اس ٹیکنالوجی کا استعمال کر رہے ہیں۔شیعہ نوجوانوں کی تنظیم Young Muslim Association قزوانی کے پیغام کو عام کرنے میں بڑا رول ادا کرتی ہے۔

سنی مسلمان امریکہ میں اکثریت میں ہیں۔ان میں عرب وترک اور چینی مسلمانوں کے علاوہ برصغیر ہندو پاک سے آئے ہوئے مسلمان ہیں جو کافی تعلیم یافتہ اور خوشحال ہیں۔یہ سبھی سنی اسلام کو مانتے ہیں۔اس خطے سے شیعہ مسلمان بہت کم امریکہ میں مقیم ہیں۔سنی مسلمانوں کی اکثریت اس وقت بھاری اکثریت میں تبدیل ہوگئی جب نیشن آف اسلام کے نئے لیڈر وارث دین محمد نے اپنے والد اور دادا کے افکار وخیالات کو ترک کر کے مالکم ایکس کی طرح سنی اسلام کو اختیار کر لیا۔اب ان کی اتباع کرنے والے سیاہ فام مسلمان عقیدۃً سنی مسلمان ہیں۔یہ نیشن آف اسلام کے بانی کو خدا کا اوتار نہیں مانتے۔اب یہ سفید فاموں سے نفرت کی تبلیغ بھی نہیں کرتے بلکہ اب وہ لوگ ان کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔وارث دین محمد نے نیشن آف اسلام کا نام بدل کر ورلڈ کمیونٹی آف اسلام رکھ دیا ہے بلکہ آج اس کا نام امریکن سوسائٹی آف مسلمس ہے اور دو لاکھ سے زیادہ اس کے سرگرم کارکن یا اتباع کرنے والے ہیں۔اب ان کے مندروں بلکہ مسجدوں میں لوگ

کرسیوں پر بیٹھ کر عبادت نہیں کرتے بلکہ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں اور اسی طرح پوری نماز ادا کرتے ہیں جیسے سنی مسلمان ادا کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی کے ساتھ یہ لوگ روزے پابندی سے رکھتے ہیں اور حج بھی پابندی سے کرتے ہیں۔ بعض سیاہ فام مسلمانوں کو یہ اصلاحات پسند نہیں آئیں، سو وہ لوگ الگ ہو گئے ہیں۔ ان کے لیڈر لوئس فرح خان ہیں جو نیشن آف اسلام کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ قادیانیوں سے ان کے رشتے بڑے گہرے ہیں اور یہ لوگ اب بھی سیاہ فاموں کی برتری میں یقین رکھتے ہیں۔ سفید فاموں سے نفرت کرتے اور اپنے بانی کو خدا کا اوتار مانتے ہیں۔

آج کل ایک چھوٹا سا گروہ صوفی مسلمانوں کا پیدا ہو گیا ہے۔ بہت سے امیر اور تعلیم یافتہ مسلمان اس گروہ سے وابستہ ہیں۔ یہ صوفی لوگ اسلامک سپریم کونسل آف امریکہ کے تحت منظم ہیں۔ یہ زیادہ تر سنی مسلمانوں میں ہی کام کرتے ہیں۔ ان کا ایک انٹرنیشنل بورڈ ہے جس کے ذریعے وہ اپنے مطالبات لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ اسلام کے روحانی پہلو کو اجاگر کرتے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد کا بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے کیونکہ مذہب کی بنیاد پر اعداد و شمار جمع نہیں کیے جاتے۔ بہرحال امریکی حکومت کے ایک اندازے کے مطابق امریکی مسلمانوں کو چار بڑے گروپوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ 0.9 فیصد کل آبادی کا مسلمان ہیں اور ان میں جنوبی ایشیا سے ترک وطن کر کے آنے والے 34 فیصد، عرب دنیا سے آنے والے 26 فیصد، امریکن۔ افریقن 25 فیصد اور دوسرے درجنوں ملکوں سے آنے والے 15 فیصد ہیں۔

امریکہ میں بہت سی مسلم تنظیمیں ہیں اور ان میں سے بعضوں نے مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں اندازے لگائے ہیں۔ کسی بھی مطالعے کو سائنٹفک کہنا دشوار ہے۔ انہیں بس تخمینہ یا دعویٰ کہا جا سکتا ہے۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ امریکہ کی کل آبادی میں مسلمان 0.9 فیصد ہیں۔ یہ بھی Pew Forum کے ذریعے 2014 میں لگایا گیا اندازہ ہے۔ پیو فورم کے اعداد و شمار بظاہر معلومات افزا ہیں۔ غالباً بعض مسلمان جن میں امریکن۔ افریقن زیادہ ہیں، اپنا مذہب چھوڑ بھی رہے ہیں۔ مذہب ترک کرنے والے یہ مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار نہیں کرتے لیکن دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کرنے والے بھی کافی ہیں۔ 0.9 فیصد جو مسلمان ہیں، ان میں تقریباً 23 فیصد نو مسلم ہیں۔ یہ نو مسلم پروٹسٹنٹ عیسائی بھی ہیں اور کیتھولک بھی۔ بہت سے دہریے بھی اسلام قبول کر رہے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ امریکن۔ افریقن ہیں جو اسلام قبول کر رہے ہیں۔ پیو فورم نے نسلی بنیاد پر اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ غیر ہسپانوی سفید فام جن میں عرب اور ایرانی بھی شامل ہیں، 38 فیصد ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے مہاجرین کا فیصد 28 ہے۔ 28 فیصد سفید فام ہیں جب کہ 2007 میں یہ 32 فیصد ہے۔ 4 فیصد اسپینی نسل کے لوگ بھی ہیں اور ان کی بڑی اکثریت نو مسلم ہے۔ احسان باگی جو Kentucky یونیورسٹی سے وابستہ ہیں، نے اپنے ایک مطالعے میں نتیجہ نکالا ہے کہ نو مسلموں میں 64 فیصد سفید فام ہیں جب کہ 27 فیصد سفید فام ہیں۔ اسپینی نسل کے نو مسلم 6 فیصد اور دوسری نسلوں کے 3 فیصد ہیں۔ 11 ستمبر کے حادثے سے پہلے امریکن۔ افریقن مسلمانوں اور دوسری نسل کے مسلمانوں کے درمیان میل جول کم تھا۔ بعض ثقافتی و مسلکی اختلافات بھی تھے۔ 9/11 کے بعد دوری کم ہوئی ہے۔ حال ہی میں امریکہ آ کر بسنے والے مسلمانوں نے پہل کر کے سیاہ فام اور امریکی سفید فام مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا تاکہ مشکل حالات میں مختلف مسائل پر ان کا تعاون حاصل ہو سکے۔

اندازاً امریکہ میں چھوٹی بڑی 2106 مساجد ہیں جن میں غالباً 60 کے قریب قادیانیوں کی عبادتگاہیں ہیں۔ سب سے بڑی مسجد Islamic Centre of America ہے جو ایرانی شیعوں کے انتظام میں ہے۔ لیکن اس مسجد میں کوئی بھی مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے۔ امریکی مسلمانوں میں سے 50 فیصد سنی، 16 فیصد شیعہ، اور 22 فیصد خود کو صرف مسلمان کہتے ہیں، شیعہ یا سنی کے خانوں میں نہیں بانٹتے۔ 16 فیصد ایسے ہیں جو اس قسم کے سوالوں کا جواب ہی نہیں دیتے۔ مساجد کا انتظام شیعہ یا سنی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوسکتا ہے۔ لیکن دوسرے فرقے کے لوگوں کے نماز پڑھنے پر پابندی نہیں ہیں یعنی لوگوں میں مسلکی تعصب شاید کم ہے۔ بہت سے امام ان ملکوں سے لائے گئے ہیں جہاں کے تارکین وطن نے مساجد کی تعمیر و انتظام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جمعہ کی نماز میں مساجد میں زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ امام خطبے اردو، عربی اور بنگالی کے ساتھ انگلش میں بھی دیتے ہیں۔

امریکی مسلمان بالعموم اچھی حالت میں ہیں۔ سیاہ فام نسبتاً غریب ہیں لیکن جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے مسلمانوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ خاص طور سے پاکستان سے آئے ہوئے مسلمان کافی تعلیم یافتہ اور مالدار ہیں۔ ان کی سالانہ آمدنی اوسطاً سفید فام امریکیوں سے بھی زیادہ ہے۔ ان کی اکثریت ڈاکٹر، سائنسداں، انجینئر، پروفیسر اور ماہرین مالیات پر مشتمل ہے۔ بہت سے لوگوں نے بزنس شروع کیا ہے اور کافی کامیاب ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق 15000 پاکستانی نژاد ڈاکٹر امریکہ میں practice کرتے ہیں اور یہ لوگ کافی مالدار ہیں۔ کئی ہزار پاکستانی Millionaire بتائے جاتے ہیں۔ پاکستان کے شاہد خان ڈالر میں ارب پتی ہیں۔ یہ امریکہ اور برطانیہ کے فٹبال کلبوں کے مالک ہیں۔ پاکستانیوں سمیت 45 فیصد تارکین وطن مسلمانوں کی سالانہ آمدنی 50000 ڈالر سے زیادہ ہے۔ جب کہ قومی سطح پر یہ فیصد صرف 44 ہے۔ مہاجرین مسلمانوں کی آبادی کے کل 19 فیصد لوگ ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ ہے جب کہ قومی فیصد 17 فیصد ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مہاجر مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ٹیکنالوجی، تعلیم یعنی کالجز اور یونیورسٹیز، طب، قانون، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کارپوریٹ ورلڈ میں کام کر رہی ہے۔

نیویارک ٹائمز کے مطابق 2005 میں 96000 مسلمانوں نے امریکی شہریت حاصل کی جو گزشتہ دو دہائیوں میں کسی بھی سال کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب ہوا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کی سب سے بڑی وجہ سیاہ فام اور اسپینی نسل کے لوگوں کا جیلوں میں اسلام کا قبول کرنا ہے۔ یہ لوگ جب جیل لائے جاتے ہیں تو غیر مسلم ہوتے ہیں۔ جیل کی تنہائیاں انہیں سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ اس سوچ بچار کے نتیجے میں اکثر مذہب سے قریب آجاتے ہیں۔ ان میں سے 80 فیصد اسلام اور باقی عیسائیت اور دوسرے مذاہب کو اختیار کرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کی مذکورہ رپورٹ کے مطابق 17 سے 20 فیصد یعنی 350000 قیدی مسلمان ہیں۔ تقریباً یہ تمام قید کیے جانے کے وقت مسلمان نہیں تھے بلکہ انہوں نے جیل میں اسلام قبول کیا ہے۔ ان میں سے بھاری اکثریت بلاشبہ سیاہ فام مسلمانوں کی ہے لیکن حالیہ دنوں میں ہسپانوی نسل کے لوگوں نے بھی جیلوں میں بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔

امریکی مسلمان اگرچہ تعداد میں کم ہیں لیکن وسیع و عریض مسلم دنیا کی ثقافتی و مسلکی تکثیریت یہاں پائی جاتی ہے۔ یہاں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس قسم کے اختلافات اور تشدد یہاں نظر نہیں آتا جو پاکستان، عرب دنیا اور ہندوستان کے بعض شہروں میں نظر

آتا ہے۔اسی طرح سنی مسلمانوں میں چاروں ائمہ کے ماننے والے ہیں اور سلفی بھی،صوفی بھی ہیں، کلچرل گروپ بھی ہیں اوراخوان المسلمون جیسی عالمی تنظیمیں بھی۔اچھی بات یہ ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر اور مسلک کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ مغربی تکثیری معاشرے کی دین بھی ہوسکتی ہے یا مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ قوت برداشت ان میں پیدا ہوئی ہے۔

مہاجر مسلمان 9/11 سے قبل امریکی سیاست سے بالعموم دور رہتے تھے۔مگر اس حادثے کے بعد وہاں جو حالات پیدا ہوئے،اس کی روشنی میں مسلمانوں نے سیاست میں دلچسپی دکھائی ہے۔ 2000 کے صدارتی انتخاب میں 80 فیصد مسلمانوں نے ریپبلکن امیدوار جارج بش کو ووٹ دیا تھا کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے حریف الگور یہود نواز ہیں۔لیکن جب بش نے افغانستان اور عراق پر حملہ کیا اور ان کی پالیسیوں اور بیانات کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں مناسب نہیں ہیں تو اکثر مسلمانوں نے ڈیموکریٹک امیدوار جان کیری کو ووٹ دیا۔لیکن جب بارک اوباما نے صدارتی الیکشن لڑا تو مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے انہیں ووٹ دیا۔بعض شہروں/علاقوں میں تو بارک اوباما کو مسلمانوں کا 90 فیصد ووٹ ملا۔لیکن مسلمان تعلیم یافتہ اور مالدار ہونے کے باوجود یہودیوں کے جیسا سیاسی وزن نہیں رکھتے۔اس کی مختلف سیاسی وسماجی اسباب ہیں۔اول یہ کہ مسلمان مختلف شہروں میں بٹے ہوئے ہیں اور کہیں بھی ان کا ووٹ فیصلہ کن نہیں ہے۔دوسرے مسلمان یہودیوں کی طرح لابی بنا کر کام کرنے کا ہنر ابھی نہیں سیکھ سکے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ انجینئر، ڈاکٹر، پروفیسر اور دوسری نوعیتوں کے پروفیشنل ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور سیاسی وسوشل کاموں کے لیے ان کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔لیکن جس طرح بعض افراد اور گروپ کام کررہے ہیں،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں مسلمان اپنی سیاسی بے وزنی کم یا ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

9/11 کے باوجود بہت سے امریکی اب بھی مسلمانوں کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ایک پولنگ تنظیم Zogby نے 2004 میں ایک sample survey کیا تھا۔سروے میں 1846 لوگوں کو انٹرویو کیا گیا تھا۔سروے میں پایا گیا کہ مسلمان دوسرے امریکیوں کی بہ نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور مالدار ہیں۔ 59 فیصد مسلمانوں کے پاس کالج ڈگری تھی۔ Zogby سروے کا حوالہ دیتے ہوئے Wall Street Journal نے اپنے 2005 کے ایک اڈیٹوریل (اداریہ) میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ زیادہ تر مسلمان پروفیشنل میدانوں میں نوکری کرتے ہیں اور ہر تین میں سے ایک مسلمان کی سالانہ آمدنی 75000 ڈالر سے زیادہ تھی۔اداریے میں یہ بھی لکھا تھا کہ بحیثیت مسلمان اور بحیثیت امریکی بھی،مسلمان 'رول ماڈل' کا درجہ رکھتے ہیں۔

یوروپ کے برعکس امریکی مسلمان خود کو سیاسی حاشیے پر نہیں محسوس کرتے۔وہ اب سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔وہ کھل کر افغانستان اور عراق سے متعلق امریکی پالیسی کی دلائل سے مخالفت کرتے ہیں۔اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کے اندر انتہا پسندی کے جذبات کو پنپنے نہیں دیتے۔اگر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اپنا کوئی انتہا پسندانہ خیالات اور عزائم رکھتا ہے تو وہ خود ہی پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔ 9/11 کے بعد جو منفی خیالات مسلمانوں کے بارے میں عام ہوئے تو ان کے ازالے کے لیے مسلمانوں نے خود بڑھ کر اقدامات کیے اور بین المذاہب ڈائیلاگ کا اہتمام کیا تا کہ مسلمانوں اور غیر مسلم امریکیوں کے تعلقات میں بہتری پیدا ہو اور سماج میں تناؤ کی کیفیت پیدا نہ ہو۔

مسلمانوں کی موجودگی اور اہمیت کو غیر مسلم امریکن بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔چنانچہ اب ان کی خاص ضروریات مثلاً نماز اور وضو

وغیرہ کے لیے بعض پبلک مقامات پر انتظام ہونے لگا ہے۔ بعض لوگ جہاں ایسے انتظامات کی تنقید کرتے ہیں، وہیں دوسرے لوگ اسے ایک سماجی وثقافتی ضرورت سمجھ کر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ امریکی فوج میں 15 ہزار مسلمان مختلف سطحوں پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر چہ حالیہ دنوں میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا گیا ہے جس کا اندازمسلمانوں کی شکایات سے ہوتا ہے۔ لیکن ایف بی آئی کی ایک رپورٹ کے مطابق یہ نفرت کچھ لوگوں تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں اور سیاہ فاموں کی بہ نسبت مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز یانسلی حملے بہت کم ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کی بہت سی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ سب سے بڑی تنظیم اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA) ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ امریکہ کی کل مساجد میں سے 27 فیصد اس سے وابستہ ہیں۔ ISNA کے زیادہ تر ممبر تارکین وطن ہیں۔ اس کا سالانہ کنونشن امریکی مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ اجتماع ثقافتی، تعلیمی اور سماجی نوعیت کا ہوتا ہے اور تارکین وطن مسلمانوں میں کافی مقبول ہے۔

دوسری بڑی تنظیم امریکن۔ افریقن مسلمانوں کی ہے جس کے سربراہ وارث دین محمد ہیں۔ یہ Nation of Islam سے نکلا ہوا اصلاح شدہ گروپ ہے۔ اس گروپ کے پاس بھی امریکہ کی 19 فیصد مساجد ہیں۔ یہ لوگ بھی کافی منظم ہیں۔ پہلے ان کے اور ترک وطن کر کے آنے والے مسلمانوں کے درمیان ایک دوری سی تھی مگر بتدریج اس میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب عقیدے کے لحاظ سے یہ عام مسلمانوں سے بہت قریب ہیں۔ دونوں قسم کے مسلمان اب آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

تیسری اہم تنظیم Islamic Circle of North America ہے۔ اس تنظیم نے اپنے دروازے تمام مسلمانوں کے لیے کھول رکھے ہیں چاہے وہ بلیک مسلم ہوں، تارکین وطن ہوں یا نومسلم، یہ گروپ خود آگے بڑھ کر مسلمانوں کے دوسرے گروپوں سے ملاقات کرتا اور ربط وضبط بڑھاتا ہے۔ یہ لوگ غیر مسلموں میں بھی سرگرم عمل ہیں۔ لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے اور بین المذاہب مکالمے کا بھی حصہ ہیں۔ ان کی ایک اور تنظیم Young Muslims ہے جو مسلمان طلبہ کی کیمپس میں مدد کرتی ہے۔

علماء اور اسکالرس پر مشتمل ایک تنظیم بھی ہے جس کا نام اسلامک اسمبلی آف نارتھ امریکہ ہے۔ یہ گروپ دعوت اسلامی کے کام میں مصروف ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے لیے بھی کام کرتا ہے۔ جدید امریکی معاشرے میں ایک اچھے مسلمان کی حیثیت سے زندگی کیسے گزاری جائے اور اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات اور مسائل کا یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں حل بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ 9/11 کے بعد اس گروپ پر پابندی لگ گئی تھی۔ مگر ان لوگوں نے اب خود کو دوسری تنظیمیں قائم کر کے منظم کر لیا ہے مثلاً ٹیکسس دعوہ اور المغرب انسٹی ٹیوٹ وغیرہ۔

مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن امریکہ کی ایک پرانی تنظیم ہے۔ اسی تنظیم کے اولڈ بوائز نے ISNA اور ICNA کو قائم کیا ہے۔ MSA کا اصل کام تعلیم کے لیے امریکہ آنے والے طلبہ کی مدد کرنا، خاص طور سے ان کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ لیکن MSA سماجی کام بھی کرتا ہے۔ یہ رمضان کے مہینے میں خصوصی مہم چلا کر بے گھروں کے لیے فنڈ جمع کرتے ہیں۔

اسلامک انفارمیشن سینٹر ایک عوامی تنظیم ہے۔ یہ گروپ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے لوگوں کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر پیش

کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سارا کام مختلف کمیٹیوں اور رضا کاروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ حجۃ الاسلام سید رفیق نقوی اس تنظیم کے سربراہ ہیں۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، ایک مسلم تھنک ٹینک ہے۔ اس نے اسلامائزیشن آف نالج کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ اس کا اصل کام علمی ہے۔ یہ سمینار کراتے، لکچر منعقد کرتے، ریسرچ کرتے اور ریسرچ کو شائع بھی کرتے ہیں۔ ان کی سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ریسرچ اور پبلی کیشن دونوں کا معیار اعلیٰ درجے کا ہے۔ یہ ایک معیاری ریسرچ جرنل بھی شائع کرتے ہیں یعنی Americal Journal of Islamic Social Sciences اس ادارے سے مسلم دنیا کی بعض اہم شخصیات وابستہ ہیں۔

کونسل آن امریکن-اسلامک ریلیشن (CAIR) مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جو انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ تنظیم امریکی وزارتِ خارجہ کے ساتھ مسلم مسائل پر مذاکرات کرتی اور مسلمانوں کے حقوق کے حق میں آواز اٹھاتی ہے۔ پہلے اس کا مقصد امریکہ کے سامنے مسلمانوں اور اسلام کی صحیح اور بہتر تصویر پیش کرنا تھا۔ اس تنظیم کے ممبر اور اس کے قائدین اعتدال پسند ہیں اور صرف امریکی پالیسیوں کی تنقید نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والے انتہا پسندانہ اقدامات کی بھی مذمت کرتے ہیں۔

مسلم پبلک افیئرس کونسل (MPAC) ایک ایسی تنظیم ہے جو عوامی فلاح و بہبود کے پروگراموں اور اس سے متعلق امریکی پالیسیوں پر نظر رکھتی ہے۔ اس تنظیم کا ہیڈ کوارٹر لاس اینجلس میں اور آفس واشنگٹن میں ہیں۔ یہ تنظیم 1988 میں قائم ہوئی اور اس کا مقصد ہے ایک امریکن مسلم تشخص کو فروغ دینا، زمینی سطح کی تنظیمیں قائم کرنا اور مرد و عورت پر مبنی ایک ایسی تنظیم بنانا جو زمینی سطح پر کام کرے۔ یہ تنظیم کوشش کرتی ہے کہ ماس میڈیا میں مسلمانوں کی بہتر امیج پیش کی جائے۔ یہ امریکی عوام کو جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ اسلام ایک اعتدال پسند مذہب ہے۔ یہ تنظیم اس امر کی بھی کوشش کرتی ہے کہ دوسری مختلف قوموں اور تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرے، ان سے بہتر تعلقات بنائے اور اتحاد قائم کرے اور امریکہ کے پالیسی سازوں اور فیصلے لینے والی سیاستدانوں اور افسران کے ساتھ ڈائیلاگ کرے۔

2012 میں ایک نئی مسلم تنظیم قائم ہوئی جس کا نام ہے امریکن مسلم پولیٹکل ایکشن کمیٹی۔ اس کے سربراہ محمد ربی عالم ہیں جو بنگلہ دیش سے ترکِ وطن کر کے آئے ہیں اور امریکی سیاست میں سرگرم ہیں۔ آج یہ غالباً امریکی مسلمانوں کی ایک بہت بری تنظیم ہے جو انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے وقف ہے، اگرچہ اس کا ہیڈ کوارٹر Kansas city میں ہے لیکن اس کے علاقائی آفیز نیویارک اور Madison میں بھی ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ایک سیاسی تنظیم ہے، اس کے دروازے تمام مسلمانوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور یہ اس بات کے لیے کوشاں ہے کہ امریکی مسلمان وہاں کے سماج میں ایک طاقتور آواز بن کر ابھریں۔ 11 ستمبر 2013 کو اس نے ملین مسلم مارچ کا اہتمام کیا تھا۔ یہ مظاہرہ واشنگٹن میں ہوا اور کافی کامیاب تھا۔

9/11 کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں عام امریکیوں کی رائے بہت خراب ہو گئی تھی۔ اب قدرے بہتری آئی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے آگے بڑھ کر امریکی سماج میں اپنی بہتر امیج پیش کرنے کی پہل کی ہے اور لوگوں سے مل رہے ہیں اور ایسے پروگرام کرتے ہیں جن میں غیر مسلموں کو بلاتے وار ان کے ساتھ ڈائیلاگ کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا بالخصوص مسلم دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، یا مسلم ممالک کے ساتھ کبھی کبھی امریکی فوجیں برسرپیکار ہو جاتی ہیں تو امریکن پبلک کی رائے مسلمانوں کے

بارے میں تیزی سے منفی ہو جاتی ہے۔

امریکی مسلمان بالعموم امریکہ میں اپنی حالت سے خوش ہیں۔ وہ وہاں کے سماج میں اب مل جل کر رہ رہے ہیں۔ بعض شکایات ہیں لیکن تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کے اسباب پر غور کرتے اور ایسا لائحہ عمل بناتے ہیں جس سے ان کے بارے میں لوگوں کے منفی خیالات دور ہو جائیں۔ مسلمانوں کا امریکی جمہوریت اور تکثیریت میں مکمل اعتماد ہے۔ 2011 ایک گیلپ سروے میں پایا گیا کہ 93 فیصد امریکی مسلم امریکہ، اپنے ملک کے وفادار ہیں۔ اگرچہ 9/11 کے بعد مسلمانوں کو زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میڈیا میں ان کی امیج خراب کی گئی ہے۔ ان کے خلاف نسلی منافرت کے حملے ہوئے ہیں، ان کے خلاف امتیاز برتا گیا ہے، انہیں شبہے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مختصراً اسلاموفوبیا میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے صبر کا مظاہرہ کیا، ہر مصیبت کا حکمت اور تدبر سے سامنا کیا۔ لوگوں نے خود قرآن کو پڑھنا شروع کیا، اپنے مذہب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خود کو وسیع امریکی سماج میں Integrate کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کوششوں کے اچھے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ امریکی مسلمانوں کے سامنے مسائل ہیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ان مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت ہے۔

معلومات کی جانچ

1- امریکہ میں مسلم تنظیموں اور ان کے رول پر ایک نوٹ لکھیں۔

2- امریکن-افریقی مسلمانوں پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

3- جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے تارکین وطن کی امریکی سماج میں حیثیت سے بحث کریں۔

8.4 مسلمان کناڈا میں

کناڈا امریکہ کا ایک اہم پڑوسی ملک ہے۔ ملک کی معیشت بہت اچھی ہے اور لوگ بھی اچھے ہیں۔ عیسائیت کے بعد اسلام یہاں دوسرا بڑا مذہب ہے لیکن دونوں کے ماننے والوں کی تعداد میں فرق بہت زیادہ ہے۔

کناڈا میں مسلمانوں کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ کناڈا کا قیام 1867 میں عمل میں آیا اور چار سال بعد 1871 کی مردم شماری میں پایا گیا کہ پورے ملک میں صرف 13 مسلمان ہیں جو یوروپ سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔ لیکن بتدریج پھر مسلمان یہاں آنے لگے اور آج ان کی تعداد ایک ملین سے زیادہ ہے۔ سب سے زیادہ شروع میں مسلمان بوسنیا سے آئے۔ یہ جنگ عظیم اول کے آغاز سے پہلے ہی یہاں آچکے تھے۔ Edmonton میں پہلی مسجد 1938 میں بنائی گئی۔ اس وقت ملک میں صرف 700 مسلمان تھے جو یوروپ، خاص طور سے بوسنیا سے آئے تھے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کناڈا میں مسلمانوں کی تعداد مزید بڑھنے لگی اور جب 1960 کی دہائی کے اواخر اور 1970 کی دہائی کے آغاز میں یہ شرط ہٹا دی گئی کہ کناڈا میں بسنے بسانے کے لیے یوروپین کو ترجیح دی جائے گی تو دوسرے ملکوں کے مسلمان بھی یہاں آنے لگے۔

چونکہ یہاں آنے والے مسلمانوں میں بوسنیا کے مسلمان اولیت کا مقام رکھتے ہیں، اس لیے آغاز میں مساجد کے قیام میں انہوں نے ہی بڑھ

چڑھ کر حصہ لیا۔ بتدریج مسلمانوں کے دوسرے گروپوں نے بھی مساجد اور اسلامک سینٹر قائم کرنے شروع کر دیے۔

کناڈا میں ایک بہت پرانا مدرسہ بھی پایا جاتا ہے جسے مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے ایک شاگرد مولانا مظہر عالم نے 1983 میں قائم کیا۔ اس کا نام الرشید اسلامک انسٹی ٹیوٹ ہے۔ یہاں حفظِ قرآن کا انتظام ہے۔ دوسرے اسلامی موضوعات ومضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جنھیں پاس کرنے کے بعد ایک طالبعلم اسلامی اسکالر اور امام بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔

کناڈا میں مسلمانوں کی تعداد 1970 کے بعد بڑھنا شروع ہوئی۔ 1971 کی مردم شماری کے مطابق مسلمان یہاں 33000 تھے۔ دس سال بعد 1981 کی مردم شماری نے پایا کہ مسلمان 98000 ہو گئے ہیں۔ 1991 کی مردم شماری میں پایا گیا کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر 253265 ہو گئی ہے۔ اس دوران مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا اور خاص طور سے اپنی مذہبی ضرورت کی تکمیل کے لیے انہوں نے مساجد اور اسلامک سینٹرس قائم کرنے شروع کر دیے تھے۔ 2001 کی مردم شماری سے پتہ چلا کہ کناڈا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر 579000 ہو گئی ہے۔ اس وقت اندازہ لگایا گیا تھا کہ 2006 کے آتے آتے یہ تعداد بڑھ کر 800000 ہو جائے گی۔ مئی 2013 تک اندازہ لگایا گیا تھا کہ یہ تعداد بڑھ کر ایک ملین سے زیادہ ہو جائے گی۔ دراصل 2011 کی مردم شماری میں ہی مسلمانوں کی تعداد 1053945 ہو گئی تھی، یعنی مسلمان کل آبادی کا 3.2 فیصد تھے۔ کہا جا رہا ہے کہ اسلام سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ لیکن ایسا شاید اس لیے ہو رہا ہے کہ مسلمان بڑی تعداد میں ترکِ وطن کر کے یہاں آباد ہو رہے ہیں۔

کناڈیائی مسلمان زیادہ تر بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ گریٹر ٹورنٹو میں مسلمان 7.7 فیصد تھے اگرچہ شیعہ مسلمان بھی کناڈا میں پائے جاتے ہیں لیکن بھاری اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے۔ صوبہ Ontario جس میں ٹورنٹو واقع ہے، میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق یہاں 424925 مسلمان تھے۔ یہ مسلمان دنیا کے تقریباً تمام ہی مسلم ممالک سے آئے ہوئے ہیں۔ لیکن ہندوستان، پاکستان، ایران اور مصر وعرب سے آئے ہوئے مسلمان زیادہ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ Ottawa کناڈا کا دارالحکومت ہے اور یہاں مسلمانوں کی آبادی 2011 میں 65880 تھی۔ یہ مسلمان لبنان، جنوبی ایشیا اور صومالیہ ومصر سے آئے ہیں۔ گریٹر مونٹریل میں مسلمانوں کی آبادی 221,040 تھی۔ ان مسلمانوں میں بڑی تعداد مراکشی نسل کی تھی۔ الجزائر اور لبنان کے مسلمان بھی یہاں قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ ایسے ہی دوسرے شہروں اور علاقوں میں بھی مسلمان اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور یہ مسلمان پوری مسلم دنیا سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔

کناڈیائی مسلمانوں کی بڑی اکثریت باہر سے آئی ہے۔ بعض لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ لوگوں کے یہاں آنے کی مختلف وجوہات ہیں۔ کچھ اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے ہیں۔ بعض بہتر معاشی مواقع کے لیے آئے ہیں۔ تحفظ، روزگار اور اہل خاندان کے ساتھ رہنے کے لیے بھی لوگ یہاں آئے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جنھیں اپنے ملکوں میں مذہبی وسیاسی اسباب کی بنا پر ستایا جا رہا تھا اور جہاں انہیں آزادیٔ اظہار رائے حاصل نہیں تھی، تو وہ یہاں آ گئے ہیں۔ 1980 کی دہائی میں جب لبنان خانہ جنگی میں جل رہا تھا تو وہاں کے عیسائیوں کے ساتھ بہت سے مسلمان بھی کناڈا میں آ کر آباد ہو گئے۔ اسی طرح 1990 کی دہائی میں صومالیہ اور بوسنیا میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت سے مسلمان کناڈا آ کر آباد ہو گئے۔ انہیں وجوہات کی وجہ سے حالیہ دنوں میں عراق سے بھی کافی لوگ یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو تقریباً مسلم دنیا کے ہر ملک نے تارکین وطن کو کناڈا میں بھیجا ہے۔ آپ اسے مسلم دنیا کا ایک مختصر سا آئینہ کہہ سکتے ہیں۔

کناڈا میں شرح پیدائش 1.6 ہے جب کہ مسلمانوں میں یہ 2.4 ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی آبادی روزافزوں ہے۔

چونکہ زیادہ تر لوگ سروس کرتے ہیں، اس لیے گھروں میں کھانا تیار کر کے کھانے کا رواج کم ہے۔ لوگ ہوٹلوں میں کھاتے یا خاصی بڑی تعداد ہوٹلوں کے کھانے پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں حلال ریسٹورنٹ کی بھرمار ہے اوران ہوٹلوں کا کناڈیائی مسلمانوں کی معاشی بہتری میں بڑا رول ہے۔

کناڈا کا چارٹر آف رائٹس اینڈ فریڈم ہر شہری کو مذہبی حق دیتا ہے یعنی وہ کسی بھی مذہب پر عمل کرسکتا ہے، اس کی تبلیغ واشاعت کرسکتا ہے یا اس کا دفاع کرسکتا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کو کسی بھی قسم کے امتیاز کا سامنا نہیں کرنا پڑرہا ہے، انہیں کھلا ہوا ماحول ملا ہے جس کا فائدہ اٹھا کر وہ ایک بہترین زندگی بسر کررہے ہیں۔ چارٹر کے سیکشن 2A کی رو سے اسکولوں اور آفیسز میں حجاب پہننے کی اجازت ہے، اگرچہ حال میں Quebec نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان عورت صرف مسلمان عورت ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہے تو ڈاکٹروں کے لیے لازمی نہیں ہے کہ اس کا علاج کریں یا اس کے لیے لیڈی ڈاکٹر اور نرس کا اہتمام کریں۔ حالیہ دنوں میں بعض مسلمانوں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مسلم خاندانوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کو سلجھانے کے لیے فیملی ڈسپوٹ کورٹ (Family Dispute Court) قائم کیے جائیں۔ لیکن اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے بھی اور غیر مسلم عوام کی طرف سے بھی۔ یہ تجویز رکھنے والے مسلمانوں نے تنازعہ کو دیکھتے ہوئے اپنی تجویز واپس لے لی۔ مخالفین کو اندیشہ تھا کہ اس طرح یہاں بتدریج شریعہ کوڈ لاگو ہوجائے گا۔

کناڈا میں مسلمانوں کی بے شمار تنظیمیں ہیں۔ یہ دراصل ہر شہر کے مسلمانوں کی تنظیمیں ہیں۔ یہ بھی ہے کہ سارے ہی نسلی گروہ اپنے اپنے ملکوں کے لوگوں یعنی ہم وطنوں سے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ بعض تنظیمیں دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کا نیشنل کیریکٹر اور مشن ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ ابھی کسی بھی تنظیم کو سارے کناڈیائی مسلمانوں کا ترجمان نہیں کہا جاسکتا۔

معلومات کی جانچ

1- کناڈا میں مسلمانوں کی آمد کب ہوئی؟

2- کناڈا میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے؟

3- کناڈیائی مسلمانوں کی سماجی وتعلیمی حالت کیسی ہے؟

8.5 مسلمان لاطینی امریکہ میں

لاطینی یا جنوبی امریکہ مدتِ دراز تک اسپین کی کالونی رہا اور اسپین نے اس وسیع علاقے کو اس وقت نوآبادی بنایا جب وہ خود اپنی سرزمین سے مسلمانوں کو یا تو جبراً نکال رہا تھا یا زبردستی انہیں عیسائی اور غلام بنایا جارہا تھا، چنانچہ مدت دراز تک جنوبی امریکہ کے دروازے مسلمانوں پر بند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی وہاں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان شاید 16 ویں یا 17 ویں صدی ہی میں جنوبی امریکہ آگئے تھے مگر اپنے اسپینی آقاؤں کے ساتھ جنہوں نے انہیں غلام اور جبراً عیسائی بنالیا تھا۔ لیکن اس ضمن میں حتمی ثبوت نہیں ملتے۔ لیکن یہ پتہ چلتا ہے کہ 18 ویں صدی کی غلاموں کی تجارت جب شروع ہوئی تو بعض غلام جنوبی امریکہ بھی لائے گئے

خصوصاً ان علاقوں میں جہاں آج، ہیٹی اور ڈومینکن ریپبلک قائم ہیں۔ ان نئے غلاموں کو بھی زبردستی عیسائی بنایا گیا لیکن پھر بھی وہ اپنے بعض رسوم ورواج کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جس کی وجہ سے آج بھی ہیٹی کے کلچر میں ان غلاموں کی ''مسلمانیت'' کے آثار نظر آتے ہیں۔ بہر حال کوئی قدیم مسلم آبادی یا گروپ ہیٹی یا دوسرے ممالک میں نظر نہیں آتا۔ مسلمان ہیں بھی تو وہ جو یہاں بیسویں صدی وغیرہ میں آئے۔ مثلاً بہت سے عرب مسلمان جنوبی امریکہ بیسویں صدی میں آئے اور زیادہ تر ہیٹی میں یا آس پاس کے علاقوں اور ملکوں میں آباد ہوئے۔

1920 میں مراکش سے کچھ عرب خاندان، 20 کے قریب، آکر ہیٹی میں آباد ہوئے اور ان کی اولادیں آج بھی وہاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آج ہیٹی کے مسلمانوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو یہیں کے باشندے ہیں۔ مراکش سے آئے مسلمان تعداد میں مقامی مسلمانوں سے کم ہیں۔ مراکشی اور مقامی مسلمان کافی غریب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مسجد تک نہ بنا پا رہے تھے۔ پہلی مسجد 1985 میں وجود میں آئی جب ایک گھر کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور اس پر ایک مینارہ بنایا گیا۔ 2000 میں پہلا مسلمان ہیٹی کے Chamber of Deputies کے لیے منتخب ہوا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے Marginalization کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہیٹی میں آج بھی مسلمان ایک اندازے کے مطابق 3000 اور دوسرے دعوے کے مطابق 5000 ہے، چنانچہ مسلمانوں کی ایک یا دو تنظیمیں ہیں جو ہیٹی اور دوسرے ممالک میں اپنی بساط کے مطابق کام کرتی ہیں۔ ان میں اسلامک آرگنائزیشن آف لاطینی امریکہ ہے۔ دوسری بلال مسجد ہے۔ بلال مسجد مسلمانوں کی تعلیم کا بھی مناسب انتظام کرتی ہے۔ اسی طرح اول الذکر تنظیم بھی مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہے۔ 3 یا 5 ہزار ہیٹین مسلمانوں میں اکثریت سنیوں کی ہے۔ بعض قادیانی بھی ہیں۔

میکسیکو دوسرا ملک ہے جہاں تھوڑے بہت مسلمان پائے جاتے ہیں۔ عمر ویٹسن (Omar Wetson) ایک برطانوی نژاد مسلمان ہیں جو سنٹرل اور شمالی میکسیکو کے اہم شہروں میں کافی سرگرم ہیں۔ صوبہ موریلوس (Morelos) میں ایک اسلامی سنٹر کی تعمیر ہوئی ہے جس کا نام دارالسلام ہے۔ یہ اسلامی سنٹر مسجد کا کام بھی دیتا ہے اور شادی وغیرہ کی تقریبات بھی یہاں انجام پاتی ہیں۔ یہاں حلال کھانا خصوصاً حلال گوشت کھانا اور حاصل کرنا سخت مشکل ہے۔ اسلامک سنٹرل جس کا اوپر ذکر ہوا اور جو مسجد کے بطور بھی کام کرتا ہے، ایک ہوٹل Oasis چلاتا ہے جو حلال کھانے اور گوشت کا انتظام کرتا ہے۔ ایک مختصر گروپ ہے جو خود کو صوفی مسلمان کہتا ہے۔ ان کے اور عام مسلمانوں کے درمیان بعض امور کو لے کر تنازعات بھی جنم لیتے ہیں۔ ایک سلفی تنظیم بھی ہے جس میں مصر اور دوسرے مغربی ایشیائی ممالک سے آئے ہوئے عرب سرگرم عمل ہیں۔ میکسیکو کے بعض لوگوں نے اسلام بھی قبول کیا ہے۔ ایسے مسلمانوں میں سے ایک عیسیٰ روجس ہیں جنہوں نے مدینہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی ہے۔

جنوبی امریکہ کے دوسرے ملکوں کا حال بھی کم و بیش ویسا ہی ہے جو ابھی بیان ہوا ہے۔ حیرت انگیز سچائی یہ ہے کہ لاطینی امریکہ سے زیادہ لاطینی نسل کے مسلمان امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ لاطینی نسل کے لوگوں کی اکثریت رومن کیتھولک ہے لیکن ایک اچھی خاصی تعداد نے حالیہ دنوں میں اسلام قبول کر لیا ہے۔ لاطینی مسلمانوں کی اکثریت نے اسلام اس کی سچی تعلیمات اور سادگی کی وجہ سے قبول کیا ہے۔ بعض لاطینی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ایمان اس لیے لائے کہ اسلامی اقدار اور لاطینی کلچر کی اقدار میں کافی مماثلت ہے، مثلاً دونوں کے یہاں سماجی مساوات، بھائی چارے اور اتحاد کے لیے ادب واحترام پایا جاتا ہے۔ دونوں کے یہاں خاندان، تعلیم اور مذہب کی بھی بہت اہمیت

ہے۔ بعض دوسرے لاطینی باشندوں نے اسلام اس لیے قبول کیا کہ عیسائی عقائد مثلاً تثلیث، اصل گناہ یا عورت کے سرچشمہ گناہ ہونے جیسے خیالات ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ان کی بہ نسبت اسلام انہیں عقل کو اپیل کرنے والا مذہب نظر آیا، سو وہ مسلمان ہو گئے۔ بعض اس لیے مسلمان ہو گئے کہ چرچ کی بہ نسبت انہوں نے اسلام کو غریبوں کا زیادہ ہمدرد پایا۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام کی غریب پروری کی وجہ سے مسلمان ہو گئے۔ بعض پڑھے لکھے لاطینی باشندے اس لیے مسلمان ہو گئے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تاریخی طور پر وہ مسلمان ہیں جنھیں زبردستی عیسائی بنالیا گیا تھا۔ اس لیے وہ اب آج کی کھلی فضا میں اپنے اصل مذہب، اسلام کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔

چونکہ امریکہ میں مردم شماری کے وقت لوگوں سے ان کے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا اس لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ وہاں ہسپانوی نسل کے مسلمانوں کی واقعی تعداد کیا ہے۔ اس لیے لوگ مختلف طریقے اپنا کر اندازے لگاتے ہیں۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق ہسپانوی نسل کے مسلمانوں کی امریکہ میں تعداد 70 ہزار سے دو لاکھ تک ہے جو زیادہ تر نیویارک، نیوجرسی اور فلوریڈا وغیرہ میں آباد ہیں۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تعداد بمشکل 40 یا 50 ہزار ہے۔ 2000 میں ISNA نے اندازہ لگایا تھا کہ ہسپانوی مسلمانوں کی تعداد 40000 ہے۔ شکاگو میں قائم امریکن مسلم کونسل کے ڈائریکٹر علی خاں کا کہنا ہے کہ اندازاً ہسپانوی مسلمانوں کی تعداد 2 لاکھ تک ہے۔ ان میں اکثریت عورتوں کی ہے۔

سچائی یہ ہے کہ یوروپ اور شمالی امریکہ کی بہ نسبت لاطینی امریکہ کے مسلمانوں کا ٹھیک سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے حالیہ دنوں میں اس طرف توجہ دی ہے جو خاص طور سے اس قسم کے سوالوں کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کریں گے کہ لاطینی امریکہ میں اسلام کب اور کیسے آیا، لوگوں نے اسلام کیوں اور کب قبول کیا اور یہ کہ عرب دنیا سے آئے ہوئے مسلمانوں سے ان کا ربط و تعلق کیسا ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ کم از کم بیسویں صدی سے لاطینی امریکہ میں مسلمان ایک چھوٹی تعداد میں موجود ہیں اور اتفاق یہ ہے کہ ان میں ہسپانوی نسل کے لوگ بھی شامل ہیں جو کبھی زبردستی عیسائی بنالیے گئے تھے۔ یہ لوگ آج امریکہ میں کام کر رہے ہیں جہاں وہ نئی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اصل کا پتہ لگا رہے ہیں اور اسلام قبول کر رہے ہیں۔

8.6 خلاصہ

شمالی امریکہ اور کناڈا میں مسلمان نسبتاً زیادہ ہیں اور منظم بھی۔ شمالی امریکہ کے مسلمانوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی اہمیت بھی ہے اور کافی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے انہیں نظر انداز کرنا مشکل بھی ہے۔ شمالی امریکہ کے مسلمانوں کی اصل اور تاریخ پر کافی ریسرچ بھی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے بارے میں تقریباً ساری ضروری معلومات میسر ہیں۔ یہی بات کناڈا کے بارے میں بھی کم وبیش کہی جاسکتی ہے، لیکن لاطینی ملکوں میں مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں بڑے کم مطالعات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے ان کے بارے میں معلومات یا اطلاعات کم بھی ہیں اور ناقص بھی۔

8.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں لکھیے

1- امریکن-افریقن مسلمان کون ہیں۔ ان کی اصل اور موجودہ حالت پر مضمون لکھیے۔

2- 9/11 کے بعد امریکہ کے مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مسلمانوں کی کوششوں پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے

3- کیا اپنی اعلیٰ تعلیم اور معاشی ترقی و خوشحالی کی بنیاد پر مسلمان امریکہ میں یہودیوں جیسی اثر انداز لابی بن سکتے ہیں؟

8.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ ثروت صولت: مسلمان اقلیتیں

2۔ آباد شاہ پوری: روس میں مسلمان قومیں

M. Ali Kettani: Muslim Minorities in the World Today-3

Sulayman Nyang: Islam in the United States of America-4

Yuonne Yezbeck Haddad & Jane I Smith: Muslim Minorities in the West-5

اکائی 9: مسلمان افریقہ میں

اکائی کے اجزاء

9.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد براعظم افریقہ کے بعض اہم ممالک میں مسلمانوں کی موجودگی اور زندگی کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے۔ افریقہ ایک بہت بڑا براعظم ہے اور اس میں درجنوں ممالک ہیں۔ اس براعظم میں اسلام پہلی صدی ہجری ہی میں پہنچ گیا تھا اور اپنی آمد سے آج تک اسلام یہاں مسلسل پھیلتا رہا ہے۔ شمالی افریقہ صدر اسلام ہی میں فتح ہو گیا تھا۔ سنٹرل اور مشرقی افریقہ میں بھی اسلام اپنی تاریخ کی ابتدائی صدیوں ہی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن جنوبی افریقہ میں اسلام کافی تاخیر سے آیا اور آج مسلمانوں کی تعداد وہاں بہت کم ہے۔ لیکن مسلمان وہاں بے وزن نہیں ہیں۔

جنوبی افریقہ کی طرح بعض دوسرے افریقی ممالک میں اسلام اور مسلمان اپنی موثر موجودگی رکھتے ہیں۔ یہ صرف جنوبی افریقہ کے آس پاس کے ممالک نہیں بلکہ اس وسیع براعظم کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بوجوہ ان ممالک میں مسلمانوں کی موجودگی پر لوگوں کی توجہ کم ہی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان ممالک کے مسلمانوں کے بارے میں تفصیلی معلومات بہم پہنچائی جائیں۔

9.2 تمہید

18ویں صدی سے براعظم افریقہ کے وہ حصے جہاں مسلمان بوجوہ اپنی ابتدائی صدیوں میں یا زمانہ وسطیٰ میں نہیں پہنچ سکے تھے، یوروپ کی استعماری طاقتوں کے ساتھ عیسائی مشنریوں کی آماجگاہ رہے ہیں۔ استعماری طاقتوں نے انہیں اپنی نوآبادی بنایا تو مشنریوں نے انہیں عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ وہ بہت سے ملکوں میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے چنانچہ آج وہ عیسائی اکثریت والے ممالک ہیں۔ بہر حال ان میں سے اکثر ممالک میں مسلمان بھی پائے جاتے ہیں اور اقلیت میں ہونے کے باوجود اہم مقام رکھتے ہیں جیسے جنوبی افریقہ۔ لیکن بعض ملکوں میں ان پر ظلم وستم بھی روا رہا ہے یا انھیں پورے شہری حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یہاں یہ ممکن نہیں کہ تمام غیر مسلم اکثریت والے ممالک کی مسلمان اقلیتوں کا مطالعہ کیا جاسکے۔ اس لیے صرف چند منتخب ممالک میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں گی۔

9.3 مسلمان جنوبی افریقہ میں

چونکہ نسلی امتیاز کے خلاف لڑائی میں جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے نیلسن منڈیلا کا کھل کر ساتھ دیا تھا، اس لیے آج مسلمانوں کی وہاں بڑی قدر ہے۔ ان کے اثر ورسوخ کو دیکھ کر بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ جنوبی افریقہ میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ سچائی یہ ہے کہ وہاں مسلمان بمشکل 1.5 فیصد ہیں۔

مسلمان جنوبی افریقہ میں 17ویں صدی میں آنا شروع ہوئے۔ اس وقت زیادہ تر مسلمان انڈونیشیا سے غلام بنا کر لائے گئے تھے۔ بعض غلام باقاعدہ پکڑے اور اپنی مرضی کے خلاف یہاں لائے گئے تھے اور بعض وہ تھے جنہوں نے اپنے ملک پر Dutch یا ولندیزیوں (ڈچ) کے قبضے کی مخالفت کی تھی اور ان کے خلاف جہاد کرتے ہوئے گرفتار ہوگئے تھے۔ یہ ایک طرح کے جنگی قیدی تھے جنہیں غلام بنا کر جنوبی افریقہ لایا گیا تھا۔ یہ سلسلہ 18ویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔

انڈونیشیائی مسلمانوں کے بعد ہندوستانی مسلمان آئے۔ یہ مسلمان ان ہندوستانیوں کے ساتھ آئے جنہیں مزدور کے طور پر یہاں گنے کے کھیتوں پر کام کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ غلام نہیں تھے، لیکن ان کے حالات غلاموں سے شاید ہی بہتر تھے۔

اور جب بیسویں صدی کے اواخر میں نسلی امتیاز کی پالیسی ختم ہوئی اور سفید فاموں کو اپنی حکومت قائم کرنے کا حق اور موقع ملا تو دوسرے افریقی ممالک سے بہت سے مسلمان یہاں آکر آباد ہوگئے۔ ان مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان سے بھی بعض مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ذرا تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

سترہویں صدی میں جنوبی افریقہ Cape کے پاپولر نام سے جانا جاتا تھا اور اس میں وہ علاقے شامل تھے جو موجودہ Cape Town کے آس پاس ہیں۔ Cape پر اس ایسٹ انڈیا کا کنٹرول تھا جو ہالینڈ نے بنائی تھی۔ اس ایسٹ انڈیا کمپنی کا جس ''ایسٹ'' پر قبضہ یا کنٹرول تھا وہ کم وبیش موجودہ انڈونیشیا ہے۔ 17ویں صدی میں غلاموں کی تجارت عروج پر تھی۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بہت سے

انڈونیشیائی مسلمانوں کو جبراً غلام بنایا اور انہیں لا کر Cape میں سنسان جگہوں پر آباد کیا۔ انہیں شہر سے دور رکھنے کی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ یہ سیاہ فاموں سے مل کر بغاوت نہ کر دیں۔ 'جبری غلاموں' کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان لوگوں کو بھی غلام بنایا جو جہادی جنگوں کے دوران قیدی بنائے گئے تھے۔ ان قیدیوں کے ساتھ بعض بااثر مسلمان بھی آئے کیونکہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انہیں انڈونیشیا سے جلاوطن کر دیا تھا۔ کمپنی کے عہدیداران اس امر کا پورا خیال رکھتے کہ مسلمان سیاہ فاموں اور غلاموں سے نہ مل پائیں کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ انہیں اپنی تبلیغ سے مسلمان بنالیں گے اور ان کے ساتھ مل کر بغاوت بھی کر سکتے ہیں۔ اپنے اس اندیشے کی وجہ سے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک حکمنامہ جاری کیا تھا 1642 میں کہ کوئی بھی مسلمان، غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ کا کام نہیں کرے گا اور اگر کرے گا تو اسے سخت سزا ملے گی۔ اس کے برعکس عیسائی مشنریوں کو کھلی چھوٹ تھی کہ لوگوں کو عیسائی بنائیں۔ مسلمانوں کو نہ مسجد بنانے کی اجازت تھی اور نہ باجماعت نماز پڑھنے کی۔ وہ گھروں میں انفرادی طور پر نماز ادا کر سکتے تھے۔ پبلک جگہوں پر باجماعت نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ عیسائی ہو جاتے تو چرچ جانے کی اجازت مل جاتی اور وہ وہاں کھل کر عبادت بھی کرتے۔ یہ حکمنامہ 1657 میں دوبارہ جاری ہوا تھا کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعض آزاد مسلمانوں کو Cape میں آباد کرنے اور ان سے دفاع کا کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ مسلمانوں کو غلام بنا کر یا اسلام کی اشاعت و تبلیغ نہ کرنے کی شرائط پر مزدور بنا کر لانے کی پالیسی 18ویں صدی کے وسط تک جاری رہی۔

یہاں بعض ان اہم مسلمانوں کا ذکر مناسب ہوگا جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یہاں لائے گئے تھے۔ 1667 میں بعض اہم انڈونیشیائی مسلمانوں کو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک بدر کر دیا کیونکہ وہ انہیں اپنے معاشی اور سیاسی مفادات کے لیے خطرہ تصور کرتی تھی۔ یہ دولتمند اور اثر و رسوخ والے مسلمان تھے۔ سب سے پہلے یہاں وہ جلاوطن مسلمان آئے جو سماٹرا کے حکمراں تھے۔ ان میں شیخ عبدالرحمٰن شاہ اور شیخ محمود بھی تھے۔ انہیں اور ان کے اہل خاندان اور دوسرے احباب کو Cape Town شہر سے باہر رہائش گاہیں دی گئیں کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں فرار نہ ہو جائیں۔ آج بھی وہ قبرستان یا اس کے آثار "اسلام ہل" نامی پہاڑی پر موجود ہیں جس میں یہ لوگ دفن ہوئے تھے۔ شیخ عبدالرحمٰن شاہ کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن وہ تعلیم یافتہ تھے اور متحرک بھی۔ چنانچہ انہوں نے خود مسلمان اور دوسرے غلاموں میں اسلام کی تفہیم و تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور مسلم کمیونٹی کو کافی منظم بنا دیا۔

1694 میں شیخ یوسف اپنے اہل خاندان اور ماننے والوں کے ساتھ یہاں تشریف لائے۔ دراصل انہیں بھی جلاوطن کیا گیا تھا۔ کیپ ٹاؤن سے کافی دور ان لوگوں کو ایک فارم ہاؤس پر رکھا گیا۔ مقصد ان غلام مسلمانوں سے انہیں دور رکھنا تھا جنھیں پہلے ہی شیخ عبدالرحمٰن کافی منظم کر چکے تھے۔ مگر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ پالیسی کامیاب نہیں ہوئی۔ بہت جلد شیخ یوسف غلاموں بلکہ اپنے "آقاؤں" کے چنگل سے بھاگنے والوں کے لیڈر بن گئے۔ انہوں نے جنوبی افریقی مسلمانوں کو کافی منظم کیا۔

یمن سے آنے والے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سعید علوی بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ Cape میں 1744 میں آئے۔ اس وقت ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کا عدن کے ساحل سے لے کر خلیج فارس اور اس سے آگے ہندوستان تک بڑا دبدبہ تھا۔ سعید علوی ان لوگوں میں سے تھے جو یوروپی استعمار کے خلاف سرگرم تھے۔ انہیں باغی قرار دے کر گرفتار کیا گیا اور پھر روبن (Robben) نامی جزیرے پر قید کر دیا گیا۔ قید سے رہائی کے بعد انہوں نے Cape میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ انہوں نے حکومت میں پولیس کی نوکری بھی کر لی تھی۔ پولیس کی حیثیت میں یہ

اکثر غلاموں کی بستیوں کا دورہ کرتے اور اس طرح ان کے درمیان دعوتی سرگرمیاں شروع کردیں۔ بالعموم انہیں کیپ کے مسلمانوں کا پہلا سرکاری طور پر تسلیم شدہ امام مانا جاتا ہے۔ 1767 میں شہزادہ عبداللہ قاضی ابوسلام کو انڈونیشیا سے جلاوطن کردیا گیا۔ انہیں بھی کیپ لایا گیا۔ شہزادہ ابوسلام حافظِ قرآن تھے۔ انہوں نے اپنی قید کے دوران اپنی یادداشت کی مدد سے قرآن مجید کو لکھا۔ یہ قرآن مجید آج بھی کیپ ٹاؤن میں محفوظ ہے۔ انہیں 1793 میں قید سے رہائی ملی۔ اسی سال انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ جنوبی افریقہ کا پہلا مدرسہ تھا اور غلاموں اور آزاد سیاہ فام مسلمانوں میں کافی مقبول تھا۔ فطری طور پر بہت سے غلام اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ عربک۔ افریقن، ایک ملی جلی زبان یا بولی، سب سے پہلے اسی مدرسے میں پڑھائی گئی۔ اپنے اس کارنامے کی وجہ سے شہزادہ ابوسلام الاستاذ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ 1793 میں، جس سال مدرسہ قائم ہوا، اسی سال کیپ کے مسلمانوں کو ایک مسجد تعمیر کرنے کی بھی اجازت ملی۔ اس مسجد یا کیپ کے سب سے پہلے باقاعدہ امام بھی شہزادہ ابوسلام ہی ہوئے۔ شہزادے اور دوسرے مسلمانوں کی کوششوں سے اسلام غلاموں کے درمیان کافی مقبول ہوا کیونکہ یہ تعلیم اور دوسرے ذرائع سے انہیں اپنی حالت میں تبدیلی لانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ بہت سے غلام پڑھ لکھ گئے اور محض تعلیم یافتہ ہوجانے کی وجہ سے انہیں ان کے آقاؤں نے نسبتاً بہترین نوکریاں یا کام دیے۔

جنوبی افریقہ میں ہندوستان سے مزدور بھی لائے گئے۔ یہ مزدور باقاعدہ معاہدوں کی بنیاد پر آئے اور یہ دو مرحلوں میں آئے۔ پہلے کچھ لوگ 1860 اور 1868 کے درمیان اور پھر 1874 اور 1911 کے دوران آئے۔ تعداد میں یہ لوگ ڈیڑھ لاکھ سے زائد تھے اور تقریباً 10 فیصد ان میں مسلمان تھے۔ یہ ان علاقوں میں آباد ہوئے جہاں گنے کی پیداوار ہوتی ہے کہ انہیں گنے کے کھیتوں پر ہی کام کرنا تھا۔ چنانچہ یہ لوگ ڈربن اور اس علاقے کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کے بعض اہل ثروت بزنس کے مقصد سے بھی یہاں تشریف لائے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا، نسل پرست حکومت کے خاتمے کے بعد بہت سے سیاہ فام مسلمان، دوسرے افریقی ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ بحیثیت مجموعی جنوبی افریقی مسلمان اچھی حالت میں ہیں، معاشی اعتبار سے بھی اور سیاسی وسماجی لحاظ سے بھی۔

حالیہ دنوں میں مسلمانوں کی تعداد میں قدرے اضافہ سیاہ فاموں کے اسلام قبول کرنے سے ہوا ہے۔ سیاہ فاموں کے جو شہر ہیں یا جہاں ان کی آبادیاں ہیں، وہاں سیکس، ایڈس، شراب نوشی، گھریلو تشدد وغیرہ عام ہیں۔ مسلمان بالعموم ان امراض اور بری عادتوں سے دور رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی یہ پاک صاف زندگی سیاہ فام غیر مسلموں کو کافی متاثر کرتی ہے اور وہ اسلام لاتے ہیں۔ جو پہلے سے مسلمان ہیں، ان نومسلموں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ امریکہ کی طرح جنوبی افریقہ میں بھی اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کئی مسلم تنظیمیں ہیں جو لوگوں کے درمیان دعوت اسلامی کا کام کررہی ہیں۔ بعض تنظیمیں صرف مسلمانوں کو اچھی تربیت فراہم کرنے میں یقین رکھتی ہیں لیکن بعض تنظیمیں اور افراد سوچتے ہیں کہ اسلام ساؤتھ افریقہ کے معاشرے میں اگر ضم ہوجائے تو اسلام اور تیزی سے جنوبی افریقہ میں پھیلے گا۔ اسلام خاص طور سے سیاہ فام عورتوں اور نوجوانوں میں مقبول ہورہا ہے۔ عورتوں میں مقبول ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف مذہب اسلام خانگی تشدد کو ناجائز سمجھتا ہے بلکہ بالعموم مسلمان اس برائی سے پاک ہیں۔ جن گھروں میں تشدد ہوتا ہے، وہاں بالعموم عورتیں ہی زیادہ نقصان میں رہتی ہیں۔ تو خانگی تشدد سے بچنے کے لیے وہ اسلام قبول کرلیتی ہیں۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ عیسائیت کو لوگ سابق نسل پرست حکومت اور سفید

فاموں کے احساس برتری سے جوڑ کر دیکھتے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں اسلام اور اس کے ماننے والے Liberator کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا لبریشن والا پہلو نہ صرف عورتوں بلکہ جنوبی افریقی نوجوانوں کو بھی خوب اپیل کر رہا ہے۔ چنانچہ کافی تعداد میں سیاہ فام نوجوان اسلام کی طرف راغب ہو رہے ہیں اور اسلام قبول بھی کر رہے ہیں۔ مالکم ایکس کی تحریریں لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ نیشن آف اسلام کی ایک شاخ بھی یہاں قائم ہوگئی ہے جو سیاہ فاموں کو اسلام کی طرف راغب کر رہی ہے۔

جنوبی افریقہ میں مسلمان بحیثیت مجموعی اچھی حالت میں ہیں۔ ہندوستان سے گئے ہوئے مسلمان بااثر بھی ہیں اور اہلِ ثروت بھی۔ نسل پرستی کے خلاف لڑائی میں وہ شامل رہے ہیں۔ یہاں ہم گاندھی جی کی نسل پرستی کے خلاف جنگ کو بھی یاد کر سکتے ہیں جس میں مسلمان تن من اور دھن سے شامل تھے۔ نسل پرستی کے خاتمے کے بعد جب عام انتخابات ہوئے تو بعض مسلمانوں نے اپنی سیاسی پارٹی بھی بنائی مگر کوئی انتخابی کامیابی نہیں ملی۔ سچ یہ ہے کہ 1994 کے عام انتخابات میں ناکامی کے بعد جب 1999 میں دوسرے عام انتخاب ہونے تو کوئی اہم مسلم پارٹی الیکشن میں کھڑی ہی نہیں ہوئی۔

لیکن بعض غیر سیاسی جماعتیں بہر حال منظم اور سرگرم ہیں اور مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی ضروریات کو پورا کر رہی ہیں۔ مسلم فقہی کونسل ایک اہم جماعت ہے جس کا سب سے اہم کام یہ تصدیق کرنا ہے کہ کون کھانا حلال ہے۔ اسلامک انٹرفیتھ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بین المذاہب ڈائیلاگ کو فروغ دیتی ہے اور اس ضمن میں مختلف پروگراموں کا انعقاد کرتی ہے۔ کئی تنظیمیں ہیں جو دعوتی سرگرمیاں انجام دیتی ہیں۔ مختلف دعوتی تنظیموں کو منظم کرنے کے لیے بھی ایک جماعت ہے جو دعاۃ کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے۔ جنوبی افریقہ حج وعمرہ کونسل بھی ایک اہم تنظیم ہے جو ان مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کرتی ہے جو حج یا عمرہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تنظیم حج اور عمرہ کی پرمٹ بھی جاری کرتی ہے۔ بہت سی شہری اور مقامی تنظیمیں بھی ہیں جو کسی خاص مقام پر رہنے والے مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

سفید فام نسل پرست حکومت کے خاتمے کے بعد جنوبی افریقہ میں نظم وضبط کی صورتحال پہلے سے زیادہ خراب ہوگئی۔ اچھے خاصے نوجوان پہلے ہی نشہ آور دواؤں کے عادی تھے یا جرائم کی دنیا میں پھنس گئے تھے۔ نسل پرستی کے خاتمے کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوا۔ قانون شکنی خاص طور سے ایک بڑا مسئلہ بن گئی۔ بعض مسلمانوں نے ان منفی رجحانات اور غنڈہ گردی کے خلاف ایک محاذ کھولا جسے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں بالخصوص عیسائیوں نے نہ صرف پسند کیا بلکہ عملاً مسلمانوں کے ساتھ اس میں شامل ہوگئے۔ لیکن پھر بتدریج یہ تحریک غلط راستے پر چل پڑی اور خود بھی قانون شکنی میں ملوث ہوگئی۔ یہ لوگ یہ بنیادی فلسفہ بھول گئے کہ برائی برائی سے نہیں ختم ہوتی۔ 2000 میں اس گروہ کے بہت سے سرکردہ لیڈروں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ آج یہ گروہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

اگرچہ مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی کامیاب نہ ہو سکی مگر ملکی سطح کی دوسری پارٹیوں سے وابستہ مسلمان بہر حال کامیاب رہے ہیں۔ جمہوری حکومت میں نہ صرف مسلم وزراء رہے ہیں بلکہ کئی مسلمان پارلیامنٹ کے ممبر ہیں۔ صوبائی اسمبلیوں اور مقامی کونسلوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی ملتی ہے۔ ابراہیم رسول ویسٹرن کیپ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ بعد میں امریکہ میں جنوبی افریقہ کے سفیر بھی رہے۔ امام حسن سلیمان 1994 سے 2009 میں اپنی موت تک پارلیامنٹ کے ممبر رہے۔ ان کا سیاسی کیریئر نسل پرست سفید فام حکومت کے دور میں

ہی شروع ہو گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ سیاہ فام عیسائیوں میں بھی مقبول تھے اور مجاہد آزادی اور نسل پرستی کے خلاف ایک موثر آواز ہونے کی وجہ سے انہیں اکثر چرچوں میں بھی تقریر کے لیے بلایا جاتا تھا۔ نسل پرست سفید فام حکومت نے انہیں جلاوطن کر دیا تھا تو انہوں نے سعودی عرب میں پناہ لی تھی جہاں انہوں نے اپنی اسلامک اسکالرشپ کو مزید جلا دی۔ وہ 1992 میں جنوبی افریقہ واپس آئے اور دوبارہ سرگرم عمل ہو گئے۔ 1994 کے عام انتخابات میں وہ کامیاب ہو کر ممبر آف پارلیامنٹ ہوئے۔ انہوں نے کئی انتخابات میں لگاتار کامیابی حاصل کی اور 2009 میں اپنے انتقال کے وقت بھی ممبر آف پارلیامنٹ تھے۔ وہ افریقن نیشنل کانگریس میں بھی سرگرم تھے اور جب اس پر پابندی عائد کر دی گئی تو یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ میں شامل ہو گئے تھے جو افریقن نیشنل کانگریس پر پابندی کے بعد اس کی جگہ لینے کے لیے بنائی گئی تھی۔

محترمہ نالیدی پینڈر خاتون سیاسی رہنما ہیں۔ آپ وزیر بھی رہی ہیں۔ افریقن نیشنل کانگریس کی اہم سرگرم کارکن و لیڈر رہی ہیں۔ شریف جوزف پینڈر سے شادی کے بعد آپ مسلمان ہو گئیں۔

سچائی یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ کم ہے اور تاریخی طور پر قلیل ہی رہی ہے لیکن وہاں کے سماج میں ان کی اہمیت کو ہمیشہ محسوس کیا گیا۔ معاہدے کے تحت لائے گئے ہندوستانی مسلمانوں میں سے بھی بعض لوگ بڑے ممتاز ہوئے۔ حضرت شیخ احمد بادشاہ پیر ایک ایسے ہی ممتاز مسلمان گزرے ہیں۔ یہ مزدور کی حیثیت سے آئے مگر جب برطانوی افسران کو معلوم ہوا کہ وہ ایک صوفی ہیں تو ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور ہمیشہ انہیں عزت کی نظر سے دیکھا۔ بادشاہ پیر ڈربن کے قبرستان میں مدفون ہیں۔ 1862 میں ملکہ برطانیہ نے ترکی کے اس وقت کے سلطان کو خط لکھا کہ ملائی نسل کے مسلمانوں کی رہنمائی اور امامت کے لیے کسی قاضی کو ارسال کیا جائے۔ ملکہ کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے سلطنت عثمانیہ نے قاضی ابوبکر آفندی کو روانہ کیا جنہوں نے کیپ کے مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دی۔ انہوں نے افریقن۔ عربک میں کتابیں بھی تصنیف کیں اور عملاً بھی اس وقت کے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے۔ ایک قلیل تعداد شیعہ مسلمانوں کی بھی ہے جو 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں ایران کی مدد سے سرگرم تھے۔ مگر مقامی سنی مسلمانوں کا تعاون نہ ملنے سے وہ اب جیسے خاموش ہو گئے ہیں۔ ایک اور چھوٹا گروہ قادیانیوں کا ہے جنہیں سنی مسلمان خارج از اسلام گردانتے ہیں۔ سنی مسلمان کافی منظم اور سرگرم ہیں۔ طلبہ تنظیمیں بھی ہیں جو سرگرم ہیں اور مسلم طلبہ کے مفادات کے لیے کام کرتی ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف ساؤتھ افریقہ 1974 میں قائم ہوئی تھی اور کبھی بہت منظم اور فعال گروہ ہوا کرتا تھا۔ مگر پھر یہ تنظیم ذرا کمزور پڑ گئی تھی۔ 2004 میں اس نے ایک بڑی کانفرنس منعقد کی جس سے تنظیم میں ذرا جان آئی مگر وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔

جمعیۃ العلماء ٹرانسوال سب سے پرانی سنی جماعت ہے جو 1923 میں قائم ہوئی تھی۔ مسلم فقہی کونسل جو 1945 میں وجود میں آئی اور مسلم یوتھ موومنٹ آف ساؤتھ افریقہ جو 1970 میں قائم ہوئی، بھی اہم جماعتیں ہیں جنہیں جنوبی افریقہ کے اکثر مسلمان ہر طرح کا تعاون دیتے ہیں۔ نیپالی مسلمانوں کی بھی ایک جماعت ہے اور یہ بھی کافی منظم اور سرگرم ہے۔ اگرچہ سنی مسلمان حنفی، شافعی اور مالکی فقہ کی اتباع کرتے ہیں لیکن اس طرح کے مسلکی تنازعات یہاں نظر نہیں آتے جو آج کل پاکستان میں اور بعض دوسرے ملکوں میں نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی نسل کے مسلمان بالعموم حنفی مسلک، کوکنی مسلمان اور ایسٹ افریقہ سے آنے والے مسلمان شافعی مسلک اور ویسٹ افریقہ اور مغرب

یعنی مراکش وغیرہ سے آنے والے مالکی فقہ کو مانتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا ہے مگر صورتحال بالعموم کنٹرول میں رہتی ہے۔ ہندوستان سے تعلق رکھنے والے سنی مسلمانوں کے علماء بالعموم دیوبند کے پڑھے ہوئے ہیں اور بریلوی علماء عام طور سے پاکستانی بریلوی مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔

جنوبی افریقہ کے مسلمان بالعموم اعتدال کے راستے پر گامزن ہیں۔ افریقی نسل کے بعض غریب نوجوانوں کو ڈرگس کی لت لگ گئی تھی اور انہوں نے گینگ بھی بنا لیے تھے۔ مگر اب ان کی اکثریت راہ راست پر آگئی ہے کیونکہ دوسرے مسلمانوں نے آگے آکر ان کی مدد کی اور غلط راستے پر چلنے سے روکا۔ مسلمانوں کا اعتدال صرف باہمی امور میں نظر نہیں آتا بلکہ بین المذاہب تعلقات میں بھی اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات کافی اچھے ہیں۔ حکومت بھی کوشاں رہتی ہے کہ ملک میں مذہبی رواداری اور بھائی چارہ قائم رہے۔ اس مقصد کے لیے نیشنل انٹر فیتھ لیڈرشپ کونسل قائم ہے اور ویسٹرن کیپ کے سابق وزیر اعظم ابراہیم رسول اس کے ممبر ہیں۔ غیر مسلموں خصوصاً سیاہ فام عیسائیوں میں مسلمانوں کی امیج اچھی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نسلی امتیاز کے خلاف ان کی لڑائی میں مسلمان ان کے ساتھ تھے۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی اکثریت تعلیم یافتہ اور متمول ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ لوگ باعمل ہیں اور شریعت پر عمل پیرا ہیں۔ مالی معاملات میں بھی لوگ شریعت کی پابندی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی بینک ہیں جیسے فرسٹ نیشنل بینک، اے بی ایس اے بینک، اسٹینڈرڈ بینک اور فیڈرل بینک وغیرہ جو شریعت کے مطابق مالی کاروبار کا انتظام کرتے ہیں۔ مسلم ممالک کے بعض بینک جیسے حبیب بینک آف پاکستان، البرکہ بینک آف سعودیہ عربیہ وغیرہ بھی شرعی بینکنگ کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ بعض دیگر مالی ادارے بھی ہیں جو مسلمانوں کی دوسری ضروریات کی تکمیل کے لیے شرعی طور پر جائز مالی امداد اور خدمات فراہم کرتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی اکثریت پبلک اسکولوں میں پڑھتی ہے جن میں بچے بچیوں دونوں کے داخلے ہوتے ہیں۔ اینگلیکن (Anglicon) اور کیتھولک چرچ کے ذریعے چلائے جارہے بعض اسکولوں میں مسلمان بچے پڑھتے ہیں کیوں یہاں انہیں بائبل پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ مدارس ومکاتب اور اسلامی اسکول بھی ہیں جہاں مسلم بچوں اور بچیوں کی ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے۔ بعض تعلیمی ادارے اسلام کے بارے میں شارٹ کورس چلاتے ہیں جب کہ کئی اداروں میں اسلامی قانون اور اسلامک فائنانس جیسے مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ قرآن اسٹڈی گروپ ہیں اور عربک و اسلامک اسٹڈیز جیسے کورس نجی ٹیوشن کے ذریعے بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ Wits University اور University of the Western Cape بھی اسلامک اسٹڈیز پڑھاتی ہیں۔ دیوبندی مکتب فکر کے لوگوں نے ملک میں کئی دار العلوم بھی قائم کیے ہیں۔ یوں تو ان مدارس میں پوری دنیا سے مسلمان طلبہ آتے ہیں لیکن دار العلوم زکریا میں اکثریت سیاہ فام مسلمان طلبہ کی ہے جو جنوبی افریقہ کے علاوہ موزمبیق، سرالیون، اور زامبیا وغیرہ سے آتے ہیں۔ ویسے دار العلوم زکریا کا دعویٰ ہے کہ اس کے یہاں تین درجن سے زائد ممالک کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ دسیوں اور دار العلوم ہیں جو کیپ ٹاؤن، پریٹوریا اور دوسرے شہروں میں قائم ہیں۔

مسلمانوں کے اپنے ٹیلی ویژن اور ریڈیو اسٹیشن بھی ہیں اور نیشنل ٹیلی ویژن پر بھی اسلام سے متعلق پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے اپنے اخبار ورسائل بھی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ میڈیا میں مسلمانوں کی نمائندگی قابل اطمینان ہے۔

جنوبی افریقہ کے مسلمان بنیادی طور پر مذہبی ہیں لیکن نیشنل لائف یعنی قومی زندگی میں بھرپور طریقے سے حصہ لیتے ہیں۔ کرکٹر ہاشم

آملہ ایک بہترین کھلاڑی ہونے کے ساتھ بہت اچھے مسلمان بھی ہیں۔ ماضی قریب میں مسلمانوں نے شرعی قوانین نافذ کرنے کا بھی مطالبہ کیا تھا یعنی وہ چاہتے ہیں کہ پرسنل لا کو کورٹ کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ 2003 میں مسلم میرج بل کا مسودہ جسٹس ڈپارٹمنٹ میں منظوری کے لیے پیش کیا گیا تھا لیکن یہ ابھی تک زیر غور ہے۔ اس بل کا مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان شرعی قوانین کے مطابق شادی کرنا چاہتے ہیں، کورٹ نہ صرف اس کی انہیں اجازت دے، بلکہ ایک مسلمان جج اور دوسرے ماہرین اسلامی قوانین کی مدد سے شادی سے متعلق اسلامی قوانین کو نافذ بھی کرے۔ مسلم قیادت کا کہنا ہے کہ اس بل سے مسلم خواتین کے حقوق کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جا سکے گا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جنوبی افریقہ کے سول قانون میں مسلم مطلقہ کے حقوق کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایسی خواتین کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً جو علماء طلاق کی تصدیق کرتے ہیں، وہ رجسٹرڈ نہیں ہیں، چنانچہ نان ونفقہ سے متعلق جو فیصلے وہ کرتے ہیں، اسے وہ نافذ نہیں کر پاتے۔ مذکورہ بل کے پاس ہونے کے بعد اس طرح کے مسائل دور ہو جائیں گے اور مسلم مطلقہ خواتین کو پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلم خواتین بھی بل کی حامی ہیں۔ لیکن مغرب زدہ مسلم خواتین بہر حال اس کی مخالف ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ مغربی قوانین میں مرد وزن کو مساوات حاصل ہے جب کہ شرعی قانون وراثت میں مساوی تقسیم کی گنجائش نہیں ہے۔ بعض غیر مسلم بھی بوجوہ اس بل کے مخالف ہیں۔ بل کے حامیوں کو غالباً ان مخالفتوں کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بل پیش کرتے وقت انہوں نے صاف طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ یہ ان مسلمانوں کے لیے ہے جو بہ رضا ورغبت اور بغیر کسی دباؤ کے شرعی قانون کے تحت نکاح وطلاق پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں کثرت ازدواج قانوناً جائز ہے، اس لیے شرعی قانون کے اس حصے پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔

جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کو مسائل بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اشتعال انگیزیوں کے جواب میں بعض مسلمان بھی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مگر نوبت تشدد تک نہیں پہنچتی۔ جب ایک جنوبی افریقی اخبار نے نبیؐ کا کارٹون شائع کیا تو مسلمانوں نے پر تشدد مظاہروں کے بجائے کورٹ کا رخ کیا۔ جج ایک مسلم خاتون تھیں جنہوں نے مسلمانوں کی اپیل کو رد کر دیا۔ دراصل کارٹون پر پابندی کا مطالبہ اس لیے کیا گیا تھا کہ اس سے تشدد بھڑک سکتا ہے۔ شاید مطالبہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کا اجماع اس امر پر ہے کہ نبی کی تصویر نہیں بنائی جا سکتی کہ اس سے ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ لیکن چونکہ مغرب اپنے غرور میں اس دلیل کو رد کرتا ہے، اس لیے جنوبی افریقی مسلمانوں نے شاید سوچا کہ یہاں کی کورٹ بھی اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ بہر حال اخبار میں کارٹون شائع ہوا۔ مسلمان کبیدہ خاطر ہوئے لیکن تشدد سے گریز کیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اپنی طرف سے صفائی بھی دی جو کمزور تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے خالص تصور توحید کو لوگوں کے سامنے ڈھنگ سے نہیں پیش کر پا رہے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

جب ایک سرپھرے امریکی نے سرعام نفرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قرآن مجید کو نذر آتش کیا تو غصے میں آکر ایک مسلم نوجوان نے بائبل کو جلانے کا اعلان کر دیا۔ خود ایک مسلمان تنظیم اس کے خلاف کورٹ گئی اور یہ دلیل دے کر اس کے خلاف آرڈر پاس کرایا کہ قرآن مجید میں غیر مسلموں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نوجوان نے نہ صرف اپنا پروگرام ملتوی کیا بلکہ یہ اعتراف بھی کیا کہ غصے میں آکر وہ غلطی کرنے بلکہ غیر اسلامی کام انجام دینے جا رہا تھا۔

بعض دوسرے مسائل بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک شہر کے ایک محلے میں جہاں تقریباً چار سو مسلمان خاندان رہتے ہیں، انہیں

مسجد کی تعمیر کرنے سے مقامی لوگ روک رہے ہیں۔لیکن یہ استثنائی واقعات ہیں۔ بالعموم جنوبی افریقہ میں تمام مذاہب کے ساتھ اسلام کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمان قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی ہوتی بھی ہے تو تشدد کے بجائے صبر وتحمل سے کام لیتے اور امن کی فضا کو قائم رکھتے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی آمد کب ہوئی ؟

2- جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور ان کے تعلیمی ادارے کے بارے میں بتائیے۔

3- جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی تنظیمیں کون سی ہیں؟

9.4 اسلام موزمبیق میں

موزمبیق جنوبی افریقہ کا ایک پڑوسی ملک ہے اور یہاں مسلمان قابل لحاظ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ مسلمان کل آبادی کا تقریباً 18 فیصد ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے اور شافعی مسلک کی اتباع کرتی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت مقامی لوگوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے نمبر پر ہندوپاک سے آئے ہوئے مسلمان ہیں اور ایک چھوٹی تعداد مشرق وسطیٰ سے بھی آئی ہے۔

مسلم دنیا سے موزمبیق کا تعلق بہت پرانا ہے۔ مسلمان یہاں تجارت کی غرض سے چوتھی صدی ہجری میں آگئے تھے۔ ان تاجروں کے اخلاق سے متاثر ہو کر بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ بعض لوگوں کی رائے میں اسلام موزمبیق میں آٹھویں صدی ہی میں آ گیا تھا۔ دسویں صدی میں علی ابن الحسان شیرازی نے یہاں ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس وقت اسلام موزمبیق اور آس پاس کے علاقوں میں ایک زبردست طاقت تصور کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف مقامی حکمراں تھے بلکہ عرب دنیا اور اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان وغیرہ سے ان کے گہری تجارتی تعلقات تھے۔ یہ صورتحال 16 ویں صدی میں پرتگالیوں کی آمد تک رہی۔ پرتگالیوں نے نہ صرف عیسائیت کو پھیلانے کی کوشش کی بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو کافی نقصان بھی پہنچایا لیکن درمیان میں تھوڑے عرصے کے لیے اس علاقے میں اومانی مسلمانوں کا اثر ورسوخ بڑھ گیا۔ لیکن پرتگالیوں نے پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ بیسویں صدی میں 1926 سے 1974 کے درمیان رومن کیتھولک ملک کا سب سے بڑا مذہبی گروپ بن گیا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ملک کی آزادی میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا تو ذرا صورتحال بدلی اور اب اسلام کو ختم کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے۔ نوآبادی نظام کے خاتمے کے بعد ایک طرح سے مارکسوادی یہاں اقتدار میں آگئے۔ یہ عرصہ بھی مسلمانوں کے لیے سخت رہا۔ لیکن 1989 میں مارکسوادی حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو کافی آزادی ملی ہے۔ وہ نہ صرف اسلام کی تبلیغ کر رہے ہیں بلکہ بڑی بڑی مساجد بھی تعمیر کر رہے ہیں۔ آج مسلمان پہلے کی بہ نسبت بہت اچھی حالت میں ہیں۔

یہاں یہ بہتر ہوگا کہ ایسٹ افریقہ کے دو ممالک کینیا اور تنزانیہ کے حالات بیان کریں جہاں مسلمان کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

9.5 مسلمان کینیا میں

کینیا براعظم افریقہ کے سواحلی ملکوں میں سے ایک اہم ملک ہے۔ یہاں اسلام کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ شاید آٹھویں صدی ہی میں اسلام کینیا کے ساحلی علاقوں میں آ گیا تھا۔ آج کینیا میں مسلمان کل آبادی کا 11.1 فیصد ہیں یعنی تقریباً 4.3 ملین لوگ مسلمان ہیں۔ مسلمان زیادہ تر کینیا کے ساحلی علاقوں میں آباد ہیں۔ ملک کی راجدھانی نیروبی میں بھی کافی مسلمان پائے جاتے ہیں جہاں کئی مساجد بھی ہیں۔ کینیا کے مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے اور شافعی مسلک کی اتباع کرتی ہے۔ شیعہ مسلمان بھی ہیں اور قادیانی جو خود کو احمدیہ فرقہ کہتے ہیں مگر مسلمان انہیں خارج از اسلام کہتے ہیں، بھی کافی سرگرم ہیں۔ یہ سیاہ فاموں میں بطور مشنری کافی سرگرم ہیں اور بہت سے افریقیوں نے قادیانیت کو اختیار بھی کیا ہے۔ مگر یہ لوگ خود کو قادیانی یا احمدی نہیں بلکہ مسلمان کہتے ہیں۔ یہاں کے شیعہ مسلمان اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں۔ یہ اس بڑے داؤدی بوہرے فرقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ممبئی اور گجرات سے لے کر کراچی اور ایران و عرب کے ساحلی شہروں سے لے کر افریقہ کے سواحلی شہروں میں آباد ہیں۔ یہ تجارت پیشہ لوگ ہیں اور کافی متمول ہیں۔ اندازاً کینیا میں ان کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے۔

تاریخی طور پر مسلمان یہاں آٹھویں صدی ہی میں آ گئے تھے۔ آثار قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلا ہے کہ جزیرہ منداپر مسلمان دسویں صدی ہی میں آباد ہو گئے تھے۔ مراکشی سیاح ابن بطوطہ غالباً یہاں کے ساحلی علاقوں میں 1331 میں آیا تھا۔ اپنے سفرنامے میں اس نے لکھا ہے کہ یہاں اس وقت کافی مسلمان آباد تھے اور لوگ بالعموم نیک، قابل احترام اور راست باز تھے۔ ابن بطوطہ نے لکڑی سے بنی خوبصورت مساجد کی موجودگی کا بھی ذکر کیا ہے۔

آغاز سے ہی مسلمان یہاں سمندر کے راستے آئے، سواحلی علاقوں میں تجارت کی اور یہیں رہائش پذیر ہو گئے۔ ان عرب اور ایرانی مسلمانوں نے یہاں کی مقامی خواتین سے شادیاں کرلیں جو بعد میں مسلمان ہو گئیں جس کے نتیجے میں ایک نئی کمیونٹی اور زبان دنیا کو ملی یعنی سواحلی عوام اور زبان۔ سواحلی اپنی ساخت کے اعتبار سے مقامی زبان بنٹو (Bantu) سے قریب ہے اور عربی زبان کے الفاظ کی اس میں بھرمار ہے۔

کینیا میں اسلام عرب تاجروں کے ذریعے آیا۔ یہ تاجر چھوٹی چھوٹی آبادیوں کی شکل میں ساحلی قصبوں اور شہروں میں آباد تھے۔ یہ آغاز میں مقامی لوگوں سے صرف تجارتی تعلقات رکھتے تھے لیکن بتدریج یہ یہاں کے مقامی سماج میں ضم ہوتے گئے۔ چونکہ تہذیبی اعتبار سے عرب تاجر زیادہ ترقی یافتہ تھے، اس لیے فطرتاً مقامی لوگوں نے ان کے مذہب اور رسوم و رواج کو اختیار کرنا شروع کر دیا جس سے سواحلی عوام اور زبان وجود میں آئے۔

ساحل پر آباد بنٹو افریقیوں نے اسلام کو آسانی سے قبول کر لیا لیکن اندرونی علاقوں میں آباد قبائل اسلام قبول کرنے سے گریزاں رہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ عرب مسلمان بالعموم تاجر تھے اور تجارت ہی میں مصروف تھے۔ وہ مبلغ نہیں تھے۔ لوگ ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرتے۔ یہ لوگ افراد ہوتے اور قبائلی نظام ایسے افراد کو اپنا باغی تصور کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قبائل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سخت جذبات رکھتے تھے۔

لیکن بتدریج ان پر یہ بات واضح ہوتی گئی کہ عرب انہیں مسلمان بنا کر ان کے قبائلی نظام کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتے بلکہ اگر لوگ مسلمان ہو رہے ہیں تو اپنی مرضی سے اور ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر ایسا کر رہے ہیں۔ شاید اکا دکا مسلمان ہی تبلیغی سرگرمیوں میں ملوث

تھے۔صورتحال میں تبدیلی پندرہویں صدی میں آئی جب پرتگالی یہاں آئے۔ وہ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ انہوں نے نہ صرف ان کی تجارت پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کی بلکہ چرچ کی ہدایت پر جارحانہ مشنری سرگرمیاں بھی شروع کردیں۔ نتیجتاً سماج میں تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں نے امن پسندی کا مظاہرہ کیا اور پہلے کی طرح ان کے کم ہی افراد تبلیغی سرگرمیوں میں شامل ہوئے۔ اس کے مقابلے میں عیسائیوں نے منظم انداز میں قبائل کے درمیان کام کرنا شروع کیا اور سرداروں کو عیسائی بنایا جس سے پورا قبیلہ عیسائی ہوجاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کینیا عیسائی اکثریت کا ملک ہے۔

اندرون کینیا اسلام کے کم رفتاری سے پھیلنے کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے اس طرف بہت کم توجہ کی۔ وہ تجارت کی غرض سے بھی اندرونِ ملک کے علاقوں میں کم ہی جاتے۔ ظاہر ہے اندرون ملک میں رہنے والوں سے ان کا ربط وضبط بہت کم تھا اور یہ وہاں اسلام کے نہ پھیلنے کی دوسری بڑی وجہ تھی۔

اندرونِ ملک اسلام کے پھیلنے کے مواقع اس وقت بڑھ گئے جب 19 ویں صدی کے اختتام پر کینیا میں ریلوے لائن بچھائی جانے لگی اور لوگوں کی آمدورفت بڑھ گئی۔ یہ ایک طرح سے کینیا کو جدید دور میں لانے کے مترادف تھا جس میں افراد پر قبائل کی پکڑ بتدریج کمزور پڑتی گئی۔ یہی وقت تھا جب بعض پرجوش مسلم مبلغین نے اسلام کی اشاعت کے لیے اندرونِ ملک کا رخ کیا۔ انہیں کچھ کامیابی ضرور ملی لیکن عیسائیوں کی منظم اور وسیع کوشش بہرحال میدان مار لے گئی۔

کینیا کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جب ملک آزاد ہوا تو دستور سازی اور حکومت کے نظم ونسق میں حصہ لینے کا انہیں موقع ملا۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں نے جہاں جنگ آزادی میں حصہ لیا وہیں خود کی اصلاح پر بھی توجہ دی۔ پڑھے لکھے کینیائی مسلمان الاخوان المسلمون، جماعت اسلامی پاکستان کے بانی قائدین حسن البنا اور سید ابوالاعلیٰ مودودی سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ ایک طرف ان لوگوں نے مسلمانوں کو قرآن وحدیث سے جڑنے کی دعوت دی اور دوسری طرف دوسری قوموں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔ مقصد اچھے مسلمان بننے کے ساتھ لوگوں کے سامنے اسلام کی سچی دعوت پیش کرنا بھی رہا ہے۔ مسلمان اس مقصد کے لیے میڈیا اور پبلی کیشن کا سہارا لے رہے ہیں۔ لوگوں میں نہ صرف اسلامی بیداری آئی ہے بلکہ اسلامی تحریکوں کی طرف ان کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ حالیہ دنوں میں بعض لوگوں نے تشدد کا راستہ بھی اختیار کیا ہے لیکن بحیثیت مجموعی مسلمان پرامن ماحول میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ عملاً وقولاً لوگوں کے سامنے اپنے مذہب کو ایک مثبت اور تعمیری شکل میں پیش کرسکیں۔

معلومات کی جانچ

1- کینیا میں اسلام کی آمد کب اور کیسے ہوئی؟

2- کینیا کی مسلم آبادی کے بارے میں بتایئے۔

9.6 مسلمان تنزانیہ میں

کینیا کی طرح تنزانیہ بھی ایسٹ افریقہ کا ایک اہم ملک ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ایک تہائی سے زیادہ ہے۔ یہ بات تاریخی طور

پر ثابت ہے کہ تنزانیہ اور دوسرے ایسٹ افریقن ممالک سے عربوں کے تجارتی تعلقات زمانہ قبل اسلام سے قائم ہیں۔ دراصل عدن سے لے کر اومان تک کا ساحلی علاقہ اس بحری تجارت میں بڑا اہم تھا جو ایسٹ افریقہ سے چین کے درمیان ہو رہی تھی۔ ایسٹ افریقہ کے باشندے تجارت میں کم ہی شامل تھے۔ دراصل یہ عرب تھے جو وہاں تجارت کی غرض سے جاتے تھے۔ یہی عرب ہندوستان اور سری لنکا بلکہ اس سے آگے ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ بلکہ چین تک تجارت کرتے تھے۔ اس بحری تجارت میں چینی بھی شامل تھے لیکن وہ بالعموم چین سے کیرلا اور سری لنکا آتے اور عرب تاجروں سے لین دین کرنے کے بعد اپنے ملک واپس چلے جاتے۔ گویا ایک طرح سے عرب تجار افریقہ اور ہندو چین کے درمیان تجارتی تعلق کی بہت مضبوط کڑی تھے۔

اسلام کی آمد کے بعد عربوں کی بحری تجارت میں کافی اضافہ ہوا کیونکہ نئی اسلامی ریاست نے مختلف طریقوں سے اس تجارت کو بہت فروغ دیا۔ ان تاجروں کے ذریعہ اسلام کیرلا، ملیشیا اور انڈونیشیا میں خوب پھیلا۔ ایسٹ افریقہ بھی اسلام کے لیے زرخیز سرزمین ثابت ہوا۔

تنزانیہ اور آس پاس کے دوسرے ایسٹ افریقی علاقوں میں اسلام صدر اول ہی میں پہنچ چکا تھا۔ چونکہ اسلام یمن میں نبیؐ کے زمانے ہی میں پہنچ چکا تھا اور اس بات کا پورا امکان ہے کہ بعض یمنی عرب تاجروں نے اسلام قبول کرنے کے ساتھ تجارت جاری رکھی ہو اور اس طرح بحیثیت مسلمان وہ صدر اول ہی میں ایسٹ افریقہ آ گئے ہوں۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران 830 عیسوی کے بعض سکے وہاں ملے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا اسلام ایسٹ افریقہ میں شاید اس سے کہیں پہلے پہنچ چکا تھا۔

ایسٹ افریقہ میں کئی مقامات پر آثار قدیمہ کی کھوج کے لیے کھدائی کی گئی۔ نویں صدی میں بنائی گئی ایک مسجد کے آثار بھی ملے ہیں۔ زنجبار میں آج بھی ایک مسجد ہے جو 1007 عیسوی میں بنائی گئی تھی۔ اس مسجد میں آج بھی نماز ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ میں یعنی نویں، دسویں صدی سے سولہویں صدی تک اسلام بحر ہند کے ساحلی علاقوں میں ایک نہایت مقبول مذہب تھا اور ان علاقوں میں مسلمان نہ صرف قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے بلکہ بحری تجارت میں بہت بڑے حصہ دار ہونے کی وجہ سے کافی مالدار بھی تھے۔ چودھویں صدی میں ابن بطوطہ نے یعنی 1332 میں ایسٹ افریقی ممالک کی سیاحت کی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے ان علاقوں میں کچھ ایسا محسوس کیا کہ جیسے وہ کسی اسلامی ملک میں ہو۔ اس وقت ساحلی علاقوں کی آبادی میں مسلمان اکثریت میں تھے اور ہر طرف سواحلی بولی جاتی تھی۔ سواحلی مقامی زبانوں اور عربی کے اختلاط کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بحری تجارت پر مسلمانوں کا قبضہ ایسا تھا کہ اسے بجا طور پر ''مسلم سمندر'' کے طور پر یاد کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان نہ صرف تجارت میں غالب تھے بلکہ جنوب مشرقی ایشیا، ہندوستان اور ایسٹ افریقہ کے ساحلوں پر ان کی بڑی بڑی کالونیاں تھیں جو کافی خوشحال تھیں۔

افریقہ میں اسلام تین طریقوں سے پہنچا ہے۔ مصر اور شمالی افریقی ممالک خلافت راشدہ اور عہد بنو امیہ میں فتح ہوئے۔ فتح ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے گئے تھے۔ جنگیں دراصل بازنطینی یا رومن ایمپائر یا ان کے حمایت یافتہ مقامی حکمرانوں سے ہوئیں۔ فتوحات نے حکومتیں گرائیں اور ان کی جگہ اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی جس میں اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرنے کی لوگوں کو پوری آزادی تھی۔ مفتوحہ علاقوں یا ملکوں نے سو دو سو سال کا عرصہ لیا ہے مسلمان ہونے کے لیے۔ اور اسلام قبول کیا ہے اسلامی انصاف، اخلاق اور

علماء کی دعوتی سرگرمیوں کی وجہ سے۔سنٹرل اور مغربی افریقہ میں اسلام پہلے پرامن طریقے سے پہنچا۔مسلمان تاجر وہاں پہلے پہنچے اور اپنے اخلاق وکردار سے لوگوں کو متاثر کیا۔پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے مقامی حکمرانوں نے ان کی خدمات حاصل کیں۔بعض امراء پھر مسلمان ہوئے اور اس طرح حکومتیں قائم ہوئیں اور ان مقامی مسلم حکومتوں نے بعض علاقوں کو فتح بھی کیا۔لیکن یہاں بھی لوگوں نے اسلام دعوت و ارشاد اور اسلامی اخلاق وانصاف کی وجہ سے قبول کیا۔

مشرقی افریقہ میں اسلام تاجروں کے ذریعے ہی پہنچا۔یہی وجہ ہے کہ مدت دراز تک اس علاقے کے مسلمان ساحلی علاقوں رقصبوں۔شہروں میں آباد رہے جہاں عربوں کی تجارت زمانہ قدیم سے جاری تھی۔ان تاجر مسلمانوں کو ہمیشہ تجارت ہی سے غرض رہی اور حکومت واقتدار سے کبھی ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا۔یہ بھی اہم ہے کہ تاجروں کی اکثریت اپنے کام سے کام رکھتی ہے اور بہت ہی کم ایسے تھے جو اپنے دین کی تبلیغ واشاعت میں مصروف تھے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان پرامن تاجر مسلمانوں کو مشرقی افریقہ میں قبولیت عام حاصل ہوگئی تھی۔یہ لوگ خوشحال تھے اور اکثر مقامی حکمرانوں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔مقامی حکمرانوں سے ان کی رشتہ داریاں بھی ہوگئی تھیں۔الغرض جب سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے یہاں حملہ کیا تو مسلمان یہاں بڑی اچھی حالت میں تھے۔یہاں کے مقامی حکمراں بھی بظاہر پرامن تھے اور عربوں کے ذریعے ہورہی تجارت کے فوائد میں سے اپنا حصہ بھی لے رہے تھے۔عربوں کے توسط سے ان کے نہ صرف عرب وایران کے حکمرانوں بلکہ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک سے بھی روابط قائم ہوگئے تھے۔جارح پرتگالیوں کی وجہ سے صورتحال میں تبدیلی آئی۔دراصل پرتگالی نہ صرف پوری بحری تجارت پر قبضہ کرنا چاہتے تھے بلکہ اپنا مذہب بھی زبردستی لوگوں پر تھوپنا چاہتے تھے۔تنزانیہ کے مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی اور مقامی حکمرانوں کے ساتھ مل کر پرتگالیوں کو نکال باہر کرنے کی کوشش کی۔مگر ابتداً پرتگالی ان پر بھاری پڑے۔مجبوراً انہوں نے اومان کے حکمراں سے مدد مانگی۔اومانی عرب اس وقت کی بحری تجارت میں نہ صرف بہت وسیع پیمانے پر شامل تھے بلکہ اپنے جہازوں کے تحفظ کے لیے انہوں نے ایک بحری بیڑہ بھی تیار کرلیا تھا۔اومانی عربوں کی مدد سے تنزانیہ کے مسلمانوں نے سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں پرتگالیوں کو تقریباً بحری تجارت واقتدار کے سین سے مار بھگایا۔پرتگالیوں کی دال ایسٹ افریقہ میں نہیں گلی تو انہوں نے اپنی پوری توجہ جنوبی ہندوستان پر مرکوز کردی اور کیرالہ کے مسلمان تاجروں کو بہت نقصان پہنچایا۔بہرحال ایسٹ افریقہ ان کی جارحیت سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اس وقت تک محفوظ رہا جب دوسری یوروپی طاقتوں نے اس علاقے پر حملہ کیا۔یہ انیسویں صدی کے اواخر کا معاملہ ہے۔پرتگالیوں کے تلخ تجربے کے بعد مسلمانوں نے نہ صرف اپنی تجارت کو مزید وسعت دی بلکہ مقامی اور اومانی حکمرانوں کے تعاون سے تنزانیہ کے دفاع پر بھی توجہ دی تھی۔مگر غیر پرتگالی یوروپی حملہ آور ان سے کہیں زیادہ طاقتور تھے۔

18ویں اور 19ویں صدی میں جب تنزانیہ اور دوسرے علاقوں میں مقامی حکمرانوں کی مدد سے اومان کو یہاں عروج حاصل تھا، تو علماء اور دعاۃ نے یہاں دعوت وارشاد کے کام کو بھی تیز کردیا۔پہلی بار مسلمان ملک کے اندرونی حصوں میں گئے۔نہ صرف انہوں نے وہاں اپنی تجارت کو فروغ دیا بلکہ دعوت وتبلیغ کا کام بھی خوب کیا جس کی وجہ سے کئی مقامات پر لوگوں نے بڑے پیمانے پر اسلام قبول کیا۔کئی مقامی افریقی امیر، نہ صرف تنزانیہ بلکہ یوگنڈا میں بھی مسلمان ہوگئے۔اندرون ملک کے ان مسلمانوں کا ساحل پر بسے مسلمانوں سے بڑا گہرا تجارتی و سیاسی ربط قائم تھا جس کی وجہ سے یہاں بھی خوشحالی آئی۔عرب اور مقامی مسلمانوں کے اختلاط سے ایک نئے کلچر اور زبان نے جنم لیا جس کا نام

ہے سواحلی۔ اس نئے کلچر اور زبان کی وجہ سے آج بھی ایسٹ افریقہ کئی ملکوں میں تقسیم ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کافی مربوط نظر آتا ہے۔

ایسٹ افریقہ میں پرتگالیوں کے بعد جرمنوں نے اپنا اثر ورسوخ بڑھانا شروع کیا اور بالآخر اسے اپنی کالونی بنالیا۔ کالونی بنانے کا واحد مقصد اس علاقے کی معیشت اور تجارت پر قبضہ کرنا تھا۔ جرمن سواحلی نہیں جانتے تھے چنانچہ اپنے اقتدار کے استحکام کے لیے انہوں نے بہت سے تعلیم یافتہ سواحلی مسلمانوں کا تعاون حاصل کیا۔ جرمنوں کو مقامی مسلمانوں کی اس وقت خاص ضرورت محسوس ہوئی جب انہوں نے ایسٹ افریقہ کے اندرونی علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ دراصل جرمن فوج نے بہت سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں شامل کرلیا۔ یہ بات اہم ہے کہ پرتگالیوں کے برعکس جرمنوں کو بس تجارت اور حکومت میں دلچسپی تھی۔ وہ مشنری سرگرمیوں میں ابتداء کم ہی شامل ہوئے جب کہ جرمن فوج اور بیوروکریسی میں شامل سواحلی مسلمانوں نے اندرونِ تنزانیہ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی وجہ سے بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ کینیا اور یوگنڈا پر جرمنوں کے بجائے برطانیہ نے قبضہ کیا اور ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن کے مسلمانوں پر دوررس منفی اثرات پڑے۔ جرمنوں نے جدید تعلیم دینے کے لیے اسکول قائم کیے تھے تو سواحلی میں درس وتدریس کو فوقیت دی، اس کے برعکس برطانیہ نے انگلش میڈیم آف ایجوکیشن کو اختیار کیا جس سے مسلمانوں کو فوج اور بیوروکریسی میں نوکریاں ملنا تقریباً بند ہوگئیں۔

ایسا نہیں ہے کہ تنزانیہ پر جرمن استعماری حکومت کے دوران مسلمانوں کو بس فائدے حاصل ہوئے۔ دراصل قصبوں اور شہروں کے پڑھے لکھے مسلمانوں کو فائدہ ملا۔ اندرونی علاقوں میں آباد مسلمان اب بھی خسارے میں رہے کہ وہ غریب بھی تھے اور غیر تعلیم یافتہ بھی۔ ان غریب مسلمانوں نے ان صوفیاء اور علماء کا رخ کیا جو جرمن حکومت کے خلاف تھے۔ یہ صوفی سلسلے جرمن حکومت کے دوران بھی سرگرم تھے اور ان کی حکومت ختم ہوجانے کے بعد بھی۔ لوگ قادریہ سلسلے کے ساتھ بھی جڑے ہوئے تھے اور شاذلیہ سلسلے کے بھی Followers بھی تھے۔ جب 07-1905 میں مقامی حکمرانوں نے بغاوت کی تو علماء وصوفیاء اور ان کے متبعین نے اس بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اگرچہ جرمنوں کے خلاف یہ بغاوت کامیاب نہیں ہوئی لیکن اندرونِ ملک مسلمانوں کی تعداد اور ان کے اثر ورسوخ میں کافی اضافہ ہوا۔

تنزانیہ میں جرمن حکومت جنگ عظیم اول کے خاتمے تک قائم رہی، اس جنگ میں، جیسا کہ معلوم ہے، جرمنوں کو شکست ہوئی۔ ان کے بعد برطانیہ کا تنزانیہ پر قبضہ ہوگیا جو پہلے ہی یوگنڈا اور کینیا میں موجود تھا۔ چونکہ تعلیم یافتہ شہری مسلمانوں کا جرمنوں سے اچھا تعلق تھا، اس لیے برطانیہ نے انہیں شبہے کی نظر سے دیکھا۔ برطانیہ نے سواحلی کے بجائے انگریزی اور دوسری مقامی افریقی زبانوں میں تعلیم کو رائج کرنا شروع کیا۔ برطانیہ نے بالواسطہ طور پر عیسائی مشنریوں کی بھی بڑی مدد کی۔ مثلاً انہیں موقع دیا کہ غیر مسلم مقامی لوگوں کی آبادیوں میں اسکول کھولیں جس کی وجہ سے انہیں لوگوں کو عیسائی بنانے میں مدد ملے۔ حکومت اور مشنری اسکولوں نے پھر بتدریج انگریزی زبان میں تعلیم دینا شروع کردیا جس کی وجہ سے غیر مسلم لوگوں نے بڑی تعداد میں عیسائیت کو قبول کرلیا۔ ان تعلیم یافتہ عیسائیوں کو برطانیہ نے حکومت کے مناصب پر فائز کیا اور انہیں خوب ترقی دی۔ اس کے برعکس مسلمان بتدریج اقتدار وحکومت سے باہر نکال دیے گئے۔ جس کا ان کی معیشت پر بہت برا اثر پڑا۔ مسلمانوں نے اپنی بدحالی کے لیے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا اور آزادی کی تحریک شروع کردی۔ یہ تحریک جنگ عظیم دوم کے آغاز کے وقت شروع ہوئی اور 1950 کی دہائی میں کافی طاقتور ہوگئی۔ اگرچہ برطانیہ نے مسلمانوں اور مقامی عیسائیوں کے درمیان خلیج پیدا کرکے لڑاؤ

اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کی، لیکن انہیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ 1954 میں تنزانیہ افریقن نیشنل یونین یعنی TANU قائم ہوئی جس میں مسلمان بڑی تعداد میں شامل تھے لیکن انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے قیادت کے منصب پر مقامی سیاہ فام عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا۔ مسلمان سیکولرازم کی بنیاد پر تعلیم یافتہ عیسائیوں کے ساتھ تھے لیکن بہت سے مسلمانوں کو شبہ تھا کہ نام نہاد تعلیم یافتہ عیسائی اندر سے عیسائی زیادہ اور سیکولر کم تھے۔ آزادی کے بعد انہیں عیسائیوں کو اقتدار میں بڑا حصہ ملا۔ بعض مسلمان بھی اعلیٰ عہدوں پر پہنچے لیکن عیسائیوں کے لیڈروں نے سیکولرازم کی آڑ میں صرف ان علاقوں کی ترقی پر توجہ دی جہاں مسلمان نہیں تھے یا بہت کم تھے۔ ان عیسائی حکمرانوں نے برطانوی استعماری حکومت کی طرح تعلیم پر خصوصی توجہ دی جس سے نہ صرف سیاہ فام عیسائی ہوتے گئے بلکہ تعلیم پا کر حکومت کی نوکریوں پر قابض بھی ہوتے گئے۔ چنانچہ جنگ آزادی میں اوروں سے کہیں زیادہ جدوجہد کرنے اور قربانیاں پیش کرنے کے باوجود مسلمان آزاد تنزانیہ میں کافی پسماندہ ہوکر رہ گئے ہیں۔

ایسٹ افریقہ کے مسلمانوں کی اکثریت یعنی تقریباً دوتہائی تنزانیہ میں آباد ہے۔ 1957 میں برطانیہ نے جو مردم شماری کرائی تھی، اس کے اعداد و شمار کی بنیاد پر ملک میں مسلمان عیسائیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ دو ایک کا تناسب تھا یعنی دو مسلمان اور ایک عیسائی۔ لیکن آزادی کے بعد 1967 میں ہوئی مردم شماری میں مسلمان ڈرامائی طور پر عیسائیوں سے کم ہوگئے۔ یعنی عیسائی 32 فیصد، مسلمان 30 فیصد اور باقی 38 فیصد مقامی عقائد ورسوم کے ماننے والے تھے۔ دس سال کے مختصر عرصے میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے واقع ہوئی، اس کی آج تک تشریح نہیں کی جاسکی ہے۔ مسلمان اور غیر جانبدار اہل قلم بڑے پیمانے پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ اقتدار پر قابض عیسائیوں نے اعداد و شمار میں گڑبڑی کی تھی۔ مسلمانوں کو کم اور مقامی عقائد کے ماننے والوں کو زیادہ دکھایا گیا۔ عیسائیوں کی تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی لیکن اصل فراڈ یہی تھا کہ بہت سے غریب اور ان پڑھ مسلمانوں کو لامذہب سیاہ فاموں میں شا[illegible] گیا اور اس کے بعد سیکولرازم کا نام لے کر مذہب کی بنیاد پر مردم شماری کرائی ہی نہیں گئی۔

تنزانیہ میں عیسائیت 18 ویں صدی میں آئی۔ اس لیے اتنے کم عرصے میں آبادی کے 32 فیصد لوگوں کا عیسائیت کو قبول کر لینا ناممکن نظر آتا ہے خاص طور سے ایسی صورتحال میں جب [illegible] کے آغاز تک جرمنوں نے مشنریوں کی کھل کر حمایت نہیں کی تھی۔ واضح رہے کہ اگرچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ، خصوصاً غریب طبقہ صوفی لیڈرشپ میں جرمنوں کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا لیکن یہ تحریک آزادی تھی جسے جنگ نہیں کہا جاسکتا۔ مسلح بغاوت 1905 میں شروع ہوئی جو 1907 تک قائم رہی۔ اس جنگ میں مشنریوں نے کھل کر جرمنوں کا ساتھ دیا اور اس کے بعد جرمن حکومت نے بھی ان کی مدد کی حالانکہ اب بھی جرمن فوج اور حکومت کے نچلی سطح کے افسران میں بہت سے مسلمان موجود تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کو کھل کر حمایت حکومتِ برطانیہ نے دینا شروع کیا جو جنگ عظیم اول میں جرمنوں کی شکست کے بعد قائم ہوئی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جرمن کالونیل حکومت جانبدار نہیں تھی۔ 1905 کی ماجی ماجی بغاوت سے پہلے بھی ان کی ہمدردیاں عیسائی مشنریوں کے ساتھ تھیں لیکن چونکہ اپنے اقتدار کی توسیع اور حکومت کے استحکام کے لیے سواحلی زبان بولنے والوں کی ضرورت تھی اور اس وقت یعنی 19 ویں صدی میں سواحلی زبان میں تعلیم یافتہ مقامی مسلمان ہی تھے، اس لیے انہوں نے ان کی مدد لی۔ لیکن ماجی ماجی بغاوت کے بعد انہوں نے کھل کر عیسائی مشنریوں کی حمایت کی۔ یہ پالیسی 1918 کے بعد برطانیہ نے بھی جاری رکھی۔ لیکن پچاس

سال کے عرصے میں ملک میں 32 فیصد آبادی کا عیسائی ہو جانا ناممکن نظر آتا ہے۔ خاص طور سے یہ بات ہضم کرنا مشکل ہے کہ 1957 کی مردم شماری کے مطابق مسلمان عیسائی تناسب دو اور ایک کا تھا یعنی دو مسلمان پر ایک عیسائی اور اگلے دس سال میں عیسائی نہ صرف مسلمانوں کے برابر آ گئے بلکہ دو فیصد زیادہ بھی ہو گئے، یہ نہ صرف ناقابلِ فہم ہے بلکہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ 1967 کی مردم شماری کے اعداد و شمار میں بڑے پیمانے پر ہیرا پھیری کی گئی تھی۔

ماجی ماجی بغاوت میں مسلمانوں کی شرکت کی وجہ سے جرمنی نے تقریباً کھل کر عیسائیوں کی طرفداری شروع کر دی۔ جنگ عظیم اول کے بعد جب برطانیہ نے تنزانیہ پر قبضہ کیا تو اس نے بھی جرمن پالیسی کو جاری رکھا۔ برطانیہ نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ہی سرکاری نوکری دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے تنزانیہ میں اسکول اور کالجز کھولے اور یہ سب بالعموم ان علاقوں میں کھولے گئے جہاں کے مقامی افریقی یا تو عیسائی ہو چکے تھے یا ان کے عیسائی ہونے کے امکانات تھے۔ مسلمان رہنماؤں نے بھانپ لیا کہ یہ ان کے مستقبل کو تاریک بنانے کی گھناؤنی سازش ہے۔ چنانچہ اس نئی خطرناک صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے خود کو تحریکوں کی شکل میں منظم کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دوسرے افریقیوں کو بھی ساتھ آنے کی دعوت دی۔ ایسی پہلی تنظیم، افریقن ایسوسی ایشن، 1929 میں قائم کی گئی۔ اسی طرح جمعیۃ الاسلامیہ 1933 میں قائم کی گئی۔ اگرچہ دونوں تنظیمیں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر قائم کی تھیں لیکن ان کے دروازے دوسروں کے لیے بھی کھلے تھے۔ عیسائی تنظیموں نے مسلم تحریکوں کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے مقامی عیسائیوں کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی۔ وہ کھل کر یہ دلیل دیتے تھے کہ چونکہ حکومت کی پالیسیاں عیسائیوں کے حق میں ہیں، اس لیے اس کے خلاف کوئی مہم نہ چھیڑی جائے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ سے آزادی کی لڑائی صرف مسلمان لڑ رہے تھے۔ بعض پڑھے لکھے عیسائی اس جنگ میں شریک ہوئے، تو مسلمانوں نے نہ صرف ان کا خیر مقدم کیا بلکہ اعلیٰ قیادت کے بعض اہم مناصب انہیں سونپ دیے۔ لیکن اس کے باوجود تحریک آزادی بڑی حد تک مسلم رنگ لیے ہوئے تھی۔ سچ یہ ہے کہ آزادی کی جنگ میں مقامی تعلیم یافتہ عیسائی اس وقت شامل ہوئے جب جنگ عظیم دوم کے بعد انہیں اندازہ ہو گیا کہ استعماری برطانوی حکومت کے دن گنے جا چکے ہیں۔

جنگ عظیم دوم تک آزادی کی لڑائی پورے طور پر مسلمان لڑ رہے تھے۔ سفید فام عیسائی مشنریوں نے مقامی عیسائیوں اور برطانوی حکومت کے درمیان ایک طرح سے نہ صرف مصالحت کرا دی بلکہ دونوں کے درمیان تعاون کی فضا قائم کر دی جس کا مقامی عیسائیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ مسلمانوں کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ برطانوی استعماری حکومت کے رہتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل تنزانیہ میں تاریک ہے۔ چنانچہ انہوں نے کھل کر برطانوی حکومت کے خلاف محاذ جنگ کھول دیا۔ پہلی بڑی عوامی تحریک 1939 میں مسلم اکثریتی علاقوں مثلاً ٹنگا اور دارالسلام میں ہوئی۔ 1947 میں بہت بڑی اسٹرائک ہوئی۔ یہ اگرچہ جنرل اسٹرائک تھی مگر مسلمان اس میں اوروں کی بہ نسبت زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ اس جنرل ہڑتال سے مجبور ہو کر استعماری برطانوی حکومت نے ایسے قوانین بنائے جس کی وجہ سے ڈاک ورکرس یونین کا قیام عمل میں آیا۔ عبدالوحید سائیکس اس یونین کے پہلے سکریٹری جنرل تھے جو بعد میں جمعیۃ العلماء فی تنزانیہ کے سکریٹری ہوئے اور تنزانیہ افریقن نیشنل یونین (TANU) کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ TANU کالونیل تنزانیہ کی پہلی سیاسی پارٹی تھی۔ اس پارٹی کے قیام کے بعد برطانیہ نے تنزانوی مسلمانوں کو مزید ستانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کو پہلے سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے دور رکھنے کی کوشش کی اور پھر

انہیں سرکاری نوکریوں میں آنے سے روکا۔اس کے برعکس عیسائیوں کی کھل کر نہ صرف ہر طریقے سے مدد کی بلکہ انہیں بڑے بڑے سرکاری عہدے بھی دیے۔

جب1950 کی دہائی میں یہ واضح ہوگیا کہ برطانیہ کے دن تنزانیہ میں گنے جاچکے ہیں تو بعض عیسائیوں نے بھی TANU میں شرکت شروع کردی۔ مسلمانوں نے یہ سوچ کر ان کا استقبال کیا کہ اس سے قومی اتحاد مزید مضبوط ہوگا۔ نہ صرف مسلمانوں نے تعلیم یافتہ عیسائیوں کا TANU میں خیر مقدم کیا بلکہ انہیں اہم عہدے بھی دیے۔ ایسے ہی عیسائیوں میں رومن کیتھولک جولیس نیریرے بھی تھے جنہیں بعض لوگ غلطی سے TANU کا بانی لیڈر مانتے ہیں۔لیکن چونکہ نیریرے اور چند دوسرے عیسائی زیادہ تعلیم یافتہ تھے،اس لیے آزادی کے متوالے مسلمانوں نے نیریرے کو TANU کا صدر بنادیا حالانکہ جنگ آزادی میں وہ نہ صرف پہلے سے شامل تھے بلکہ اس راہ میں مصیبتیں اٹھائی تھیں اور قربانیاں پیش کی تھیں۔آگے چل کر مسلمانوں کو احساس ہوا کہ نیریرے کو صدر بنانا ان کی غلطی تھی۔

آزادی کے بعد بھی نیریرے ملک کے صدر بنے۔ انہوں نے بظاہر خود کو سیکولر لیڈر کے طور پر پیش کیا،لیکن دراصل وہ نہ صرف کٹر عیسائی تھے بلکہ ہر وہ ممکن کوشش اور اقدام کرتے تھے جس سے مسلمان سیاست و معیشت میں عیسائیوں سے ہمیشہ پیچھے رہیں۔ پہلے ہی برطانوی حکومت اپنے آخری ایام میں ایسے انتخابی قوانین وضع کرچکی تھی جس کی وجہ سے مسلمان سیاسی طور پر زیادہ سرگرم ہونے کے باوجود نہ انتخاب لڑ سکے اور نہ ہی ووٹ دے سکے۔اسی کے ساتھ بہت سے مسلمان جو TANU میں تھے وہ اس امر کے خلاف تھے کہ مسلمان اسلام کے نام پر سیاست کریں۔ بلکہ برطانیہ کے خلاف لڑائی میں عیسائیوں کا ساتھ لینے کے لیے انہوں نے عیسائی لیڈروں کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ آزادی کے بعد انہیں لوگوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور برطانوی حکومت ہی کی پالیسی ایک طرح جاری رکھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی پسماندگی جاری رہی۔

تنزانیہ 1961 میں آزاد ہوا اور TANU لیڈرشپ کے سیکولر وعدوں پر مسلمانوں نے بھرپور اعتماد ظاہر کرتے ہوئے آزاد حکومت کی کھل کر حمایت کی۔آزادی سے قبل TANU نے وعدہ کیا تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان خاص طور سے تعلیم کے میدان میں جو نابرابری برطانوی حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہے،اسے دور کیا جائے گا۔ مسلمان جماعتوں نے اس کا انتظار نہیں کیا۔1962 میں اہم جماعتوں نے ایک کانفرنس کی۔ کانفرنس نے یہ فیصلہ کیا کہ حکومت اپنے وعدے پورے کرتے ہوئے مسلمان علاقوں میں اسکول اور کالج قائم کرے گی لیکن خود مسلمانوں کو بھی اپنے طور پر اسکول اور یونیورسٹیاں قائم کرنا چاہیے۔ اس فیصلے سے نئی عیسائی غلبے والی حکومت کے کان کھڑے ہوگئے اور وہ پرانی برطانوی پالیسی پر قائم رہی۔ چنانچہ آج مسلمانوں کے قائم کردہ اسکول تو ہیں اور مسلمان پڑھ بھی رہے ہیں،لیکن ان کی تعلیمی پسماندگی پہلے کی طرح قائم ہے۔ تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے سرکاری نوکریوں میں بھی ان کی نمائندگی کم ہے۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ TANU سے ان مسلمانوں کو ایک ایک کرکے مختلف بہانوں سے نکال دیا گیا جنہوں نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔آزاد تنزانوی حکومت سے مسلمانوں کو جو امیدیں تھیں،وہ ایک ایک کرکے ٹوٹ چکی ہیں۔TANU سے مسلم نوجوان بیزار ہوکر مختلف جماعتوں میں بٹ گئے ہیں۔اپنے طور پر وہ کوشش بھی کررہے ہیں کہ تنزانیہ کے سماج میں وہ مقام حاصل کرسکیں جس کے وہ مستحق ہیں۔لیکن مسلمانوں کے لیے ترقی کا راستہ مشکل بنادیا گیا ہے۔یہ وقت ہی بتائے گا کہ ان کی جدوجہد کب بارآور ہوگی۔

معلومات کی جانچ

1- تنزانیہ کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ کیا ہے؟

2- تنزانیہ میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کیسی ہے؟

9.7 خلاصہ

اس مضمون میں جنوبی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں قدرے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ مسلمان وہاں بہت کم تعداد میں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی اکثریت بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس کے بعد کینیا اور تنزانیہ کے مسلمانوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ان ملکوں میں اسلام کب پہنچا اور آج وہاں مسلمانوں کی حالت کیا ہے۔ تنزانیہ ایسٹ افریقہ کا وہ ملک ہے جہاں مسلمان سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ اس لیے تنزانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی اور ان کے مستقبل سے قدرے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ایک بات واضح ہے کہ کینیا اور تنزانیہ میں پرتگالیوں اور ان کے بعد دوسری استعماری طاقتوں کی آمد سے پہلے مسلمان یہاں بڑی اچھی حالت میں تھے۔ لیکن یوروپی استعمار کی مسلم مخالف پالیسیوں کی وجہ سے ان کے سیاسی و معاشی مفادات کو نقصان پہنچا۔ خاص طور سے تنزانیہ میں جہاں مسلمانوں نے جنگ آزادی میں اوروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آج مسلمانوں کی حالت کچھ اپنوں کی نادانیوں اور کچھ غیروں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے کافی ناگفتہ بہ ہے۔

9.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیں:

1۔ تنزانیہ کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے رول پر روشنی ڈالیں۔

2۔ کینیا میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کی موجودہ حالت سے بحث کریں۔

3۔ جنوبی افریقہ میں اسلام کب اور کیسے پہنچا؟

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیں

4۔ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

5۔ برطانیہ کی تعلیمی پالیسی سے تنزانوی مسلمانوں کو کیا نقصان ہوا؟

6۔ آزادی کے بعد اقتدار و حکومت میں شامل عیسائی لیڈروں نے مسلمانوں کو کیسے نقصان پہنچایا؟

9.9 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ ثروت صولت: مسلمان اقلیتیں

2۔ آباد شاہ پوری: روس میں مسلمان قومیں

3- M. Ali Kettani: Muslim Minorities in the World Today

Sulayman Nyang: Islam in the United States of America.4

Yuonne Yezbeck Haddad & Jane I Smith: Muslim Minorities in the West.5

اکائی 10: مسلمان ایشیا میں

اکائی کے اجزاء

10.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد براعظم ایشیا کے چند اہم ممالک میں بسنے والی مسلم اقلیتوں کے بارے میں ضروری اطلاعات فراہم کرنا ہے۔ مقصد واضح ہے کہ ہم صرف ان ممالک کا مطالعہ نہیں کرنا چاہتے جہاں مسلمان اکثریت میں یا جو تاریخی طور پر سرزمین اسلام یا اسلام کا گہوارہ کہلاتے رہے ہیں۔ روس، چین اور سری لنکا وغیرہ وہ ممالک ہیں جہاں اسلام صحابہ کرام کے زمانے ہی میں پہنچ گیا تھا۔ روس وچین میں ابتداء اسلام اور مسلمانوں کا خیر مقدم ہوا لیکن بعد کے ادوار میں اور آج بھی بہت سے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہے۔ برما، تھائی لینڈ اور فلپائن میں بھی مسلم اقلیت کے ساتھ زیادتیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ اس لیے ان ملکوں کے مسلمانوں کے موجودہ حالات کو سمجھنا، ان کے بارے

میں صحیح معلومات حاصل کرنا اپنے آپ میں خود ایک مقصد ہے۔

10.2 تمہید

اس اکائی کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں روس اور چین میں اسلام کی آمد اور صدر اول کے مسلمانوں کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں گی۔ بہرحال تاریخ مختصراً بیان ہوگی اور زیادہ توجہ موجودہ حالات پر دی جائے گی۔ دوسرے حصے میں سری لنکا اور تھائی لینڈ کے مسلمانوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ یہ دونوں ملک اس قدیم بحری تجارتی گزرگاہ کے اہم اسٹیشن تھے جو ایسٹ افریقہ سے چین کے درمیان ہوتی تھی اور جس کا عرب ایک بہت ہی اہم حصہ تھے بلکہ عرب ہی تھے جو ایسٹ افریقہ سے چین تک سفر طے کرتے تھے۔ چینی بالعموم ہندوستان اور سری لنکا سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان ممالک میں اسلام اپنے صدر اول میں ہی پہنچ چکا تھا۔ تیسرے حصے میں تین ممالک، برما، فلپائن اور جاپان کے مسلمانوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ جاپان میں مسلمان بہت کم تعداد میں ہیں لیکن برما اور فلپائن میں وہ خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور دونوں ہی ممالک، خاص طور سے برما میں آج مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ اس اکائی میں مذکورہ تمام ہی ممالک کی مسلم اقلیتوں کی تاریخ اور موجودہ صورتحال دونوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعہ سے امید ہے قاری/طالبعلم کو معلوم ہوگا کہ اسلام اپنے آغاز سے پرامن دعوت وتبلیغ کے ذریعے پھیلا ہے۔ اس نے نہ صرف زمانۂ قدیم و وسطیٰ میں بلکہ جدید دور میں بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور بہت سے لوگ مسلمان بھی ہوگئے ہیں۔

10.3 مسلمان روس میں

یہاں روس سے ہماری مراد تاریخی روس اور موجودہ روس ہے نہ کہ سوویت یونین جو 1990 کی دہائی کے آغاز میں منتشر ہوگیا۔ روس ایک قدیم ملک ہے، عیسائی اکثریت کا ملک ہے اور اسلام سے اس کا تعلق بھی بہت قدیم ہے۔ آج عیسائیت کے بعد اسلام روس کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ مسلمان ماسکو سمیت روس کے ہر بڑے شہر اور اہم علاقے میں موجود ہیں۔ صدیوں سے ستائے جانے، خاص طور سے زاروں اور کمیونسٹوں کے عہد میں مٹائے جانے کی منظم کوشش، بلکہ ظلم وتشدد کے باوجود اسلام آج وہاں زندہ ہے جو اپنے آپ میں ایک معجزہ ہے۔

آج روس میں حکومت اور دانشور دونوں اسلام کو اپنا تاریخی ورثہ تصور کرتے ہیں۔ آزادانہ طور پر انجام دیے گئے ایک سروے کے مطابق 6% روسی خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے یعنی کل آبادی کا تقریباً 14 فیصد یا ہر 7 روسی میں سے ایک مسلمان ہے۔ مسلمان کئی نسلی اقلیتوں کی شکل میں شمالی کا کیشیا میں بحر اسود اور بحر کیسپین کے درمیانی علاقے میں آباد ہیں۔ Volga Basin میں تاتار اور بشکیر قومیتیں آباد ہیں جن کی بڑی اکثریت مسلمان ہے۔ دسمبر 2006 کی ایک اطلاع کے مطابق روس میں کل پانچ ہزار سے زائد مسلمانوں کی رجسٹرڈ تنظیمیں ہیں۔ روسی آرتھوڈکس چرچ سے وابستہ تنظیموں کی تعداد 29 ہزار سے زیادہ ہے۔

موجودہ روس اور سابق سوویت یونین کے بعض حصوں کو عرب مسلمانوں نے آٹھویں صدی ہی میں فتح کرلیا تھا۔ 922 میں پہلی مسلم ریاست، وولگا بلغاریہ قائم ہوئی۔ اس کے بعد کا کیشیا اور یوروپی علاقوں میں رہنے والے ترکوں نے اسلام قبول کرلیا۔ کرائمیہ میں جو خان ریاستیں قائم ہوئیں، ان کی روس سے جھڑپیں سولہویں صدی تک جاری رہیں۔ کرائیمیہ میں رہنے والے تاتاریوں کے روس سے تجارتی

رشتے بھی تھے جو اٹھارہویں تک قائم رہے۔ اگرچہ عثمانی ترکوں اور تاتاریوں کو بدنام کیا جاتا ہے کہ وہ غلاموں کی تجارت میں شامل تھے، بلاشبہ اکادکا لوگ اس کام میں ملوث تھے لیکن اکثریت روایتی تجارت میں دلچسپی رکھتی تھی یعنی تاتاری ایک طرح سے روسیوں تک وہ سامان پہنچاتے جن کی انہیں ضرورت تھی اور اس ضمن میں انہیں عثمانی ترکوں سے مدد مل رہی تھی۔ یہ کہنا کہ وہ بس غلاموں کی تجارت کر رہے تھے، زیادتی ہوگی۔

سولہویں صدی میں ہی روس نے خود کو ایک بڑی فوجی طاقت بنانا شروع کیا۔ انہوں نے کازان کو 1552 میں آسانی سے فتح کر لیا۔ اس فتح کے بعد روسیوں نے مسلمانوں پر ہر طرح کا تشدد روا رکھا۔ روسی مسلمانوں کے خلاف تعصب برتتے۔ ان کو مختلف بہانوں سے دباتے اور حکومتی اداروں وغیرہ سے انہیں دور رکھتے۔ یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی میں کیتھرین کے دور تک جاری رہا۔ کیتھرین نے مساجد کو تاراج اور غیر آباد بنا دیا تاکہ مسلمان کہیں اپنے ثقافتی ورثے کی تجدید و احیاء میں نہ لگ جائیں۔ یہ کوشش بھی کی گئی کہ مسلمان ہو چکے تاتاریوں اور قازخوں کو ان کے اسلام لانے سے پہلے کے ورثے سے روشناس کرایا جائے اور ان کو ترغیب دی جائے کہ وہ اسلام سے پہلے اپنے ماقبل اسلام ماضی پر فخر کریں۔ اس مقصد کے لیے ان قازخ اور تاتاری شخصیات اور ان کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا جو اسلام لانے سے قبل ان کے آباواجداد نے انجام دیے تھے۔ قازخوں میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لیے روسی حکمراں اکثر انہیں سرکاری فوجی افسران کے یہاں بھیج دیتے تاکہ وہ ان کی شان وشوکت دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔ قازخ علماء اور دانشوروں نے روسیوں کی چال کو بھانپ لیا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ترک اصلیت کو اجاگر کرنے میں مصروف ہو گئے تاکہ مذہبی و قومی ورثے کی حفاظت ممکن ہو سکے۔ روسی حکومتوں نے ایسا کرنے والے تاتاریوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ تاتاری ستائے گئے ملک بدر کیے گئے یا ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں روس سے مسلمانوں کو اس طرح نکال باہر کرنا ممکن نہیں تھا جیسا کہ پندرہویں سولہویں صدی میں اسپین اور پرتگال میں یا اس سے پہلے سسلی (صقلیہ) میں ہوا تھا۔ لیکن روسیوں نے بہرحال ایسی پالیسیاں اختیار کیں جس سے مسلمان تاتاریوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً روس کے دوسرے علاقوں میں رہنے والے روسیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو تاتاری علاقوں میں زمینیں دی گئیں تاکہ لوگ یہاں آکر آباد ہوں۔ ایسا ہوا اور بڑے پیمانے پر ہوا جس کی وجہ سے تاتاری یا تو اپنی زمینوں سے بے دخل ہو گئے یا اپنی ہی روایتی سرزمین پر اقلیت میں آ گئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ایسا صرف تاتاری مسلمانوں کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا جو کسی اور قومیت سے تعلق رکھتے تھے اور تاتاری علاقوں کے بجائے روس کے کسی اور علاقے میں آباد تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کاکیشین مسلمان کاکیشیا میں برائے نام رہ گئے، کاکیشیا میں رہنے والی دوسری مسلم قوموں کے ساتھ بھی برا سلوک ہوا۔ کرائمیہ میں رہنے والے تاتاریوں پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔ روسی فوج ان کے گاؤں اور قصبوں کو گھیر لیتی، سارے لوگوں کو گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کیا جاتا اور پھر کسی نزدیکی بندرگاہ جانے پر مجبور کیا جاتا جہاں وہ بھوک پیاس کی حالت میں ترکی کے جہازوں کا انتظار کرتے۔ اس انتظام میں کتنے ہی لقمہ اجل بن جاتے اور جو بچ جاتے وہ مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر ترکی پہنچتے۔ کاکیشیا کے مسلمانوں نے اس جبر کے خلاف بغاوت کی تو انہیں بھیانک انجام کا سامنا کرنا پڑا۔ روسی فوج نے ان سے ترکی چلے جانے کو کہا یا پھر خود روس کے دور دراز کے علاقوں مثلاً سائبیریا وغیرہ میں آباد کیے جانے کی پیشکش کی۔ اکثریت نے ترکی آنا پسند کیا۔ یہ لوگ اناطولیہ کے علاوہ موجودہ شام، اردن، فلسطین، عراق اور کوسوو میں آباد

ہوئے۔کم سے کم پانچ لاکھ لوگوں نے ترکِ وطن کیا کیونکہ روسیوں نے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ کھلا چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے بھی تھے جنہیں ترکی یا تو جانے نہیں دیا گیا یا ان کے پاس وہاں جانے کے لیے مطلوب سرمایہ نہیں تھا۔ ان لوگوں کو روسیوں نے زبردستی دوسرے علاقوں میں آباد کیا۔ بے شمار لوگ راستے ہی میں ہلاک ہوگئے اور جو بچے وہ نامانوس علاقوں میں سخت پریشانیوں سے دوچار ہوئے۔ ان نئے علاقوں میں ان کے پاس کرنے کے لیے وہ کام نہیں تھا جو وہ جانتے تھے۔ چنانچہ زندہ رہنا نہایت مشکل ہوگیا۔ خوشحال زندگی بسر کر رہے ان مسلمانوں کو نہایت غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا اور ایسا صرف زاروں نے 19 ویں صدی میں نہیں کیا بلکہ ان کے جانشین کیمونسٹوں نے بھی مسلمانوں کو ان کے علاقوں سے نکال کر دوسرے علاقوں میں آباد کرنے کی پالیسی جاری رکھی۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا یعنی ایک ایسا روس قائم کرنا جس میں یا تو صرف روسی نسل کے لوگ ہوں اور وہ بھی وہ روسی جو روسی آرتھوڈکس چرچ سے وابستہ تھے۔ ان سارے مظالم کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج جسے جمہوریہ تاتارستان کہتے ہیں، اس میں تاتاری مسلمان کم اور غیر تاتاری روسی اکثریت میں ہیں۔

1917 میں کیمونسٹ انقلاب سے زاروں کے مظالم سے مسلمانوں کو نجات ملی۔لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ کیمونسٹوں نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ وہ بھی زاروں ہی جیسے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ زاروں نے صرف مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جب کہ کیمونسٹوں نے تمام ہی مذاہب کے ماننے والوں پر ظلم کیا۔ زاروں کی طرح بڑے پیمانے پر نہیں، تو چھوٹے پیمانے پر کیمونسٹوں نے بھی مسلمانوں کو جبراً سائبیریا بھیجا۔ انھوں نے اپنی مذہب مخالف پالیسی کے تحت مساجد بند کر دیں اور لوگوں کو جبراً مذہب پر عمل کرنے سے روکا۔ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے ہزاروں مسلمان ترکِ وطن کر کے دوسرے ملکوں میں جا بسے۔

1989 میں دیوار برلن گرنے کے بعد روس سے بھی کیمونسٹوں کا جنازہ نکل گیا۔ صدیوں بعد مسلمانوں کو مظالم سے نجات ملی۔ کیمونسٹوں کی جگہ لینے والی نئی حکومتیں نہ مذہب مخالف ہیں اور نہ ہی اسلام مخالف، البتہ ان لوگوں کو موجودہ روس بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے جو اس سے الگ ہو کر علیحدہ ریاست بنانا چاہتے ہیں جیسے چیچنیا کے مسلمان۔ ویسے موجودہ روس کی پالیسی نہ مذہب مخالف ہے اور نہ ہی سرکاری طور پر اسلام مخالف۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔

1991 میں سوویت روس کا خاتمہ ہوگیا۔ کیمونسٹ ایمپائر پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد کئی مسلمان ریاستیں جیسے قزاخستان، تاجکستان اور ازبکستان وغیرہ آزاد مسلم ریاستیں بن گئیں۔ روس جو بہت سے معاملات کے اعتبار سے سوویت یونین کا جانشین قرار دیا گیا، کی پالیسیوں میں بھی بڑی تبدیلی آئی۔ کیمونسٹوں کی مذہب مخالف پالیسی ختم کر دی گئی جس سے روس کے اندر رہنے والی مسلم اقلیت کو بھی راحت نصیب ہوئی۔ لیکن جب چیچنیا کے مسلمانوں نے آزادی کا مطالبہ کیا تو روس نے تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے اپنی فوجیں بھیج دیں۔

کیمونسٹ روس کم ہی مسلمانوں کو حج کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ لیکن 1991 کے بعد اس پالیسی میں زبردست تبدیلی آئی۔ خود مسلمانوں نے اپنی ایک جماعت بنالی جس کا نام تھا۔ روسی مسلمانوں کی یونین جس کے لیڈر تاتارستان کے امام خطیب مقدس تھے۔ اس تنظیم کا مقصد روسیوں کے ذہنوں کو اسلام کے بارے میں صاف کرنا ہے یعنی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔ النور آل رشیا مسلم موومنٹ ایک دوسری تنظیم ہے جو مساجد کے اماموں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کے تحفظ کے

لیے کام کرتی ہے۔ 1991 میں اسلامک کلچرل سینٹر آف رشیا کا قیام عمل میں آیا۔ اس سینٹر میں ایک مدرسہ بھی چل رہا ہے جو روسی مسلمانوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے علماء سازی کا کام کرتا ہے۔ روس میں رہنے والے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اپنی روایتی مادری زبان کے علاوہ روسی زبان بولنے لگی ہیں۔ ایسے مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی رہنمائی کے لیے بہت سی کتابیں اور رسالے بھی روسی زبان میں شائع ہونے لگے ہیں۔

قازان میں ماسکو کے بعد سب سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ قازان تاتارستان میں واقع شہر ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی اسلامک یونیورسٹی ہے۔ جس میں ذریعہ تعلیم روسی کے ساتھ تاتاری زبان بھی ہے۔ داغستان میں کئی اسلامک یونیورسٹیاں اور مدارس ہیں۔ زیادہ مشہور داغستان اسلامک یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ آف تھیالوجی اینڈ انٹرنیشنل ریلیشنز وغیرہ ہیں۔

سینٹرل ایشیا کے مسلمانوں کی طرح روس کے مسلمانوں کی اکثریت بھی سنی ہے۔ پانچ فیصد کے قریب شیعہ مسلمان ہیں۔ چیچنیا اور داغستان میں تصوف کا زور ہے اور آذربائیجان میں شیعہ مسلمان کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ باقی علاقوں میں سنی مسلمان اکثریت میں ہیں۔ روسی نسل کے بعض لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔

چونکہ کمیونسٹ روس نے ایک طرح سے حج پر پابندی عائد کر رکھی تھی، اس لیے کمیونزم کے زوال کے بعد روسی مسلمانوں میں حج کے لیے بڑا شوق پایا جاتا ہے۔ لیکن سعودی عرب نے انتظام کے نقطۂ نظر سے وہاں کے لیے جو کوٹہ مقرر کیا ہے، وہ ناکافی ہے۔ 2006 میں 18000 روسی مسلمانوں نے حج کیا اور 2010 میں بیس ہزار لوگوں نے یہ فریضہ انجام دیا۔ روسی مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے کوٹے میں مزید اضافہ کیا جائے۔

تاتارستان یوروپی روس کا وہ علاقہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔ یہاں اب صرف تاتاری مسلمان نہیں ہیں۔ ایک بہت بڑی تعداد ان مسلمانوں کی بھی ہے جو یہاں کاکیشیا اور سینٹرل ایشیا سے آکر آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ تاتاری نہیں بولتے۔ جمعہ کا خطبہ بالعموم تاتاری زبان میں دیا جاتا ہے۔ غیر تاتاری مسلمان اکثر شکایت کرتے ہیں اور اس خواہش کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ مساجد کے امام روسی زبان میں بھی خطبہ دیں۔ تاتاری امام ابھی تک ایسا کرنے سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اس طرح چھوٹے موٹے دوسرے مسائل بھی ہیں۔ مگر اچھی بات یہ ہے کہ لوگ مسئلوں کو حل کرنے میں یقین رکھتے ہیں اور ان کی بنیاد پر سر پھٹول نہیں کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ ماسکو، روس کے دارالحکومت میں 20 لاکھ سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو ہمیشہ سے ہی اس شہر کے باشندے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً 20 ہی لاکھ وہ مسلمان ہیں جو مختلف شہروں اور علاقوں سے یہاں کام کرنے آئے ہیں۔ اتنے زیادہ مسلمانوں کے لیے ماسکو میں صرف چار مساجد ہیں۔ ہر ایک مسجد میں دس ہزار نمازی بیک وقت عبادت کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے چالیس لاکھ مسلمانوں کے لیے صرف چار مساجد ناکافی ہیں۔ لیکن ماسکو کے میئر مزید مساجد کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ روس کے مسلمانوں کا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہ اور دوسرے چند چھوٹے چھوٹے مسائل ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ ڈائیلاگ کا دروازہ ہمہ آن کھلا ہوا ہے۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ افہام وتفہیم کی مزید راہیں کھلیں گی اور مسائل بھی حل ہوتے جائیں گے۔

10.4 مسلمان چین میں

چین سے عربوں کے تجارتی تعلقات اسلام کی آمد کے قبل سے قائم ہیں۔ خود چینی تاجر بحری راستے سے ہندوستان اور سری لنکا تک تجارت کرتے تھے جہاں ان کی ملاقات عرب تاجروں سے ہوتی تھی۔ چینیوں کے برعکس عرب ایسٹ افریقہ سے براہ ہندوستان وسری لنکا، ملیشیا، انڈونیشیا اور چین تک تجارت کرتے تھے۔ ظہور اسلام کے بعد بھی یہ تجارت جاری رہی اور اسلام دورِ صحابہ ہی میں یہاں آ گیا۔ ممکن ہے بعض صحابہؓ دورِ نبوی ہی میں یہاں آئے ہوں لیکن اس کے تاریخی شواہد نہیں ملتے۔ بحری راستے کے علاوہ شاہراہِ ریشم کے توسط سے بھی اسلام چین میں صدرِ اول ہی میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اسلام اور مسلمان دورِ صحابہ ہی سے چین میں موجود ہیں اور ان سے متاثر ہو کر بے شمار چینیوں نے اسلام قبول بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وسیع وعریض چین کے طول وعرض میں ہر جگہ مسلمان نظر آتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چینی مسلمان کل آبادی کا دو فیصد ہیں۔ چین میں کل 55 تسلیم شدہ اقلیتیں ہیں جن میں سے دس مسلمان اقلیتی ونسلی گروپ ہیں۔

چینی مسلمان اپنی تاریخ میں اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے یہاں سب سے پہلے اسلام لانے والے سعد بن ابی وقاص اور دو دیگر صحابۂ کرام تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ 616 سے 618 کے درمیان چین پہنچے تھے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ دورِ نبوی ہے یعنی اسلام دورِ نبوی میں ہی اس دور دراز سرزمین میں پہنچ گیا تھا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق سعد بن ابی وقاص تین دوسرے صحابہ کے ساتھ دوبارہ چین 637 میں آئے تھے یعنی نبیؐ کے انتقال کے فوراً بعد۔ ایک تیسری روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے سعد بن ابی وقاص کو 650 میں بادشاہ چین کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ جو روایت بھی صحیح ہو، یہ بات طے ہے کہ اسلام چین میں صدرِ اول ہی میں پہنچ گیا تھا۔

چین پر بعض اہم خاندانوں نے حکومت کی ہے مثلاً Tang Dynasty۔ اس کے بعد Song Dynasty، پھر Yuan Dynasty اور اس کے بعد Ming اور Qing خاندانوں یا Dynasties نے چین پر حکومت کی۔ ان سارے ہی ادوار میں اسلام فروغ پاتا رہا ہے۔ لیکن یہاں مختصر مضمون میں اتنی ساری تفصیلات دینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم سیدھے جدید دور میں آ جاتے ہیں جب چین دنیا کے نقشے پر ریپبلک کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔

Qing Dynasty کے خاتمے کے بعد Sun Yat-Sen نے Republic of China کی بنیاد رکھی اور یہ اعلان کیا کہ چین پر ہَن، مَن (Manchu) مینگ (منگول) ہوئی (Hui) جو مسلمان ہیں، تبتیوں اور Miao لوگوں کا برابر کا حق ہے۔ قدیم اور زمانۂ وسطیٰ کے چین میں مسلمان اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ایک وقت تو وزیرِ دفاع بھی ایک مسلمان ہی تھا جس کا نام تھا Bai Chongxi۔ اسی طرح بعض صوبوں کے گورنر بھی مسلمان تھے۔ چین اور جاپان کے درمیان دوسری لڑائی کے دوران مسلمانوں نے چین کے دفاع کے لیے بڑی قربانیاں دیں۔ وہ بہادری سے لڑے اور سیکڑوں میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ جب جنگ میں جاپانیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو انہوں نے مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا۔ انہوں نے ہوئی (Hui) مسلمانوں کی مساجد تباہ کر دیں، ان کے آدمیوں اور بچوں کا قتل کیا اور ان کی عورتوں کے ساتھ مسلسل منہ کالا کیا۔ وہ مساجد میں سور کا گوشت ڈال دیتے اور جب مسلمان احتجاج کرتے تو انہیں گولیوں سے بھون دیتے۔ ان کی عورتوں کے ساتھ زنا بالجبر کرتے اور پھر قتل کر دیتے۔ ان کا جرم بس یہ تھا کہ انہوں نے چین کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے دفاع کے

لیے جاپانیوں کے خلاف ہتھیار اٹھایا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں بعض گھناونے واقعات کی تفصیل درج ہیں جن سے جاپانیوں کی مجرمانہ ذہنیت اور جانوروں جیسی فطرت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً Nanking میں واقع ایک مسلمان کے گھر پر تقریباً تیس سپاہی ایک شام پہنچتے ہیں۔ گھر کے مالک کا نام Ha تھا۔ سپاہیوں کے مطالبے پر Ha نے دروازہ کھولا تو اسے ایک سپاہی نے اپنے ریوالور سے قتل کر دیا۔ Ha کی بیوی نے سپاہیوں کے قدموں پر گر کر گڑ گڑاتے ہوئے درخواست کی کہ کسی اور کو قتل نہ کریں۔ سپاہیوں نے انہیں بھی قتل کر دیا۔ سپاہی پھر اندر گئے۔ ایک خاتون اپنے ایک سال کے بچے کے ساتھ ایک ٹیبل کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ اسے باہر نکال کر ننگا کر کے کئی سپاہیوں نے زنا بالجبر کیا۔ پھر ان کے سینے میں بندوق کی سنگین گھونپ دی اور شرمگاہ میں ایک بوتل ٹھونس دی گئی اور ان کے ایک سالہ بچے کو سنگین سے مار ڈالا گیا۔ سپاہی پھر دوسرے کمرے میں گئے جس میں چار لوگ چھپے ہوئے تھے۔ ایک 76 سالہ مرد، ان کی 74 سالہ اہلیہ اور 16 اور 14 سال کی دو بچیاں۔ سپاہیوں نے بچیوں کے ساتھ زنا کرنا چاہا تو بوڑھی خاتون نے انہیں بچانے کی کوشش کی تو ایک سپاہی نے اپنے ریوالور سے انہیں قتل کر دیا۔ بوڑھے مرد نے اپنی بیوی کی لاش کو اپنی گود میں لے لیا تو اسے بھی مار دیا گیا۔ اس کے بعد دونوں لڑکیوں کو زبردستی ننگا کر کے ان کے ساتھ کئی سپاہیوں نے زنا بالجبر کیا۔ پھر سولہ سالہ لڑکی کو سنگینوں سے گود دیا گیا اور اس کی شرمگاہ میں جبراً ایک کین ڈال دی گئی۔ اس کی 14 سالہ بہن کو بھی سنگینوں سے مارا گیا لیکن اس کی شرمگاہ کے ساتھ کمینے پن کی حرکت نہیں کی گئی۔ ان دونوں کی ایک تیسری بہن جو سات یا آٹھ سال کی تھی، اسے بھی جان سے مار دیا گیا۔ بہنوں کے دو بھائی تھے جن کی عمر بالترتیب 4 اور 2 سال تھیں۔ بڑے بھائی کو سنگینوں سے گود کر مار دیا گیا اور چھوٹے کے سر کو تلوار سے دو حصوں میں کر دیا گیا۔

مذکورہ بالا واقعہ کوئی استثنائی (Isolated) واقعہ نہیں ہے۔ چونکہ چینی فوج کے ساتھ مسلمان جاپانیوں کے خلاف لڑ رہے تھے، اس لیے جاپانیوں نے اپنے مقبوضہ علاقے کے مسلمانوں اور چینیوں کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے اپنے وطن عزیز کے لیے جان نچھاور کرنے کی روایت جاری رکھی۔ 1937 میں جاپانیوں کے خلاف لڑنے کے لیے خود ترک نسل کے مسلمان بڑھ کر آگے آئے اور چین کی طرف سے صف اول کے مجاہدوں میں شامل ہو گئے۔ بدقسمتی سے آج چین میں انہیں ترک نسل کے مسلمانوں کے ساتھ موجودہ چینی حکمراں زیادتی کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کو کمیونسٹ چین، خاص طور سے کلچرل انقلاب کے دس سالہ سیاہ دور میں بھی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں، بدھسٹوں اور دوسرے مذہبی گروپوں کے لیے بھی یہ وقت برا تھا۔ کمیونسٹوں نے تمام ہی مذاہب کے ماننے والوں کو سوشلزم مخالف قرار دیتے ہوئے ان کے مذہبی مقامات اور مذہبی کتابوں کی بے حرمتی شروع کر دی، ریڈ گارڈس مساجد گرا دیتے، قرآن کی کاپیاں برباد کر دیتے اور دوسری مذہبی علامات کی حرمت بھی پامال کرتے۔ پھر بھی خود چینی مسلمانوں کا ماننا ہے کہ کمیونسٹ روس کے مقابلے میں کمیونسٹ چین کی پالیسیاں کم سخت اور کم ظالمانہ تھیں۔ بہرکیف 1978 کے بعد چین نے اپنی سخت پالیسیوں میں نرمی پیدا کی۔ اگرچہ آج بھی چین میں کمیونسٹ حکومت ہے لیکن اس کی پالیسیاں بالکل بدل چکی ہیں۔ مذہب بیزاری میں بھی کمی آئی ہے۔ مساجد اب نہ پامال کی جاتی ہیں اور نہ ہی قرآن کو پھاڑا جاتا ہے۔ مگر ان مسلمانوں پر بہرحال عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے جو علیحدگی پسند ہیں۔

معاشی کھلے پن کی اپنی پالیسی کی وجہ سے موجودہ کمیونسٹ چین نے مسلم دنیا سے اپنے تعلقات استوار کیے ہیں۔ مسلمانوں کے تئیں

بھی ان کی پالیسی میں نرمی آئی ہے۔ خاص طور سے ہوئی (Hui) مسلمانوں کے بارے میں چینی حکومت کا رویہ بالکل بدلا ہوا ہے۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ ہوئی مسلمان اویغور مسلمانوں کے برعکس علیحدگی پسند نہیں اور تاریخی طور پر چینی فوج کے ساتھ دشمنوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہوئی مسلمانوں کو سیاسی آزادی نسبتاً زیادہ حاصل ہے۔ چینی حکمرانوں کی یہ پالیسی اس وقت سامنے آئی جب 1989 میں مسلمانوں کے بارے میں ایک دل آزار کتاب شائع ہوئی۔ Hui مسلمانوں نے اس کتاب کے خلاف زبردست احتجاج کیا جس کے دوران اکا دکا تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ چینی پولس نے نہ صرف احتجاجیوں کو تحفظ فراہم کیا بلکہ ان کی بعض پر تشدد کارروائیوں سے چشم پوشی بھی کی۔ خود چینی حکومت نے کتاب پر فوراً پابندی عائد کردی۔ مگر اگر یہی کام اویغور (Uighur) مسلمانوں نے کیا ہوتا تو حکومت اور پولس دونوں کا رویہ بالکل مختلف ہوتا۔

ایک اور واقعے سے بھی کمیونسٹ حکومت کی نئی نرم مسلم پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ 2007 میں چینی کیلنڈر کے مطابق "Year of Pigs" منایا جانا تھا۔ حکومت نے CCTV پر خنازیر کی تصاویر والے اشتہارات پر پابندی لگادی تا کہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے جذبات مجروح نہ ہوں جو خنزیر کو ناپاک اور حرام مانتے ہیں۔ اگر چہ سرکار ''اقلیات'' کا لفظ استعمال کر رہی تھی لیکن ہر کوئی سمجھتا تھا کہ ایسا صرف تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کے جذبات کو سامنے رکھ کر کیا گیا تھا۔

چند ماہ قبل Charlie Hebdo کا معاملہ پیش آیا تھا۔ اس فرنچ میگزین میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی گئی تھی۔ میگزین کے آفس پر مسلح حملہ ہوا جس سے جانی و مالی نقصان ہوا۔ ساری دنیا خاص طور پر مغرب میں ایک مسلم مخالف لہر دوڑ گئی۔ اس واقعے کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی اور دل آزاری کی گئی۔ چین کے حکومتی کنٹرول والے میڈیا نے چارلی ہبدو میں حضرت محمد کے توہین آمیز کارٹون شائع کرنے پر میگزین اور اس کے ایڈیٹر کی زبردست تنقید کی۔ حکومت کے ایک اخبار Global Times نے آزادی رائے کے حق کو محدود کرنے کی وکالت کی، اور چارلی ہبدو پر الزام لگایا کہ وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی جنگ کا خطرہ پیدا کر رہا ہے۔ اخبار نے یہ بھی لکھا کہ چارلی ہبدو پر حملہ دراصل مغربی استعمار کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔

Hui اور اویغور مسلمان چین میں زیادہ ہیں۔ دوسرے نسلی گروہ بھی ہیں جو پورے چین میں پھیلے ہوئے ہیں۔ متوقع طور پر سب کو یکساں آزادی حاصل نہیں ہے۔ ہوئی مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔ وہ نئی مساجد بھی تعمیر کرسکتے ہیں اور ان کے بچے مساجد جاتے بھی ہیں جب کہ ژنگجیانگ کے اویغور مسلمانوں کو یہ آزادیاں حاصل نہیں ہیں، بلکہ فرانس کی طرح اسکارف پر پابندی لگانے کی بھی بات چل رہی ہے۔ چین میں مذہبی تعلیم پر پابندی ہے۔ اویغور مسلمانوں کے معاملے میں اس قانون پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے جب کہ Hui مسلمانوں کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے۔ Hui مسلمان تو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بعض مساجد میں باقاعدہ مذہبی تعلیم کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ سیکنڈری ایجوکیشن کی تکمیل کے بعد Hui مسلمانوں کے بچے امام سے مذہبی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں جب کہ اویغور مسلمانوں کو یہ مراعات حاصل نہیں ہیں۔ اسی طرح حکومت کی نوکری کرنے والے Hui مسلمانوں کو رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کی اجازت ہے لیکن اویغور مسلمانوں کو نہیں۔ Hui مسلمان حج کرنے جارہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے مگر اویغور مسلمانوں پر اس ضمن میں زیادتی کی جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح Hui مسلمانوں کی خواتین نقاب پہن سکتی ہیں جب کہ اویغور مسلمان خواتین پر پابندی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ چینی حکومت جان بوجھ کر Hui اور اویغور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خود اویغور مسلمانوں کو بھی آپس میں لڑاتی ہے۔ مثلاً اویغور مسلمانوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لیے ان فوجی ٹکڑیوں کو ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے جن میں Hui مسلمان بطور سپاہی اور افسر زیادہ تعداد میں کام کرتے ہیں۔ اسی طرح ژنگجیا نگ کے اویغور مسلمانوں کو مختلف علاقوں میں بانٹ کر ان کے ساتھ مختلف سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ مثلاً ترپن (Turpan) اور ہامی (Hami) علاقوں کے اویغور مسلمانوں کو Tarim Basin میں رہنے والے اویغور مسلمانوں کا افسر بنا دیا۔ اس کی وجہ ہے کہ ترپن معاشی طور پر زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ خود کو چین سے زیادہ وابستہ رکھتا ہے اور علیحدگی پسندانہ جذبات نہیں رکھتا۔ چنانچہ چینی حکومت ان کی ترقی کا پورا خیال رکھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کاشغر میں رہنے والے اویغور مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھایا جاتا ہے کیونکہ وہ علیحدہ مسلم ریاست کے لیے تحریک چلا رہا ہے۔ ترپن میں رہنے والے اویغور مسلمانوں کو کم وبیش وہی مذہبی آزادیاں حاصل ہیں جو Hui مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ لیکن کاشغر کے اویغور مسلمانوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے اور مذہب مخالف قوانین پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ یہی مذہب مخالف قوانین ترپن میں بھی نافذ ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کیا جاتا اور کمیونسٹ افسران چاہے وہ ہَن ہوں یا خود اویغور مسلمان ان خلاف ورزیوں کا نوٹس نہیں لیتے۔ اسی طرح کاشغر کے اویغور مسلمانوں کو مساجد بنانے کی اجازت یا تو نہیں ہے یا بڑی مشکل سے ملتی ہے جب کہ ترپن میں رہنے والے اویغور مسلمانوں نے 1979 سے 1989 کے عشرے میں 350 سے زائد مساجد تعمیر کیں اور کمیونسٹ افسروں نے اس پر نہ اعتراض کیا اور نہ ہی مساجد کی تعمیر پر پابندی لگائی۔ حکومت غالباً یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ جو چین سے علیحدہ ہونا چاہے گا، اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے گا لیکن جو ان کے ساتھ ہے، ان کے لیے کم وبیش وہی کیا جائے گا جو چینی اکثریت کے لیے کیا جاتا ہے۔

اویغور مسلمان، خاص طور سے جو کاشغر میں رہتے ہیں، Hui مسلمانوں سے ناخوش رہتے ہیں بلکہ نفرت بھی کرتے ہیں کیونکہ ان پر ظلم ڈھانے کے لیے وہ چینی حکومت میں مختلف عہدوں پر فائز ہیں۔ کاشغر کے اویغور مسلمان یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ ماضی میں Hui فوجی افسروں نے جنگ کاشغر میں تقریباً 8000 اویغور مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔ وہ یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ چینی حکومت کی پالیسی کے تحت Hui مسلمان ملک کے مختلف حصوں سے آ کر ان کے شہروں اور علاقوں میں آباد ہو گئے ہیں تاکہ ان کی آبادی کم ہو جائے۔ وہ یہ بھی الزام عائد کرتے ہیں اور اس میں کافی سچائی بھی ہے کہ چینی حکومت نے Hui مسلمانوں کو زیادہ بچے پیدا کرنے کی اجازت دی جس کی وجہ سے ان کی آبادی میں 4.4 فیصد اضافہ ہوا 1940 سے 1982 کے درمیان حالانکہ اسی عرصے میں اویغور مسلمانوں کی آباد میں صرف 1.7 فیصد اضافہ ہوا۔ وجہ صاف ہے کہ اویغور مسلمانوں پر نظر رکھی گئی کہ چینی حکومت کی پالیسی کے تحت وہ زیادہ بچے نہ پیدا کر سکیں۔ کاشغر کے علاقے میں صورتحال یہ ہے کہ Hui اور اویغور مسلمان ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مساجد بھی الگ ہیں۔

یوں تو مسلمان چین کے ہر حصے میں نظر آتے ہیں لیکن ان کی بڑی اکثریت ان علاقوں یا صوبوں میں ہے جن کی سرحدیں سنٹرل ایشیا سے ملتی ہیں۔ ژنگجیا نگ، گانسو اور ننگژیا وغیرہ وہ صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد رہتی ہے۔ ینان (Yunnan) صوبے میں بھی کافی تعداد میں مسلمان رہتے ہیں جو جنوب مغربی چین میں واقع ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد سنٹرل چین کے صوبے ہنان میں رہتی ہے۔ Hui یعنی ہوئی مسلمان کل مسلم آبادی کا 48% ہیں یعنی 9.8 ملین۔ دوسرے نمبر پر اویغور مسلمان ہیں جو چین کی مسلم آبادی کا

41% ہیں یعنی 8.4 ملین۔ دوسری مسلم قومیتیں یا نسلی گروپ اور ان کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔ قازخ (1.25 ملین/ 6.1%)۔ ڈونگزیانگ 2.5 فیصد یعنی 514000۔ سالار (105000) تاجک (41000) بونان (17000) اور تاتار 5000 ہیں۔ تبتی مسلمان بھی ہیں لیکن ان کی تعداد کا پتہ نہیں چل سکا کیونکہ انہیں دوسرے تبتیوں کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چین میں مسلمان شاید دو کروڑ بیس لاکھ کے آس پاس ہیں جو کل آبادی کا دو فیصد سے ذرا کم ہے۔ چینی حکومت کے مطابق مسلمان 21 ملین ہیں۔ 36 ہزار مساجد یا عبادتگاہیں ہیں۔ 45 ہزار سے زائد امام ہیں اور دس اسلامی اسکول ہیں۔

گزشتہ 20 سالوں میں مسلمانوں نے خود اپنے طور پر یا حکومت نے ان کے لیے کئی اسکول اور کالج کھولے ہیں۔ مسجدوں سے ملحق بالعموم مکتب یا مدرسے ہیں۔ حکومت نے کئی اسلامک کالج کھولے ہیں۔ اسی طرح کئی آزاد اور پرائیویٹ کالج بھی قائم کیے گئے ہیں جن میں چینی مسلمان تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں چینی مسلمانوں نے مصر، شام، سعودی عرب، پاکستان اور ملیشیا کا رخ کیا ہے تا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔

چین کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت سنی ہے۔ شیعہ مسلمان بہت کم ہیں۔ کچھ اسمٰعیلی ہیں اور غالباً تاجک نسل کے مسلمان بھی شیعہ ہیں۔ جب کمیونسٹ حکومت زیادہ سخت اور مذہب مخالف تھی، تو بہت کم مسلمانوں کو حج کی سعادت ملتی تھی۔ مگر اب دس ہزار سے زیادہ چینی مسلمان ہر سال حج کرتے ہیں۔ حکومت کے ذریعے قائم کی گئی چائنا اسلامک ایسوسی ایشن مسلمانوں کی بڑی حد تک نمائندہ جماعت ہے جو چین میں ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے کام کرتی ہے۔

تو چین میں مسلمانوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عام طور سے مسلمان یہاں پرسکون زندگی گزارتے رہے ہیں۔ مسلمان چین کو اپنا ملک سمجھتے ہیں اور اس کے لیے قربانیاں بھی دیتے رہے ہیں۔ چین پر جاپانی حملے اور قبضے کے خلاف مسلمان رضاکارانہ طور پر جنگ میں شامل ہوئے جس کے جرم میں جاپانیوں نے ان پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اسی طرح کمیونسٹ چین میں بھی، خصوصاً دس سالہ ثقافتی انقلاب کے دور میں بھی مسلمانوں کو سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا اور آج کاشغر میں رہنے والے اویغور مسلمانوں کو دشواریوں کا سامنا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی چینی مسلمان وہاں اچھی طرح زندگی گزارتے رہے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1- روسی مسلمانوں پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

2- زاروں اور کمیونسٹوں کے روس میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک رہا؟

3- چین میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے بارے میں بتائیں۔

4- موجودہ دور میں چین کے مسلمان، ان کے مسائل کیا ہیں؟

10.5 مسلمان سری لنکا میں

سری لنکا سے عربوں کے تعلقات زمانہ قبل اسلام سے ہیں۔ عرب تاجر ایسٹ افریقہ اور ہندوستان کے درمیان کی تجارت میں بہت

بڑے پیمانے پر شریک تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس تجارت پر ان کا غلبہ تھا۔ چینی تاجر صرف سری لنکا تک آتے تھے اور اس سے آگے ایرانی اور عرب بندرگاہوں کا رخ نہ کرتے، لیکن عرب ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ اور چین تک تجارت کرتے تھے۔

اسلام کے آنے سے پہلے بعض عرب سری لنکا اور جنوبی ہند (کیرالا) میں مقامی حکمرانوں کے تعاون سے آباد ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے مقامی خواتین سے شادیاں بھی کر لی تھیں۔ دراصل ایسا انسانی ضرورت کے تحت ہوتا تھا۔ تجارتی جہاز موافق ہواؤں پر اپنے سفر کے لیے منحصر تھے۔ سال کے بعض حصوں میں ہوائیں دو تین ماہ تک اس طرح چلتیں کہ عرب تجارتی بیڑے ہندوستان اور سری لنکا کا رخ کرتے۔ مثلاً عدن سے ہندوستان 30 سے 40 دن کا سفر درکار ہوتا اگر موافق ہوائیں چلتیں۔ اور یہ ہوائیں تین ماہ تک اسی طرح چلتی رہتیں۔ اس دوران یہ لوگ اپنا مال بیچتے، عربوں کی ضرورت کا مال خریدتے اور پھر جب موافق ہوائیں چلتیں تو اپنے گھروں کا رخ کرتے۔ کبھی کبھی مال نہ بکتا تو سفر مؤخر کر دیتے۔ اس طرح وہ 6 مہینے سے سال بھر تک گھروں سے باہر رہتے۔ سو انہیں فطری ضرورت کی تکمیل کے لیے شریک حیات کی ضرورت تھی۔ سو انہوں نے یہاں شادیاں کر لیں۔ اسلام آنے کے بعد یہی عرب اور ان کی مقامی بیویاں سب سے پہلے مسلمان ہوئیں۔ کئی صدیوں تک یہ مسلمان سری لنکا اور جنوبی ہند یعنی کیرالا میں کافی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن جب 16 ویں صدی میں پرتگالی آئے تو انہوں نے زبردستی یعنی فوجی طاقت کے بل پر اس بحری تجارت پر قبضہ کرنا چاہا۔ لڑائیاں ہوئیں جو مسلمان ہار گئے کیونکہ وہ تاجر تھے اور صرف چند سپاہی اپنے ساتھ بحری قزاقوں سے حفاظت کے لیے رکھتے تھے۔ یہ لوگ پرتگالی بحری بیڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سری لنکا کے حکمرانوں نے برے دنوں میں مسلمانوں کی مدد کی اور بہتوں کو ساحل سے ہٹا کر اندرونی علاقوں اور صوبوں میں آباد کر دیا۔

18 ویں اور 19 ویں صدی میں ہالینڈ اور انگلینڈ جاوا اور ملیشیا سے بہت سے مسلمانوں کو بطور مزدور یہاں سری لنکا میں لا کر آباد کیا گیا۔ اس طرح سری لنکا کی مسلم آبادی اب عربوں، سری لنکا کے مقامی لوگوں اور ملائی نسل کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ 19 ویں اور 20 ویں صدی میں ہندوستان اور پاکستان سے بعض لوگ یہاں آ کر آباد ہو گئے خاص طور سے تامل مسلمان جس سے سری لنکائی مسلمانوں کی آبادی تکثیری سماج بن گئی۔ سری لنکا کے مسلمان سنی ہیں۔ روایتی مسلمان ہیں۔ شمالی ہندوستان اور پاکستان سے بعض لوگوں نے آ کر تصوف کی آمیزش کی ہے مگر یہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

آزاد سری لنکا میں مسلمانوں کے مذہبی وثقافتی معاملات کی نگرانی و بہبود کے لیے ایک شعبہ حکومت نے قائم کیا ہے۔ یہ شعبہ 1980 کی دہائی میں قائم کیا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اصل سری لنکائی سماج سے کٹنے نہ دیا جائے۔ بدقسمتی سے سری لنکا کی حکومت اور تاملوں کی لڑائی میں مسلمان بھی پھنس گئے ہیں۔ اتنے ہی پر بس نہیں، اسکالرشپ بھی تقسیم ہو گئی ہے۔ ایک گروپ کہتا ہے کہ سری لنکا کے مسلمان یا کم از کم ان کی اکثریت تامل ہے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے ہندوازم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ دوسرا گروپ کہتا ہے۔ اور اس کی حمایت حکومت بھی کرتی ہے۔ کہ سری لنکائی مسلمان عربوں کی اولادیں ہیں اس لیے یہ تاملوں سے ایک الگ نسلی گروپ ہیں۔ صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ مقامی سیاست اور لڑائی اس علمی تقسیم کے لیے ذمہ دار ہے۔ بہرحال سری لنکا کے مسلمانوں کی اصلیت جو بھی ہو، وہ آج وہاں کا 9.2 فیصد ہیں۔

جافنا سری لنکا کا وہ صوبہ ہے جہاں تاملوں کی اکثریت ہے۔ یہاں ایک لاکھ کے قریب تامل مسلمان بھی تھے۔ فطری طور پر اقلیت

ہونے کے ناطے وہ حکومت اور تامل ہندوؤں کی لڑائی سے خود کو دور رکھنا چاہتے تھے۔ مگر ان تاملوں کو یہ پالیسی پسند نہیں تھی جو جافنا میں اپنی علیحدہ ریاست کے لیے سری لنکائی فوج سے جنگ کر رہے تھے۔ یہ جنگ 26 سال تک جاری رہی۔ تاملوں کی جنگ جو جماعت کا نام تھا: لبریشن ٹائیگرس آف تامل ایلم یا وہ صرف تامل ٹائیگرس کے نام سے جانے جاتے تھے۔ جب تامل مسلمانوں نے حکومت کی فوج سے لڑنے سے انکار کر دیا اور خود کو غیر جانبدار رکھنا چاہا تو تامل ٹائیگرس نے ان پر مظالم ڈھانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ انہیں جافنا سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ اس وقت سری لنکا کی فوج کمزور تھی اور ان کا تحفظ نہیں کر پائی۔ چنانچہ ایک لاکھ کے قریب تامل مسلمان اپنے ہی ملک میں بے گھر ہو گئے۔ اگر چہ 2002 میں تامل ٹائیگرس کے لیڈر پربھاکرن نے باقاعدہ مسلمانوں سے معافی مانگی مگر تلخی ابھی بھی باقی ہے۔ لوگ جافنا میں اپنے گھروں کو واپس لوٹنا نہیں چاہتے۔ جنگ بندی کے بعد بعض مسلمان بہرحال لوٹ کر جافنا گئے ہیں لیکن ان کی تعداد دو ہزار کے آس پاس ہے۔ نکالے جانے سے پہلے یہاں مسلمانوں کا اپنا عثمانیہ کالج تھا جنگ بندی کے بعد یہ کالج دوبارہ کھل گیا ہے لیکن مسلمان طلبہ کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو قابلِ فہم ہے۔ ہزار دو ہزار مسلمان ہی جہاں ہوں، وہاں مساجد بھی کم ہی ہوں گی۔ آج غالباً وہاں صرف دو مساجد ہیں جو بہرحال کام کر رہی ہیں۔ وہ سینکڑوں مساجد جو پہلے تھیں، یا تو تباہ ہو چکی ہیں یا خالی پڑی ہیں کیونکہ ان کے نمازی مجبوری میں کہیں اور جا بسے ہیں۔ 2002 کے ایک سروے کے مطابق جافنا میں دو ہزار مسلمان تھے۔ 15 سو جافنا کے تامل مسلمان اور پانچ سو دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے تاجر۔ صرف دس دکانوں کے مالک مسلمان تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ مسلمان جافنا کا رخ کرنے سے اب بھی ڈر رہے ہیں۔

لیکن سری لنکا کے دوسرے علاقوں میں مسلمان اچھی حالت میں ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کے 749 اسکول ہیں، 205 مدارس ہیں اور بیروو الا میں ایک اسلامک یونیورسٹی بھی ہے۔ کولمبو میں الایمان نامی اسکولوں کی ایک چین (Chain) ہے جو 2008 سے اسلامی اور سرکاری نصاب ایک ساتھ پڑھا رہے ہیں۔ مسلمان سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں بھی پڑھ رہے ہیں۔ بہتوں نے انجینئرنگ اور میڈیسن میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ چونکہ سری لنکا میں نوکری کے مواقع کم ہیں، اس لیے ان مسلمانوں نے مشرق وسطیٰ، امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور یوروپ میں ملازمت اختیار کر لی ہے۔ تامل مسلمانوں کی بہ نسبت دوسری نسلوں کے مسلمانوں کی حالت اچھی ہے کیونکہ ایک طرف انہیں ان حالات سے نہیں گزرنا پڑا جن سے جافنا کے تامل مسلمان دو چار ہوئے اور دوسری طرف برطانوی استعماری حکومت کے زمانے ہی سے انہوں نے تعلیم پر توجہ مرکوز کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے اسی وقت انہیں سرکاری نوکریاں ملنے لگی تھیں۔

سری لنکا کے مشرقی صوبے میں مسلمان کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جب 16 ویں صدی میں پرتگالیوں نے مسلمانوں کو ستانا شروع کیا تو سنہالی بادشاہ نے صدیوں پرانے تعلقات کو نبھاتے ہوئے انہیں اندرونی علاقوں میں آباد کیا اور انہیں روزی روٹی کمانے کے لیے زمینیں بھی فراہم کیں۔ آج بھی یہ مسلمان کسان ہیں، تاجر ہیں یا مچھلیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اکثریت کیرالا سے آئی ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ عرب نسل کے مسلمان کولمبو، کالوتارا اور بیروو الا وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ کولمبو میں مسلمان کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اچھی حالت میں ہیں۔ یہ بزنس میں ہیں، سول سرونٹس ہیں، ڈاکٹرس اور انجینئرس ہیں۔ کولمبو کی میونسپل کارپوریشن میں ان کا کافی دبدبہ ہے۔ اکثر مسلمان کارپوریٹروں کا ووٹ میئر کے انتخاب میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

اوپر ملائی نسل کے مسلمانوں کا ذکر ہو چکا ہے جو انڈونیشیا سے یہاں آئے یا لائے گئے تھے، بعض ڈچ یا ہالینڈ کی فوج کا حصہ تھے جنہیں یہاں

سری لنکا میں پوسٹ کیا گیا تھا۔ کچھ سزا یافتہ لوگ تھے جنہیں یہاں جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا اور کچھ انڈونیشیا کے مسلمان سردار تھے جنہیں باغیانہ خیالات واعمال کی وجہ سے ملک بدر کردیا گیا تھا اور وہ یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ آج یہ مسلمان تقریباً -/50000 ہیں یعنی کل سری لنکا کی مسلم آبادی کا 5 فیصد صرف۔ تعلیم وتجارت میں یہ لوگ اچھے ہیں اور قدرے خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔

اسمٰعیلی شیعہ، خوجہ، یمنی اور داؤدی بوہرہ بھی سری لنکا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سبھی اچھی حالت میں ہیں۔ بزنس میں بھی آگے ہیں اور تعلیم میں بھی۔ چنانچہ اندرونِ ملک اور بیرون ملک بھی یہ لوگ بڑی اچھی حالت میں ہیں۔

10.6 مسلمان تھائی لینڈ میں

تھائی لینڈ ملیشیا سے لگا ہوا ایک ملک ہے جہاں سیاحت کے لیے دنیا جہاں سے لوگ آتے ہیں۔ مسلمان تجارت کے مقصد سے یہاں زمانہ وسطیٰ سے آتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے بہت سے مسلمان یہیں کے ہو کر رہ گئے اور آج ان کی نسلیں تھائی زبان بولتی اور وہیں کے کلچر میں گھل مل گئی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے عقائد اور بعض ثقافتی علامتوں کی وجہ سے دوسروں سے مختلف ہیں۔ آج کل مسلمان کل آبادی کا 6 فیصد ہیں۔ 99 فیصد مسلمان سنی ہیں۔ ایک فیصد شیعہ ہیں۔ مسلمان پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملیشیا سے لگے ہوئے تین صوبوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں کبھی مسلمانوں کی اکثریت ہوا کرتی تھی۔ مگر بتدریج حکومت نے تھائیوں کو یہاں بسا کر Malay نسل کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ علیحدگی پسندی کے راستے پر چل پڑے ہیں اور آئے دن تھائی فوج سے ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ بغاوت کو دبانے کے لیے تھائی فوج نے مظالم بھی ڈھائے ہیں۔

Malay نسل کے مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ کبھی وہ تین جنوبی صوبوں، پالا، پٹانی، اور ناراتھیوت میں اکثریت میں تھے۔ تھائیوں کو زبردستی یہاں لاکر بسایا گیا جس سے آج وہ اقلیت میں آگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے جدوجہد کررہے ہیں۔ عام طور سے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مذکورہ تین صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یا مسلمانوں کی اکثریت انہیں صوبوں میں رہتی ہے۔ لیکن حکومت کے ذرائع کا کہنا ہے کہ 6 فیصد تھائی مسلمانوں میں سے صرف 18 فیصد مذکورہ صوبوں میں رہتے ہیں۔ باقی 82 فیصد ملک کے دوسرے حصوں میں رہتے ہیں اور راجدھانی بنکاک میں نسبتاً سب سے زیادہ مسلمان رہتے ہیں۔ جنوب کا ایک اور صوبہ جس کا نام ساتن ہے اور جس کی سرحدیں ملیشیا سے ملتی ہیں، وہاں بھی مسلمان بہت بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔

سیام، تھائی لینڈ کا پرانا نام ہے۔ یہاں رہنے والے مسلمان مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف ملکوں سے یہاں آکر آباد ہوئے ہیں مثلاً چین، پاکستان، بنگلہ دیش، ملیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ۔ تھائی لینڈ کے بہت سے مسلمان تھائی ہیں لیکن تقریباً یہاں کے دو تہائی مسلمان Malay نسل کے ہیں۔ جو تھائی مسلمان ہیں، وہ یا تو مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان ہیں، یا کسی مسلمان سے شادی کرنے کے لیے مسلمان ہوگئے ہیں یا حالیہ سالوں میں انہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ یہ تھائی نسل کے مسلمان بالعموم سینٹرل اور جنوبی صوبوں میں رہتے ہیں۔ ان میں بعض وہ مسلمان بھی ہیں جن کے آباء واجداد ایران سے آئے تھے مگر اب وہ تھائی ہوکر رہ گئے ہیں۔ مثلاً تھائی فوج کے سابق سربراہ سونتھی بون یار اتگلین جو کہتے ہیں کہ ان کے جدامجد شیخ احمد قمی ایرانی تھے جو تجارت کی غرض سے یہاں آئے اور یہیں

کے ہو کر رہ گئے۔

جنوبی تھائی لینڈ کے صوبوں کا ذکر ہو چکا ہے جہاں Malay نسل کے مسلمان کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں یہاں ایک اسلامی حکومت تھی جسے پتانی کنگڈم کہا جاتا تھا۔ تھائی لینڈ نے اس سلطنت پر قبضہ کر کے اسے اپنے اندر ضم کر لیا۔

تھائی لینڈ کے شمال میں اور سینٹرل تھائی لینڈ میں چینی نسل کے مسلمان اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یقین کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ چین کی ہوئی (Hui) نسل سے تعلق رکھتے ہیں یہاں روہنگیا مسلمان بھی ہیں جو اپنے ملک کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے ہیں اور تھائی لینڈ کے مختلف شہروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ لوگ اکثر غربت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان سے بھی یہاں مسلمان آ کر آباد ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تعلیم یافتہ ہیں اور اچھی پوزیشن یا عہدوں پر فائز ہیں۔ بعض کا تعلق لیبر کلاس سے بھی ہے۔

تھائی مسلمان دوسرے تھائیوں کی طرح ہیں لیکن اپنی عبادت وثقافت کی وجہ سے وہ دوسروں سے مختلف نظر آتے ہیں۔ تھائی حکومت کے اندازے کے مطابق 2007 میں ملک میں 3494 مساجد تھیں۔ سب سے زیادہ پتانی صوبے میں 636 مساجد ہیں۔ 99 فیصد مساجد سنی مسلمانوں کے زیر انتظام ہیں۔ صرف ایک فیصد شیعہ مسلمانوں کے پاس ہیں۔

تھائی لینڈ کی حکومت مسلمانوں سے رابطے کے لیے کئی راستے اختیار کرتی ہے۔ سترہویں صدی میں ایک تھائی بادشاہ نے شیخ الاسلام کا آفس کھولا تھا اور پہلے شیخ الاسلام شیخ احمد تھے۔ جدید تھائی لینڈ میں بھی یہ آفس پایا جاتا ہے۔ شیخ الاسلام کا تقرر وزیر اعظم کے مشورے پر بادشاہ کرتا ہے۔ شیخ الاسلام، تھائی مسلمانوں کا آفس یا تو اس کی مدت پوری ہونے کے بعد خالی ہوتا ہے، وہ استعفے دے سکتا ہے یا وزیر اعظم کے کہنے پر بادشاہ اسے ہٹا سکتا ہے۔

ایک اور آفس ہے: سنٹرل اسلامک کونسل آف تھائی لینڈ۔ مسلمانوں میں سے کم از کم پانچ کونسلروں کو بادشاہ اس کونسل کا ممبر بنا سکتا ہے۔ اسلامی معاملات پر یہ کونسل وزیر تعلیم اور وزیر داخلہ کو مشورہ دیتی ہے۔ یہ کونسل مرکزی سطح پر بھی ہے اور صوبوں میں بھی ہے، خاص طور سے ان صوبوں میں جہاں مسلمان قابلِ لحاظ اقلیت ہیں۔ کبھی کبھی حکومت مسلمانوں سے دوسرے طریقوں سے رابطے قائم کرتی ہے۔ کبھی کبھی ان کی مدد بھی کرتی ہے۔ جیسے بڑی مساجد کی تعمیر کے لیے فنڈ دینا یا حج سبسڈی۔ حکومت تعلیمی اداروں کی تعمیر میں بھی مدد کرتی ہے۔

جنوبی تھائی لینڈ کے تین بلکہ چار صوبوں میں جہاں مسلمان قابلِ لحاظ تعداد میں ہیں، ایک مدت سے علیحدگی پسندی کی تحریک چل رہی ہے۔ یہ بغاوت 1960 کی دہائی میں شروع ہوئی۔ مسلمانوں کے مطالبات مذہبی بھی ہیں اور نسلی بھی۔ 2001 سے مسلمانوں کی مسلح جدوجہد میں کافی شدت آئی ہے جسے تھائی حکومت دہشت گردی اور بغاوت سے تعبیر کرتی ہے۔ اس مسئلۂ جنوب کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں۔

19 ویں صدی میں جنوبی تھائی لینڈ میں مسلمانوں کی ایک ریاست تھی جس کا نام تھا Sultanate of Pattani۔ اس میں جنوب کے تین صوبے، پایا یا جالا، ناراتھیوت اور خود پتانی شامل تھے۔ ان تینوں صوبوں کو سرحدی صوبوں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ کی فوجوں نے مذکورہ تینوں صوبوں، بعض دوسرے علاقوں اور ملیشیا کے صوبے کلنتان کو 18 ویں صدی کے اواخر میں فتح کیا تھا۔ پھر

مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی جسے پھر تھائی لینڈ نے اپنے اندر زبردستی شامل کر لیا اور تب سے یہ علاقہ یعنی جنوبی تھائی لینڈ کا ہی حصہ ہے۔ لیکن یہاں کے مسلمانوں کو یہ بہرحال احساس رہا ہے کہ کبھی وہ آزاد تھے۔

اگرچہ جنوب میں مسلح جدوجہد 1960 کی دہائی سے چل رہی ہے لیکن 2001 کے بعد اس میں بڑی تیزی آئی ہے۔ علیحدگی پسند بالعموم تینوں صوبائی صوبوں میں ہی سرگرم ہیں لیکن کبھی کبھی اس جنگ کے شعلے دوسرے صوبوں میں بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

جولائی 2005 میں تھائی وزیراعظم تھیکسن شیناوترا نے جنوب کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہت زیادہ اختیارات حاصل کر لیے۔ گویا مسلمان علیحدگی پسندوں کو اور سختی سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے تشدد مزید بھڑک اٹھا۔ 19 ستمبر 2006 کو ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ تھیکسن کا تختہ الٹ دیا گیا۔ تھیکسن کی پالیسی کو پورے طور پر بدلتے ہوئے ملٹری حکومت نے ایک نئی پالیسی اختیار کی جس کا مقصد لوگوں کے دل و دماغ کو جیتنا تھا۔ لیکن مسلمانوں علیحدگی پسندوں نے جیسے ملٹری حکومت کو بھی رد کر دیا ہو۔ ان کی مسلح جدوجہد جاری رہی اور 2008 تک تین ہزار لوگ مارے جا چکے تھے۔ ملٹری نے دعویٰ کیا تھا کہ 2008 تک سارا تشدد ختم ہو جائے گا۔ مگر تشدد میں کمی کے بجائے اور تیزی آتی گئی۔

Democrats کی سربراہی میں قائم حکومت، جس کے سربراہ Abhisit Vejjajiva ہیں، ان کے وزیر خارجہ نے اعلان کیا کہ جنوب میں علیحدگی پسندی اور تشدد کا مسئلہ 2010 تک حل کر لیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ تشدد میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مارچ 2011 میں تھائی حکومت نے بالآخر اعتراف کیا کہ جنوب میں تشدد پر قابو پانا مشکل ہے اور یہ کہ اس مسئلے کو حل کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ مکمل آزادی نہیں تو کم از کم جنوب کے صوبوں کو خودمختاری دی جائے۔ اس تحریک میں کئی گروپ شامل ہیں۔ زیادہ تر گروپ خودمختاری چاہتے ہیں اور امن کی گفتگو میں شامل ہونا چاہتے ہیں مگر جو سب سے بڑا علیحدگی پسند گروہ ہے، وہ حکومت سے مذاکرات کا قائل نہیں ہے اور اس کا فوری مقصد یہ ہے کہ تشدد کے ذریعے جنوب کو شورش زدہ علاقہ بنا دیا جائے جہاں حکومت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے۔ اس مقصد میں گروپ کسی حد تک کامیاب بھی ہے۔ تھائی حکومت کا الزام ہے کہ باہری ممالک کے جہادی یہاں آ گئے ہیں اور خارجی پیسہ اس پرتشدد تحریک میں لگا ہوا ہے۔ لیکن زیادہ تر مبصرین کا کہنا ہے کہ یہ مقامی تھائی مسئلہ ہے اور اس میں مقامی مسلمان ہی شامل ہیں۔ تھائی حکومت یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ بس 500 مجاہدین حکومت کے خلاف لڑ رہے ہیں جب کہ آزاد ذرائع کہتے ہیں کہ مجاہدین کی تعداد کہیں زیادہ ہے یعنی تقریباً -/15000۔ 2004 سے 2014 کے درمیانی وقفے میں 6000 سے زیادہ لوگ مارے جا چکے اور 10000 سے زائد زخمی ہوئے ہیں۔ کہنا مشکل ہے کہ آخر مسئلے کا کیا حل نکلے گا۔

جنوب کے مسلمانوں کی شکایت اس وقت شروع ہوئی جب بنکاک کے حکمرانوں کو ایک دن مسلمانوں کو مکمل طور پر تھائی بنانے کی سوجھی۔ 1909 کے ایک معاہدے کے مطابق مسلمانوں کو اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی اجازت تھی۔ بنکاک کی سنٹرل حکومت مقامی افسروں پر انحصار کرتی تھی کہ وہی قوانین کو نافذ کریں۔ ان افسروں کو واضح ہدایت تھی کہ جنوب میں تھائی لینڈ کا Civil Law نہ نافذ کیا جائے بلکہ مسلمانوں کو وراثت اور عائلی امور سے متعلق اپنے شرعی قوانین پر عمل کرنے دیا جائے۔

مگر 1934 میں بنکاک نے پورے تھائی لینڈ بالخصوص جنوب کو ایک یک رنگی تھائی کلچر میں رنگنے کا پروگرام بنایا۔ ایک نام نہاد نیشنل

کلچرا یکٹ پاس کیا گیا اور پورے ملک میں زبردستی نافذ کیا جانے لگا۔ جنوب کے مسلم علاقوں رصوبوں میں بھی زبردستی اسے نافذ کیا گیا۔ مسلم پرسنل لاکوز بردستی ختم کر دیا گیا۔ اسکول کا نصاب تک بدل دیا گیا اور تھائی زبان میں پڑھانا لازمی قرار دے دیا گیا۔ شرعی عدالتیں جو مدت سے قائم تھیں، ختم کر دی گئیں۔ تھائی کلچر کے نام پر دراصل بدھسٹ کلچر کو نافذ کیا گیا۔ فطری طور پر مسلمانوں نے اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔ انہوں نے پرامن جدو جہد شروع کی۔ 1947 میں حاجی سولونگ نے، جو پٹانی پیوپلز موومنٹ کے بانی تھے، ایک تحریک چلائی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو خود مختاری دی جائے، ان کے لسانی وثقافتی حقوق کا تحفظ کیا جائے اور پرسنل لا پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے۔ بنکاک کی حکومت نے اس پرامن تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ جنوری 1948 میں سولونگ کو گرفتار کر لیا گیا۔ چار سال بعد 1952 میں انہیں رہا کیا گیا مگر 1954 میں وہ مشتبہ حالات میں غائب ہو گئے اور آج تک ان کا پتہ نہیں چلا۔

جب پرامن تحریکوں کا یہ حشر کیا جاتا ہے اور ان کے لیڈروں کو غائب کر دیا جاتا ہے تو پھر مسلح جدو جہد ہی شروع ہوتی ہے۔ 1959 میں تنکو جلال ناصر نے پٹانی نیشنل لبریشن فرنٹ کی بنیاد ڈالی۔ اسے پہلا ملائی باغی گروپ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد پٹانی یونائٹیڈ لبریشن آرگنائزیشن قائم ہوئی۔ ان تنظیموں کا مقصد علیحدہ پٹانی ریاست قائم کرنا تھا جہاں وہ اپنے مذہب پر عمل کر سکیں، اپنے اسلامی کلچر کو نام نہاد تھائی بدھسٹ کلچر سے محفوظ رکھ سکیں۔ آغاز ہی سے انہوں نے بنکاک حکومت کے symbols مثلاً فوج، اسکول اور بیوروکریسی پر حملے شروع کر دیے، حکومت کی فوجوں نے جتنا ہی انہیں دبانے کی کوشش کی، اتنا ہی ان کی آزادی کی جنگ میں تیزی آتی گئی۔

بیسویں صدی کے اواخر میں تحریکات آزادی میں اختلافات کی وجہ سے سرگرمی میں ذرا کمی واقع ہو گئی تھی۔ لیکن اکیسویں صدی میں گوریلا گروپ زیادہ منظم نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سرکاری فوجوں کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ تشدد اور مزید تشدد سے دونوں ہی فریقوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مسئلے کا حل ایک ہی ہے۔ دونوں فریق اپنی حدوں میں رہیں۔ ہماری دنیا کے زیادہ تر ممالک تکثیری سماج بن چکے ہیں جہاں اقلیتوں کے حقوق کا پاس ولحاظ کیا جاتا ہے۔ بنکاک تھائی بدھسٹ کلچر نافذ کرنے کی حماقت سے جتنی جلدی باز آ جائے، اتنا ہی تھائی لینڈ کے لیے بہتر ہے۔ ورنہ کوئی نہیں جانتا کہ تشدد کا سلسلہ کب اور کہاں رکے گا۔

معلومات کی جانچ

1- سری لنکا کے مسلمانوں کی تاریخ بیان کیجیے۔

2- سری لنکائی مسلمانوں کی موجودہ حالت کے بارے میں بتایئے۔

3- تھائی لینڈ میں اسلام کی آمد بیان کیجیے۔

4- تھائی لینڈ کے جنوبی صوبوں میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کے بارے میں ذکر کیجیے۔

10.7 مسلمان برما میں

برما ایک بدھ مت کے ماننے والوں کی اکثریت والا ملک ہے۔ یہاں مسلمان بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اس ملک سے مسلمانوں کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ برما بھی دراصل اس بحری تجارت کا ایک اہم پڑاؤ تھا جو ایسٹ افریقہ سے چین کے درمیان زمانہ قبل اسلام

سے جاری تھی۔ عرب اس تجارت کے سرخیل تھے، جب اسلام آیا تو عرب تاجر اسے بھی اپنے ساتھ، اپنے اخلاق و کردار اور عادات و حرکات کے ساتھ لے گئے۔ ان کی مذہبیت نے لوگوں کو متاثر کیا اور وہ ایمان لائے۔ فطری ضرورتوں کی تکمیل کے لیے یہ عرب تاجر مقامی خواتین سے شادیاں کرتے تو وہ بھی ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتیں۔ یہی کچھ سری لنکا، جنوبی ہندوستان اور چین وغیرہ کی طرح برما میں بھی ہوا۔

برما میں اسلام چین اور ہندوستان کے راستے سے پہنچا اور شاید ملیشیا کے راستے سے بھی۔ تاریخی ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام نویں صدی میں ہی پہنچ گیا تھا۔ لیکن اگر تصور کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو شاید اسلام یہاں ساتویں صدی میں دور صحابہ میں پہنچا ہوگا۔ یہ وہ وقت تک جب عرب تاجر ایسٹ افریقہ سے چین تک تجارت کرتے تھے اور راستے میں جن بندرگاہوں پر رکتے، ان میں سے بعض برما میں واقع تھیں۔ اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ اسلام برما میں اسی وقت پہنچ گیا ہوگا۔ ہاں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے پاس تاریخ کی لکھی ہوئی گواہی موجود نہیں ہے۔

سو ہم سیدھے دور جدید میں آتے ہیں۔ اس مختصر مضمون میں زمانۂ وسطیٰ کے برما میں مسلمانوں کی موجودگی کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ آج برما میں حکومت کے ذریعے کرائی گئی مردم شماری کے مطابق مسلمان کل آبادی کا چار فیصد ہیں۔ یہ سبھی سنی مسلمان ہیں۔ لیکن مغربی ذرائع کہتے ہیں کہ حکومت نے مسلمانوں کی تعداد کم کر کے بتایا ہے۔ خود برمی مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد 14 سے 20 فیصد کے درمیان ہے۔

برما میں کئی نسلوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان رہتے ہیں۔ برمی نسل کے مسلمان ہیں۔ ہندوستانی اور چینی نسل کے مسلمان ہیں۔ عرب اور ایرانی نسل کے ساتھ ملائی نسل کے مسلمان بھی ہیں۔ روہنگیا مسلمان بھی ہیں جن پر آج کل مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔

برما یا میانمار کی سرکاری پالیسی یہ ہے ملک کے سارے باشندے، چاہے ان کا تعلق کسی بھی لسانی یا نسلی گروپ سے ہو اور چاہے وہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں، قانون کی نظر میں وہ سب برابر ہیں۔ برما میں نسل، رنگ، مذہب اور زبان کی بنیاد پر کسی کے خلاف امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ یہ برما کے دستور میں بھی لکھا ہوا ہے اور سپریم کورٹ کے ایک سے زیادہ کئی فیصلوں میں بھی۔ 2005 میں برما کی وزارتِ مذہبی امور نے ایک اعلامیے کے ذریعے ساری دنیا کو بتایا تھا کہ برما اپنی پوری تاریخ میں ایک کثیر مذہبی اور کثیر نسلی ملک رہا ہے اور یہ کہ یہاں کے حکمرانوں نے بدھ ازم کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا۔ سچ تو یہ ہے کہ برمی حکمرانوں نے قدیم زمانے سے عہد جدید تک تمام ہی مذاہب بالخصوص اسلام کا کھلے دل سے خیر مقدم کیا۔ مساجد بنانے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ اکثر اس مقصد کے لیے زمینیں فراہم کی اور دوسرے طریقوں سے بھی مدد کی۔ جو چیز وزارتِ مذہبی امور نے نہیں بتائی وہ یہ کہ مسلمان برمی فوج کے شانہ بہ شانہ ان کے دشمنوں سے برسرپیکار ہوئے اور اپنی جانوں کی قربانی بھی دی۔ اسے بدقسمتی ہی کہا جائے گا کہ آج کی برمی حکومت روہنگیا نسل کے مسلمانوں کا قلع قمع کرنے پر تلی نظر آتی ہے۔ آج ان غریب اور بے سہارا مسلمانوں کا کوئی بھی پشت پناہ نہیں ہے۔

برما کی تاریخ میں مسلمان بالعموم پرسکون طریقے سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ بلاشبہ بعض اوقات ناخوشگوار واقعات ضرور رونما ہوئے جن کا اختصار سے یہاں ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سولہویں صدی میں بادشاہ بے ان ناگ کا ذکر آتا ہے جس نے سب سے پہلے

مسلمانوں پر ظلم کیا۔ اس نے حلال گوشت پر پابندی لگادی یعنی جانوروں کو ذبح کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ اس نے عیدِ قرباں پر بھی پابندی لگادی کیونکہ اس تہوار کی شرائط میں سے ایک جانور کی قربانی دینا بھی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں بھی ایک برمی بادشاہ نے جانوروں کے ذبیحے اور قربانی پر پابندی لگادی تھی۔ بعض بادشاہوں نے چند مسلمانوں کو خنزیر کھانے پر بھی مجبور کیا اور سولہویں صدی میں شاید بعض مسلمانوں کو زبردستی بدھسٹ بھی بنایا گیا تھا۔ لیکن زمانہ قدیم اور عہد وسطیٰ میں زیادہ تر مسلمانوں اور بدھ مت کے ماننے والوں کے درمیان امن ومحبت اور تعاون کی فضا قائم رہی۔ ایک آدھ ایسے برمی بادشاہوں کا بھی ذکر آتا ہے جنہوں نے علماء وصوفیاء کو قتل کرایا مگر پھر تائب ہوئے اور مسلمانوں سے باقاعدہ معافی بھی مانگی۔

جب برطانیہ نے اس کو اپنی کالونی بنالیا تو اپنی حکومت کی عمر دراز کرنے کے لیے اس نے یہاں بھی وہی لڑاؤ اور حکومت کرو کا پرانا حربہ استعمال کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے 1930 میں ہندوستان مخالف فساد برپا ہوا۔ اس فساد کے دوران برمیوں کے نشانے پر ہندوستانی تھے اور برطانوی بھی۔ اس فساد کے دوران برمیوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کا ٹارگیٹ ہندو ہے یا مسلمان۔ لیکن 1938 میں غالباً پہلا مسلم مخالف فساد برپا ہوا۔ جب یہ فسادات ہوئے تو اسی وقت بعض برما کے لوگوں نے ''برما برماوالوں کے لیے'' تحریک شروع کی۔ اس تحریک سے وابستہ افراد ایک جلوس کی شکل میں مسلمانوں کے ایک بازار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ہندنژاد برطانوی پولیس نے اس تشدد پر آمادہ بھیڑ کو کنٹرول کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ تین بدھسٹ پجاریوں کو چوٹیں آئیں۔ اسے بہانہ بنا کر پورے ملک میں مسلم مخالف فسادات برپا کیے گئے۔ مسلمانوں کے گھر اور دوکانیں لوٹ کر جلا دیے گئے۔ مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا یا پھر جلا دیا گیا۔ بہت سے مسلمانوں پر حملے ہوئے اور انہیں قتل بھی کیا گیا۔ تشدد بڑی تیزی سے پورے ملک میں پھیل گیا۔ مساجد کو خاص طور سے فسادیوں نے نشانہ بنایا۔ پورے برما میں 113 مساجد کو نقصان پہنچایا گیا۔

اس وقت برما میں برطانیہ کی استعماری حکومت تھی جس نے فسادات کی وجہ جاننے اور ان کا تدارک کرنے کے لیے ایک انکوائری کمیٹی بنائی۔ کمیٹی کو یہ بھی پتہ لگانا تھا کہ لوگ حکومت سے کس بات پر ناراض ہیں۔ اپنی تحقیق کے بعد کمیٹی نے جو رپورٹ حکومت کو سونپی، اس میں صاف طور پر اعتراف کیا گیا کہ سماجی، سیاسی اور معاشی حالت میں ابتری اور تنزلی فسادات کی ذمہ دار ہے۔ اس کمیشن سے پہلے 1927 میں برٹش حکومت نے سائمن کمیشن قائم کیا تھا جسے یہ پتہ لگانا تھا کہ موروثی نظام حکومت برما اور ہندوستان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ اس کمیشن نے یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ برمی مسلمانوں کو قانون ساز اسمبلی میں جگہ دی جائے۔ تمام شہریوں کے ساتھ تمام اقلیتوں کو سائمن کمیشن نے یہ تجویز بھی رکھی کہ سب لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہو۔ مسلمانوں کو جائداد بنانے اور خریدنے کا حق ملا۔ سائمن کمیشن نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ ان کے اپنے اسکول کھولے جائیں تاکہ ان کی معاشی حالت میں بہتری آئے۔ کمیشن نے مزید برآں سرکاری خزانے سے مسلمانوں کے لیے الگ سے اسکول قائم کرنے کی اجازت دی۔ سب سے اہم سیاسی تجویز یہ تھی کہ برما کو ہندوستان سے الگ کر کے لوگوں کو Self Government کا حق دیا جائے۔

جنگ عظیم دوم سے ذرا پہلے برما میں دو تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ایک تھی برما مسلم کانگریس (بی ایم سی) اور دوسری اینٹی فاشسٹ پیوپلز فریڈم لیگ (اے ایف پی ایف ایل) جنگ کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی طرح برما بھی آزاد ہوا۔ اے ایف پی ایف ایل کے لیڈر جنرل

آنگ سن 1948 میں پہلے وزیر اعظم بنے۔ عہدہ سنبھالنے کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے بی ایم سی سے گزارش کی کہ وہ اے ایف پی ایف ایل کی ممبر شپ سے استعفےٰ دے دے۔ جواب میں بی ایم سی نے فیصلہ کیا کہ وہ مذہبی تنظیم نہ رہے گی اور دوبارہ اے ایف پی ایف ایل کی ممبر بن جائے گی۔ مگر برمی حکمراں بی ایم سی کا وجود ہی ختم کرنا چاہتے تھے، پہلے 1955 میں بی ایم سی کو تحلیل ہونے کا حکم ہوا اور پھر 30 ستمبر 1956 کو اسے اے ایف پی ایف ایل سے نکال دیا گیا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد بدھ ازم کو برما کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا جس سے مذہبی اقلیتیں کافی ناراض ہوئیں۔

برما کے مسلمانوں کی حالت اس وقت اور خراب ہوگئی جب 1962 میں برمی فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ نئی حکومت نے مسلمانوں کو فوج اور دوسری سرکاری نوکریوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ ان کے خلاف نفرت انگیز مہم چلائی گئی۔ مسلمانوں نے پر امن طور پر اپنے حقوق کی حفاظت کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے آل برما مسلم یونین بنائی۔ لیکن حکومت نے اس پر دہشت گردی کا الزام عائد کرتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم ڈھانے کا کاروبار جاری رکھا۔ اکیسویں صدی میں بعض سنگین مسلم کش فسادات ہوئے ہیں جن میں سرکار بھی شامل نظر آتی ہے۔ فروری 2001 میں ایک معمولی جھگڑا دونوں فرقوں کے درمیان فساد کا سبب بن گیا۔ یہ فساد Sitline شہر میں ہوا۔ جھگڑے کے بعد کرفیو لگا دیا گیا اور پھر جم کر مسلمانوں کی دوکانیں لوٹی اور جلائی گئیں۔ مئی 2001 میں مسلمانوں کے خلاف دوسرا بڑا فساد ہوا بلکہ منظم انداز میں انجام دیا گیا۔ یہ مقامی مسلمانوں کی اپنی کسی غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ بامیان، افغانستان میں گوتم بدھ کی مورتیاں توڑے جانے کی پاداش میں انہیں سزا دی گئی۔ برمیوں نے کھل کر مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی مساجد انتقاماً گرا دی جائیں۔ 15 مئی 2001 کو Taungoo میں فساد پھوٹ پڑا۔ دوسو سے زیادہ مسلمان مارے گئے، 11 مساجد شہید کر دی گئیں اور چار سو سے زیادہ گھروں میں آگ لگا دی گئی۔ تین دن بعد یعنی 18 مئی کو فوج کے ایک جنرل کی نگرانی میں مسلمانوں کی دو بڑی مساجد بلڈوزر سے گرا دی گئیں۔ اتنے ہی پر بس نہیں کیا گیا۔ باقی تمام مساجد میں نماز پڑھنے پر پابندی عائد کر دی گئی جو مئی 2002 تک قائم رہی۔

2010 سے فسادات میں مزید تیزی آئی ہے۔ اب یہ فسادات اراکان صوبے میں ہو رہے ہیں جہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے۔ یہ روہنگیا مسلمان ہیں۔ بدھسٹ مذہبی رہنما کھلے عام قاتل ہجوم کی قیادت کرتے ہوئے مسلمانوں پر حملے کر رہے ہیں۔ مساجد گرا دی گئی ہیں۔ اسکول برباد کر دیے گئے ہیں۔ گھروں میں آگ لگا دی گئی ہے۔ پناہ گزیں کیمپوں کو بھی نہیں بخشا جا رہا ہے۔ روہنگیا مسلمان ملک سے بھاگ کر در در بھٹک رہے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ روہنگیا مسلمان دہلی میں آ کر پناہ لیے ہوئے ہیں۔ کسی بھی عینک سے دیکھا جائے یہ نسل کشی ہے۔ مگر دنیا خاموش ہے۔

10.8 مسلمان جاپان میں

جاپان میں اسلام کی تاریخ شاید بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ حالانکہ بعض پرانے تاریخی ریکارڈوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اس ملک کے بارے میں بہت پہلے سے جانتے تھے۔ جاپان میں مردم شماری کے وقت لوگوں سے ان کے مذہب کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا۔ اس لیے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ آج جاپان میں مسلمانوں کی صحیح تعداد کیا ہے۔ جو بھی ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر یا

شاید اس سے بھی کم ہے۔ سب سے زیادہ تعداد ایک لاکھ کی بتائی جاتی ہے۔ دوسرے ذرائع ستر ہزار بتاتے ہیں جس میں صرف 10 فیصد اصل جاپانی ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ جاپان ایک بند سماج رہا ہے۔ باہر کی دنیا سے اس کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ حقیقت میں جاپانی یہ بھی نہیں پسند کرتے تھے کہ کوئی باہر سے ان کے یہاں آکر آباد ہو۔ باہر کی دنیا کے لیے جاپان نے انیسویں صدی کے وسط میں اپنے دروازے کھولے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان یہاں کم تعداد میں کیوں پائے جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے ویسے زمانہ وسطیٰ کے جاپان کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ابن خورداد بہ نے جاپان کو ایک مالدار ملک کے طور پر یاد کیا ہے جہاں سونے کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ چودھویں صدی کی چینی منگ سلطنت کی فوج میں Hui مسلمان پائے جاتے تھے۔ فوج کا ایک جنرل مسلمان تھا جسے جاپانی تلواریں پسند تھیں۔ سو اس نے دسیوں ہزار تلواریں اپنے اور اپنے سپاہیوں کے لیے خریدی تھیں۔ چین ہی کے ایک مسلمان ایڈمرل کا ذکر ملتا ہے جس کا جہاز کسی جاپانی بندرگاہ پر 1416 اور 1419 کے درمیان لنگر انداز ہوا تھا۔ سولہویں صدی میں ایک پرتگالی جہاز بھی جاپان آیا تھا جس کے مسلمان ملازمین میں سے بعضوں نے ساحل پر اتر کر جاپانیوں میں اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اسی طرح انیسویں صدی میں بعض برطانوی اور ڈچ (ہالینڈ) جہازوں کے مسلمان ملازمین بھی جاپانیوں کے رابطے میں آئے تھے۔ 1870 کی دہائی کے اواخر میں نبی کی زندگی پر ایک کتاب جاپانی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ یہ واضح نہیں کہ اسے کتنے لوگوں نے پڑھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علمی حلقوں میں ایسی کتابوں کی مانگ رہی ہوگی، ورنہ کوئی ترجمہ کر کے کیوں شائع کرتا۔ 1890 میں سلطنت عثمانیہ نے اپنا ایک جہاز جاپان بھیجا تھا تا کہ حکومت کا شکریہ ادا کر سکے کیونکہ ایک جاپانی شہزادے نے چند سال قبل ترکی کا دورہ کیا تھا۔ یہ جہاز واپسی کے وقت بحری طوفان کا شکار ہو گیا اور ڈوب گیا۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاپان سے کسی مسلم حکومت کا یہ شاید پہلا اہم سرکاری رابطہ تھا۔

جن جاپانیوں نے اسلام قبول کیا، ان میں ایک اہم نام عمر یماؤ کا کا ہے۔ ان کا اصل نام Kotaro Yamaoka تھا۔ ممبئی میں ان کی ملاقات ایک روسی اہل قلم عبدالرشید ابراہیم سے ہوئی۔ یماؤ کا جاپان کی سیکرٹ سروس میں تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے جاپان میں پہلی مسجد قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ انھیں کافی پاپڑ بیلنے پڑے۔ سالوں بعد یہ مسجد 1938 میں بن کر تیار ہو سکی۔ یہ مسجد ٹوکیو میں ہے۔ ایک اور جاپانی، Bumpachiro Ariga کا ذکر ملتا ہے جن کے ہندوستان سے تجارتی روابط تھے اور یہاں کے مقامی مسلمانوں سے متاثر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ Yamado Toajiro ایک جاپانی تاجر تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ 1892 تک لگاتار بیس سال تک استنبول میں رہے۔ وہ غیر سرکاری طور پر ترکی میں جاپان کے سفیر بھی رہے۔ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا اور جب مدتوں بعد جاپان واپس جا رہے تھے، تو حج کرنے کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔

جاپان کے اندر ایک چھوٹے موٹے سماجی گروپ کے طور پر مسلمانوں کی زندگی اس وقت شروع ہوئی جب روس میں اشتراکی انقلاب کے بعد مظالم سے بچنے کے لیے بہت سے ترکی النسل تاتاریوں نے جاپان میں پناہ لی۔ یہ پناہ گزیں تاتاری جاپان کے کئی شہروں میں آباد ہوئے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے محلے بنا لیے۔ 1938 میں ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق 400 تھی۔ ان مسلمانوں سے متاثر ہو کر بعض جاپانیوں نے بھی اسلام قبول کیا۔

جاپان کی سب سے پہلی مسجد 1935 میں تعمیر کی گئی۔ اسے پناہ گزیں تاتاری مسلمانوں نے بنایا۔ ٹوکیو کی مسجد جس کا ذکر اوپر ہوا،

1908 میں پلان کی گئی تھی لیکن اس کی تکمیل 1938 میں ہوئی۔ اس مسجد کے پہلے امام عبدالرشید ابراہیم (1944-1857) تھے جو 1938 میں جاپان آ گئے تھے۔ ان کے بعد عبدالحیٔ قربان علی امام (1972-1889) ہوئے۔ مشرف بہ اسلام ہونے والے جاپانیوں کا ان مساجد کی تعمیر میں کوئی خاص رول نہیں رہا۔ صرف ایک جاپانی مسلم کے کسی مسجد کے امام ہونے کا ذکر ملتا ہے یعنی شیخ ابراہیم سوادا جنھوں نے ٹوکیو کے اہل بیت اسلامک سینٹر میں امامت کی۔

جاپان میں شیعہ مسلمانوں کی بھی ایک مختصر تعداد رہتی ہے۔ یہ ہندوستان اور ایران سے یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ عزاداری اور مجلس کے انعقاد میں ان رسوم کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے جو ہندوستان میں عام ہیں۔

بعض مسلم تنظیمیں بھی جاپان میں سرگرم ہیں۔ سب سے پرانی تنظیم ''گریٹر جاپان مسلم لیگ'' 1930 میں قائم ہوئی۔ اس تنظیم کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے جاپان میں اسلامک اسٹڈیز کا ماحول پیدا کیا۔ ایک وقت جاپان میں سو سے زیادہ کتابیں اور جرنل اسلام کے بارے میں شائع ہوئے جن کی اشاعت وتصنیف میں مذکورہ تنظیم کا بڑا ہاتھ تھا۔ بلاشبہ ان کتابوں کو شائع کرنے کا مقصد جاپان کے فوجی رہنماؤں اور عامۃ الناس میں اسلام کا بہترین تعارف کرانا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں، جاپانی اور اسلامی دانشور یہ سوچ رہے تھے کہ جنگ عظیم اول کے بعد جس طرح اسلام کو حاشیے پر ڈال گیا، اسی طرح جاپان کو بھی اپاہج بنا دیا جائے گا۔ اس سوچ نے جاپانی اور مسلم دانشوروں کو قریب لانے کا عمل شروع کیا جس کے نتیجے میں زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ یہی جاپانی دانشور تھے جنہوں نے جاپانی حکومت پر زور دیا کہ ملک میں اسلام کو بھی بطور مذہب تسلیم کر کے مسلمانوں کو بھی وہی فوائد فراہم کیے جائیں جو بدھ ازم اور عیسائیت وغیرہ کو حاصل ہیں۔ جنگ عظیم دوم سے پہلے نہ صرف یہ دانشورانہ تعاون مسلمانوں اور جاپانیوں کے درمیان بڑھا بلکہ جاپانی حکومت یا اس کی تنظیموں نے جنوب مشرقی ایشیا کی ان مسلمان تنظیموں کی حمایت بھی شروع کر دی جو مغرب کے خلاف سرگرم عمل تھیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد یہ علمی تعلق اور تعاون جو مسلم اور جاپانی دانشوروں کے درمیان قائم ہوا تھا، ٹوٹ گیا۔ پھر بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ اس تعاون کے نتیجے میں جاپانی زبان میں اسلام پر اچھا خاصا لٹریچر تیار ہوا۔ قرآن مجید کا اسی زمانے میں ترجمہ ہوا اور بعض مشہور جاپانی مشرف بہ اسلام بھی ہوئے۔ ان میں سب سے اہم نام Shumei Okawa کا ہے۔ جو سیاستداں بھی تھے اور اہل قلم بھی۔ وہ مسلمان ہو گئے تھے اور جیل میں قرآن مجید کا جاپانی زبان میں ترجمہ مکمل کیا۔ جنگ عظیم دوم میں جاپان کی شکست کے بعد انہیں جیل میں یہ کہہ کر ڈالا گیا تھا کہ وہ جاپانی حکومت کے پروپیگنڈے میں شامل تھے۔ یہ الزام بعد میں یہ کہہ کر ہٹا دیا گیا تھا کہ اوکاوا کی دماغی حالت صحیح نہیں تھی لیکن مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ غلط ہے۔ مغرب یا امریکہ نے الزام اس لیے ہٹا دیا تھا کیوں کہ ان میں کوئی دم ہی نہیں تھا اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ثبوت تھا، پھر بھی فتح کے نشے میں سرشار امریکیوں نے پہلے انہیں اسپتال میں داخل کرایا اور پھر جیل بھیج دیا اور پھر جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ رہائی کے بعد وہ اپنے گاؤں چلے گئے جہاں انہوں نے خاموشی سے زندگی بسر کی اور 1957 میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پڑھے لکھے جاپانیوں کی اسلام میں دلچسپی جنگ عظیم دوم کے بعد بھی جاری رہی۔ 1973 کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اور بعد میں تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تیل کی اہمیت کو جاپان نے بھی محسوس کیا۔ اس تیل بحران سے نکلنے کے بعد جاپان نے مغربی ایشیا سے اپنے تعلقات میں کافی اضافہ کیا۔ اس وقت تک ان کے رابطے میں ترک اور روسی مسلمان تھے۔ لیکن 1970 کی دہائی میں عربوں

سے ان کے تعلقات میں بہت اضافہ ہوا اور بہت سے جاپانی مسلمان ہوگئے۔ یہ لوگ ان جاپانی مسلمانوں کے لیے بڑے مددگار ثابت ہوئے جو جنگ عظیم دوم کے دوران اور بعد میں مسلمان ہوئے اور جنہوں نے 1953 میں ''جاپان مسلم ایسوسی ایشن'' نامی تنظیم قائم کی تھی۔ اس تنظیم کے دوسرے صدر عمر یتا تھے جو جنگ عظیم دوم میں چین کے بعض حصوں پر جاپان کے قبضے کے دوران چین میں تھے اور وہیں چینی مسلمانوں سے رابطے میں آئے اور مسلمان ہوگئے۔ یتا نے حج کیا تھا اور قرآن مجید کی جاپانی زبان میں تشریح کی جو کافی مقبول ہوئی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بعض بااثر لوگوں نے اسلام قبول کیا، لیکن جاپان میں اسلام آج بھی ایک بہت چھوٹی اقلیت کا مذہب ہے۔

10.9 اسلام فلپائن میں

فلپائن میں آج مسلمان اگرچہ گیارہ فیصد ہیں لیکن اس ملک میں وہ زمانہ وسطی سے موجود ہیں اور چار سو سال سے مغربی طاقتوں سے برسر پیکار ہیں جنہوں نے طاقت اور پیسے کے بل پر لوگوں کو عیسائی بنالیا ہے۔ اسلام فلپائن میں چودھویں صدی میں اس وقت پہنچا جب خلیجی ممالک، جنوبی ہندوستان (کیرالا) اور ملیشیا کی مختلف ریاستوں کے امراء نے تجارت کی غرض سے اس سرزمین پر قدم رکھا۔ 1380 میں کریم المخدوم پہلے عرب تاجر تھے جو فلپائن کے علاقے Sulu اور Jolo پہنچے تھے۔ دوسرے عرب تاجروں کی طرح کریم المخدوم بھی ایماندار اور نیک تاجر تھے۔ ایسٹ افریقہ سے چین تک عرب تاجر اپنی محنت، لگن، ایمانداری اور صاف ستھری تجارت کے لیے مشہور تھے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی یہ تاجر اپنے مذہب پر قائم رہتے اور وہ کہیں بھی ہوتے، مذہبی رسوم ضرور ادا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ عربوں کی تجارت بہ ایں معنی ان سارے ممالک کے لیے فائدہ مند تھی جن سے ان کے تجارتی روابط قائم تھے۔ بالعموم سامان پیدا کرنے یا بنانے والا اپنا مال مارکیٹ میں لے جا کر بیچتا ہے۔ مگر عرب تاجر مال بنانے والے ممالک کے پاس خود پہنچتے، ان سے ان کی اضافی چیزیں لیتے اور وہ چیزیں انہیں دیتے جو ان کے پاس نہیں تھیں یا جن کی انہیں ضرورت تھی۔ ایسے تاجروں کا کون خیر مقدم نہیں کرے گا اور جب لوگ یہ دیکھتے کہ یہ تاجر نہ صرف اچھے تاجر ہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں تو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ تو یہ مسلمان تاجروں کی صاف ستھری تجارت اور دیانت تھی جس کی وجہ سے ہر جگہ اسلام پھیلتا گیا۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ فلپائن کی سرزمین پر سب سے پہلے کریم المخدوم نے قدم رکھا۔ 1390 میں ایک مقامی راجہ اور ان کے ماننے والوں نے اسلام کی تعلیمات کو کافی فروغ دیا۔ یہ لوگ المخدوم کے ہاتھوں پہ ایمان لائے تھے۔ انہیں لوگوں نے چودھویں صدی کے اواخر میں پہلی مسجد تعمیر کی جس کا نام شیخ کریم المخدوم مسجد رکھا۔ پندرہویں صدی میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ یعنی عرب اپنی تجارت کو مزید فلپائنی علاقوں تک بڑھاتے گئے۔ اور اپنے اخلاق سے لوگوں کو متاثر بھی کرتے گئے۔ نتیجۃً کئی علاقوں میں مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہوگئیں۔ یہ مقامی مسلم آبادیاں کافی منظم ہوتیں اور ایک راجہ یا داتو ان کا سربارہ ہوتا۔ اسلام ملیشیا اور انڈونیشیا میں پہلے ہی پہونچ چکا تھا اور ان ممالک میں کافی مستحکم بھی تھا جس کا فائدہ فلپائنی مسلمانوں کو بھی پہونچ رہا تھا۔ پندرہویں صدی میں فلپائن میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کئی ریاستیں یا امارات قائم ہوگئی تھیں مثلاً Maguindanao کی سلطنت، Sulu کی سلطنت، Lanao کی سلطنت وغیرہ جنوبی فلپائن کے بعض دوسرے حصوں میں بھی مسلمان کافی تعداد میں موجود تھے۔ جب اسپین کا بحری بیڑہ فلپائن پہنچا ہے تو فطری طور پر مسلمانوں نے خطرے کی گھنٹی کو محسوس کیا کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ وہ اسلام کے سخت دشمن ہیں جو اسپین سے مسلمانوں کو یا تو نکال رہے تھے یا پھر انہیں زبردستی عیسائی بنا رہے تھے۔ مسلمان

تاجر بس تاجر تھے۔ ان کے پاس بحری قزاقوں سے لڑنے کے لیے سپاہی ضرور تھے مگر یہ کوئی فوج نہیں تھے۔ کچھ تاجر دعوت دین کا کام بھی انجام دیتے مگر اکثریت بس تجارت کرتی اور اپنے طور پر ذکر وعبادت میں بھی مصروف رہتی۔ چنانچہ جب اسپینی بیڑہ فلپائن پہنچتا ہے تو اس وقت منیلا کے علاقے میں بھی مسلمان کافی تعداد میں موجود تھے اور ان کی اکثریت مقامی فلپائنی لوگوں پر مشتمل تھی۔ شمالی فلپائن کے علاقے Luzon کے لوگ بھی بڑی تعداد میں مسلمان ہو گئے تھے اور جنوب کے جزیرہ منڈاناؤ (Mandanao) کے لوگ بھی مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ گویا جنوبی فلپائن کے اکثر لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ اگرچہ بعض علاقے جہاں ہندو اور بدھسٹ تھے، وہاں اسلام کے پھیلنے کی رفتار کافی سست تھی۔

فلپائن کی بحری تجارت کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت تھی کہ اس کی بندرگاہیں بڑی اچھی تھیں۔ چنانچہ برونائی، جو ایک چھوٹی سی ریاست تھی، نے اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کے لیے فلپائن کے تاجروں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور جن علاقوں میں ان کا اثر ورسوخ تھا، انہیں اپنا تابعدار بنالیا۔ سلطان بلقیہ نے جنہوں نے 1485 سے 1521 تک حکومت کی، خاص طور سے منیلا کی بندرگاہ میں بڑی دلچسپی دکھائی کیوں کہ یہ ایک فطری بندرگاہ تھی اور یہاں سے چین تک زبردست تجارت ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے اثرات یہاں اس قدر بڑھا لیے کہ منیلا کی حکومت ان کی باجگزار ہوگئی۔ بعض دوسرے قریبی علاقوں میں بھی مسلمانوں کے قدم جم گئے اور ان کی ریاستیں قائم ہوگئیں جن میں سلیمان کی امارت کافی اہم اور مضبوط تھی۔ فلپائن میں مسلمانوں کی تاریخ میں سلیمان اول، دوم اور سوم کی حکومتوں کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ انہوں نے خود منیلا کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔

جب سولہویں صدی میں اسپین کا بحری بیڑہ فلپائن فتح کرنے آیا تو منیلا کے پاس Luzon میں لنگر انداز ہوا۔ اس وقت منیلا سلیمان کے زیر اقتدار تھا۔ مسلمانوں نے اسپینیوں کا جم کر مقابلہ کیا مگر جنگ ہار گئے کیونکہ ان کے بحری بیڑے تجارتی زیادہ اور جنگ لڑنے والے کم تھے۔ 1570 کی دہائی میں اسپین نے فلپائن میں منیلا کے قریب اپنے قدم جما لیے تھے اور پھر دھیرے دھیرے پورے جزیرے کو انہوں نے فتح کر لیا۔ صرف جنوبی فلپائن میں ان کی دال نہ گلی جہاں مسلمان آج بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

آج جنوبی فلپائن کا صوبہ منڈاناؤ (Mindanao) وہ جگہ ہے جہاں مسلمان کافی تعداد میں ہیں اور جہاں مسلمان گزشتہ 4 سو سالوں سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ لڑائی پہلے انہوں نے اسپین کے خلاف، پھر امریکہ اور جاپان کے خلاف لڑی اور آج بھی موجودہ حکومت سے اپنی علیحدہ ریاست کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اپنی چار سو سالہ جدوجہد کو فلپائنی مسلمان تحریک آزادی کا نام دیتے ہیں جو آج بھی جاری وساری ہے۔ منڈاناؤ میں انہیں جزئی خودمختاری حاصل ہے۔ موجودہ حکومت، جو رومن کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ تمام فلپائن کی حکومت ہے اور مذہب کی بنیاد پر وہ کسی کے خلاف امتیاز نہیں برتتی مگر مسلمان ان کی باتوں پر یقین نہیں کرتے اور ان کی تحریک آزادی جاری وساری ہے۔

معلومات کی جانچ

1- فلپائن میں مسلمانوں کی آمد اور موجودہ حالت کے بارے میں بتائیے۔

2- برما میں مسلمانوں پر ظلم وستم پر روشنی ڈالئے۔

3- جاپان میں مسلمانوں کی موجودگی کا جائزہ لیجئے۔

10.9 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اس اکائی میں جن ملکوں کا ذکر کیا گیا وہاں مسلمان قابل ذکر تعداد میں ہیں۔ چین اور روس کو چھوڑ کر یہ وہ ممالک ہیں جہاں مسلمان آباد تو بڑی تعداد میں ہیں لیکن مسلم دنیا ان کے حالات اور کیفیات سے اکثر ناواقف ہے۔ چین اور روس کے مسلمان بظاہر یکساں شہری ہونے کے باوجود حقوق سے محروم ہیں، جس کی وجہ سے وہ ان ملکوں میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدو جہد بھی کر رہے ہیں، اس لیے ان کی خبریں تو ذرائع ابلاغ میں آجاتی ہیں لیکن دیگر مقامات کے بارے میں معلومات نسبتاً کم ہیں۔ بلاشبہ روس اور چین سے اسلام کا تعارف قدیم ہے لیکن سری لنکا، برما، تھائی لینڈ اور فلپائن سے بھی اسلام اور مسلمانوں کا تعلق کچھ کم پرانا نہیں ہے۔ مسلمان ان ملکوں میں نہ صرف یہ کہ زمانہ قدیم سے آباد ہیں بلکہ انہوں نے اپنی ایک نمایاں شناخت بھی قائم کی ہے۔ جاپان میں اسلام کا تعارف نیا ضرور ہے البتہ اسلام جاپان میں تیزی سے فروغ پانے والے مذاہب میں سب سے آگے ہے۔

10.11 نمونے کے سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیں:

1- روس کے مسلمانوں کے حالات بیان کیجیے۔

2- چین کے مسلمانوں (Hui اور اویغور) پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

3- برما کے مسلمانوں کی حالت زار پر مضمون لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیں:

4- سری لنکا میں اسلام کب آیا، وہاں کے مسلمانوں کی موجودہ حالت بیان کریں۔

5- تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی اپنے ثقافتی ورثے کی بقا کے لیے جدو جہد پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

6- جاپان میں اسلام اور مسلمانوں پر ایک نوٹ لکھیں۔

7- فلپائن میں اسلام کی آمد اور اشاعت و تبلیغ پر تفصیلی مضمون لکھیں۔

10.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ ثروت صولت: مسلمان اقلیتیں

2۔ آباد شاہ پوری: روس میں مسلمان قومیں

3- M. Ali Kettani: Muslim Minorities in the World Today

4- Sulayman Nyang: Islam in the United States of America

5- Yuonne Yezbeck Haddad & Jane I Smith: Muslim Minorities in the West

اکائی 11 : مسلمان آسٹریلیا میں

اکائی کے اجزاء

11.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد قاری کو یہ بتانا ہے کہ آسٹریلیا میں مسلمان کب آئے، آبادی میں ان کا تناسب کیا ہے اور انہیں کن مسائل و مشکلات کا سامنا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ وہ کن ملکوں سے یہاں آئے، کس نسل سے تعلق رکھتے تھے، آنے کا مقصد کیا تھا اور یہاں آنے پر ان کا استقبال کس طرح ہوا۔ قاری کو یہ بھی بتایا جائے گا کہ آج وہاں مسلمان کس حالت میں ہیں۔ آسٹریلیا کے علاوہ نیوزی لینڈ اور فجی کے مسلمانوں کے بارے میں بھی گفتگو ہوگی۔

11.2 تمہید

آسٹریلیا ایک براعظم ہے، یہ ایک اہم ملک ہے۔ مسلمان یہاں برطانیہ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ مگر وہ یہاں تجارت کرنے آئے تھے اور یہ مسلمان ابتدائی دور کے عرب تاجر نہیں تھے جو اسلامی مشن اور تہذیب کے علمبردار ہوا کرتے تھے۔ بلکہ یہ انڈونیشیا کے مسلمان تھے اور شاید ان میں اپنے مذہب اور تہذیب کا وہ شعور نہیں تھا جو صدر اول کے عرب تاجروں میں پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی بہ نسبت

آسٹریلیا کی تاریخ اور سماج پر اسلام کی چھاپ مدھم نظر آتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ سفید فاموں نے اس ملک کو اپنی کالونی کم و بیش اسی انداز میں بنایا جس طرح امریکہ کو بنایا تھا یعنی مقامی باشندوں کا قتلِ عام کر کے۔ آج بھی آسٹریلیا میں اس مقامی آبادی کے بعض لوگ رہتے ہیں مگر دبائے ہوئے لوگوں کی طرح۔ آسٹریلیا کے علاوہ مثلاً نیوزی لینڈ کے مسلمانوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی جائیں گی۔

11.3 آسٹریلیائی مسلمانوں کی تاریخ

آسٹریلیا میں سب سے پہلے آنے والے مسلمان انڈونیشیائی باشندے تھے۔ یہ لوگ کھیرے کی شکل کے ایک سمندری جاندار یا کھیرے مچھلی پکڑتے تھے جو آسٹریلیا کے سمندروں میں کافی تعداد میں پائی جاتی ہے اور جس کی چین کے بازاروں میں بڑی مانگ تھی۔ اس سمندری جاندار یا مچھلی کو غذا کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا اور دواؤں کے لیے بھی۔ انگریزی میں اسے ٹریپنگ (Trepang) کہتے ہیں۔ تو یہ ''سمندری جاندار'' آسٹریلیا کے سمندروں میں خوب پائے جاتے تھے۔ انہیں کی تلاش میں انڈونیشیا کے مسلمانوں نے آسٹریلیائی سمندروں کا رخ کیا۔ اس لیے یہ آسٹریلیا میں آنے میں پہلے مسلمان ہوئے۔ اس ضمن میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ انڈونیشیائی مسلمان آسٹریلیا کب پہنچے اور وہاں کی آبادی پر کیا اثر ڈالا۔ جس طرح امریکہ کے قدیم باشندوں کو ریڈ انڈین کہا جاتا ہے، اسی طرح آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کو Aboriginal یعنی ایب اوریجنل کہتے ہیں۔ انڈونیشیا سے آنے والے مسلمانوں کا سابقہ انہیں ایب اوریجنل لوگوں سے پڑا تھا جن پر آج بھی اسلام کے بعض اثرات ملتے ہیں۔ گریفتھ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر Regina Ganter کا ماننا ہے کہ ''تاریخی طریقے کی محفوظ بنیادوں پر انحصار کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آسٹریلیا میں ٹریپنگ صنعت کی ابتداء 1720 سے 1750 کے درمیان ہوئی۔ محدود پیمانے پر اگر اس سے پہلے بھی انڈونیشیا کے مسلمانوں اور آسٹریلیا کے درمیان رابطے قائم رہے ہوں تو یہ ممکن ہے۔'' Ganter کا مزید کہنا ہے کہ Yolngu لوگوں پر اس رابطے کے اثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں یعنی ان کی زبان، آرٹ، کہانیوں اور غذائیات میں۔ ایک دوسرے پروفیسر، ماہر علم الانسان، جان بریڈلے (John Bradley) کا یہ کہنا ہے کہ'' آسٹریلیا اور انڈونیشیا کے درمیان یہ رابطہ کافی کامیاب رہا تھا۔ انہوں نے باہم تجارت کی جو کافی صاف ستھری تھی اور اس میں کوئی نسلی تعصب نہیں تھا۔ آج اکیسویں صدی میں بھی ایب اوریجنل اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے مابین اس تعلق کے اثرات آسٹریلیا کی مقامی آبادی پر پائے جاتے ہیں اور شمالی آسٹریلیا میں اس رابطے یا اس قدیم تعاون کو یاد کیا جاتا اور اسے خوشی کے موقع اور تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔'' اس وقت کو آج بھی باہمی اعتماد و اکرام کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

بعض دوسرے ماہرین نے بالکل مختلف نتیجہ نکالا ہے۔ Ian Melntosh ایک ماہر علم الانسان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انڈونیشیا اور آسٹریلیا کے درمیان ابتدائی روابط خوشگوار نہیں تھے۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے مقامی آسٹریلیائی باشندوں پر غالب ہونے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے ہوئے، کاروبار ماند پڑ گیا اور لوگ غربت کا شکار ہوئے۔ آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ نے ایک رپورٹ تیار کی ہے جس کے مطابق ابتدا میں تو لوگوں نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو خوش آمدید کہا۔ لیکن بعد میں آسٹریلیا کے مقامی باشندوں کو شکایت ہوئی کہ ان کا استحصال ہو رہا ہے تو نتیجتاً لوگ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تشدد دونوں طرف سے ہوا۔

11.4 آسٹریلیا کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب

آسٹریلیا میں مردم شماری 1802 میں ہوئی۔اس کے بعد 1811، 1822 اور 1828 میں ہوئی۔ بہت کم مسلمانوں کا ذکر ملتا ہے۔ جب برطانیہ نے چوروں اور ڈاکوؤں کو سزا کاٹنے کے لیے یہاں آباد کیا، تو اس وقت بھی بہت کم مسلمان پائے جاتے تھے۔ بڑے پیمانے پر مسلمان 1860 کے بعد آسٹریلیا میں آباد ہوئے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں بعض مسلمان ان برطانوی جہازوں کے ملازم کے طور پر آئے جن میں جرائم پیشہ لوگوں کو قید کاٹنے کے لئے Norfolk Island پر لایا جاتا تھا۔ یہ جزیرہ ایک طرح سے برطانیہ کے قید خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ غالباً 1796 میں بعض مسلم اس جزیرے پر آئے تھے۔ وہ یہاں آباد بھی ہوئے تھے لیکن بعد میں تسمانیہ میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ 2006 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق صرف 6 لوگوں نے خود کو غیر عیسائی بتایا۔

انیسویں صدی کے وسط میں بھی بعض مسلمان آسٹریلیا لائے گئے۔ بعض افغانوں کا ذکر ملتا ہے جو 1860 سے 1890 کے درمیان شتربانوں کی حیثیت میں یہاں لائے گئے تھے اور وہ یہیں آباد ہوگئے۔ آسٹریلیا میں اونٹ 1840 میں درآمد کیے گئے تھے۔ ابتدا میں انہیں وسیع صحراؤں اور ریگستانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سفر کے دوران استعمال کیا گیا اور بعد میں Camel Train کے لیے جو آسٹریلیا کے ماحول کے مطابق تھی۔ سب سے پہلے یہ شتربان 1860 میں آئے۔ یہ کل آٹھ تھے اور ان میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ یہ لوگ ملبورن میں آکر رکے بعد میں یہیں آباد ہوگئے۔ 1866 میں شتربانوں کا دوسرا گروپ آیا جس میں 31 لوگ شامل تھے۔ یہ راجستھان اور بلوچستان سے آئے تھے مگر ان سب کو افغان کہا جاتا تھا۔ یہ مسلمان اپنے ساتھ اپنا مذہب اور کلچر بھی لائے جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے مختلف نظر آتے تھے۔ یہ شتربان Alice Springs کے آس پاس کے علاقوں میں آباد ہوئے اور یہاں کی مقامی آبادی کی خواتین سے شادیاں کرلیں۔ ایڈلیڈ سے ساؤتھ آسٹریلیا ہوتے ہوئے شمالی علاقوں تک جانے والی ایک ٹرین کو آج بھی Ghan کہا جاتا ہے اور Ghan مخفف ہے افغان (Afghan) کا۔ 1870 کی دہائی میں بعض ملائی مسلمانوں کو ایک معاہدے کے تحت لایا گیا۔ یہ لوگ غوطہ خور تھے جنہیں ویسٹرن آسٹریلیا سے موتی نکالنے کا کام سونپا گیا تھا۔ 1875 تک کل 1800 ملائی مسلمان غوطہ خوری کے کام میں مصروف تھے اور سب کے سب آسٹریلیا ہی کے ہو کر رہ گئے۔ جنوبی آسٹریلیا کے مقام Marree میں سب سے پہلی مسجد 1861 میں افغان مسلمانوں نے بنائی۔ کتابوں میں بعض اہم واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً 23 جولائی 1884 کو مسلمانوں نے ملبورن کے البرٹ پارک میں عید منائی۔ اس میں کل 70 مسلمان شامل ہوئے تھے۔

بیسویں صدی آتے آتے آسٹریلیا پر سفید فاموں کا پورا قبضہ ہو چکا تھا اور حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ صرف سفید فاموں کو ہی آسٹریلیا میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں صرف یوروپی مسلمانوں کو آسٹریلیا میں ہجرت کر کے آنے اور یہاں بسنے کی اجازت تھی۔ اس پالیسی کے نتیجے میں 1920 اور 1930 کی دہائیوں کے درمیان بہت سے البانوی مسلمان آکر یہاں آباد ہوئے کہ وہ یوروپین لگتے تھے۔ ان البانوی مسلمانوں نے اپنی پہلی مسجد 1960 میں بنائی اور ملبورن میں پہلی مسجد 1963 میں بنائی گئی۔ بیسویں صدی کے ایک واقعے کا تاریخ کی کتابوں میں بڑا ذکر ملتا ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز میں Broken Hell واقع ہے۔ 1915 میں جب جنگ عظیم اول

جاری تھی، دو افغانوں نے خود کو عثمانی سلطنت کا وفادار بتاتے ہوئے آسٹریلیائی لوگوں پر حملہ کر دیا۔ چار لوگ مارے گئے اور سات زخمی ہوئے۔ پولیس نے دونوں افغانوں کو مار گرایا۔ بعض لوگ اسے Battle of Broken Hill بھی کہتے ہیں جسے مبالغہ ہی کہا جا سکتا ہے۔

آسٹریلیا کافی بڑا ملک یا براعظم ہے۔ سفید فاموں نے پہلے یہ سوچا کہ ملک کی ساری دولت پر بس انہیں کا حق ہو، لیکن معاشی ترقی کے لیے افرادی قوت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ جنگ عظیم دوم کے بعد دوسروں کے آسٹریلیا میں آ کر آباد ہونے کی پالیسی میں نرمی کی گئی۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ ان مسلمانوں کو ملک میں آ کر آباد ہونے دیا جائے جو جنگ کی وجہ سے مشرقی یوروپ میں بے گھر ہو گئے تھے۔ ان لوگوں میں خاص طور سے وہ مسلمان شامل تھے جن کا تعلق بوسنیا و ہرزیگووینا سے تھا۔ 1967 سے 1971 کے عرصے میں دس ہزار ترک شہری ترکی اور آسٹریلیا کے درمیان ایک معاہدے کے تحت یہاں آ کر آباد ہوئے۔ 1970 تک آسٹریلیا کی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ نئے لوگوں کو یعنی جو حال ہی میں آ کر آسٹریلیا میں آباد ہوئے ہیں، وہ اپنے سابقہ کلچر سے جدا ہو کر آسٹریلوی ثقافت کا حصہ بنیں۔ مگر 1970 کی دہائی میں اس پالیسی میں تبدیلی ہوئی اور حکومت نے مہاجرین کے مذہب و ثقافت کو تسلیم کرنے کی پالیسی اختیار کر لی۔ یعنی 1970 کی دہائی سے آج تک آسٹریلیا ایک کلچر کی پالیسی چھوڑ کر ثقافتی تکثیریت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس پالیسی کا مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا ہے۔ اسی دہائی میں حکومت کی مہاجرین کے تئیں پالیسی میں مزید نرمی آئی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ 1975 میں بڑے پیمانے پر مسلمان، خاص طور سے لبنانی مسلمان آسٹریلیا میں آ کر آباد ہوئے۔ لبنان کی خانہ جنگی کے دوران اور بھی زیادہ مسلمان آئے۔ چنانچہ جو آبادی مسلمانوں کی 1971 میں 22311 یعنی 0.17% تھی وہ 1976 میں بڑھ کر 0.33% یا 45200 ہوگئی۔ آج بھی آسٹریلیا میں لبنانی مسلمان ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا گروہ ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ لبنان کی خانہ جنگی کے دوران صرف مسلمان ہی آ کر آسٹریلیا میں آباد نہیں ہوئے بلکہ لبنانی عیسائی اور بھی بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ 4 لبنانی مسلمانوں پر 6 لبنانی عیسائی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مسلمان بھی آسٹریلیا میں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 60 سے زیادہ ملکوں کے مسلمان آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔ بوسنیا، ترکی اور لبنان کے مسلمان بلاشبہ بڑی تعداد میں ہیں لیکن عراق، افغانستان، پاکستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا، ملیشیا، ایران، فجی، البانیا، سوڈان، صومالیہ، مصر اور فلسطین کے مسلمان بھی آسٹریلیا میں پائے جاتے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری میں 476291 لوگوں نے کہا کہ وہ اسلام کے ماننے والے تھے۔ گویا کل آبادی کا 2.2 فیصد۔

یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ 1990 کی دہائی میں بہت سے مسلمان طلبہ آسٹریلیا میں جدید اعلیٰ تعلیم کے لیے آئے اور یہاں کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا۔ یہ طلبہ زیادہ تر ملیشیا، انڈونیشیا، انڈیا، بنگلہ دیش، پاکستان سے آئے ہیں اور ان ہزاروں غیر ملکی طلبہ میں شامل ہیں جو درجنوں ملکوں سے یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، اسلام آسٹریلیا میں ایک اقلیتی مذہب ہے۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد بس 2.2 فیصد ہے۔ اس طرح اسلام عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا اسامی مذہب ہے۔ عیسائیوں کے سارے فرقے ملک کی آبادی کا 61 فیصد ہیں جب کہ کسی بھی مذہب کو نہ ماننے والے 22.9 فیصد ہیں اور بدھ ازم کے ماننے والے 2.5% ہیں۔ گویا اسلام چوتھے نمبر پر ہے۔ مسلمانوں کی شرح

پیدائش دوسرے مذاہب کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جو لوگ باہر سے یہاں آکر آباد ہو رہے ہیں، ان میں بھی اچھے خاصے مسلمان ہوتے ہیں، اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ 2030 تک مسلمانوں کی آبادی بڑھ کر 714000 ہو جائے گی۔ آسٹریلیائی مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔ شیعہ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ تصوف پر بھی بعض لوگ عمل پیرا ہیں اور کچھ قادیانی بھی پائے جاتے ہیں۔

اپنے مذہب اسلام کی وجہ سے تمام آسٹریلیائی مسلمان ایک ہیں لیکن نسل، زبان اور ثقافت کی بنیاد پر یہ آپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ لیکن مذہب بہر حال انہیں جوڑتا ہے۔ کم از کم مساجد میں انہیں ایک کر دیتا ہے جب کہ ثقافت اور کبھی کبھی زبان انہیں ایک دوسرے سے مختلف دکھاتی ہے۔ لیکن یہ لسانی و ثقافتی اختلاف کبھی باہمی منافرت کا سبب نہیں بنایا جا سکا ہے۔ اگر مسئلے درپیش ہیں مسلمانوں کو تو وہ غیر مسلموں کی طرف سے ہیں۔ مثلاً خلیج میں جب پہلی جنگ ہوئی عراق کو کویت سے بے دخل کرنے کے لیے تو آسٹریلیا میں عرب مخالف حالات پیدا کیے گئے۔ اخباروں میں خطوط شائع ہوئے جن میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ عرب مسلمان ملک کے تئیں اپنی وفاداری ثابت کریں یا اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ اسی طرح بعض ان عرب خواتین کو سر عام خوف زدہ کیا گیا جو حجاب یا اسکارف پہنے ہوئے تھیں۔ حکومت آسٹریلیا کے کمیشن برائے حقوق انسانی و مساوی مواقع نے 1991 میں اپنی جو رپورٹ شائع کی، اس میں بھی عربوں کے خلاف نسلی منافرت پھیلانے اور سر عام انہیں ہراساں کرنے کا ذکر ہے۔ یہ بھی ایک طرفہ تماشہ ہے کہ آسٹریلیا خلیج میں تمام عربوں کے خلاف لڑنے نہیں گیا تھا بلکہ دو عرب ممالک میں سے ایک کا ساتھ دینے گیا تھا جو باہم برسر پیکار تھے۔ دو بھائیوں کی آپسی لڑائی کی وجہ سے اگر آسٹریلیا کے عربوں کے درمیان بھی اختلاف ہو جائے تو یہ فطری بات ہے اسے کسی طرح ملک دشمن سرگرمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر بد قسمتی سے آسٹریلیا کے بعض شہریوں نے عرب مخالفت میں اندھا ہو کر ایسا کیا۔ اچھی بات یہ رہی کہ حکومت کی سطح پر کوئی عرب مخالف قدم نہیں اٹھایا گیا۔

بعض دوسرے مواقع پر بھی عام مسلمانوں اور دوسرے آسٹریلوی شہریوں کے درمیان تناؤ کا ماحول پیدا ہوا یا کیا گیا۔ ایسا 2000 میں بھی ہوا اور 2010 میں بھی۔ سڈنی میں ایک حادثہ ہوا۔ چند لبنانی نوجوانوں نے بعض غیر مسلم خواتین کے ساتھ جنسی زیادتی کی۔ ردعمل میں بے گناہ اور غیر متعلق مسلمانوں کو عام آسٹریلیائی لوگوں نے عتاب کا شکار بنایا۔ 2005 میں بھی سڈنی میں ایک واقعہ ہوا جس سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پر تشدد فسادات پھوٹ پڑے۔ بڑے پیمانے پر لوگوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے۔ 2012 میں ایک مسلم مخالف فلم، Innocence of Muslims کے خلاف مسلمان پر امن طریقے سے احتجاج کر رہے تھے کہ اچانک فساد شروع ہو گیا۔ 15 اور 16 دسمبر 2014 کو سڈنی میں بعض دہشت گردوں نے کچھ لوگوں کو زبردستی یرغمال بنا لیا تو اس وقت بھی مسلم مخالف ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن ایسے تمام واقعات پر مسلمانوں کی اکثریت پر امن رہی اور نتیجے کے طور پر بہت سے غیر مسلم آسٹریلیائی لوگ ان کی حمایت میں سامنے آئے اور اس مقصد کے لیے سوشل میڈیا پر باقاعدہ تحریک بھی چلائی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض آسٹریلیائی مسلمان نوجوان اور چند لیڈران انتہا پسندانہ خیالات رکھتے ہیں۔ لیکن بھاری اکثریت نہ صرف پر امن ہے بلکہ انتہا پسندی کے خلاف برسر پیکار ہے۔ آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلس کے صدر نے تو یہ مطالبہ کر دیا ہے کہ آئندہ انہیں مسلمانوں کو ملک میں آنے دیا جائے جن کے خیالات میں انتہا پسندی نہیں پائی جاتی بلکہ وہ اعتدال کے راستے پر گامزن ہیں۔ عام مسلمانوں کی اس سوچ کو بہت سے غیر مسلم آسٹریلیائی عوام کی بھی حمایت حاصل ہے۔

11.5 آسٹریلیائی مسلمانوں کے مسلک

آسٹریلیائی مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔ یہ سنی مسلمان زیادہ تر Lekemba اور اس کے مضافات مثلاً پنچ باول، ولے پارک، بینکس ٹاؤن اور آبرن وغیرہ میں رہتے ہیں۔ سلفی حضرات بھی پائے جاتے ہیں جن کے بعض خیالات و افکار کو انتہا پسندانہ تصور کیا جاتا ہے۔ دعوت اسلامی نامی ایک گروپ بھی ہے جو پوری دنیا میں تبلیغ اسلام کا دعویٰ کرتا ہے۔

شیعی مسلمان زیادہ تر سینٹ جارج، کیمپ بیل ٹاؤن، فیر فیلڈ، آبرن اور سڈنی کے لیور پول علاقے میں رہتے ہیں۔ اُرن کلف میں شیعوں نے الزہرا مسجد بنائی ہے جو کافی خوبصورت ہے۔ یہ مسجد 1983ء میں تعمیر ہوئی۔ 2008 میں، بتایا جاتا ہے، شیعوں کی تعداد آسٹریلیا میں 30000 تھی۔ نومبر 2013 میں شیعوں نے عاشورہ کا جلوس نکالا تھا جس میں تین ہزار لوگ شامل تھے۔ علوی فرقے کے لوگ بھی آسٹریلیا میں آباد ہیں، ان کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے اور یہ لوگ ترکی، شام اور لبنان سے آئے ہیں۔ علویوں کا اپنا اسلامی اسکول ہے جسے الصادق کالج کہا جاتا ہے اور اس کے کیمپس کئی علاقوں میں قائم ہیں۔ دروز بھی پائے جاتے ہیں جو دراصل شیعی اسلام سے نکلا ہوا ایک گروپ ہے۔ دروز آسٹریلیا میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ایک مختصر تعداد اسمٰعیلی شیعوں کی بھی ہے۔

ایک چھوٹی سی تعداد صوفی مسلمانوں کی ہے جو خود کو احباش کہتے ہیں۔ المنارہ کالج احباش صوفیا کا ہے۔ ان کی اپنی مسجد بھی ہے۔ کبھی کبھی احباش صوفیا اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان تناؤ کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ قادیانی بھی ہیں غالباً تین ہزار ہیں اور ان کی مسجدیں بھی ہیں۔

آسٹریلیائی مسلمان، خصوصاً سنیوں نے کئی مساجد تعمیر کی ہیں اور اسکول بھی چلا رہے ہیں۔ مذہبی رہنما مساجد میں امامت کرتے اور دوسرے معاملات میں بھی اپنی قوم کی قیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ 1988 میں آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلس نے شیخ تاج الدین ہلالی کو پہلا مفتی اعظم مقرر کیا۔ یہ نیوزی لینڈ کے بھی مفتی اعظم تھے۔ ہلالی کے بعد فہمی ناجی ہوئے اور اب ابراہیم ابو محمد مفتی اعظم ہیں۔ آپ ستمبر 2011 سے اس عہدے پر فائز ہیں۔

11.6 مسلم تنظیمیں

مساجد اور اسکولوں کے علاوہ بھی بہت سی تنظیمیں ہیں جو آسٹریلیائی مسلمان چلاتے ہیں۔ بعض رفاہی تنظیمیں بھی ہیں جو مخصوص طبقوں کی مدد کرتی ہیں۔ بڑی تنظیمیں جس میں بڑے پیمانے پر مسلمان شامل ہوتے ہیں، کونسل کہلاتی ہیں۔ ان کونسلوں میں مختلف ممالک اور نسلوں کے مسلمان شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ادارے ہیں جو خاص مقاصد کی تکمیل کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً بعض صرف ضرورتمند خواتین یا طلبہ کی مدد کرتی ہیں اور بعض ان مسلمانوں کی جو آفات سماوی و ارضی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ کم از کم دو تنظیمیں ہیں جو سیاسی عزائم رکھتی ہیں۔ ایک حزب التحریر ہے جو خود کو سیاسی جماعت کہتی ہے جس کا نصب العین اسلام ہے۔ دوسری سیاسی پارٹی اہل السنہ والجماعۃ ہے۔ نظریاتی اعتبار سے یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

آسٹریلیا میں اسلامک بینکنگ یا فائنانس کا بھی بڑا زور ہے۔ بہت سے مالی ادارے قائم ہیں جو شرعی اصولوں کے مطابق مالی کاروبار کرتے ہیں۔ اسلامی معاشیات آسٹریلیائی یونیورسٹیوں میں بطور مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ شرعی اصولوں کے مطابق سرمایہ کاری کے لئے بھی ادارے قائم ہیں۔ شرعی اصولوں کے مطابق ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن کا بھی یہ ادارے انتظام کرتے ہیں۔ بعض ادارے زکوٰۃ جمع کرنے اور اس کی مناسب تقسیم کی غرض سے قائم کیے گئے ہیں۔ اسلامی اداروں کے قیام میں سعودی عرب کے افراد اور تنظیموں نے حالیہ دنوں میں بڑی دلچسپی لی ہے۔ اندازاً اس مد میں سعودی افراد اور ادارے سوملین ڈالر سالانہ خرچ کر رہے ہیں۔ سعودی اعانت سے چلنے والے اداروں کو بعض آسٹریلیائی مسلمان اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، خاص طور سے ہندوپاک کے بریلوی خیالات کے حامی مسلمان۔ کبھی کبھی تناؤ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر صورتحال قابو میں ہے۔ کبھی تشدد کی نوبت نہیں آئی۔ مغربی ایشیا کی سیاست اور وہاں کے مختلف گروپوں اور ملکوں کے درمیان جاری کشمکش کے اثرات آسٹریلیائی مسلمانوں پر صاف نظر آتے ہیں۔ اسکول بھی اس سے نہیں بچ پائے ہیں کیونکہ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو مغربی ایشیا کے ممالک یا اداروں کے تعاون سے قائم ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی سیاست اور نظریات کا ان پر صاف اثر نظر آتا ہے۔

امریکہ اور مغربی یوروپ کی طرح آسٹریلیا میں حلال گوشت حاصل کرنا ایک مسئلہ ہے۔ آسٹریلیا گوشت برآمد بھی کرتا ہے۔ سعودی عرب ایک بہت بڑا گاہک ہے اور وہ چاہتا ہے کہ صرف آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کونسلس ہی یہ سند دے کہ کون گوشت حلال ہے۔ ممکن ہے کہ فیڈریشن کا تصدیق کیا ہوا گوشت ہی سعودی عرب بھیجا جاتا ہو۔ فیڈریشن کے علاوہ دوسرے ادارے بھی ہیں جو حلال گوشت کی تصدیق کرتے یا سند دیتے ہیں۔ بعض غیر مسلم حلال سرٹیفکیٹ کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ایک مخصوص مذہب کی منھ بھرائی ہو رہی ہے۔ حکومت نے اس تنقید کو رد کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کروڑوں ڈالر کے گوشت کی برآمد سے فائدہ ہوتا ہے جو کوئی بھی حکومت نظر انداز نہیں کر سکتی۔

11.7 مسائل ومشکلات

آسٹریلیا میں مسلمانوں کو بعض مسائل کا بھی سامنا ہے۔ مثلاً مسلمانوں میں بے روزگاری دوسری قوموں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ عورتوں کے حقوق کا بھی مسئلہ ہے۔ ''اسلام پسندی'' اور ''اسلامی انتہا پسندی'' بھی مسئلے ہیں۔ بہت سے مبلغین ہیں یا امام ہیں جو کبھی کبھی متنازعہ بیانات جاری کر دیتے ہیں جس سے اعتدال پسند مسلمانوں کے لئے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان اندرونی مسائل کے علاوہ دوسرے مسائل بھی ہیں جن کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔

حالیہ دنوں میں مغربی ایشیا اور دوسرے مسلم ملکوں میں بعض انتہا پسندانہ خیالات رکھنے والی تنظیمیں منظر عام پر آئی ہیں۔ یہ افراد یا تنظیمیں مقامی سطح پر کام کرنے کے بجائے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کر کے اپنے افکار و خیالات کو گلوبل بنانے میں مصروف ہیں۔ یعنی وہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ نوجوان مسلمان ان کے انتہا پسندانہ خیالات و افکار سے متاثر ہو کر ان کے گروپ میں شامل ہوں۔ بدقسمتی سے انہیں یہاں وہاں جزئی کامیابیاں بھی ملی ہیں۔ ان انتہا پسندانہ خیالات کے حامی افراد اور تنظیموں نے آسٹریلیا میں بھی اپنے قدم

جتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی سرگرمیوں سے نہ صرف آسٹریلیا کی حکومت پریشان ہے بلکہ خود وہاں کے مسلمان بھی دل برداشتہ ہیں۔ مسئلے ہر سماج میں ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا کے مسلمان بھی بعض مسائل سے دو چار ہیں اور انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سیاست کے زیر اثر آسٹریلیا بعض ایسے کام بھی کرتا ہے جسے بعض مسلمان پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ خود بھی انتہا پسندانہ خیالات وافکار کے نہ صرف حامی ہو جائیں بلکہ شمشیر برہنہ لے کر میدانِ جہاد میں کود پڑیں۔ جہاد سے قبل اسلام مسائل کے پرامن حل کا حمایتی ہے۔ یہ بات ذہن نشیں رہے تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے آسٹریلیائی مسلمانوں کی بھاری اکثریت امن پسند ہے اور اسلام کی اعتدال پسندی کی اعلیٰ تعلیم سے بخوبی واقف ہے۔

حالیہ سالوں میں آسٹریلیا میں بعض ناخوشگوار واقعات ہوئے ہیں جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک میں بھی نام نہاد ''اسلامی انتہا پسندی'' داخل ہو چکی ہے۔ اس سے نہ صرف حکومت پریشان ہے بلکہ وہاں کے مسلمان بھی پریشانیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ کئی غیر ملکی دہشت گرد تنظیموں نے آسٹریلیا میں اپنی شاخیں قائم کر لی ہیں یا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں پاکستان کی لشکر طیبہ اور مصر کی الجماعۃ الاسلامیہ شامل ہیں۔ کئی افریقی ممالک میں سرگرم الشباب کے بارے میں یقین کیا جاتا ہے کہ وہ آسٹریلیائی سرزمین پر دہشت گردانہ سرگرمیوں میں شامل رہی ہے یا دہشت گردی کا پروگرام بنا رہی ہے۔ احمد نامی ایک شخص نے 2001 میں ایک مختصر عسکریت پسند گروپ بنایا اور لوگوں میں یہ پیغام پھیلانے کی کوشش کی کہ آسٹریلیا میں اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش کرنی چاہیے۔ عبدالناصر بنبیریکا اور خالد چیخو اپنے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ساتھ بالترتیب ملبورن اور سڈنی میں سرگرم تھے یہاں تک کہ پولیس نے انہیں 2005 میں گرفتار کر لیا۔ حکومت کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ خارجی تنظیموں یا افراد کے زیر اثر بعض آسٹریلیائی مسلمان شہریوں نے دہشت گردانہ سرگرمیوں میں شرکت کی ہے۔ اس ضمن میں پولیس بنبیریکا کے علاوہ فہیم خالد لودھی اور جوزف ٹی تھامس کا نام لیتی ہے۔

داعش جو شام اور عراق میں سرگرم ہے، کو آسٹریلیائی حکومت نے دہشت گرد تنظیم قرار دے رکھا ہے۔ حکومت یہ دعویٰ بھی کرتی ہے کہ داعش نے آسٹریلیائی مسلمان نوجوانوں کو بھرتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ حکومت کے افسران دعویٰ کرتے ہیں کہ سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے داعش ان نوجوانوں کو ٹارگیٹ کر رہی ہے جو متاثر ہونے کی عمر میں ہیں اور جنہیں حکومت وسماج سے بعض شکایات ہیں۔ چونکہ ایسے نوجوان داعش کی آواز پر لبیک کہہ سکتے ہیں، اس لیے انہیں ہی ٹارگیٹ کیا جا رہا ہے۔ اور انہیں اس امر پر ابھارا جا رہا ہے کہ آسٹریلیا میں دہشت گردانہ کارروائیاں انجام دیں۔ مئی 2015 میں پولیس نے ملبورن میں بعض نونہالوں کو گرفتار کیا جن میں دو 18 سال سے کم عمر کے لڑکے شامل تھے۔ ان پر یہ الزام عائد ہوا کہ وہ بم پھوڑنے کی سازش کر رہے تھے۔ اس سے قبل جون 2014 میں حکومت نے دعویٰ کیا تھا کہ 150 کے قریب آسٹریلیائی مسلمان داعش کے شانہ بشانہ شام اور عراق میں لڑ رہے ہیں۔ اپریل 2015 میں حکومت نے ایک لسٹ جاری کی جس میں اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ ان میں کئی طلبہ بھی تھے۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ لسٹ میں شامل افراد داعش کے حامی ہیں۔ حکومت نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اب تک بیس آسٹریلیائی مسلمان داعش یا دوسری انتہا پسند تنظیموں کے لئے لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کر چکے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا ہے کہ حکومت نے خاموش آپریشن کے ذریعے 249 نوجوانوں اور دیگر کو جہادی سرگرمیوں میں شامل ہونے سے روک دیا ہے۔ بعض لوگ جو ''جہاد'' کے لیے پہلے شام یا عراق میں موجود ہیں، اب اپنے فیصلے پر افسوس کر رہے ہیں اور وطن لوٹ آنا چاہتے ہیں۔

حکومت کہتی ہے کہ اگر یہ لوگ واپس آئے تو ان پر مقدمہ چلایا جائے گا۔

حکومت آسٹریلیا کو اندازہ ہے کہ مسلمانوں میں مغرب کے خلاف جذبات کیوں پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لندن اور یوروپ کے دوسرے شہروں میں رونما ہونے والے دہشت گردانہ واقعات کے بعد ہی حکومت آسٹریلیا متحرک ہوگئی۔ 2005 میں لندن میں کئی مقامات پر دہشت گردانہ حملے ہوئے۔ اس سے سبق لیتے ہوئے حکومت آسٹریلیا نے فیصلہ کیا کہ مسلم سماج سے قریبی روابط قائم کیے جائیں اور نوجوانوں کو انتہا پسندانہ تنظیموں کے جال میں پھنسنے سے روکا جائے۔ خود مسلمان لیڈروں کو احساس ہے کہ انتہا پسندی غلط ہے نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ سیاسی اعتبار سے بھی کہ اس سے مسلم سماج کا ہی نقصان ہوگا۔ چنانچہ آسٹریلیا کے مسلم لیڈران اور دوسری شخصیات نے انتہا پسندی کی تنقید کرتے ہوئے داعش جیسی تنظیموں کی مذمت کی ہے۔ آسٹریلیا کے شیعہ مسلمان بھی دہشت گردی کے خلاف ہیں۔ فروری 2015 میں آسٹریلین فیڈریشن آف مسلم کونسلس کے سابق صدر امیر علی نے اماموں سے گزارش کی ہے کہ نوجوانوں کو داعش اور دیگر انتہا پسند تنظیموں سے بچانے کی کوشش کریں۔ تعلیم یافتہ مسلمان، ڈاکٹرس، انجینئرس اور دوسرے پروفیشنلس نے بھی اپنے ہم مذہبوں سے کہا کہ وہ خاموش نہ رہیں بلکہ کھلے عام داعش جیسی بربریت انجام دینے والی تنظیموں کا بائیکاٹ کریں۔ کیونکہ ان کے بقول داعش کی سرگرمیاں خصوصاً بربریت کے انداز میں سر قلم کرنا وغیرہ ناقابل برداشت ہیں۔ یہ غیر اسلامی اور غیر انسانی ہیں اور ایسے لوگوں کے خلاف آواز اٹھانا نہ صرف جائز ہے بلکہ یہ مسلم سماج کے حق میں ہوگا کہ ایسے عناصر کا قلعہ قمع کیا جائے۔

اگرچہ خود عام مسلمانوں اور ان کے لیڈروں نے خود کو نہ صرف انتہا پسندانہ خیالات رکھنے والوں سے دور رکھا ہے بلکہ ان کی مذمت کرتے ہوئے آسٹریلیائی مسلمانوں سے رہِ اعتدال پر چلنے کی اپیل کی ہے جو اسلام کا راستہ ہے، مگر اس کے باوجود آسٹریلیا کا دانشور طبقہ اور سیاستداں بشمول حکمرانوں کے، سبھی ایسی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں جیسے سارے ہی مسلمان ''دہشت گردی'' کو جزء ایمان سمجھتے ہیں۔ مئی 2015 میں حکومت نے باقاعدہ اعلان کیا کہ ملک میں پرورش پانے والے دہشت گردوں کے خلاف لڑائی کو جیتنے کے لئے 450 ملین ڈالر مختص کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اخبارات ورسائل میں دانشوروں اور صحافیوں نے ایسے مضامین لکھے یا ایسے خیالات کا اظہار کیا جیسے آسٹریلیا دہشت گردوں کا سب سے بڑا اڈہ ہے۔ حکومت، صحافی اور دانشور بھول گئے کہ ان کے آواز اٹھانے سے پہلے ملک کی مسلم لیڈرشپ اپنے نوجوانوں کو داعش کے جھانسوں میں نہ آنے کا نہ صرف مشورہ دے رہی تھی بلکہ عملاً کوشش بھی کر رہی تھی۔ مگر دانشور اور صحافی ایسے قائدین کو بھی دبے لفظوں میں دھمکی دینے سے باز نہیں آئے۔ جی ہاں دھمکی دی گئی، وہ دھمکی جو مشورے کے انداز میں دی جاتی ہے۔

بالعموم وسیع آسٹریلیائی سماج اور مسلمانوں کے درمیان رشتے اچھے رہے ہیں۔ صورتحال 2001 میں امریکہ کے ٹریڈ سینٹروں پر حملے کے بعد بدلنا شروع ہوئی۔ جارج بش نے جارحانہ مگر احمقانہ پالیسی اختیار کرتے ہوئے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اتنے ہی پر بس نہیں، اس نے ہر اس ملک کو اس جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کیا جو اس کا ہمدرد تھا۔ آسٹریلیا خود ہی بڑھ کر اس جنگ میں شریک ہو گیا جو اس کی جنگ تھی ہی نہیں۔ دراصل آسٹریلیا کی مدد کی امریکہ کو ایسی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغربی ایشیا سے لے کر افغانستان تک امریکہ کی پالیسی ایسی رہی ہے کہ وہ ہزاروں مسلمانوں کو ناراض کرتی ہے۔ ایسا ہی کچھ آسٹریلیا میں بھی ہوا۔ چند لوگوں نے انتہا پسندانہ زبان میں بات ضرور کی مگر آغاز سے ہی ان کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ کوئی بامعنی رول ادا کر سکتے۔ مگر آسٹریلیا کی حکومت نے مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کی

پالیسی جیسے اختیار کرلی جو کسی بھی طرح مناسب نہیں تھی۔ حکومت کے ساتھ میڈیا بھی، مغربی یوروپ اور امریکہ کی نقالی کرتے ہوئے مسلم مخالف ہو گیا۔ 2004 میں کمیشن برائے حقوق انسانی ومساوی حقوق نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کی اس شکایت کا ذکر کیا ہے کہ میڈیا کا رویہ مسلم کمیونٹی کی طرف جارحانہ رہا ہے۔ یعنی غیر آسٹریلیائی مسلمانوں کی دہشت گردی کو یوں بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے جیسے یہی ساری دنیا کے مسلمانوں کا مذہب ہے۔ اسی طرح جرم ایک انفرادی عمل ہوتا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اگر کسی جرم میں ماخوذ ہوا تو اسے میڈیا نے یوں پیش کیا جیسے پوری مسلم کمیونٹی جرائم پیشہ ہے۔ مسلمانوں کو یہ شکایت بھی ہے کہ میڈیا اس قسم کی رپورٹ شائع کر کے وسیع آسٹریلیائی سماج سے انہیں لڑانا چاہتا ہے۔ بعض دانشوروں کا بھی ماننا ہے کہ میڈیا میں مسلم مخالف رجحان پایا جاتا ہے۔ مگر ان کے خیال میں یہ رجحان 1980 کی دہائی کے اواخر میں پروان چڑھنا شروع ہوا جس میں امریکہ پر حملہ کے بعد تیزی آ گئی۔ اپنے مذہب، کلچر اور سماج پر اس بے جا تنقید سے مسلمان بجا طور پر دکھی ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان آسٹریلیا میں اپنی آمد کے وقت سے ہی بعض مراعات سے محروم رہے ہیں۔ دراصل ان کے خلاف امتیازی سلوک برتا جاتا تھا مگر کھلم کھلا نہیں۔ سچائی تو یہی ہے کہ سفید فاموں کی پالیسی غیر سفید فاموں کی طرف جارحانہ ہی رہی ہے اور شروع کے مسلمان بھی غیر سفید فام نسل سے تھے۔ لیکن جب غیر سفید فاموں کو بھی ضرورتاً آسٹریلیا میں آ کر آباد ہونے کی اجازت دی گئی اور سرکار نے مذہبی تکثیریت پر عمل کرنے کی پالیسی کا اعلان کیا تو مسلمانوں کو لگا کہ اب ان کے ساتھ امتیازی سلوک ڈھکے چھپے انداز میں بھی نہیں کیا جائے گا۔ مگر یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف امتیاز جاری رہا اور 9/11 کے بعد اس میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ اسے دھڑلے سے انجام دیا جانے لگا۔ آج یہ صورتحال ہے کہ کبھی کبھی مساجد کی تعمیر سے بھی مسلمانوں کو روکا جاتا ہے۔ اسلامک سائنسز اور ریسرچ اکیڈمی، یونیورسٹی آف ویسٹرن سڈنی نے 2014 میں نیوساؤتھ ویلس کی مساجد کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں یہ انکشاف کیا گیا کہ کم از کم 44 فیصد نئی مساجد تعمیر کرنے کے معاملات میں مسلمانوں کو سفید فاموں کی طرف سے اعتراض اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے 20 فیصد معاملات میں مخالفت کرنے والے معمولی اقلیت تھے۔ لیکن تعمیر مساجد سے روکنا یا اس پر اعتراض کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آسٹریلیا ابھی بھی مکمل تکثیری سماج نہیں بن پایا ہے۔

مشل ہمفرے سڈنی یونیورسٹی کے ماہر سماجیات ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان یہاں ورکنگ کلاس کے طور پر آئے اور اپنی مذہبی و ثقافتی ضروریات کی تکمیل کے لئے مساجد کی تعمیر کی، اور اپنی مذہبی وثقافتی پہچان ہی کو باقی رکھنے کے لئے انہوں نے روزے رکھے، نمازیں پڑھیں اور ان کی خواتین نے حجاب یا اسکارف اپنے سروں پر باندھا۔ مگر آسٹریلیا کا سماج، خاص طور سے سفید فام لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مذہب اور ثقافت پر عمل کرنے کی ضد گویا ملک کے تکثیری سماج کو مسترد کرنے کے برابر ہے۔ ظاہر ہے یہ سفید فاموں کی ایک غلط سوچ ہے۔ ضرورت تھی کہ اس غلط سوچ کو درست کرنے کی تدبیریں کی جاتیں مگر یہاں الٹا مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جانے لگا اور آج ان سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنی مسلمانیت پر ضد نہ کرتے ہوئے وسیع آسٹریلیائی سماج کا حصہ بننے کی کوشش کریں یعنی اپنے شعائر سے دستبردار ہو جائیں۔

اسلام میں عورتوں کے حقوق ایک ایسا مسئلہ ہے جو فہم مغرب کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ رہا ہے۔ خود مسلمانوں میں بعض ایسے رسوم

رائج ہوگئے اور مسلمان ان کی تاریخیت کی وجہ سے انہیں اس طرح اپنائے رکھنے پر بضد ہیں کہ مغرب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان ایسا کیوں کرتے ہیں۔ مثلاً بعض عربوں میں عورتوں کے ختنے کی روایت چلی آرہی ہے۔ یہ نہ قرآن میں مذکور ہے اور نہ ہی سنت میں۔ گویا یہ ایک سماجی روایت ہے وہ بھی بعض عرب ملکوں میں۔ سچائی یہ ہے کہ یہ رسم بڑے محدود پیمانے پر پائی جاتی ہے مگر بعض عرب اس کا یوں دفاع کرتے ہیں جیسے یہ اسلامی رسم ہے۔ ان کی اس حرکت کا فائدہ اٹھا کر آسٹریلیا کے بعض دانشور اور بعض حکومتی افسران بھی اسلام میں عورتوں کے حقوق کو نشانہ تنقید بناتے ہیں۔

بعض باتیں یقیناً ایسی ہیں جن پر مغرب کا اعتراض بے جا ہے۔ مثلاً اگر آسٹریلیا واقعی ایک تکثیری سماج بن گیا ہے تو پھر انہیں یہ ماننا چاہیے کہ ان مسلمان عورتوں کو حجاب پہننے کی اجازت ہے جو پہننا چاہتی ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ کسی پر اپنی فکر تھوپنے کے بجائے لوگوں کو، یہاں تک کہ بے پردہ مسلم خواتین کو بھی بہ طریق احسن اپنے نقطۂ نظر کا قائل بنانا چاہیے۔ اگر مسلمان عورتیں خواتین ڈاکٹروں سے علاج کرانا پسند کرتی ہیں، تو کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے بعض مسلمان خواتین کی کوششوں سے کم از کم موناش اسپتال میں مسلم خواتین کی درخواست پر انہیں خواتین ڈاکٹر ہی دیکھتی ہیں۔ اسی طرح موناش کونسل نے مسلمان خواتین کے لیے یا تو سوئمنگ پول میں وقت مقرر کر دیا ہے یا ان کے لئے علیحدہ انتظام کر دیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ کو مسئلہ بنایا جائے تو وہ ناقابل حل ہی نہیں بلکہ مصیبت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے ایمانداری سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی نہ کوئی واستہ نکل ہی آتا ہے۔

آسٹریلیا میں مسلمان دو درجوں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو حالیہ دنوں میں وہاں آئے ہیں۔ یہ یا تو پہلے سے تعلیم یافتہ تھے یا انہوں نے آکر یہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ زیادہ تر پروفیشنل ہیں۔ آسٹریلیا میں مواقع پا کر یہ لوگ یہیں رک گئے۔ ان کی تنخواہیں ویسی ہی ہیں جیسی دوسروں کی ہیں۔ مگر اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ورکرس یا مزدور کے طور پر یہاں لائے گئے تھے۔ ان کی آمدنی نیشنل اوسط سے کم اور بعض معاملات میں بہت کم ہے۔ قومی سطح پر 11 فیصد غیر مسلم آسٹریلیائی ایک ہفتہ میں ایک ہزار ڈالر یا اس سے زیادہ کماتے ہیں مگر مسلمانوں میں یہ تعداد صرف 5 فیصد ہے۔ امتیازی سلوک بھی محدود پیمانے پر ایک وجہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اصل وجہ وہی ہے کہ ان مسلمانوں کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے جو مزدور کے طور پر یہاں آئے تھے۔ خاص طور سے ایسے ماحول میں جہاں اسلام مخالف جذبات کسی نہ کسی سطح پر پائے جاتے ہیں، وہاں ضروری ہے کہ مسلمان صبر، ہمت اور محنت کو اپنا ہتھیار بنا کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں، بہت سے آسٹریلیائی مسلمان یہ سبق پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کتنے ہی جرائم کی طرف چلے گئے ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کی کئی جیلوں میں مسلمان بھرے پڑے ہیں۔ قومی سطح پر بھی جیل میں ان کا تناسب آبادی میں ان کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض آسٹریلیائی مسلمان کچھ ایسے کام بھی کرتے ہیں جو ان کے لیے ہی نہیں، بلکہ پورے مسلم سماج کے لیے مصیبت کا سبب بنتے ہیں۔ بعض انتہا پسند تنظیمیں اور افراد ہیں مثلاً حزب التحریر وغیرہ۔ یہ لوگ مغربی آسٹریلیا میں بھی آگئے ہیں۔ اسرائیل کی چیرہ دستیاں سب پر واضح ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ آسٹریلیا میں یہودیوں کے خلاف لٹریچر تقسیم کریں، خصوصاً اس وقت جب یہ ملک کی پالیسی کے خلاف ہو۔ ضرورت ہے کہ ایسے بیانات سے بچا جائے، ایسے لٹریچر کی تقسیم سے اجتناب کیا جائے جو تنازعات اور بس تنازعات کو جنم دیتا ہے، ایسے تنازعات جن پر بحث و مباحثہ سے صرف مسلمان قوم کا نقصان ہوتا ہے۔

اگر چہ سفید فاموں نے آسٹریلیا پر قبضہ کرنے کے لئے یہاں کی اصل آبادی ایب اوریجنلس (Aboriginals) کو بڑے پیمانے پر قتل کیا، لیکن اس کے باوجود وہ اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آج بھی انہیں سفید فاموں سے شکایت ہیں، ان کی بعض شکایتیں اسی نوعیت کی ہیں جو مسلمانوں کی ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ بات دونوں قوموں کو قریب لا رہی ہے۔ دراصل ایب اوریجنلس اور مسلمانوں کے درمیان تعلق 18 ویں صدی سے یا شاید اس سے پہلے سے چلا آرہا ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اسلام کے اثرات آسٹریلیا کی اصل مقامی آبادی پر نظر بھی آتے ہیں۔ اس تاریخی تعلق اور موجودہ مشترکہ مسائل کے حوالے سے دونوں گروپ مزید قریب آسکتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ 2011 کی مردم شماری کے مطابق 1140 Aboriginals پہلے ہی یا تو مسلمان ہو چکے ہیں یا اس وجہ سے مسلمان ہیں کہ ان کے آباء واجداد دونوں قوموں سے تعلق رکھتے تھے یعنی باپ مسلمان تھا جس نے مقامی خاتون سے شادی کی جو بعد میں یا شادی کے وقت مسلمان ہو گئی تھی۔ اس تاریخی تعلق کو مزید استوار کرنے سے دونوں ہی کا فائدہ ہوگا۔

معلومات کی جانچ

1- آسٹریلیا میں اسلام کی آمد پر روشنی ڈالئے۔

2- آسٹریلیائی مسلمانوں کے مسائل کیا ہیں؟

3- آسٹریلیائی مسلمانوں کے مسالک اور تنظیموں کی بابت اظہار خیال کیجئے۔

11.8 اسلام نیوزی لینڈ میں

اسلام نیوزی لینڈ میں یوں تو انیسویں صدی میں ہی چند مسلمانوں کی شکل میں آگیا تھا لیکن باقاعدہ طور پر مسلمان بیسویں صدی میں آکر آباد ہوئے۔ 1900 سے 1960 تک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں جنوبی ایشیا سے مسلمان یہاں آکر آباد ہوتے رہے۔ 1970 کے عشرے میں فجی میں رہنے والے ہندستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد یہاں آکر آباد ہوئی۔ 1990 کی دہائی میں بہت سارے ممالک سے مسلمان یہاں آئے، خاص طور سے ان ممالک سے جہاں خانہ جنگیاں جاری تھیں۔ 1959 میں پہلا اسلامی سنٹر قائم ہوا۔ آج کئی اسلامک سنٹر اور مساجد قائم ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔ لیکن شیعہ مسلمان بھی خاطر خواہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ قادیانی بھی ہیں جو خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن خود مسلمان انہیں اسلام سے خارج کرتے ہیں۔ قادیانیوں کو یہاں احمدی مسلمان کہا جاتا ہے۔

1850 کے عشرے میں ہندوستان سے ایک مسلمان خاندان کرائسٹ چرچ میں آکر آباد ہوا۔ یہ غالباً نیوزی لینڈ میں آنے والے سب سے پہلے مسلمان تھے۔ 1874 میں حکومت نے جو مردم شماری کرائی تھی اس میں 15 چینی خاندانوں کا ذکر ملتا ہے جو مسلمان تھے اور سونے کی کانوں میں کام کرنے کی مہارت رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں تین گجراتی مسلمان خاندان یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ادھر ادھر سے بعض دوسرے مسلمان بھی یہاں آئے۔ 1950 کے آتے آتے کافی مسلمان ہو چکے تھے جنہوں نے اسی سال ایک مسلم تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا نام نیوزی لینڈ مسلم ایسوسی ایشن (NZMA) تھا۔ یہ تنظیم آک لینڈ میں 1950 میں قائم ہوئی تھی۔ 1951 میں یوروپ سے 60 کے قریب مسلمان پناہ گزیں کی حیثیت میں آئے جن میں مظہر کراس نقی بھی شامل تھے جو بعد میں نیوزی لینڈ مسلم ایسوسی

ایشن کے صدر بھی ہوئے۔ ان یوروپی اور گجراتی مسلمانوں نے باہم مل کر ایک گھر خریدا اور اسے 1959 میں ایک اسلامک سنٹر میں تبدیل کر دیا۔ 1960 میں گجرات سے یہاں پہلے امام آئے جن کا نام تھا مولانا سعید موسیٰ پٹیل۔ اس کے بعد جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا سے بہت سے طلبا آئے جنہوں نے کئی مساجد اور اسلامک سنٹر قائم کیے۔

اپریل 1979 میں مظہر کراس نقی نے نیوزی لینڈ کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جن کی اکثریت اس وقت ولنگٹن، آک لینڈ اور کینٹر بی میں رہتی تھی۔ ان سارے مسلمانوں نے مل کر فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشن آف نیوزی لینڈ قائم کی۔ مظہر کو ان کی سماجی خدمات کی وجہ سے حکومت نے 2002 میں کوئین سروس میڈل سے سرفراز کیا۔ بعد میں حاجی اشرف چودھری فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔ چودھری صاحب بعد میں نیوزی لینڈ پارلیامنٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے، یہ 1999 کا واقعہ ہے۔

1970 کی دہائی میں فجی سے بڑے پیمانے پر مسلمان نیوزی لینڈ آئے۔ 1987 میں فجی میں پہلا فوجی انقلاب آیا تو بہت سے ہندوستانی نژاد مسلمان نیوزی لینڈ میں آ کر آباد ہو گئے۔ 1990 کی دہائی میں دوسرے جنگ زدہ ممالک سے بھی مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے۔ مثلاً صومالیہ، بوسنیا، افغانستان، عراق اور کوسوو سے۔ ایران سے بھی کچھ مسلمان یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ نیوزی لینڈ کے مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے لیکن شیعہ بھی خاطر خواہ تعداد میں موجود ہیں۔ حالیہ دنوں میں شیعہ حضرات کافی سرگرم ہوئے ہیں اور ہر سال بڑے اہتمام سے عاشورہ مناتے ہیں خاص طور سے آک لینڈ میں۔

مسلمان کل آبادی کا بس 1.2 فیصد ہیں یعنی یہی کوئی 35 سے 37 ہزار تک۔ مسلمان سمجھ دار ہیں اور مقامی آبادی سے مل جل کر رہتے ہیں۔ جب دو اخباروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کارٹون شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں کو دکھ ہوا۔ مسلمانوں نے آک لینڈ میں پر امن مظاہرہ بھی کیا لیکن تشدد سے دور رہے۔ حکومت نے اخباروں پر پابندی تو نہیں لگائی، مگر نہ شائع کرنے کی اپیل ضرور کی۔ ایڈیٹرس نے کسی کی نہ سنی۔ لیکن جب نیوزی لینڈ کے عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی کہا کہ کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہونچانا غلط ہے تو دونوں اخباروں کے ایڈیٹرس نے مسلمانوں سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ میٹنگ میں انہوں نے معافی تو نہیں مانگی لیکن یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے فوٹو نہیں شائع کریں گے۔ مسلمانوں نے مسلم ممالک سے نیوزی لینڈ کی برآمدات کو بائیکاٹ نہ کرنے کی اپیل کی۔ 2006 کی مردم شماری کے مطابق نیوزی لینڈ میں 36072 مسلمان تھے۔ ان کی اکثریت باہر سے آئی ہے لیکن بعض مقامی باشندے بھی مسلمان ہوئے ہیں۔ جو یوروپی نیوزی لینڈر ہیں یا موری عیسائی۔ آج مسلمانوں کی کئی مساجد ہیں اور اسکول اور کالج بھی۔ المدینہ اور زائد کالج مسلمان لڑکیوں کے لیے ہیں۔

مسلمان نیوزی لینڈ میں ایک مہذب، قانون کی پابندی کرنے والے اور امن پسند گروپ کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مل کر انٹر فیتھ ڈائیلاگ کا اہتمام کرتے ہیں تا کہ تمام دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مل جل کر رہ سکیں۔

نیوزی لینڈ میں عیسائی دو مرحلوں میں آئے۔ ایک انیسویں صدی میں برطانیہ سے مفاہمت اور مصالحت ہو جانے کے بعد جس کے نتیجے میں یہ ایک برٹش کالونی بن گیا۔ یہ مغربی یوروپی سفید فام عیسائی ہیں۔ دوسرے مادری یا موری عیسائی ہیں جو یہاں تیرہویں صدی میں آئے تھے۔ ان مادری عیسائیوں میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا ہے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔ مسلمان غیر مسلم اکثریت سے اچھے تعلقات رکھتے ہیں، اور کوئی بھی نیوزی لینڈ کا شہری ان سے شاکی نہیں ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ

آئندہ دنوں میں بھی وہ اپنا بھرپور رول ادا کرتے رہیں گے۔

11.9 خلاصہ

آسٹریلیا ایک بڑا ملک ہے اور وہاں مسلمان بھی نہ صرف بڑی اقلیت ہیں بلکہ ہر طرف نظر بھی آتے ہیں۔ یہ مختلف النسل ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں۔ زبانیں اور کلچر مختلف ہیں۔ نیوزی لینڈ کے مسلمان بھی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر ان میں بڑا بھائی چارہ پایا جاتا ہے۔ مسلمان اگر سمجھ بوجھ سے کام لیں اور ملک کی ترقی میں contribution دینے والے بن جائیں تو اس براعظم میں مسلمانوں کا مستقبل بہت تابناک ہے۔

11.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1- آسٹریلیا میں مسلمان کب آئے اور کیسے آباد ہوئے۔

2- آسٹریلیائی مسلمانوں کے مسائل سے بحث کریں۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3- آسٹریلیائی مسلمانوں میں انتہا پسندی کیوں آ رہی ہے۔

4- نیوزی لینڈ میں اسلام کب آیا اور آج وہاں مسلمانوں کی صورتحال کیسی ہے۔

11.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- ثروت صولت: مسلمان اقلیتیں

2- آباد شاہ پوری: روس میں مسلمان قومیں

3- M. Ali Kettani: Muslim Minorities in the World Today

4- Sulayman Nyang: Islam in the United States of America

5- Yuonne Yezbeck Haddad & Jane I Smith: Muslim Minorities in the West

بلاک: 3 مسلم تحریکات اور ادارے

فہرست

اکائی 12 : وہابی تحریک، سنوسی تحریک، نورسی تحریک، الاخوان المسلمون

اکائی کے اجزاء

12.1 مقصد

اس اکائی میں عالم اسلام خاص طور پر مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی چار بڑی تحریکات یعنی وہابی تحریک، سنوسی تحریک، نورسی تحریک اور الاخوان المسلمون کا تعارف کرایا جائے گا۔ یہ تحریکات اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے اہم اس لیے ہیں کہ انہوں نے اپنے اپنے علاقوں کے مسلمانوں کی مذہبی و سماجی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں اور جدید مسلم دنیا میں اپنے اپنے خطوں میں ان کے پیروکاروں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ایک سنوسی تحریک کو چھوڑ کر بقیہ تینوں تحریکیں آج بھی فعال و متحرک ہیں اور اپنے اثر و نفوذ کو وسیع کرنے کے منصوبے اور پروگرام بھی رکھتی ہیں۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طالب علم مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے مذہبی و سماجی تانے بانے اور اس میں مذہبی تحریکات کے کرادر کو سمجھنے کا اہل ہو سکے گا۔

12.2 تمہید

جدید مسلم دنیا کی مذہبی تحریکات اور اداروں کا مطالعہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ ان کے مطالعے سے ہمیں ان تحریکات کے اثر والے علاقوں کے مذہبی و سماجی اور اکثر سیاسی و معاشی حالات کو جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس اکائی کے تحت جن چار بنیادی طور پر مذہبی تحریکات کا مطالعہ کیا جائے گا، اگر غور سے دیکھا جائے تو ماضی قریب کے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کی تشکیل جدید میں ان کا کلیدی رول رہا ہے۔ وہابی تحریک سعودی عرب اور خلیجی عرب ممالک کے سماج و سیاست میں بھی گہری جڑیں رکھتی ہے اور بظاہر مذہبی ہونے کے باوجود عرب سیاست

سے اس کا گہرا تعلق روز اول سے رہا ہے۔ سنوسی تحریک نے ایک صوفی تحریک ہونے کے باوجود لیبیا کی آزادی اور تشکیل میں جو اہم رول ادا کیا اسے شمالی افریقہ کی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے، ترکی کی نورسی تحریک ایک ایسے صوفی منش مذہبی رہنما سے منسوب ہے جس نے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود ترکی کی مذہبی نشاۃ ثانیہ میں اہم رول ادا کیا۔ الاخوان المسلمون کے بارے میں صرف یہ کہنا ہی کافی ہے کہ نسبتاً نوخیز ہونے کے باوجود اور مسلسل اتار چڑھاؤ کا شکار رہنے کے بعد بھی یہ تحریک عالم عرب کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم تحریک ہے اور عربوں کی نئی تعلیم یافتہ نسل پر اس کے غیر معمولی اثرات ہیں۔

12.3 وہابی تحریک

12.3.1 پس منظر اور آغاز وارتقاء

عربوں کی جدید تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ان کی جدیدیت اور مذہبیت دونوں میں دو عناصر کا رول بہت اہم رہا ہے۔ ان میں پہلا عنصر خارجی نوعیت کا تھا یعنی مصر، جسے عرب دنیا کا دروازہ بھی کہا جاتا ہے، پر فرانسیسی حکمران نپولین کا حملہ اور قبضہ، گو یہ قبضہ بہت ہی مختصر عرصے کے لیے رہا لیکن عرب دنیا اور خاص طور پر مصر پر اس کے اثرات بہت ہی دوررس مرتب ہوئے۔ مصر پر نپولین کے حملے اور قبضے کے نتیجے میں عرب دنیا کے لوگ ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن سے متعارف ہوئے، انہیں نئے نئے علوم وفنون کا پتہ چلا اور وہ مغرب کی جدید ترقیات سے پہلی مرتبہ روشناس ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر پر نپولین کے حملے کو جدید عرب دنیا کے آغاز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مصر پر نپولین کے حملے نے عرب دنیا میں جدید علوم وفنون، مغربی افکار وخیالات، یورپی تہذیب وتمدن اور نئی ترقیات کے دروازے کھول دیے اور اس طرح عرب اس حوالے سے اپنی تاریخ کے جدید دور میں داخل ہوئے۔

دوسرا عنصر جس نے جدید عرب دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ایک مذہبی تحریک تھی اور یہ کہیں باہر سے درآمد نہیں کی گئی تھی بلکہ اس کے برپا ہونے کے حالات اور اسباب خود عرب دنیا کے اندر موجود تھے گویا یہ ایک اندرونی تحریک تھی۔ دنیا اسے وہابی تحریک کے نام سے یاد کرتی ہے یعنی ایک ایسی تحریک جس کا آغاز عرب دنیا کے ایک بڑے مذہبی رہنما، مبلغ، داعی اور مصلح محمد بن عبدالوہاب کی کوششوں سے ہوا۔ محمد بن عبدالوہاب کے نام کی نسبت سے ہی یہ وہابی تحریک کہلاتی ہے۔ البتہ محمد بن عبدالوہاب کے پیروکار اسے وہابی تحریک کا نام دینا پسند نہیں کرتے۔ اس تحریک کو وہابی تحریک کا نام انگریزوں کا دیا ہوا ہے اور اسے اس تحریک کے مخالفین یا یورپی مصنفین استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دیگر مقامات پر بھی انگریز مخالف مذہبی تحریکات کو خاص طور پر ہندوستان میں تحریک شہیدین کو بھی انگریزوں نے وہابی تحریک کا نام دے دیا حالانکہ ان کا محمد بن عبدالوہاب کی مذہبی تحریک سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس تحریک (وہابی تحریک) کے پیروکار اپنے لیے موحد یا سلف کا نام استعمال کرتے یا پسند کرتے ہیں۔ یہ سنی مسلمان ہیں اور امام احمد بن حنبل کے مسلک کی اس تشریح کے مطابق پیروی کرتے ہیں جو امام ابن تیمیہ نے کی ہے۔ اور جس کی دعوت محمد بن عبدالوہاب نے دی ہے۔ چونکہ اس تحریک کا یہی نام زیادہ رائج اور استعمال میں ہے اس لیے یہاں بھی اس کا تعارف وہابی تحریک کے نام سے ہی کرایا جارہا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کے زمانے میں، جیسا کہ ہم ان کے حالات میں پڑھیں گے، عرب دنیا کے حالات خاص طور پر نجد وحجاز کی

صورت حال بہت ہی خراب تھی ۔سیاسی طور پر یہ انتشار وافتراق کا شکار تھے ۔عثمانی حکومت کا اقتدار اعلیٰ ان پر برائے نام ہی قائم تھا اور سیاسی تنظیم نام کی کوئی چیز یہاں پر نہ تھی ۔ ہر قبیلے اور علاقے کا سردار اپنے آپ میں ایک حکمراں ہوا کرتا تھا، لوٹ مار اور آپسی جنگ عام تھی، امن و قانون نام کی کوئی چیز یہاں پر باقی نہ رہ گئی تھی بلکہ بعض لوگوں کے خیال میں عرب ایک بار پھر قبل از اسلام دور جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے ۔ یہ زوال سیاسی زندگی میں ہی نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں عرب دنیا کے سماجی و مذہبی حالات بھی انتہائی خراب ہو چکے تھے ۔ مذہب کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو اسلام کی سادہ اور توحید پر مبنی تعلیمات پر رسوم ورواج اور بدعات وخرافات کی گرد اتنی موٹی پڑ گئی تھی کہ اصل اسلامی تعلیمات کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں چلتا تھا ۔عملاً بت پرستی تو نہیں ہوتی تھی لیکن رسم ورواج کے نام پر جو کچھ رائج تھا اسے بت پرستی کے شائبہ سے خالی بھی نہیں قرار دیا جاسکتا ۔زیارت قبور کے نام پر قبر والوں سے ہی تمام حاجات وضروریات کے پورا ہونے کی امید کی جاتی تھی، ان پر چڑھاوے اور نذرانے چڑھائے جاتے تھے ۔درختوں تک کو تقدس اور احترام کا درجہ دے دیا گیا تھا اور ان مقامات پر جا کر طرح طرح کی رسمیں مذہب کے نام پر ادا کی جاتی تھیں ۔غرض مذہب اسلام اپنی اصل تعلیمات سے دور رسوم ورواج اور بدعات کا ایک ایسا ملغوبہ بن گیا تھا جس میں مذہب کی کچھ ظاہری چیزیں تو ضرور باقی تھیں لیکن ان میں سے اس کی روح نکال دی گئی تھی ۔

12.3.2 بانی تحریک

وہابی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب 1703ء میں جزیرہ نمائے عرب کے مرکزی علاقے نجد کے ایک گاؤں عیینہ میں پیدا ہوائے ۔ان کا تعلق قبیلہ بنوسنان سے تھا جو بنوتمیم کی ایک شاخ ہے ۔ان کا خاندان مذہبی علماء کا خاندان تھا اور عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ۔عیینہ میں ہی محمد بن عبدالوہاب نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے مکہ اور مدینہ کا سفر کیا ۔مدینہ میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد محمد بن عبدالوہاب نے عرب، عراق اور ایران کے علاقوں کا دورہ کیا تا کہ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو جائیں ۔اس کے بعد انہوں نے عیینہ سے ہی اپنی دعوت اصلاح کا آغاز کیا اور خاص طور پر پختہ قبروں پر ادا کی جانے والی رسوم اور بدعات کو انہوں نے نشانہ بنایا البتہ انہیں عیینہ میں زیادہ کامیابی نہیں ملی اور انہیں یہ جگہ چھوڑنی پڑی ۔

عیینہ چھوڑنے کے بعد محمد بن عبدالوہاب درعیہ آ گئے جہاں اس کے امیر محمد بن سعود نے ان کا خیر مقدم کیا اور بہت جلد درعیہ کی پوری آبادی ان کی ہم خیال اور ان کی کوششوں میں معاون بن گئی ۔اس طرح درعیہ میں محمد بن عبدالوہاب کو سیاسی اور عوامی دونوں طرح کی حمایت حاصل ہوئی جو آئندہ ان کے دعوت واصلاح کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں کافی معاون ثابت ہوئی ۔ایسا لگتا ہے کہ محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب دونوں کو اپنے اپنے مقاصد اور عزائم پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کی ضرورت تھی لہٰذا دونوں کے درمیان ایک طرح کا خاموش اور غیر تحریری معاہدہ ہو گیا جس کے تحت محمد بن سعود کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے محمد بن عبدالوہاب کے مذہبی طبقے کی حمایت کی یقین دہانی کرائی گئی، اسی طرح مذہبی معاملات میں محمد بن عبدالوہاب کو محمد بن سعود کا سیاسی وفوجی تعاون حاصل ہوا ۔ یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس پر آل سعود (محمد بن سعود کے سیاسی ورثاء وجانشین) اور آل شیخ (محمد بن عبدالوہاب کے مذہبی ورثاء وجانشین) اس وقت سے لے کر آج تک قائم ہیں اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی حدود کا خیال رکھتے ہیں ۔

اس طرح محمد بن عبدالوہاب نے محمد بن سعود (اور بعد میں ان کے بیٹے عبدالعزیز) کے سیاسی اقتدار میں اپنی دعوت اصلاح کا آغاز کیا

اور آل سعود کے زیر اقتدار علاقوں میں اسے پھیلانے میں کامیاب رہے۔ بعد میں ان کے جانشینوں نے بھی اس کام کو جاری رکھا تا آں کہ ان کی دعوت ایک بڑی تحریک میں تبدیل ہوگئی اور جسے دنیا وہابی تحریک کے نام سے جانتی ہے۔ 1792ء میں محمد بن عبدالوہاب کا 89 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ البتہ اپنی زندگی میں ہی وہ اپنی دعوت اور مشن کو گہری بنیادیں فراہم کرنے میں کامیاب رہے۔

12.3.3 وہابی تحریک کی دعوت

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا سب سے بنیادی اور اہم عنصر توحید ہے۔ انہوں نے اپنے ماحول میں یہ دیکھا اور پایا کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ توحید کی اصل حقیقت لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں دونوں میں سب سے زیادہ زور عقیدہ توحید پر دیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں یہ توحید کا عقیدہ ہی ہے جو لوگوں کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ اس دنیا میں ان کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ یہ عقیدہ ہی انہیں بتاتا ہے کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والی ذات اکیلی اور تنہا خدا کی ذات ہے۔ اس خدا کا کوئی بھی کام ہو، وہ کوئی بھی فیصلہ کرنا چاہے کسی کی مجال نہیں کہ اس کے فیصلے اور کام کو متاثر کر سکے۔ یعنی دنیا کی کوئی طاقت وقوت نہیں جو اس کے کاموں اور فیصلوں میں شریک ہو۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ کی ذات قادر مطلق ہے وہ جس کو چاہے جب اور جتنا نواز دے اور چاہے تو کسی کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ کرے۔ انہوں نے کہا کہ خدا کی مخلوق میں کوئی بھی شے اس لائق نہیں ہے کہ اس کی پرستش اور پوجا کی جائے، صرف اس کی ذات ہے جس کی ہمیں عبادت کرنی چاہیے، جس کے سامنے ہمیں اپنا سر جھکانا چاہیے، جس سے کہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے پورا ہونے کی امید رکھنی چاہیے۔ کوئی دوسرا نہیں جس کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ یہی وہ تعلیم ہے جس سے قرآن مجید کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو دعوت دی کہ اللہ کے علاوہ چیزوں کی عبادت کو چھوڑ کر صرف ایک خدا کی بندگی میں داخل ہو جائیں۔

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس بات پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ عقائد واعمال کی تشریح صرف اور صرف خدا کا حق ہے۔ ان کے مطابق جن عقائد کو تسلیم کرنا اور جن اعمال کو کرنا ہے، انہیں اللہ تعالی نے قرآن میں اور اپنے رسول کے ذریعہ بیان کر دیا ہے، قانون سازی صرف اور صرف خدا کا حق ہے، کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے معاملات میں مداخلت کرے یا اس کے فیصلوں میں کسی طرح کا تغیر یا تبدیلی کرے۔ ان کے مطابق عقائد کے حوالے سے متکلمین کی موشگافیاں یا قانون سازی کے حوالے سے فقہا کی رائیں ہمارے لیے آخری حجت اور دلیل نہیں بن سکتیں۔ آخری فیصلہ اللہ کی کتاب اور سنت رسول کو کرنا ہے (حالانکہ اس پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت کی کس تعبیر وتشریح کو حتمی مانا جائے) اور وہی ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔ ان کے مطابق ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق قرآن وسنت سے استفادہ کر سکتا ہے اور دین پر عمل بھی کر سکتا ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں موجود بدعات وخرافات کے خاتمے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور اس حوالے سے کئی بار ان کا اور ان کے متبعین کا رویہ انتہا پسندانہ بھی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے قبروں کو پختہ کرنے اور ان پر شاندار مقبرے تعمیر کرنے کے خلاف تحریک چلائی۔ انہوں نے استعانت (مدد چاہنے) کی غرض سے قبروں کی زیارت سے منع کیا، اسی طرح انہوں نے قبروں کے اطراف کو بطور مسجد استعمال کرنے سے بھی منع کیا۔ ان کے زمانے کے نجد وحجاز میں ایسے بہت سے درخت تھے جنہیں مذہبی

تقدس کا لبادہ پہنا دیا گیا تھا انہوں نے ان درختوں کو کاٹ دینے اور پختہ قبروں کو منہدم کر دینے کے لیے تحریک چلائی اور جہاں جہاں انہیں موقع ملا انہوں نے خود ان کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح ان پر اور ان کے متبعین پر یہ الزام بھی ہے کہ انہوں نے بہت سی ان کتابوں کو جلانے کا حکم دیا جو ان کے خیال میں بدعات و خرافات کے فروغ میں معاون تھیں۔

12.3.4 محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا اثر

محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ہم یہ جان چکے ہیں کہ ان کا تعلق نجد کے علاقے سے تھا اور درعیہ کے حکمراں خاندان، جو بعد میں آل سعود کے نام سے مشہور ہوا، سے انہیں ان کی تحریک کے فروغ میں بھرپور تعاون ملا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی دعوت بہت جلد نجد کے علاقے میں پھیل گئی۔ حالانکہ نجد کے اندر بھی ابتدائی دور میں انہیں مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ انہیں عیینہ چھوڑ دینا پڑا۔ البتہ درعیہ پہنچنے کے بعد محمد بن سعود کی حمایت اور سیاسی پشت پناہی نے ان کی دعوت کے لیے ان تمام علاقوں میں راستہ ہموار کر دیا جو ابن سعود کے زیر تسلط آتے گئے۔ محمد بن سعود کو اس سیاسی حمایت اور پشت پناہی کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی حکومت کو ہر جگہ مذہبی اعتبار حاصل ہوتا گیا۔ محمد بن سعود اور محمد بن عبدالوہاب کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا، اور جس پر سعودی عرب میں آج تک عمل جاری ہے، اس کی رو سے محمد بن سعود محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کو سیاسی طاقت کے ذریعہ آگے بڑھائیں گے، ضرورت پڑنے پر وہ اس کی توسیع اور دفاع کے لیے فوجی طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ اس کے بدلے محمد بن عبدالوہاب نہ صرف یہ کہ ان کی حکومت کو مذہبی اعتبار عطا کریں گے بلکہ اپنی دعوت کے ذریعہ اس کی توسیع میں معاون ہوں گے۔ معاہدے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ سیاسی اختیارات و معاملات محمد بن سعود اور ان کے خاندان کے حوالے رہیں گے جب کہ عوام کی مذہبی اور سماجی نگرانی محمد بن عبدالوہاب اور ان کے خاندان کے لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی۔

اس معاہدے کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت جلد محمد بن عبدالوہاب کی دعوت ان تمام علاقوں میں پھیل گئی جو آل سعود کے زیر اقتدار آتے گئے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں جب موجودہ سعودی عرب کی تشکیل عمل میں آئی تو اس وقت بھی سرکاری طور پر محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کی حمایت جاری رہی۔ آج سعودی عرب وہابی تحریک کے سب سے بڑے مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے اس کے علاوہ خلیج کے دوسرے ملکوں میں بھی سعودی اثرات کے سبب وہابی تحریک کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔ اس تحریک کے پیروکار بڑی تعداد میں خلیجی ملکوں کے علاوہ عرب دنیا کے دیگر ملکوں شام، مصر اور عراق میں بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں اس تحریک کی وجہ سے عرب دنیا میں مذہبی بحث و مباحثے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری کے بعد سے عربوں میں ایک طرح کا جو فکری جمود آ گیا تھا، اس تحریک نے اس فکری جمود پر پڑی برف کو پگھلانے کا بھی کام کیا۔ اس کی وجہ سے عربوں کے اندر مذہبی و فکری بے داری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی۔ اور سعودی عرب کو تیل کی فراہمی سے ہونے والی بے پناہ آمدنی کے بعد اس کی سرپرستی میں دیگر ملکوں میں بھی اس کے اثرات بڑھے ہیں، اسی طرح سعودی عرب کی جانب سے فراہم کردہ دعاۃ نے بھی وہابی تحریک کی اشاعت میں اہم رول ادا کیا ہے۔

12.4 سنوسی تحریک

انیسویں صدی عیسوی میں جب کہ عالم اسلام کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ مسلمانوں کا یہ زوال صرف سیاسی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ

مسلم سماج کی مذہبیت اور روحانیت بھی زوال پزیر تھی۔ان حالات میں مسلم دنیا میں تجدید واصلاح کی مختلف کوششیں مختلف علاقوں میں مختلف سطحوں پر ہوئیں۔ان میں کئی کوششیں ایسی تھیں جنھوں نے آگے چل کر ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اپنے اپنے حلقوں میں دیرپا اثر کی حامل قرار پائیں۔ان تحریکات میں ایک اہم تحریک شمالی افریقہ کی سنوسی تحریک تھی،جس کا بظاہر آغاز تو عالم عرب سے ہوا لیکن اس کا اصل دائرہ کار شمالی افریقہ کا ملک لیبیا اور خاص طور پر اس کے جنوبی صحرائی علاقے تھے جہاں اس تحریک کے لوگوں نے مسلمانوں میں تجدید واصلاح کے کام کے ساتھ ساتھ صحرائی غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا کام بھی کیا۔گو یہ تحریک اپنی ابتدا میں خالص مذہبی نوعیت کی تھی لیکن بہت جلد اس نے سماجی اور پھر ایک سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور لیبیا کی جدوجہد آزادی میں اپنے رہنماؤں اور کارکنوں کے کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ یادرکھی جائے گی۔

12.4.1 پس منظر اور آغاز وارتقاء

شمالی افریقہ،جس میں لیبیا بھی شامل ہے،میں اسلام کی دعوت اسلام کی پہلی صدی یعنی ساتویں صدی عیسوی میں ہی پہنچ چکی تھی۔ عربوں نے اس علاقے کو صرف فتح ہی نہیں کیا بلکہ یہاں اسلام کو پھیلایا بھی جس کی وجہ سے یہ پورا علاقہ ایک طویل عرصے کے لیے عدل و انصاف اور امن وسلامتی کا گہوارہ بن گیا۔مقامی آبادی کے علاوہ بڑی تعداد میں عرب بھی جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر یہاں آ کر آباد ہوگئے۔کہا جاتا ہے کہ اس علاقے میں عربوں کی آبادی میں اضافہ بارہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔عباسیوں کے زوال کے ساتھ ان علاقوں کا اقتدار بھی کمزور پڑتا گیا یہاں تک کہ سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں عثمانیوں نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔یہاں سیاسی اقتدار تو مسلمانوں کا مستحکم ہوگیا البتہ مذہبی وسماجی زوال کا سلسلہ جاری رہا اور قبائلی عوام دھیرے دھیرے مذہب سے دور ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ مذہب کے نام پر بدعات وخرافات کا چلن عام ہوگیا۔مسلمان ہونے کے باوجود بعض قبائل میں بت پرستی عام ہوگئی تھی۔ارکان اسلام کا لوگوں کے اندر پاس ولحاظ باقی نہ رہا تھا۔حج کے لیے مکہ معظمہ جانے کے بجائے وہ اپنے علاقے کے بعض مشہور مقامات کی زیارت کو حج کا بدل سمجھتے تھے۔اسی طرح بعض قبائل روزہ سے اس طرح جان چھڑا لیتے تھے کہ ان کے تیس صحت مند نوجوان ایک ہی دن روزہ رکھ چھوڑتے اور یہ سمجھ لیا جاتا کہ پورے قبیلے کی جانب سے تیس روزے پورے ہوگئے۔اسی طرح قبائل کے درمیان لوٹ مار اور قتل وغارت گری عام تھی۔شمالی افریقہ خاص طور پر لیبیا کے یہ حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ مذہب اسلام،جس سے کہ توحید کا چشمہ صافی پھوٹتا ہے،کو باہر سے درآنے والی خرابیوں اور برائیوں سے پاک کیا جائے اور اسلام کی خالص توحید پرمبنی تعلیمات کو لوگوں میں عام کیا جائے۔تجدید واصلاح کا یہ کام جس شخصیت کے حصے میں آیا وہ کوئی اور نہیں محمد بن علی سنوسی تھے جنہیں سنوسی کبیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

محمد بن علی سنوسی نے اصلاح احوال کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ روحانیت اور عملیت کا ایک حسین امتزاج تھا۔انہوں نے اس پورے علاقے میں صوفی خانقاہوں کی طرز پر سنوسی زاویے تعمیر کیے۔بظاہر روحانی مذہبی تعلیم کے یہ مراکز فی الحقیقت دعوت واصلاح کے مراکز تھے اور ان کے ذریعہ لیبیا میں اصلاح ودعوت کا وہ عظیم کام انجام پایا کہ جس نے لیبیا کے عوام میں مذہبی بے داری کے ساتھ ساتھ سیاسی بے داری بھی پیدا کی اور ان کی قیادت میں انہوں نے مغربی استعماری طاقتوں کا خوب جم کر مقابلہ کیا اور بالآخر لیبیا کو سیاسی آزادی ملی۔سنوسی دعوت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے افریقہ کے نیم وحشی قبائل کے اندر بھی اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔وہ

لوگ ضلالت وگمراہی کی جس تاریکی میں بھٹک رہے تھے اس سے انہیں نکال کر ایمان ویقین کی روشنی میں لے آئے۔ان کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا کہ وہی لوگ جو کچھ عرصہ پہلے تک ہر طرح کی برائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور انسانیت ایسا لگتا تھا کہ جنہیں چھو کر بھی نہیں گزری ہے،اسلام کی برکت سے اور سنوسی زاویوں کی کوششوں سے نیکی اور خیر وفلاح کی طرف دعوت دینے والے بن گئے۔وہ لوگ کہ جو علم سے بالکل ہی بے بہرہ تھے،ان میں تعلیم عام ہوگئی اور ان کے اندر باعمل علماء پیدا ہونے لگے۔یہ سنوسی زاویوں کی کوشش اور برکت ہی تھی کہ وہ علاقہ جہاں امن وامان نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی،لوٹ مار اور چوری وڈاکہ زنی جہاں عام تھی،وہاں پر اب ہر طرف امن وامان تھا، لوگوں کے پاس کام تھا اور ہر طرف خوش حالی تھی۔

12.4.2 بانی تحریک: محمد بن علی سنوسی

سنوسی تحریک کے بانی شہرہ آفاق عالم اور مصلح محمد بن علی سنوسی ہیں،جنہیں شمالی افریقہ کے عوام اور سنوسی حلقوں میں 'سنوسی کبیر' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔وہ الجزائر کے ساحلی شہر مستغانم کے ایک محلے الواسطیہ میں 22 دسمبر 1787ء کو پیدا ہوئے۔ان کا گھرانہ اپنے علم و فضل کی وجہ سے معروف تھا اور شجرہ نسب مراکش کی ادریسی حکومت کے بانی ادریس بن عبداللہ الکامل کے واسطے سے اللہ کے رسولؐ سے جاملتا ہے۔سنوسی کی نسبت کے بارے میں دو رائیں ہیں ایک یہ کہ سنوس نام کے قبیلے سے تعلق تھا اس لیے سنوسی کہلائے اور دوسری یہ کہ ان کے خاندان میں ایک بزرگ محمد بن یوسف بن عمر بن شعیب سنوسی گزرے ہیں اور انہیں کی نسبت سے سنوسی کہلاتے ہیں۔صرف دو برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا،پرورش اور تعلیم وتربیت چچی سیدہ فاطمہ نے کی۔بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور مقامی علماء وفقہا سے تفسیر، حدیث،فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔بعدازاں فاس کی مشہور جامعہ قزوین میں داخلہ لیا اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کی۔یہیں پر انہوں نے طریقت (تصوف) کے آداب بھی سیکھے۔تعلیم سے فراغت کے بعد تقریباً چودہ برس تک جامعہ قزوین میں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ 1825ء میں انہوں نے مصر وحجاز کا رخ کیا تا کہ وہاں کے علماء سے مزید استفادہ کریں،حالانکہ اس وقت تک وہ خود بھی ایک ممتاز عالم کے طور پر شمالی افریقہ میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔چونکہ محمد بن علی سنوسی تعلیم اور مذہب کے حوالے سے اجتہادی نقطۂ نظر کے حامل تھے وہ ازہر کے مروجہ نظام تعلیم کو اصلاح طلب سمجھتے تھے نیز مذاہب اربعہ میں کسی ایک کی تقلید ضروری نہیں خیال کرتے تھے،اس لیے ازہری علماء نے انہیں مصر میں پریشان کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے وہ مصر چھوڑ کر حجاز چلے گئے،وہاں کے ممتاز علماء سے استفادہ کیا اور یہاں پر انہوں نے 1837ء میں مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں اپنے پہلے تعلیمی واصلاحی مرکز یعنی زاویے کی بنیاد ڈالی۔محمد بن علی سنوسی کا یہ زاویہ خانہ کعبہ سے قریب جبل ابوقبیس پر واقع تھا اسی لیے سنوسی حلقوں میں زاویہ ابی قبیس کے نام سے مشہور ہے۔اس زاویے سے محمد بن علی سنوسی نے جس علمی واصلاحی کام کا آغاز کیا آگے چل کر اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور سنوسی یا سنوسیہ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔وہ اس زاویے میں اپنے طالب علموں کو اسلام کے اوامر ونواہی کی پابندی کی تلقین کرتے اور ان سے مطالبہ کرتے کہ اپنی صفوں میں اتحاد واتفاق کو قائم رکھیں۔

1840ء میں سنوسی کبیر نے زاویہ ابی قبیس کا انتظام اپنے ایک بااعتماد شاگرد کے حوالے کیا اور خود لیبیا کے لیے روانہ ہوئے تا کہ اپنے دعوتی واصلاحی کام کو وہاں فروغ دے سکیں۔یہاں پر انہوں نے البرقہ (ایک جگہ کا نام) کے قبائل کی درخواست پر جبل اخضر پر ایک تعلیمی و اصلاحی مرکز قائم کیا،اس کا نام انہوں نے زاویہ البیضاء رکھا۔یہ لیبیا میں قائم ہونے والا پہلا سنوسی زاویہ تھا اور سنوسی زاویوں کی تاریخ میں اہم

الزوایا کے نام سے جانا جاتا ہے۔اور یہاں سے لیبیا اور افریقہ کے دوسرے علاقوں میں سنوسی دعوت وتحریک کوفروغ ملا۔اس زوایے کا افریقہ کے اندر مسلمانوں کی اصلاح اور اسلامی تعلیمات کے فروغ میں بہت ہی اہم رول رہا ہے۔کیونکہ اس کے بعد صرف لیبیا میں ہی نہیں بلکہ مصر، سوڈان، حجاز، شام، انڈونیشیا اور ترکی تک ہر جگہ سنوسی زاویوں کا گویا ایک جال سا پھیل گیا۔

1846 میں محمد بن علی سنوسی حج کے ارادے سے دوبارہ حجاز کے لیے عازم سفر ہوئے، اس بار حجاز میں ان کا قیام 1853ء تک تقریباً سات برس رہا البتہ اس دوران بھی ان کا رابطہ افریقہ میں سنوسی کارکنان سے رہا کبھی خط وکتابت کے ذریعہ اور کبھی حج پر آنے والے سنوسی اخوان کے ذریعہ۔1854ء میں سنوسی کبیر برقہ واپس لوٹ آئے یہاں انہوں نے ایک دوسرا زاویہ العزیات کے نام سے قائم کیا، اور یہیں پر خود بھی قیام کیا۔رفتہ رفتہ اس کی شہرت بھی پھیل گئی اور لوگ دور دراز سے آکر یہاں آباد ہونے لگے یہاں تک کہ یہ ایک بڑی آبادی بن گئی۔صرف تین چار برس کے عرصے میں ہی تقریباً پورے صحرائے لیبیا کے قبائل ان کے مرید بن گئے۔ان کے خلفا اور داعیوں نے ان کے اندر کتاب وسنت پر عمل کی تحریک کو بڑھاوا دیا۔محمد بن علی سنوسی کی روز افزوں مقبولیت نے سیاسی حلقوں میں بھی بے چینی پیدا کردی، اس لیے انہوں نے مناسب خیال کیا کہ اپنا مرکزی زاویہ کسی ایسی جگہ قائم کریں جہاں عثمانی حکومت کا رسوخ کم سے کم تر ہو، اس کے لیے صحرائے لیبیا کے اندر جغبوب کا مقام انہیں مناسب لگا چنانچہ 1856ء میں وہ جغبوب منتقل ہوگئے اور وہاں ایک عظیم الشان زاویہ قائم کیا۔اور پھر اندرون صحرا زاویوں کا ایک سلسلہ پھیلا دیا جس کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات اور ان کی برکات سے یہ پورا علاقہ منور ہوگیا۔انہوں نے صحراء کے اندر اپنی دینی دعوت اور اخوان کی جسمانی مشقت سے ایسا نظام قائم کیا کہ جہاں زندگی انتہائی مشکل ہوا کرتی تھی وہاں پر ہر طرف ہریالی وخوش حالی نظر آنے لگی۔جغبوب منتقل ہونے کے تھوڑے دنوں بعد ہی سنوسی کبیر کی طبیعت ناساز رہنے لگی اور 7 ستمبر 1859ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔جغبوب کی جامع مسجد کے برابر سپرد خاک ہوئے۔

اصلاحی کاموں اور روحانی تربیت کے ساتھ محمد بن علی سنوسی کو تصنیف وتالیف سے خاص شغف تھا اور مختلف موضوعات پر ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات کی تعداد 60 تک بتائی جاتی ہے۔ان کی آٹھ کتابوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''المجموعۃ المختارۃ'' کے نام سے 1968ء میں بیروت سے شائع ہوا ہے۔

12.4.3 زاویوں کی ہیئت ترکیبی ونظام

اوپر بار بار زاویہ کا ذکر آیا ہے۔طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ زاویہ ہے کیا چیز؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اس کی ہیئت اور نظام کا ذکر کردیا جائے۔

سنوسی زاویہ عام طور پر ایک زرخیز قطعہ زمین میں قائم کیا جاتا اور اس میں درج ذیل عمارتیں ہوتی تھیں:

1- مسجد: یہ زاویے کا سب سے اہم حصہ ہوتی تھی، یہاں زاویے میں مقیم لوگ اور آس پاس کے قبائل کے افراد نمازیں ادا کرتے تھے۔

2- مدرسہ یا اسکول: عام طور پر انہیں مکاتب قرآنیہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔یہاں پر سنوسی برادران کے بچوں کو قرآن، اصول و عقائد اسلام اور عربی زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔یہ تعلیم لازمی تھی اور کوئی شخص بلاوجہ اپنے بچوں کو ان مدارس سے نکال نہیں سکتا تھا۔

3- مضافہ یا مضیافہ (مہمان خانہ): مہمان خانے میں عام طور پر مسافر یا غریب لوگ ٹھہرتے تھے اور یہاں ان کی مہمان نوازی کی جاتی تھی۔ کچھ زاویوں میں تاجروں کے قیام کا انتظام بھی ہوتا تھا اور ان کے تجارتی سامان رکھنے کے لیے کمرے بھی ہوتے تھے گویا یہ زاویے کارواں سرائے کا کام بھی کرتے تھے اور ان سے زاویے کو مالی آمدنی بھی ہوتی تھی۔

4- مخزن: یعنی سامان رکھنے کے لیے گودام۔ یہاں زاویے کا سامان رکھا جاتا تھا۔

5- رہائشی مکانات: زاویہ کے شیخ اور اس کے دوسرے کارکنوں کی رہائش کے لیے زاویے کے اندر ہی مکانات تعمیر کیے جاتے تھے۔

6- طلبہ کے کمرے: دور دراز سے تعلیم کی غرض سے آنے والے طلبہ کے لیے زاویے میں الگ رہائشی کمرے ہوتے تھے۔

7- مطبخ: یہاں پر طلبہ اور مہمانوں کا کھانا تیار کیا جاتا تھا۔

8- ورکشاپ: بڑے زاویوں میں جہاں طلبہ کو تعلیم کے ساتھ ہنر بھی سکھایا جاتا تھا، وہاں ان کے لیے علیحدہ سے ورکشاپ بھی ہوتی تھی۔

9- اصطبل: زاویے کے گھوڑوں اور دیگر کارآمد جانوروں کو رکھنے کے لیے زاویے میں ایک اصطبل بھی ہوتا تھا۔

زاویوں کا نظام کچھ اس طرح ہوتا کہ ہر زاویہ کا ایک شیخ (امیر) ہوتا، جو اکثر اوقات منصف کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ زاویے کے دیگر ارکان جو اخوان کہلاتے تھے کے ذمے قبائل میں سنوسی دعوت کو پھیلانا ہوتا تھا۔ زاویے سے متعلق ہر فرد پر لازم تھا کہ وہ ہفتے میں باری باری ایک دن تعلیم وتعلم کے لیے، ایک دن زراعت وکاشت کاری اور باغبانی کے لیے اور ایک دن جہاد کی عملی تربیت حاصل کرنے کے لیے وقف کرے۔ اس طرح ہر زاویہ اپنے آپ میں خود کفیل ہوتا تھا۔ اس طرح زاویہ صرف خانقاہ نہ ہو کر ایک تعلیمی، روحانی، ثقافتی اور اقتصادی مرکز بھی ہوتا تھا۔ بلکہ اکثر زاویوں میں تجارتی منڈی بھی ہوتی تھی جہاں آس پاس سے چیزیں فروخت کے لیے لائی جاتیں اور ضرورت مند خریدتے تھے۔ عام طور پر زاویوں کو سماجی بہبود کے ایسے مرکز کی حیثیت حاصل ہوتی تھی جہاں لوگ اپنے حالات زندگی اور ذرائع و وسائل کو بہتر بنا سکتے تھے۔ سنوسی اخوان میں محنت کو بہت اہمیت حاصل ہوتی تھی، کسب حلال پر خاص زور دیا جاتا تھا اور ایک نمونے کی آبادی تیار کی جاتی تھی جو دیگر آبادیوں کے لیے بھی مثال بن سکے۔

12.4.4 تعلیمی وتبلیغی خدمات

سنوسی تحریک اور اس کے کاموں کا اگر جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ احیاء اسلام کی ایک تحریک تھی جس نے اپنی دعوت اور پروگراموں کے ذریعہ اسلامی تہذیب وتمدن کے احیاء اور اپنے زمانے کے مسلم سماج کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق تشکیل دینے کی کوشش کی۔ اسلامی تہذیب وتمدن کا احیاء ہو یا سماج کی اسلامی اصولوں پر تشکیل، اس میں تعلیم کا کردار بہت ہی بنیادی اور کلیدی نوعیت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ سنوسی تحریک نے اپنے زاویوں کے ذریعے اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت پر بہت ہی زیادہ زور دیا۔ تحریک کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تعلیم کو اس میں تمام امور پر فوقیت اور برتری حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سنوسی تحریک کے زاویے اور خانقاہیں بنیادی طور پر تعلیم وتربیت کے مراکز اور اشاعت وتبلیغ دین کے سینٹر ہوا کرتے تھے۔ ان میں اپنے زمانے کے نامور اساتذہ طلبہ کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہوتے۔ تحریک کے رہنماؤں خاص طور پر بانی تحریک سنوسی کبیر نے سنوسی جامعات یا مدارس کے لیے

ایک بہترین اور جامع نصاب تعلیم تیار کیا تھا جو تمام زاویوں کی تعلیم گاہوں میں یکساں تھا اور یہ تمام درس گاہیں ایک مرکز (جامعہ جغبوب) سے منسلک تھیں، جو اس زمانے میں جامعہ ازہر کے بعد عالم اسلام کی دوسری بڑی یونیورسٹی تھی۔

سنوسی تحریک کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ اس میں خواتین کو بھی خاص طور پر ان کی تعلیم کو یکساں اہمیت حاصل تھی۔ تحریک کے زاویوں میں خواتین کی تعلیم کے لیے علیحدہ نظم ہوتا تھا جہاں پر خواتین معلمات لڑکیوں کو تعلیم دیتیں اور ان کی تربیت کرتیں۔ خواتین کی ان درس گاہوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ انہیں دعوت و اصلاح کے کام کے لیے بھی تیار کیا جاتا تا کہ وہ خواتین میں دعوت کا کام کر سکیں۔ اسی طرح امور خانہ داری کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی تا کہ وہ جس گھر میں بھی جائیں، بہتر طور پر اس کا انتظام و انصرام کر سکیں اور اس طرح سنوسی دعوت کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کر سکیں۔

سنوسی تحریک کی تعلیمی و دعوتی خدمات کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس تحریک کے زاویوں کے اندر تعلیم بالغان کا الگ سے شعبہ ہوتا تھا۔ بڑوں کے لیے جو باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، ہفتے میں دو دن پیر اور جمعہ کو شام کے وقت کلاسوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان کے حالات اور ضروریات کے مطابق خود زاویے کا شیخ (سربراہ) ان کو پڑھاتا تھا۔ ان کلاسوں میں عام طور پر انہیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سکھائی جاتیں، قرآن مجید کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا سکھایا جاتا اور ضروری احکام و فرائض کی تعلیم دی جاتی تا کہ یہ لوگ اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال سکیں۔

تعلیم و تبلیغ کے میدان میں سنوسی تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غلاموں کی تعلیم و تربیت پر خاص طور پر توجہ دی۔ اس زمانے کے افریقہ میں غلامی کا رواج عام تھا، انسان جانوروں کی طرح بازاروں میں بکا کرتے تھے۔ سنوسی تحریک کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس غیر انسانی رویے کو انسانی رویے میں تبدیل کر کے اسلام کے قرن اول کی یاد تازہ کر دی، اس مقصد کے لیے سنوسی لیڈران یہ کرتے کہ وسطی افریقہ سے غلام بچوں کو خرید لیتے، زاویوں میں رکھ کر ان کی بہترین تعلیم و تربیت کرتے اور جب وہ بڑے ہو جاتے اور تعلیم و تربیت کے زیور سے پوری طرح آراستہ ہو جاتے تو انہیں آزاد کر کے انہیں کے علاقوں میں دعوت و تعلیم کے کام کے لیے بھیج دیا جاتا۔ تا کہ وہ وہاں پر اسلام کی دعوت و اشاعت کا کام کریں۔ اندرون صحرا دور تک افریقی قبائل میں اسلام کی اشاعت انہیں آزاد کردہ غلاموں کی دعوتی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

12.4.5 سنوسی تحریک کے اثرات

سنوسی تحریک اور اس کی دعوت و تبلیغ کے کاموں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جدید مسلم دنیا میں یہ ایک ایسی تحریک کے طور پر ابھری جس نے اپنے عروج کے زمانے میں شمالی اور وسطی افریقہ کی مسلم معاشرت، سیاست اور معیشت پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک نے ایک طرف تو سیاسی میدان میں اطالوی، فرانسیسی اور برطانوی سامراجوں کا مقابلہ کیا، ان کے خلاف مسلمانوں کا محاذ بنایا اور ان سے آزادی کا راستہ ہموار کیا تو دوسری طرف خود مسلمانوں کے اندر تنظیم پیدا کی، انہیں اصول وضوابط کا پابند بنایا، ان کے اندر جو برائیاں اور کمزوریاں تھیں ان کو دور کر کے اسلامی روح کا حامل ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی کامیاب کوشش کی جسے صحیح معنوں میں مثالی اسلامی معاشرہ کہا جا سکے۔ سیاست کے حوالے سے اس تحریک نے دین و دنیا کی تفریق کو ختم کیا اور کوشش کی کہ مذہب اور سیاست کو ہم آہنگ کر دیا

جائے۔ چونکہ سنوسی تحریک کے رہنماؤں کو سماجی ضروریات کا بخوبی اندازہ تھا اس لیے انہوں نے ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جو اپنی ضروریات کے لیے بڑی حد تک خود کفیل ہو۔ انہوں نے اپنے زاویوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت کی تعلیم کو نصاب تعلیم کا لازمی جزو بنایا جس کا اثر یہ ہوا کہ بہت جلد نہ صرف یہ کہ سنوسی زاویے خود کفیل ہوگئے بلکہ ان کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں افریقہ کے اندر صنعت وحرفت، کاشت کاری اور مویشی پالن کو بھی کافی فروغ ملا جس کی وجہ سے ان علاقوں میں خوش حالی آ گئی۔ شمالی و وسطی افریقہ کو سنوسی تحریک کی ایک دین یہ بھی ہے کہ گرچہ اس کے رہنما خود مالکی مذہب کے پیروکار تھے لیکن انہوں نے خود کو مسلکی اختلاف سے الگ رکھا، سنوسی تحریک کے دروازے تمام مسالک اور عقائد کے لوگوں کے لیے کھلے رکھے جس کی وجہ سے ان کی دعوت کو عوامی مقبولیت ملی۔ ان لوگوں نے اندھی تقلید کی مخالفت کی اور مسلمانوں کے اندر وسیع المشربی اور روشن خیالی کو فروغ دینے کی کوشش کی تاکہ قرآن وسنت کی بنیاد پر ایک مثالی مسلم معاشرہ وجود میں آئے جو آگے چل کر دنیا کی جدید تعمیر کے لیے رہنما کا کام دے سکے۔

سنوسی تحریک اپنے مقاصد، دعوت، اصلاحی کوششوں کے حوالے سے انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط تک عالم اسلام کی ایک اہم اور بڑی دعوت رہی البتہ مختلف وجوہ سے سیاست میں اس کا زیادہ اشتغال خاص طور پر لیبیا کے لیے مسلح جدوجہد آزادی کی تحریک نے اس کے دیگر اصلاحی اور دعوتی کاموں کو متاثر کیا اور بالآخر تحریک کا سیاسی زوال اس کے حتمی زوال کا سبب بن گیا۔ حالانکہ اپنے مقاصد کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب تحریک تھی اور اس کے بارے میں سنوسی کبیر کے ایک سوانح نگار سید خالد محمود ترمذی نے بہت اچھی بات لکھی ہے اور اسی پر ہم اس موضوع کو ختم کرتے ہیں:

''سنوسی تحریک حقیقی معنوں میں دعوت الی اللہ کی تحریک تھی جس کے مقاصد میں سے پہلا مقصد مسلمانوں کو قرآن وسنت کی سختی سے پیروی کرنے کی دعوت دینا تھا، دوسرا مقصد مسلمانوں کے بچوں کو دینی وفنی تعلیم دینا تھا، جس سے وہ نابلد تھے۔ تحریک کا تیسرا مقصد قبائل کے آپس کے تنازعات کو ختم کر کے، ان میں اتحاد واتفاق کی فضا قائم کر کے انہیں ایک عظیم مقصد یعنی تبلیغ اسلام کے لیے تیار کرنا تھا۔ چوتھا مقصد مسلمانوں کی اخلاقی وروحانی پستی، معاشرتی بدحالی، سیاسی درماندگی اور معاشی پس ماندگی کی اصلاح کر کے ایک صحیح اسلامی معاشرے اور ریاست کا قیام تھا۔ الغرض سنوسی تحریک ایک ایسی جامع ومانع اصلاحی تحریک تھی۔ اس کا طریقہ کار شریعت وطریقت کا حسین امتزاج تھا۔ انسانی زندگی کے ہر عملی پہلو کو محیط، کسی پہلو کو خواہ معاشرتی ہو یا معاشی، اخلاقی وروحانی ہو یا سیاسی اس نے نظر انداز نہیں کیا تھا اور یہ ایک ایسی بین الاقوامی تحریک بن گئی تھی کہ تمام اسلامی ممالک میں اس کی شاخیں (زاویے) قائم ہوگئیں تھیں۔ بہرحال سنوسی تحریک تجدید واحیائے دین کے میدان میں جدید دنیائے اسلام کی سب سے مؤثر اور طاقت ور تحریک تھی جس نے شمالی و وسطی افریقہ، مصر وسوڈان، حجاز وہند، انڈونیشیا، ترکی اور ایران میں لاکھوں لوگوں کو ہدایت کی راہ دکھائی۔''

معلومات کی جانچ

1۔ وہابی تحریک کو یہ نام کیوں دیا گیا؟

2۔ وہابی تحریک کی سرگرمیوں کا علاقہ کون سا ہے؟

3۔ سنوسی تحریک کے بانی کا نام بتائیں۔

4۔ سنوسی تحریک کا پہلا زاویہ کب اور کہاں قائم ہوا؟

12.5 نورسی تحریک

عالمی نقشے پر اگر نظر ڈالیں تو ترکی ایک ایسے مقام پر واقع ہے جہاں دو براعظم (ایشیا اور یورپ) ہی نہیں ملتے بلکہ دو تہذیبیں (مسلم تہذیب اور مغربی تہذیب جو بنیادی طور پر عیسائی تہذیب ہے) بھی آپس میں ملتی اور ایک دوسرے سے لین دین کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک طرف اسی راستے سے اسلامی تہذیب وثقافت مشرقی یورپ کے ملکوں میں پہنچی تھی تو دوسری طرف اٹھارہویں صدی عیسوی تک یورپ کی نشأۃ ثانیہ نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا تھا کہ اس کی تہذیب ترکی کے راستے مسلم دنیا پر اثر انداز ہونے لگی۔ 1727 میں ترکی میں پہلا پرنٹنگ پریس (چھاپہ خانہ) لگا، البتہ یہ ترکی کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ اس کے توسط سے چرچ اور ریاست کی علیحدگی کا مغربی تصور مسلم دنیا میں داخل ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں ہی (کیونکہ ترکی کے طبقہ علماء نے مذہبی کتابوں کی پرنٹنگ پریس کے ذریعہ طباعت کی مخالفت کی تھی) مذہبی اور غیر مذہبی ادبیات کی تفریق عمل میں آئی اور ترکی کا پڑھا لکھا طبقہ قدیم وجدید میں تقسیم ہوگیا۔ قدیم وجدید کی اس تقسیم نے ترکی کو ایک ایسی ذہنی وفکری کشمکش سے دوچار کیا جو فوج کی اصلاح اور تنظیمات کے راستے سے ہوتی ہوئی بالآخر مصطفیٰ کمال پاشا کے ذریعے ایک ایسے انقلاب پر منتج ہوئی جس کی بنیاد قدیم یعنی مذہب کو جدید یعنی لامذہبیت (زیادہ صحیح الفاظ میں مذہب مخالفت یا دشمنی) سے بدل ڈالنے کی کوشش پر تھی۔ ترکی میں کمالی انقلاب (مصطفیٰ کمال پاشا کا لایا ہوا) کامیاب نہیں ہوسکا اور ترکی میں قدیم وجدید کی جو کشمکش تقریباً تین سو برس پہلے شروع ہوئی تھی آج بھی کسی منطقی نتیجے پر پہنچنے کے لیے کوشاں ہے۔ کمالی انقلاب جو قدیم وجدید کی کشمکش کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے، اگر کامیاب نہیں ہوا تو اس کی بنیادی وجہ ترک معاشرے میں پیوست مذہب (اسلام) کی گہری جڑیں ہیں اور ان کی آبیاری دور جدید میں (کمالی انقلاب کے دوران اور اس کے بعد) ایک ایسی تحریک نے کی ہے جو نورسی تحریک کے نام سے دنیا بھر میں جانی جاتی ہے۔

12.5.1 پس منظر اور آغاز وارتقا

اس میں شک نہیں کہ عثمانیوں کا نظام حکومت مذہب کے الہامی اصولوں پر مبنی نہیں تھا اور اپنے آخری دور میں استبداد کو جواز فراہم کرنے کے لیے حکمرانوں نے مذہب کو سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا تھا جس کا انتہائی نتیجہ مصطفیٰ کمال پاشا کے ذریعہ انقلاب کی صورت میں برآمد ہوا۔ ترکوں کو اس انقلاب کا اس شدت کے ساتھ انتظار تھا کہ انہوں نے انقلاب کے لیڈر مصطفیٰ کمال پاشا کو اتا ترک (ترکوں کا باپ Father of the Turkish Nation) کا خطاب دے ڈالا۔ عثمانی استبداد سے ترکوں کا صرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی نالاں نہیں تھا بلکہ ترکوں کے مذہبی طبقے میں بھی ایسے لوگ تھے جو عثمانی استبداد کو پسند نہیں کرتے تھے اور جنہوں نے مصطفیٰ کمال پاشا کے انقلاب کی حمایت کی تھی۔ البتہ غور سے دیکھا جائے تو کمالی انقلاب کے بعد بھی ترکی کے حالات میں کوئی بہت بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ انقلاب کے نتیجے میں بظاہر جدید اور نام کا جمہوری ترکی ضرور وجود میں آیا لیکن اس کی حیثیت یک جماعتی آمریت سے کچھ زیادہ نہ تھی جس میں تمام تر اختیارات مصطفیٰ

کمال پاشا کو حاصل تھے۔ انہوں نے جس استبداد اور آمریت کے خلاف انقلاب برپا کیا تھا اس کی کامیابی کے بعد خود بھی اسی راستے پر چل پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے مخالفین کے خلاف وہی طریقے اور حربے استعمال کیے جوان سے پہلے استعمال ہوتے رہے تھے۔

عثمانی حکومت کے استبداد سے جو لوگ نالاں تھے اور جنہوں نے ترکی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لیے کوشش کی ان میں مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ہم خیالوں کی طرح بعض دیگر شخصیات بھی تھیں، ان میں ایک نمایاں نام بدیع الزماں سعید نورسی کا ہے جنہوں نے تن تنہا اپنی ذات سے ترکی میں ایک ایسی تحریک برپا کردی جس نے ترکی کو نہ صرف یہ کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ہم نواؤں کے انتہا پسندانہ ردعمل سے بچالیا بلکہ ترکی کے معاشرے کو اس کی بنیادی اسلامی مذہبی شناخت سے محروم نہ ہونے دینے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ دنیا بدیع الزماں سعید نورسی کی اس تحریک کو ان کے نام کی نسبت سے نورسی تحریک کے نام سے جانتی ہے۔

12.5.2 بانی تحریک

بدیع الزماں سعید نورسی ترکی کے صوبے بتلیس (Bitlis) کے ایک گاؤں نورس میں 1877ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میرزا بن علی بن خضر تھا اور والدہ کا نام نوریہ بنت ملا طاہر تھا۔ خود ان کا اصل نام سعید تھا، بدیع الزماں کا خطاب انہیں ان کی بے انتہا ذہانت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ سے ان کے اساتذہ نے دیا تھا جو ہمیشہ کے لیے ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ اپنے وطن نورس کی نسبت سے نورسی کہلائے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اس کے بعد کچھ مزید روایتی تعلیم مقامی اور اطراف کے علماء سے حاصل کی، البتہ انہیں مطالعہ کا بچپن سے ہی بہت زیادہ شوق تھا، اس لیے کم عمری میں ہی بیشتر روایتی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرلیا تھا۔ اسی دوران چودہ پندرہ برس کی عمر میں ان پر زہد وریاضت کا غلبہ ہوا تو کچھ مدت خلوت نشینی میں مجاہدے اور ریاضت میں گزاری۔ بعدازاں رشد و ہدایت کی ذمہ داریوں میں مشغول ہوئے اور اس کام کے لیے وان (ترکی کا ایک شہر) منتقل ہوگئے۔ وان میں بدیع الزماں سعید نورسی تقریباً پندرہ برس تک مقیم رہے۔ اس دوران انہوں نے رشد و ہدایت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مطالعے کے شوق کو بھی جاری رکھا۔ یہاں پر انہوں نے مذہبی اور روایتی علوم کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مغربی علوم کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ وان میں قیام کے دوران انہوں نے تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، طبیعات، جدید کیمیا، طبیعات الارض، ہیئت اور فلسفہ وغیرہ علوم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، خاص طور پر علم ریاضی میں خصوصی مہارت پیدا کرلی، ان علوم میں مہارت کی وجہ سے وان میں ان کا تعارف استاد بدیع الزماں سعید نورسی کے طور پر ہونے لگا۔ یہیں پر مطالعہ و تجربے کے دوران پہلی مرتبہ ان میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ ان کے زمانے کا دینی تعلیمی نظام ناقص ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ مذہبی درسگاہوں میں دینی وشرعی علوم کے ساتھ ساتھ جدید سائنس اور حکمت کی تعلیم کو بھی شامل نصاب کیا جانا چاہیے۔ استاد سعید نورسی کے اندر یہ احساس اتنا شدید تھا کہ انہوں نے خود اپنے طور پر اس جانب پیش قدمی شروع کی۔ انہوں نے عثمانی خلافت کے مشرقی صوبے اناطولیہ میں قدیم وجدید تعلیم پر مشتمل ایک یونیورسٹی "مدینۃ الزہرا" کے نام سے بنانے کا منصوبہ اور خاکہ تیار کیا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے 1908ء میں انہوں نے عثمانی دارالحکومت استنبول کا سفر بھی کیا تاکہ اس کے لیے درکار وسائل فراہم کیے جاسکیں۔ انہوں نے سلطان سے ملاقات کرکے اس کے سامنے اپنے منصوبے کو رکھا اور سرکار عالی (عثمانی حکومت) سے مالی امداد حاصل کرنے میں انہیں کامیابی بھی مل گئی۔ البتہ اسی دوران عثمانی خلافت میں سیاسی اتھل پتھل اور پھر بعدازاں پہلی عالمی جنگ نے ان کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہننے سے محروم کردیا اور جامعۃ الزہرا کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔

بدیع الزماں سعید نورسی بنیادی طور پر درس وتدریس اور تبلیغ کے آدمی تھے اور اس کے لیے ان کی کوششیں جاری تھیں کہ پہلی عالمی جنگ نے انہیں مدرس سے مجاہد بنا دیا۔ روس کے خلاف جنگ میں انہوں نے بذات خود حصہ لیا اور ایک محاذ پر گرفتار ہو کر تقریباً دو برس تک قید کی زندگی گزاری۔ انقرہ میں نئی حکومت کے قیام کے بعد انہوں نے 13 /اپریل 1920ء کو مجلس کبیر ملی (ترکی پارلیامنٹ) کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کی۔ البتہ جب نئی حکومت کے عزائم ان پر واضح ہوئے تو انہوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے دعوت و اصلاح کے کام میں مصروف ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی میں تبدیلی کا اہم موڑ تھا اور خود انہوں نے اس سے پہلے کی زندگی کو سعید قدیم اور اس کے بعد کی زندگی کو سعید جدید کے ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

ترکی میں انقلاب کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا نے اصلاحات کے نام پر مذہب اور مذہبی اداروں کی مخالفت اور انہیں ختم کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا، استاد بدیع الزماں سعید نورسی سیاسی اصلاحات کے حامی ہونے کے باوجود ان معاملات میں اس کا ساتھ نہیں دے سکے بلکہ انہوں نے اس کے ان اقدامات کی خاموشی کے ساتھ مخالفت کی جس کی وجہ سے انقرہ کی حکومت ان کی سخت مخالف ہو گئی۔ لہٰذا ان کی زندگی کے آیندہ تقریباً 30 برس قید و بند، نظر بندی اور ابتلا و آزمائش میں گزرے۔ البتہ اسی ابتلا و آزمائش کے دوران انہوں نے رسائل نور (بنیادی طور پر یہ رسائل قرآن مجید کی متفرق آیات کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہیں) کی تالیف اور اپنے طلبہ (جو طلبہ نور کے نام سے معروف ہیں) کی تربیت کے ذریعہ ترکی میں مذہب اور مذہبی اقدار کے تحفظ کے حوالے سے ایک ایسا انقلاب برپا کرنے میں کامیابی حاصل کی جس نے کمالی انقلاب کی تمام سطوت و شوکت اور طاقت کے باوجود ترکی کو اس کی مسلم مذہبی شناخت سے محروم نہیں ہونے دیا۔ سیاسی جبر کے دوران، جب ترکی میں واحد سیاسی پارٹی نظام جاری رہا، انہوں نے حکومت سے براہ راست ٹکراؤ کے بجائے خاموشی کے ساتھ ایک ایسے لائحۂ عمل پر اپنا سفر جاری رکھا جو ترکی میں مذہب اسلام اور مذہبی اقدار کی بقا کا ضامن ہوا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ 1950ء میں ترکی میں کثیر جماعتی سیاسی نظام متعارف ہونے کے بعد مختلف دستوری رکاوٹوں کے باوجود اسلامی بے داری کی ایک لہر وجود میں آئی جس نے یہ ثابت کر دیا کہ ترکی میں کمالی انقلاب ناکام رہا اور اب ترکی ایک ایسے سفر پر گامزن ہے جہاں دستوری رکاوٹوں کی وجہ سے مذہب و لامذہبیت کے درمیان کشمکش تو ضرور جاری ہے لیکن ترکی میں مذہب کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ اسے ترک معاشرے اور سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ترکی آج جس مقام پر ہے اس میں اسے مغرب سے حذر تو نہیں لیکن وہ مشرق سے بے زار بھی نہیں، بلکہ مشرق کی طرف اس کی دل چسپی میں اضافہ ہوا ہے، اسے اس مقام تک پہنچانے میں سعید نورسی اور ان کے طلبہ نور کی کوششوں کا رول انتہائی اہم ہے۔ استاد بدیع الزماں سعید نورسی اپنی پوری زندگی خاص طور پر 1925ء کے بعد سے 23 /مارچ 1960 میں اپنی وفات تک انہوں نے مشکلات اور مصائب کے باوجود دعوت و اصلاح کے کام کے لیے بھرپور جدوجہد کی اور جدید ترکی میں مذہب اور مذہبی اقدار کی بقا کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

12.5.3 نورسی تحریک کی خدمات

نورسی تحریک ان معنوں میں کوئی منظم تحریک نہیں ہے کہ اس کا کوئی متحدہ پلیٹ فارم، دستور اور قیادت ہو بلکہ یہ ایک ایسی کوشش ہے جسے مذہب اور مذہبی اقدار کے دفاع و تحفظ کے لیے استاد سعید نورسی نے شروع کیا اور جسے ان کے طلبہ یا ان کے طلبہ کے شاگرد اور متاثرین

آج مختلف تنظیمی ناموں اور اداروں کی شکل میں جاری رکھے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے طور پر مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ یہاں پر ہم نورسی تحریک کی ان خدمات کا ایک مختصر تعارف کرانا چاہیں گے جو اس نے ترکی میں تحفظ ودفاع اسلام کے حوالے سے انجام دی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عثمانی حکومت میں سیاسی جبر واستبداد تھا، ترکی میں جو لوگ اس کے خلاف تھے ان میں مصطفیٰ کمال اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ علماء کا ایک طبقہ بھی تھا جس میں ایک نمایاں نام سعید نورسی کا ہے لیکن مصطفیٰ کمال نے جدید ترکی میں جس طرح کے اقدامات کیے اور جو اصلاحات نافذ کیں وہ ترک سماج کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھیں۔ چنانچہ نورسی تحریک نے ان اقدامات کی مخالفت اور ان اصلاحات پر عمل نہ کر کے ترکی کے بنیادی کردار کی حفاظت میں اہم رول ادا کیا۔ نورسی تحریک کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انتہائی حکمت اور کامیابی کے ساتھ ترکی کے سماج کے اندر اسلام کی شمع کو روشن رکھا۔ اس نے حکومت سے ٹکراؤ اور تصادم کا راستہ نہیں اختیار کیا اور نہ ہی اپنا کوئی سیاسی ایجنڈا ترتیب دیا بلکہ خاموشی کے ساتھ اسلام کی دعوت عام لوگوں کے سامنے پیش کی۔ یہاں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ نورسی تحریک کی سیاست سے بے تعلقی ترکی کے مخصوص حالات کے تقاضے کے تحت تھی نہ کہ صوفی رجحان کے سبب۔ کیونکہ ترکی کا آئین مذہب کے نام پر کسی طرح کی سیاسی سرگرمی کی اجازت نہیں دیتا۔

نورسی تحریک کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ جدید ترکی کے حکمرانوں نے عربوں کی مخالفت اور دشمنی میں عربی زبان، جو قرآن کی زبان ہے، کی بھی مخالفت کی اور اس پر پابندی عائد کر دی، نورسی تحریک نے ترکی کے لوگوں میں پہلے قرآن مجید کی اہمیت کو اجاگر کیا اور پھر اس بات کو ان میں عام کیا کہ قرآن مجید کے پیغام کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے اس کا عربی زبان میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ کسی دوسری زبان میں ترجمے کی مدد سے قرآن مجید کو پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ خود بانی تحریک نے قرآن مجید سے محبت کو ترک عوام میں فروغ دینے کے لیے رسائل نور کی شکل میں قرآنی تعلیمات کو لوگوں کے اندر عام کیا۔

جدید ترکی کے حوالے سے نورسی تحریک کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے ترکوں میں محبت قرآن اور قرآنی تعلیمات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ صاحب قرآن محمد رسول عربیؐ سے محبت اور پھر محبت رسولؐ کے تقاضوں سے ترک سماج کو آشنا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ رسائل نور میں متعدد مقامات پر اللہ کے رسولؐ کی ذات وحیات کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ان کا پڑھنے والا حضور پر نورؐ کا شیدائی بن جائے۔

نورسی تحریک کی ایک بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے کاموں اور لٹریچر کے ذریعہ ترکی کے اندر کمیونزم، فری میسن اور قوم پرستی جیسی تحریکات کے فروغ پر قدغن لگانے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی۔ رسائل نور کے اندر کمیونزم اور فری میسن کو ایسی تحریکات اور نظریات سے تعبیر کیا گیا ہے جو مذہب اسلام اور اسلامی عقائد کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح قوم پرستی کے عفریت کو ایک ایسی بیماری سے تعبیر کیا گیا جو فرنگیوں (انگریزوں) نے مسلمانوں کو لگائی ہے اور جس کی وجہ سے انہوں نے مسلم قوم اور ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھیرنے میں کامیابی حاصل کی۔ رسائل نور میں قرآنی تعلیم کے مطابق انسانوں کی قوموں اور قبیلوں میں تقسیم تعارف اور باہمی تعاون کے مقصد سے ہے۔ جھگڑے نفرت اور دشمنی سے اسے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

12.5.4 رسائل نور ایک مختصر تعارف

نورسی تحریک کے مطالعے کے دوران طلبہ نور اور رسائل نور جیسے الفاظ بار بار آتے ہیں۔طلبہ نور سے یہ سمجھنا تو آسان ہے کہ اس سے مراد نورسی تحریک اور اس کے افراد ہیں۔البتہ رسائل نور کے حوالے سے طلبہ کے ذہن میں سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اس لیے ذیل میں ان کا مختصر تعارف درج کیا جاتا ہے:

رسائل نور بنیادی طور پر ایسے رسائل کا مجموعہ ہیں جو قرآن مجید کی متفرق تعلیمات کی تشریح وتفسیر پر مبنی ہیں۔کم وبیش 130 رسائل پر مبنی رسائل نور قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر وتشریح ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں ان سوالات اور اعتراضات کا جواب دینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو سائنس اور فلسفے خاص طور پر مادی اور اثباتی فلسفے کے نام پر اسلام پر کیے جاتے ہیں۔ان میں ایسا مثبت اور دل نشین پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے کہ ان کے مطالعے سے جدید تعلیم یافتہ ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات ہی رفع نہیں ہوتے بلکہ یہ اپنے قاری کو اسلام کا گرویدہ اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والا بھی بنا دیتے ہیں۔130 رسائل پر مشتمل رسائل نور کو چار مجموعوں کی شکل میں شائع کیا گیا ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

1- مجموعہ سوزلر (sozler) یعنی کلمات: 720 صفحات پر مشتمل رسائل نور کا یہ سب سے زیادہ ضخیم مجموعہ ہے۔اس میں 33 کلمات ہیں۔یہ انقرہ یونیورسٹی سے پہلی بار 1957ء میں شائع ہوا تھا۔

2- مجموعہ لمعلر (lemalar) یعنی لمعات: یہ مجموعہ 430 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں 31 لمعات شامل ہیں۔رسائل نور کے اس مجموعے کو بھی انقرہ یونیورسٹی نے پہلی بار 1957ء میں شائع کیا تھا۔

3- مجموعہ مکتوبات (Letters): اس مجموعے کی ضخامت 500 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں استاد بدیع الزماں سعید نورسی کے 33 طویل خطوط ہیں جو مختلف موضوعات کی تشریح وتفسیر کرتے ہیں۔1958ء میں یہ مجموعہ انقرہ سے پہلی بار شائع ہوا۔

4- مجموعہ شاعلر (Sualar) یعنی شعاعیں (Rays): یہ مجموعہ 14 اشعاعوں پر مشتمل ہے اور اس کی ضخامت 495 صفحات ہے۔1959ء میں یہ مجموعہ پہلی بار استنبول سے شائع ہوا تھا۔

ان مجموعوں میں ان کے علاوہ بعض اضافی چیزیں مثلاً بعض خطبات اور ضمیمے وغیرہ بھی شامل ہیں۔سعید نورسی کے کورٹ مارشل اور بعض دیگر مقدمات کی کارروائیاں بھی ان میں موجود ہیں۔حال کے دنوں میں رسائل نور کے ان تمام مجموعوں کو ایک جگہ کلیات رسائل نور کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔عربی انگریزی اور اردو سمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں ان کے مکمل یا منتشر ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔

12.6 الاخوان المسلمون

12.6.1 پس منظر

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز مسلم دنیا کے حوالے سے اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اسی دوران مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچا۔

مسلم دنیا کے مختلف علاقے اس وقت تک ایک ایک کر کے مسلمانوں کے اقتدار سے نکل گئے اور بالآخر مسلم دنیا کے ایک بڑے علاقے کو وحدت کے شیرازے میں جوڑے رکھنے والی عثمانی خلافت یا حکومت کے زوال نے اس پر آخری مہر لگادی۔ جدید مسلم دنیا کی عبوری تاریخ کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کا زوال صرف سیاسی ہی نہیں تھا، اقتصادی طور پر وہ بہت پہلے یورپی طاقتوں سے مات کھا چکے تھے۔ اس دوران ان کی علمی اور مذہبی زندگی کو بھی زبردست چیلنجوں کا سامنا رہا۔ مغرب اور اس کے پروپیگنڈے کے زیراثر مسلم دنیا میں بھی ایسے افراد اور گروپ وجود میں آگئے تھے جو اسلام کو ایک فرسودہ اور جدید زمانے کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر مذہب کے طور پر پیش کرنے لگے تھے۔ ایسی تحریریں اور افکار عام ہونے لگے تھے جن کے زیراثر مغربی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ مسلمان ہی نہیں روایتی مذہبی تعلیمی نظام کے پروردہ علماء کرام بھی اسلام اور اس سے متعلق امور کا تجزیہ ان اصولوں کے مطابق کرنے لگے تھے جنہیں مغرب نے اپنے مخصوص حالات کے تحت وضع کیا تھا۔ اسلام اور اسلامی اصول وعقائد کو اس طرح نشانہ بنایا جانے لگا کہ گویا اب یہ اس کا دم واپسیں ہے اور اب اس کی تعلیمات وہدایات میں کوئی ایسی کشش یا طاقت باقی نہیں رہی جو عام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک مسلم دنیا میں مذہب سے دوری اور بے عملی کی ایک ایسی رو (لہر) چل پڑی جس نے اسلام اور مسلمان کو دوالگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا۔

بلاشبہ اس دوران مسلم دنیا کا زوال بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ تاریکیوں پر تاریکیوں کا غلبہ ہوتا جارہا تھا اور ظاہری حالات کسی بھی خوش میدی کی پیش گوئی کرنے سے قاصر تھے، لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کی سحر ہو، تاریکیوں کے ہر سیلاب کے پرے اجالوں کی حکومت قائم ہو۔ چنانچہ ایسا ہی اسلام اور مسلم دنیا کے ساتھ بھی ہوا۔ ٹھیک انہیں دہائیوں میں جب مسلم دنیا کا سیاسی زوال اور اس کے نتیجے میں ہر طرح کا اخلاقی وسماجی زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا، مسلم دنیا میں ایسی شخصیات اور تحریکات نے جنم لینا شروع کیا جنہوں نے اپنے فکر وعمل سے ایک نئے انقلاب کی دستک دی، احیاء اسلام کے لیے کوششیں شروع کیں اور تعلیم یافتہ ونوجوان طبقے میں دین ومذہب سے وابستگی کا شعور پیدا کیا۔ اسی زمانے کی ایک اہم اور بڑے ہی دوررس اور ہمہ گیر اثرات کی حامل تحریک الاخوان المسلمون کی تھی جس نے صرف مصر کے اندر ہی نہیں بلکہ پورے عالم عرب اور اس سے بھی آگے بڑھ کر مسلم دنیا میں اسلام کی طرف رجوع کا ایک ایسا سلسلہ قائم کیا کہ آج تک وہ جاری ہے اور جس سے متاثر ہو کر سیکڑوں ہزاروں نہیں لاکھوں لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں اور انہوں نے خود کو اور اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور اس کے مقاصد کے حصول کے لیے وقف کر دیا۔

12.6.2 آغاز وارتقا

الاخوان المسلمون موجودہ دور میں عالم عرب کی سب سے بڑی، موثر اور سب سے زیادہ منظم تنظیم ہے۔ اس تنظیم کا باقاعدہ قیام مصر کے ایک شہر اسماعیلیہ میں 1928ء میں عمل میں آیا۔ اسماعیلیہ کا شہر ان دنوں مصر میں انگریزوں کی ایک بڑی چھاؤنی تھا اور یہاں پر مغرب کے اثرات ہر طرف دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے تھے۔ تنظیم کے بانی حسن البناء (1906-1949) تھے، جن کا تعلق مصر میں قاہرہ کے نواحی علاقے بحیرہ کے ایک گاؤں محمودیہ سے تھا اور جو بحیثیت استاد ان دنوں اسماعیلیہ میں مقیم تھے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ مصر اور عالم عرب میں اسلامی بیداری اور نوجوانوں کا اسلام سے تعلق بڑی حد تک الاخوان المسلمون کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ اسی لیے عالم عرب میں الاخوان المسلمون کو خطے

الاخوان المسلمون کی تاریخ کے طالب علم کے لیے 1960 کی دہائی بہت ہی اہمیت کی حامل اس لیے بھی ہے کہ اس دوران خود تنظیم کے اندر مختلف تعبیرات کو لے کر اعتدال پسند اور سخت گیر رویے کے حاملین کے درمیان نہ صرف کشمکش پیدا ہوئی بلکہ یہ کشمکش اپنے عروج کو پہنچ گئی یہاں تک کہ یہ تنظیم اسی مسئلے کو لے کر پہلی بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ تنظیم سے ٹوٹ کر علیحدہ ہونے والوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی جو زیادہ تر سائنسی یا تکنیکی ماہرین تھے۔ اعتدال پسندی اور انتہا پسندی کی جس کشمکش سے الاخوان المسلمون کی تنظیم 1960ء کی دہائی میں دوچار ہوئی تھی مصر کے مخصوص حالات میں، جب کہ بیشتر وہاں استبدادی آمریت قائم رہی ہے اور اس نے سیاسی وسماجی تنظیموں پر کڑی نظر رکھی ہے اور اکثر ان کو نشانہ بھی بناتی رہی ہے، مقاصد کے حصول اور اس کے طریقہ کار کو لے کر وہ کشمکش آج تک جاری ہے۔ 2011ء کے مصر کے عوامی انقلاب کے بعد حالات بدلنے کی جو ایک امید قائم ہوئی تھی اور ایسا لگا تھا کہ مصر کے ساتھ ساتھ اخوان کے اندر کی بھی کشمکش شاید دور ہو سکے گی، اسے بھی جنرل عبدالفتاح السیسی نے جولائی 2013ء میں اس وقت ختم کر دیا جب انہوں نے جدید مصر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عوامی اکثریت سے جمہوری طور پر منتخب ہونے والے صدر محمد مرسی اور ان کی حکومت کو برطرف کر کے انہیں جیل بھیج دیا اور خود اقتدار پر قابض ہو گئے۔

12.6.3 الاخوان المسلمون کی تنظیمی وسعت

الاخوان المسلمون کے بارے میں اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ اس کا کوئی عالمی نیٹ ورک ہے، جو نہ صرف یہ کہ اس سے وابستہ افراد کو فکری اور نظریاتی طور پر متحد رکھتا ہے بلکہ بوقت ضرورت مالی و دیگر معاونت بھی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کے دور میں الاخوان المسلمون صرف عرب دنیا کی نہیں بلکہ عالمی اسلامی اجتماعیت کی نمائندہ اور حامل تنظیم ہے۔ اس کے کردار کو صرف مصر یا بعض عرب ملکوں تک محدود کرنا اس کے اصولوں اور اثرات کی آفاقیت کے منافی ہے۔ البتہ تنظیم کا یہ اتحاد صرف فکری و نظری ہے۔ اخوان کے نام یا آئیڈیالوجی سے وابستہ عالم عرب یا دنیا کی دیگر تنظیمیں اپنے اپنے دائرہ کار میں آزاد و خود مختار ہیں اور ان کے مالی و افرادی انتظامات یہاں تک کہ کئی دفعہ ان کی پالیسیاں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی کے آخر میں وجود میں آنے والی اس تنظیم کے اثرات بہت جلد مصر کے پڑوسی عرب ملکوں میں پھیلنے لگے تھے اور اسی کے سبب یہ تنظیم آگے چل کر عالم عرب کی سب سے زیادہ بااثر اور منظم تنظیم کی شکل اختیار کر سکی، الاخوان المسلمون نے بیرون مصر باقاعدہ اور سرگرمی کے ساتھ اپنے کام کا آغاز 1930ء کی دہائی کے وسط میں کیا اور اسی وقت پڑوسی عرب ملکوں میں تنظیم کی شاخیں بھی قائم ہونا شروع ہوئیں۔ اس دوران الاخوان المسلمون کے فروغ واستحکام کی غرض سے تنظیم کے مختلف رہنماؤں نے شام، لبنان، فلسطین، اردن، یمن، عراق اور کئی دیگر ملکوں کے دورے بھی کیے۔ 1940 اور 1950 کی دو دہائیوں کے دوران الاخوان المسلمون نے ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں اپنی تنظیم کے مخصوص کیمپ لگائے۔ ان کیمپوں میں دنیا کے مختلف ملکوں سے حج کے لیے آنے والے وفود کا استقبال کیا جاتا، ان سے ملاقاتیں ہوتیں، انہیں الاخوان المسلمون کی دعوت سے متعارف کرایا جاتا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلم دنیا میں ہر جگہ الاخوان المسلمون اب ایک مانوس نام بن گیا اور لوگ اسے جاننے لگے۔ اسی طرح مصر میں جامعہ ازہر کو ہمیشہ سے مسلم دنیا میں ایک اہم اور بڑے تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے، یہاں تعلیم کی غرض سے آنے والے متعدد طلبہ دوران تعلیم اخوان کی دعوت سے متاثر ہوتے، اس کا مطالعہ کرتے اور جب اپنے ملکوں کو واپس لوٹتے تو اخوان کی دعوت بھی اپنے ساتھ لے جاتے اور اکثر اسی کی طرز پر اپنے ملکوں میں بھی دعوتی سرگرمیاں شروع کرتے۔ اس کے نتیجے میں متعدد ملکوں میں اخوان کی برادر اور دوست تنظیمیں وجود میں آئیں جن کا نام تو الاخوان المسلمون نہیں تھا لیکن ان کی بنیادی آئیڈیالوجی اخوان کی ہی جیسی تھی۔

عرب دنیا کی سطح پر الاخوان المسلمون کی سرگرمیوں اور تعارف میں بہت زیادہ اضافہ اس وقت ہوا جب 1948 کی جنگ فلسطین میں اخوان رضا کاروں نے بڑے پیمانے پر شرکت کی اور شجاعت و بہادری کے ناقابل فراموش کارنامے دکھائے۔ اس دوران ہی الاخوان المسلمون نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ عرب دنیا کی ہم خیال تنظیموں کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات استوار ہو جائیں تا کہ اگر کبھی مصر کے مخصوص حالات میں اس پر مشکل وقت آ پڑے تو وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے (اخلاقی) کی پوزیشن میں ہوں۔ بہت جلد اس کے اثرات بھی دیکھنے کو ملے مثلاً 1954ء میں جب مصر میں الاخوان المسلمون کی آزمائش کا دور شروع ہوا تو شام کے اخوانیوں نے مصری اخوان کی حمایت کی اور اس دوران شام کو الاخوان المسلمون (مصر) کے علاقائی دفتر کی حیثیت حاصل رہی۔ اسی طرح جب 1981ء میں شام کی الاخوان المسلمون پر سرکاری عتاب نازل ہوا اور ان پر شام کی زمین تنگ کر دی گئی تو اردن کے اخوانیوں نے ان کی مدد اور حمایت کی۔

عرب دنیا کے علاوہ شمالی افریقہ کے ملکوں میں بھی الاخوان المسلمون کے اثرات بہت زیادہ ہیں خاص طور پر مراکش کی استقلال پارٹی کے ساتھ الاخوان المسلمون کے قریبی تعلقات رہے ہیں، اسی طرح تیونس کی النہضہ پارٹی (جس کی قیادت راشد الغنوشی کے ہاتھ میں ہے) بھی بنیادی طور پر اخوان کی آئیڈیالوجی کی حامل ہے۔ الجزائر اور لیبیا میں بھی اخوان کی فکر کے حامل افراد اور جماعتیں موجود ہیں بلکہ یہاں کے علماء کے ساتھ اخوانیوں کے گہرے مراسم بھی ہیں۔ اندرون افریقہ اریٹریا اور صومالیہ جیسے ملکوں میں بھی الاخوان المسلمون کے ہمدرد گروپ موجود ہیں۔ اخوان کے ساتھ بعض مماثلتیں دور دراز کے مسلم ملکوں میں موجود مسلم تنظیموں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً برصغیر (ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش) میں جماعت اسلامی، ملائیشیا، انڈونیشیا اور فلپائن میں موجود اسلامی تنظیمیں اخوان کے ساتھ نظریاتی اشتراک رکھتی ہیں۔

12.6.4 الاخوان المسلمون: موجودہ صورت حال

ذرائع ابلاغ سے معمولی شغف رکھنے والا بھی اس بات سے اچھی طرح واقف ہوگا کہ 2011ء میں عرب عوامی بے داری کی جو لہر چلی اور جس کے نتیجے میں مختلف عرب ملکوں میں حکومتیں تبدیل ہوئیں، اس بات کی امید کی جانے لگی کہ عرب دنیا میں بھی عوامی جمہوریت کو فروغ حاصل ہوگا اور تیونس اور مصر میں کامیاب جمہوری انتخاب بھی منعقد ہوئے۔ لیکن عرب عوام کو شاید ابھی اور انتظار کرنا تھا اس لیے عرب دنیا کا جمہوریت کی جانب سفر درمیان میں ہی رک گیا۔ اور اب عرب دنیا کا ایک بڑا حصہ سیاسی عدم استحکام، خانہ جنگی اور شورش سے دوچار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عرب دنیا میں عوامی بیداری کی جو لہر پیدا ہوئی اس کا سب سے زیادہ فائدہ الاخوان المسلمون یا اسی جیسے نظریات کی حامل برادر مسلم تنظیموں کو پہنچ رہا تھا اور قوی امکان تھا کہ اگر جمہوریت کا قافلہ آگے بڑھتا ہے تو عرب دنیا کے بیشتر ملکوں میں یہ مسلم تنظیمیں یا تو برسر اقتدار آجائیں گی یا اہم پوزیشن حاصل کر لیں گی۔ موجودہ عالمی تناظر میں دنیا کے ارباب حل وعقد (امریکہ اور اس کے اتحادی) اور عرب حکمرانوں کے لیے عرب دنیا میں اس طرح کی کوئی سیاسی تبدیلی قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مختلف طریقوں اور حربوں کو استعمال کرتے ہوئے جمہوریت کی گاڑی کو پٹری سے اتار دیا گیا۔ الاخوان المسلمون یا اس جیسی مسلم شناخت رکھنے والی تنظیموں پر الزام یہ ہے کہ اگر یہ اقتدار میں آ گئیں تو ایک ایسے نظام کو نافذ کریں گی جس میں 'دوسروں' کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی، مذہب کے نام پر انسانی حقوق کی پامالی ہوگی اور ایسے اقدامات کیے جائیں گے جو امن عالم کے لیے خطرہ ہوں۔ حالانکہ یہ الزامات محض الزامات ہیں، حقیقت واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں اور جو

ابتدائی تجربہ تھا وہ بھی اس کی نفی کرتا ہے۔ البتہ اس کا نقصان الاخوان المسلمون کو دوہری سطح پر ہو رہا ہے، ایک طرف اس کی قیادت دار و گیر، قید و بند اور پھانسی کی سزاؤں جیسے حالات سے دوچار ہے، دوسری طرف تنظیم کے کارکنوں کے ایک بڑے طبقے میں جمہوریت اور جمہوری قدروں پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ انہیں ایسا لگتا ہے کہ جمہوریت اور عوامی خواہش جیسے نعرے محض مغربی دکھاوا ہیں اگر یہ ان کے مفادات پورے کرتے ہیں تو قابل قبول بصورت دیگر ان کے نزدیک عوامی جمہوریت کے مقابلے بدترین قسم کی آمریت زیادہ بہتر ہے اگر وہ ان کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ الاخوان المسلمون عالم عرب کی سطح پر ایک بار پھر زبردست طریقے سے انتہا پسندی اور اعتدال پسندی کی کشمکش کا شکار ہو گئی ہے۔ اعتدال اور جمہوریت کے راستے عوامی مقبولیت کا حصول اور پھر اقتدار تک رسائی کے لیے جو کوششیں تنظیم کی اعتدال پسند قیادت نے 1970ء کی دہائی کے آغاز میں شروع کی تھیں اور جن پر وہ حالات کی نامساعدت کے باوجود آگے بڑھتی رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر حالات ایسے ہی بدستور جاری رہے تو تنظیم کے اندر اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان جاری یہ کشمکش ایک بار پھر اس کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار پر منتج ہو گی۔

معلومات کی جانچ

1۔ نورسی تحریک کے بانی کو کس خطاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

2۔ رسائل نور بنیادی طور پر کیا ہیں؟

3۔ الاخوان المسلمون کا قیام کب اور کہاں عمل میں آیا؟

4۔ مصر میں جمہوری طریقے پر منتخب ہونے والے پہلے صدر کا نام بتائیں۔

12.7 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اس اکائی میں مغربی ایشیا و شمالی افریقہ کی چار بڑی مسلم تحریکات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ چاروں تحریکیں ایسی ہیں کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے علاقوں کے مسلم سماجوں کو متاثر کیا ہے بلکہ پوری مسلم دنیا پر ان کے اثرات محسوس کیے جاتے ہیں۔ ان تحریکوں کے حوالے سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان کی اکثریت اب بھی کافی فعال ہے اور اپنے اپنے دائرہ میں مصروف عمل بھی ہے ۔ چنانچہ وہابی تحریک ایک ایسے زمانے میں شروع ہوئی جب صحرائے عرب کا علاقہ پھر سے دور جاہلیت کی مثال پیش کر رہا تھا' اس نے اپنی دعوت کا مرکز توحید کے پیغام کو بنایا اور قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دیا۔ اس تحریک کو آل سعود کی سیاسی پشت پناہی حاصل رہی اور موجودہ جزیرۃ العرب کے اندر مذہبی و فکری اصلاح میں اس کا اہم رول رہا۔ سنوسی تحریک کا میدان عمل شمالی افریقہ رہا۔ اس نے اپنے زاویوں کے توسط سے افریقہ کے قبائلی اور صحرائی علاقوں میں اسلام کے پیغام کو عام کیا۔ اس کے لیے جو طریقہ کار وضع کیا گیا اس میں روحانیت اور عملیت کا ایک امتزاج تھا اور اسی چیز نے اسے اپنے دور عروج میں شمالی افریقہ کی سب سے بڑی تحریک بنا دیا۔ البتہ سیاست میں زیادہ مشغول ہو جانے کے سبب اس کا دعوتی کردار متاثر ہوا اور یہ زوال کا شکار ہوئی۔ نورسی تحریک وہاں کی دیگر تحریکوں کے مقابلے نسبتاً جدید تحریک ہے۔ اس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے۔ اس تحریک کے رہنما بدیع الزماں سعید نورسی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مخالف حالات

کے باوجود مغرب زدہ ترکی میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے چراغ کو جلائے رکھا بلکہ اپنے طلبہ اور وسائل کی مدد سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ترکی ایک بار پھر اسلام سے وابستہ اپنے ماضی کی دریافت کے راستے پر گامزن ہے۔ الاخوان المسلمون، دور جدید میں عرب دنیا کی ہی نہیں پورے عالم اسلام کی اپنے اثرات اور کام کے اعتبار سے سب سے بڑی اور منظم تحریک ہے۔ حالات میں مستقل اتار چڑھاؤ کے باوجود یہ عرب دنیا میں اپنی دینی دعوت کے کام میں مصروف ہے۔ اس کا آغاز مصر میں ہوا اور آج بھی یہ مصر کی بڑی مذہبی و سیاسی طاقت ہے البتہ اس کی سیاسی قوت ہی اب اس تحریک کے لیے مسئلہ بن گئی ہے اور اب دنیا کی بیشتر حکومتیں اس کی مخالف ہو گئی ہیں۔

12.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ وہابی تحریک کی دعوت اور اس کے اثرات پر ایک مضمون لکھیں۔

2۔ سنوسی تحریک کی تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3۔ نورسی تحریک کی خدمات کا تعارف کرائیں۔

4۔ الاخوان المسلمون کی تنظیمی خدمت سے بحث کیجیے۔

12.9 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ تاریخ فکر اسلامی: محمد اجتبا ندوی

2۔ ایک مظلوم مصلح: محمد بن عبد الوہاب۔ مسعود عالم ندوی

3۔ جدید ترکی میں اسلامی بے داری: عبید اللہ فہد

4۔ مغربی افریقہ میں اسلام: شیث محمد اسماعیل

5۔ استاد بدیع الزماں سعید نورسی: ثروت صولت

اکائی 13: نہضۃ العلماء، جمعیۃ محمدیہ، گولن تحریک، مہدوی سوڈانی، النہضۃ الاسلامیہ، تیجانیہ

اکائی کے اجزاء

13.1 مقصد

اس اکائی میں مسلم دنیا کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والی چھ تحریکات کا تعارف کرایا جائے گا۔ ان میں سے دو نہضۃ العلماء اور جمعیۃ محمدیہ کا تعلق مشرق بعید یعنی جنوب مشرقی ایشیا کے ملک انڈونیشیا سے ہے۔ یہ دونوں جماعتیں نہ صرف یہ کہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی اور بااثر تنظیمیں ہیں بلکہ اپنے کارکنوں اور ارکان کی تعداد کے اعتبار سے مسلم دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری سماجی و مذہبی تنظیمیں بھی ہیں۔ تین جماعتوں تیجانیہ، سوڈان کی مہدوی تحریک اور النہضہ الاسلامیہ (تیونس) کا تعلق شمالی و مغربی افریقہ کے علاقے سے ہے۔ تیجانیہ و مہدوی تحریک ماضی قریب میں شمالی و مغربی افریقہ کی اہم مسلم اصلاحی تحریکات رہی ہیں اور اپنے صوفی پس منظر کی وجہ سے آج بھی بعض علاقوں میں کافی اثر انداز ہیں۔ النہضۃ الاسلامیہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کا تعلق عرب دنیا میں حالیہ عوامی بیداری کی تحریک (عرب اسپرنگ) سے ہے۔ اس کا قیام تو 1980ء کی دہائی میں عمل میں آیا تھا البتہ 2011ء کے تیونسی انقلاب اور بعد میں تیونس میں جمہوریت کے سفر کے حوالے سے اس کا مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح گولن تحریک تعلیم، ذرائع ابلاغ اور بین مذہبی مذاکرات کے حوالے سے ترکی اور ترکی سے باہر پوری

دنیا میں ایک مؤثر آواز کے طور پر ابھری ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبہ جدید مسلم دور کی ان اہم تحریکات، ان کی سرگرمیوں اور جدید دنیا پر ان کے اثرات کو نہ صرف سمجھنے بلکہ ان کا معروضی تجزیہ بھی کرنے کے اہل ہوسکیں گے۔

13.2 تمہید

عالم اسلام آج تبدیلی کے جس دور سے گزر رہا ہے اس میں مسلم دنیا کے تمام خطوں اور علاقوں کی صورت حال یکساں نہیں ہے۔ اسی طرح ماضی قریب میں مسلم دنیا میں وجود پذیر ہونے والی تنظیموں اور تحریکوں کی صورت حال بھی اپنے حالات وتناظر اور دائرہ کار میں الگ الگ ہے۔ البتہ ایک چیز جو ان تمام تحریکات میں مشترک نظر آتی ہے وہ ہے اسلامی بیداری کا فروغ اور مسلم دنیا کی سیاسی وسماجی حالات کی اصلاح۔ اس طرح کئی بار یہ ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہوئے اور کئی بار تو باہم بظاہر متصادم رہتے ہوئے بھی مسلم دنیا کی تعمیر جدید میں اہم کردار کی حامل ہیں اور ان میں سے ہر جماعت اور تحریک اپنی اپنی سطح پر اپنے مفوضہ کردار کو ادا کر رہی ہے۔ اور اثرات کے اعتبار سے سبھی اپنے اپنے علاقوں میں اہمیت کی حامل ہیں۔

13.3 نہضۃ العلماء (انڈونیشیا)

13.3.1 پس منظر

آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا مسلم دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ مشرق بعید میں مختلف جزیروں پر مشتمل اس ملک کی آبادی میں 90% (نوے فیصد) سے زیادہ مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کے دور زوال میں جب یورپی سامراج نے ایشیا اور افریقہ کے ایک بڑے علاقے میں اپنی کالونیاں قائم کیں تو اس وقت انڈونیشیا ہالینڈ کے حصے میں آیا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران 1942-1945 تک ایک مختصر وقفے کو چھوڑ کر 1949ء تک انڈونیشیا پر ہالینڈ کا قبضہ رہا۔ (1942 سے 1945 تک انڈونیشیا پر جاپان کا قبضہ رہا)۔ البتہ انڈونیشیا کے مسلمانوں میں سیاسی واقتصادی بیداری اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کا آغاز بیسویں صدی کے بالکل آغاز میں ہوگیا تھا جب 1906 میں انڈونیشیا کی معیشت پر چینیوں کے غلبے کے خلاف جدوجہد کا آغاز ہوا اور جس نے آگے چل کر 1912ء میں شرکت اسلام پارٹی کی شکل اختیار کی، جو انڈونیشیا کی پہلی مسلم غیر سیاسی جماعت تھی۔ شرکت اسلام کے رہنماؤں میں ایک عبدالوہاب حسب اللہ (1971-1888) تھے جن کا تعلق انڈونیشیا کے روایتی علماء کے طبقے سے تھا۔ ان کی کوششوں سے 1916 میں نہضۃ الوطن کے نام سے جزیرہ سورابایا میں ایک تنظیم قائم ہوئی اور اسی تنظیم کے ذریعہ انڈونیشیا میں روایت پسند علماء کی سب سے بڑی، مضبوط اور بااثر تنظیم نہضۃ العلماء کے قیام کا راستہ ہموار ہوا۔

نہضۃ العلماء کے قیام کا ایک اور پس منظر یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں انڈونیشیا کے اندر مصر کے مشہور عالم اور دانشور مفتی محمد عبدہ کے افکار کو بہت تیزی کے ساتھ فروغ مل رہا تھا۔ خاص طور سے محمدیہ تحریک کے قیام نے اس میں مزید سرعت پیدا کردی کیونکہ محمدیہ تحریک کی قیادت نے بہت ہی منظم اور سائنٹفک انداز میں محمد عبدہ کی اصلاحات اور ان کے افکار کو انڈونیشیائی علماء اور سماج کے اندر متعارف کرایا اور اس کے دوررس اثرات بھی مرتب ہوئے۔ محمد عبدہٗ کے اصلاحی افکار انڈونیشیا کے روایتی علماء کے لیے قابل قبول نہیں تھے

لیکن وہیں پر جدت پسند علماء کا طبقہ ان افکار و خیالات کی اشاعت میں بھر پور حصہ لے رہا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انڈونیشیا کے سماج میں جدت پسندی اور روایت پسندی کو لے کر ایک طرح کے ٹکراؤ اور تصادم کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اور چونکہ محمد یہ تحریک کی کوششیں منصوبہ بند اور منظم تھیں اس لیے اسے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے میں زیادہ کامیابی مل رہی تھی۔ روایت پسند علماء کا طبقہ، جو ابھی تک مذہبی طور پر غالب طبقہ تھا اس کے لیے مفتی محمد عبدہٗ کی اصلاحات بدعات کا درجہ رکھتی تھیں اور وہ انڈونیشیا کے سماج پر اپنا غلبہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ عبدالوہاب حسب اللہ کا تعلق انڈونیشیا میں علماء کے اس روایت پسند طبقے سے تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ محمد عبدہٗ کی اصلاحات بدعت ہیں اور ان بدعات کے سبب انڈونیشی سماج کو جو خطرہ لاحق ہے اس کا ازالہ بہت ضروری ہے اور اس کے لیے منظم جدوجہد کی جانی چاہیے۔ چنانچہ حسب اللہ کی قیادت میں ان لوگوں نے روایتی علماء کی ایک تنظیم کے قیام کی تحریک شروع کی لیکن شروع میں اسے بہت زیادہ کامیابی اس لیے نہیں ملی کہ روایتی علماء خود آپس میں تقسیم تھے، البتہ 1926 میں یہ کوشش اس وقت کامیاب ہوگئی جب روایتی علماء کے طبقے کی اس وقت کی سب سے محترم شخصیت ہاشم اشعری (1871-1939) نے روایتی علماء کی تنظیم کے قیام کی ضرورت پر حامی بھری۔ ہاشم اشعری مشرقی جاوا کے جزیرے میں ایک بڑے دینی مدرسے کے سربراہ تھے اور تنظیم کے قیام کے بعد وہی اس کے پہلے صدر بھی منتخب ہوئے۔

13.3.2 نہضۃ العلماء: آغاز وارتقا

نہضۃ العلماء کا باقاعدہ قیام 1926 میں عمل میں آیا، اس تنظیم کے محرک اول عبدالوہاب حسب اللہ تھے البتہ اس کا پہلا صدر ہاشم اشعری کو بنایا گیا۔ نہضۃ العلماء میں صدر کو رئیس اکبر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس وقت سے نہضۃ العلماء انڈونیشیا کی دو سب سے بڑی مذہبی تنظیموں (دوسری محمد یہ ہے) میں سے ایک ہے اور روایتی مذہبی کیریکٹر کے سبب نہضۃ العلماء کا عوام پر اثر زیادہ ہے۔ تنظیم پر روایتی علماء کا غلبہ ہے اور اس کے پیروکاروں کی اکثریت شافعی مسلک سے تعلق رکھتی ہے، جو انڈونیشیا کے مسلمانوں کا اکثریتی مسلک ہے۔ انڈونیشیا میں اس تنظیم کی مقبولیت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں کے سماج میں اس کی جڑیں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں۔ اس کی طاقت وقوت کا اصل سرچشمہ انڈونیشیا کے وہ روایتی مذہبی ادارے (مدارس) ہیں جہاں بڑے پیمانے پر طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ساتھ ان کے قیام وطعام کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ ان مدرسوں میں دینی علوم کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ مذہبی علماء کی نگرانی میں عربی زبان وادب، فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ مختلف مذہبی علوم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انڈونیشیا میں اس طرح کے بڑے مدارس کی تعداد ایک اندازے کے مطابق دس ہزار کے قریب ہے اور تقریباً بیس لاکھ طلبہ ان میں تعلیم پاتے ہیں۔ یہ دینی مدارس عام طور پر انڈونیشیا کے دیہی علاقوں میں واقع ہیں اور تقریباً سبھی نہضۃ العلماء سے کسی نہ کسی طور پر منسلک ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انڈونیشیا میں نہضۃ العلماء کے ارکان اور حمایتیوں کی تعداد 3 کروڑ سے زیادہ ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انڈونیشیا کے سماج میں مذہب کا کردار کتنا وسیع اور اہم ہے۔

نہضۃ العلماء انڈونیشیا میں روایتی علماء کی ایک ایسی تنظیم ہے جس نے نہ صرف علماء کے اندر بیداری پیدا کی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے (نہضۃ العلماء یعنی علماء کی بیداری) بلکہ اس تنظیم کا انڈونیشیا کی قومی بیداری اور آزادی کی تحریک میں بھی اس کا رول بہت اہم رہا ہے، اس تنظیم نے انڈونیشیا میں سیاسی بیداری کی تحریک شرکت اسلام پارٹی میں شمولیت کے ذریعہ عوامی بیداری میں بھر پور تعاون کیا۔ اسی طرح نہضۃ العلماء نے اہل سنت والجماعت کے حصار کے اندر رہتے ہوئے انڈونیشیا کے روایتی مسلم سماج کو جوڑنے، اسے مذہب سے منسلک رکھنے اور اس

کے اندر سماجی خدمت کے جذبے کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ 1926 میں تنظیم کا جو چارٹر تیار ہوا اس میں اس تنظیم کے مقاصد پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

''مختلف سنی مسالک کے علماء کے درمیان باہمی تعلقات کو فروغ دینا، درسی کتابوں کی اچھی طرح چھان بین کرنا کہ ان میں اہل سنت والجماعت کے عقائد کے خلاف کوئی چیز نہ آنے پائے۔ درسی کتب کو بدعات سے محفوظ رکھنا۔ چار معروف اسلامی مسالک کی بنیاد پر اسلام کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس کے فروغ کے لیے کوشش کرنا، مدارس کا قیام، مساجد، خانقاہوں اور اقامت گاہوں کا انتظام و انصرام، یتیموں اور غریبوں کی دیکھ بھال، ایسی اجتماعیتوں کی تشکیل جو زراعت کو ترقی دے سکیں اور تجارت و صنعت کے شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق فروغ دے سکیں۔''

نہضۃ العلماء کے مقاصد کے اس چارٹر سے ہی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نہضۃ العلماء کی قیادت کو تنظیم کے آغاز کے دنوں سے ہی انڈونیشیا کے سماج اور اس کی ضرورتوں کا بھرپور ادراک تھا، چنانچہ انہوں نے تنظیمی اقدامات کے علاوہ ظاہری مظاہرے سے بھی روایت پسند انڈونیشیائی سماج کے حالات اور ضرورتوں کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا ایک اظہار تنظیم کے علامتی نشان یعنی جھنڈے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

1927ء میں نہضۃ العلماء نے اپنے لیے جس پرچم (جھنڈے) کا انتخاب کیا وہ بھی اس کی روایت پسندی کی دلیل ہے البتہ اس جھنڈے میں اس کی وسیع تر اسلامی اتحاد کی خواہش کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ نہضۃ العلماء کے جھنڈے میں کرہ زمین کے بالکل اوپر ایک بڑا سا ستارہ ہے جو حضرت محمد ﷺ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس بڑے ستارے کے دونوں طرف چار نسبتاً چھوٹے ستارے ہیں جو حضرت محمدؐ کے چاروں خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کرۂ زمین کی نچلی سطح پر چار اور چھوٹے ستارے دکھائے گئے ہیں یہ اہل سنت والجماعت کے چار معروف مسالک (حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ نو ستارے ایک ساتھ مل کر ان نو اولیاء اللہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جنھوں نے سب سے پہلے انڈونیشیا کے سب سے بڑے جزیرے جاوا میں اسلام کی دعوت اور اس کے پیغام کو عام کیا۔ پرچم پر گلوب اور اس کی ہری رنگت انسانیت کو اس پیغام کی یاددہانی کراتی ہے کہ اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے یعنی زمین جس سے وہ وجود میں آئی، اسی میں پلٹ کر جانا ہے اور اسی سے فیصلے کے دن اسے دوبارہ برپا کیا جائے گا۔ گلوب (کرۂ زمین) کے چاروں طرف 99 خوبصورت دائروں کے ساتھ ایک سنہری لڑی اس اللہ کے 99 ناموں کا اظہار ہے جن کے ذریعہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا اتحاد عمل میں آتا ہے۔ اس طرح غور کیا جائے تو نہضۃ العلماء کا پرچم اس کی سنی روایت پسندی، تصوف کی جانب اس کے میلان اور خاص طور پر روایتی مسلم علماء کے افکار کا اظہار ہے۔

13.3.3 لائحہ عمل اور دائرہ اثر:

نہضۃ العلماء نے انڈونیشیا میں اپنے قیام کے ساتھ ہی اپنا دائرہ کار اور طریقہ کار متعین کر لیا تھا اور اسی وقت ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیے تھے جو مستقبل میں اس کی حیثیت کا تعین کر سکیں۔ چنانچہ مذہبی مدارس اور ان کے ارد گرد انہیں کے زیر اثر وجود میں آنے والی روایتی انڈونیشی اسلامی تہذیب و ثقافت کے فروغ اور اس سے وابستگی پر خاص زور دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ تنظیم میں اساسی حیثیت

اور مرکزی کردار دونوں علماء کو حاصل تھا اور آج بھی حاصل ہے۔ ان علماء کو انڈونیشیا کی زبان میں کائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انڈونیشیا میں سماجی طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ انہیں عربی زبان وادب میں مہارت حاصل ہونی چاہیے، بیشتر اوقات عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے مکہ معظمہ میں ایک طویل عرصے تک قیام کو ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ عربی کے علاوہ دیگر اسلامی علوم میں بھی انہیں مہارت حاصل ہونی چاہیے یعنی بالعموم انہیں قرآن مجید پورا حفظ ہوتا ہے، حدیث وفقہ اور تصوف کی کتابوں کے بہت سارے متن بھی انہیں ازبر ہوتے ہیں اور ان کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی تقریر اور گفتگو کے دوران موقع بہ موقع قرآن وحدیث کے متن حوالے کے طور پر پیش کرتے رہیں اور ان کی تفسیر وتشریح کریں۔ خاص طور پر حدیث کے علم میں سند وروایت کا سلسلہ اللہ کے رسولؐ تک پہنچنا ضروری خیال کیا جاتا ہے جسے 'اجازت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی ان علماء کو حدیث بیان کرنے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ مدارس کے ان بڑے علماء کے بارے میں یہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ انہیں اسلام کی مقامی روایت کا بھی بخوبی علم ہو خاص طور پر نو (9) صوفیا اور دیگر بڑے علماء کے بارے میں ان کی معلومات عام لوگوں سے زیادہ ہو۔ ان علماء کے لیے اسلامی علوم میں مہارت ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات ان کا صاحب کشف وکرامت ہونا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے اور اس کے لیے وہاں رائج طریقت کے مختلف سلسلوں میں سے کسی ایک سے ان کی وابستگی بھی ضروری قرار پاتی ہے۔ البتہ انڈونیشیا میں علماء صرف روحانی زاویوں تک محدود نہیں ہیں اور نہ ہی ان کی رہنمائی مدرسوں کی چہار دیواری تک محدود ہوتی ہے بلکہ ان علماء کا عوام کی معاشرتی اور مذہبی زندگی میں بھی خاصا دخل ہوتا ہے۔ ان کی اکثریت عام معاشرے میں اور عام لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔ عام نمازوں کے علاوہ جمعہ کے خطبوں اور دیگر اسلامی تہواروں (عیدین) کے موقعوں پر اپنی تقریروں میں یہ عام لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے ہیں۔ اگر ان کا تعلق تصوف کے کسی سلسلے سے بھی ہوتا ہے تو پھر یہ ذکر کی محفلیں منعقد کرتے ہیں جن میں لوگ بڑی تعداد میں نسبت اور برکت کے حصول کے لیے شریک ہوتے ہیں۔ مذہبی مسائل میں فتویٰ دینا بھی ان علماء کی ذمہ داری ہے۔ انڈونیشیا کے عام سماج پر علماء کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ لوگ اکثر اپنے گھریلو معاملات یہاں تک کہ بچوں کے شادی بیاہ اور تجارت میں بھی ان سے مشورہ کرتے ہیں۔ نکاح وطلاق اور وراثت کے امور بھی علماء طے کرتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں کو علماء کی ان ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے چنانچہ عام طور پر انہیں وہ معاش کی تگ ودو سے آزاد رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مقامی باشندے اپنے علما کے لیے چاول اور کھانے کی دوسری چیزیں باہمی تعاون سے جمع کرتے ہیں۔ ان کے لیے زندگی کی دوسری ضروریات اور عمارتوں کے لیے تعمیراتی سامان بھی یہی لوگ فراہم کرتے ہیں اور نذرانے کے طور پر انہیں کچھ رقم بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رہ کر اپنے مذہبی وسماجی فرائض انجام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ مدارس کے لیے زمین اور عمارتیں بالعموم وقف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے انڈونیشیا کے مدارس کی بڑی تعداد مالی طور پر خود کفیل اور سرکاری وعوامی دباؤ سے آزاد ہے۔

انڈونیشیا کے سماج پر اپنے اثر کو قائم وبرقرار رکھنے اور اسے مزید وسعت دینے کے لیے نہضۃ العلماء کی قیادت نے وہاں کی مقبول عام مذہبی روایت کو ایک تنظیمی ڈھانچے میں تبدیل کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ سماج کے عام لوگوں کے ساتھ ان کا ربط ضبط رہتا ہے بلکہ وہ ان پر اپنے اثر کو مزید استحکام دینے میں بھی کامیاب رہتے ہیں مثلاً نہضۃ العلماء نے ابتدا سے ہی ایک مقامی روایت 'لیلۃ الاجتماع'' کو اپنے سرگرمیوں کا اہم حصہ بنائے رکھا ہے۔ لیلۃ الاجتماع ایک طرح کی ماہانہ میٹنگ ہوتی ہے جو قمری مہینوں کے پندرہویں دن مقامی علماء کے ذریعہ منعقد کی جاتی ہے۔ اس کا آغاز ان مقامی لوگوں کی غائبانہ نماز جنازہ سے ہوتا ہے جو اس دوران وفات پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد

علماء کی تقریریں ہوتی ہیں جن میں وعظ ونصیحت کے ساتھ ساتھ نہضۃ العلماء کی پالیسیوں اور پروگراموں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اسی میٹنگ میں تنظیم کی مقامی سرگرمیوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے اور انہیں مزید مؤثر بنانے کے لیے پروگرام بھی چاک آؤٹ کیا جاتا ہے۔ میٹنگ کا ایک سیشن (حصہ) سوال وجواب کے لیے ہوتا ہے۔ گویا مقامی لوگوں کو اس طرح ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جاتا ہے جس میں وہ اپنے ذاتی وروحانی (مذہبی) مسائل اپنی مذہبی قیادت کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر وہاں سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش بھی ہوتی ہے۔ مقامی علماء کی نگرانی میں انجام دی جانے والی صرف اس ایک سرگرمی سے ہی اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انڈونیشیا کے سماج میں نہضۃ العلماء کی جڑیں کتنی گہری اور مضبوط ہیں۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کے مسائل کو نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ انہیں حل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں گویا ہر عالم (کائی) کی سرپرستی میں پورا ایک سماج مصروف عمل رہتا ہے۔ اپنی عوامی مقبولیت کے سبب ہی علما بالعموم سیکولر حکمرانوں کے دباؤ سے آزاد رہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس مذہبی اختیارات کے ساتھ ساتھ اقتصادی وسائل بھی ہوتے ہیں اور وہ حکومت پر منحصر نہیں ہوتے۔ اس لیے سیکولر حکمراں خود مجبور ہوتے ہیں کہ سماج کے بہتر نظم ونسق اور اس کے مختلف مسائل کو حل کرنے کے لیے علماء کا تعاون حاصل کریں۔ انڈونیشیا کے سماج میں علماء کی اس حیثیت نے جہاں ایک طرف حکمرانوں کو مجبور کیا کہ وہ علماء کا تعاون حاصل کریں اور انہیں تحفے تحائف دے کر اپنی موافقت پر آمادہ کریں تاکہ ان کا سیاسی اقتدار برقرار اور مستحکم رہے وہیں دوسری طرف حکمراں طبقے سے علماء کی قربت کے سبب ان میں بعض اخلاقی برائیاں بھی درآئی ہیں اور ان کی وجہ سے علما کی سماجی حیثیت کو کچھ نقصان بھی پہنچا ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی نہضۃ العلماء علماء کی ایک ایسی تنظیم ہے جس میں وہ حکومت کے اثر سے آزاد رہ کر اپنی مذہبی وسماجی خدمات کے ذریعہ عوام کو متحرک اور متاثر کرتے ہیں۔

نہضۃ العلماء کو انڈونیشیا میں قیام کے بعد کی پہلی دو دہائیوں کے دوران بہت تیزی کے ساتھ فروغ حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ تنظیم کی قیادت نے عوامی روایت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ نئی ضروریات اور تقاضوں کو محسوس کیا اور ایسے اقدامات کیے جو اسے سماج کے لیے سودمند بنائے رکھیں۔ اس نے محمدیہ تحریک کی اصلاحات کی مخالفت پر بس نہیں کیا بلکہ خود بھی اصلاح کے عمل سے گزری۔ چنانچہ تنظیم کی قیادت نے انڈونیشیا میں رائج مدارس کے قدیم نظام میں دورس تبدیلیاں کیں اور ان مدارس کو نئے دور اور اس کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اس حوالے سے سب سے اہم نام واحد ہاشم (1900-1957) کا ہے جو ہاشم اشعری کے صاحب زادے تھے۔ واحد ہاشم نے انڈونیشیا میں مدارس کا ایک نیا تعلیمی نظام متعارف کرایا، مدارس کے لیے ایک باقاعدہ نصاب تعلیم تیار ہوا اور درجہ بندی کے ساتھ اس کی تدریس و تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ واحد ہاشم نے لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے الگ ادارے قائم کیے جہاں ان کی بہتر تعلیم وتربیت کا انتظام ہو۔ خواتین سماج کا آدھا حصہ ہوتی ہیں انہیں بالکل بیکار نہیں چھوڑا جاسکتا۔ واحد ہاشم نے ان کی اہمیت کو بھی محسوس کیا اور نہضۃ العلماء کا ایک بازو مسلمات کے نام سے قائم کیا جو عورتوں میں کام کرے۔ اسی طرح نوجوان کسی بھی سماج کی اصل قوت ہوتے ہیں واحد ہاشم نے نوجوانوں کی قوت اور صلاحیت کو منظم کرنے کے لیے انصار کے نام سے نہضۃ العلماء کا نوجوان بازو تشکیل دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض ہوا انڈونیشیا بیسویں صدی کے وسط (1949ء) تک ہالینڈ کی کالونی رہا۔ بیسوی صدی کے آغاز میں انڈونیشیا کی آزادی کے لیے قومی تحریکوں کا آغاز ہوا تو نہضۃ العلماء نے بھی ان میں بھرپور حصہ لیا خاص طور پر ماشوی تحریک میں شامل رہی اور آزادی کے بعد اس نے ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا خاص طور پر انڈونیشیا کی وزارت مذہبی امور کا قلمدان ایک طویل مدت تک نہضۃ العلماء کے رہنماؤں

کے ہاتھ میں رہا۔ اس کے علاوہ بھی نہضۃ العلماء کے مختلف رہنما سیاست میں سرگرم رہے اور مختلف کابیناؤں کے رکن رہے جن میں ادہم خالد کا نام سب سے نمایاں ہے جو 1952ء میں انڈونیشیا کے پہلے نائب وزیراعظم بنے۔ البتہ سیاست میں سرگرمی اور سیاست دانوں سے قربت نے اس دوران جب کہ انڈونیشیا میں ایک طرح کی جمہوری آمریت قائم تھی، نہضۃ العلماء کے مذہبی اور سماجی کردار کو مجروح بھی کیا جس کی وجہ سے 1980 کی دہائی میں ایک بار پھر تنظیم کو غیر سیاسی رخ دینے کی کوششیں ہوئیں اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی ملی لیکن 1998ء میں جنرل سوہارتو کی اقتدار سے بے دخلی کے بعد نہضۃ العلماء ایک بار پھر سیاست میں سرگرم ہوئی، اس کے سربراہ عبدالرحمان واحد نیشنل اویکننگ پارٹی بنا کر 1999ء کے انتخابات میں کامیاب بھی ہوئے اور دو سال تک انڈونیشیا کے صدر بھی رہے۔ البتہ سرگرم سیاست نہضۃ العلماء کو راس نہیں آئی، بہت جلد اس کا سیاسی بازو انتشار کا شکار ہو گیا اور اب ایک بار پھر نہضۃ العلماء نے 2010ء کے بعد سے خود کو سیاست سے پوری طرح الگ کر لیا ہے اور ایک سماجی مذہبی تنظیم کے طور پر کام کر رہی ہے۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نہضۃ العلماء نے انڈونیشیا میں روایتی مذہبی علماء کی تنظیم کے طور پر اپنا سفر محمدیہ تحریک کے ردعمل کے طور پر شروع کیا۔ 1949ء میں انڈونیشیا کی آزادی تک اس کا کردار۔ خواہ مذہبی سماجی خدمات ہوں یا ملک کی آزادی کے لیے سیاسی کوششیں۔ بہت ہی روشن رہا۔ البتہ آزادی کے بعد نامعلوم مصالح کے تحت نہضۃ العلماء سوہارتو کے آخری دور تک بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ارباب اقتدار کی حمایت کرتی رہی۔ اس کے اس رویے کے سبب نہضۃ العلماء کو اتنا فائدہ تو ضرور ملا کہ انڈونیشیا کی مذہبی بیوروکریسی پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی لیکن اقتدار سے قربت کے نتیجے میں تنظیم کے علماء میں اخلاقی زوال بھی دیکھنے کو ملا اور تنظیم کی عوامی ساکھ کو بھی نقصان پہنچا۔ 1983ء میں تنظیم کا سیاست سے الگ رہنے کا فیصلہ بھی سیاست سے اس کی وابستگی کو بالکل ختم نہیں کر سکا یہاں تک کہ 1998ء سے لے کر 2010 تک اس نے اپنے سیاسی بازو کے توسط سے انڈونیشیا کی سیاست میں بھرپور سرگرمی دکھائی۔ البتہ سیاست میں داخلے کا یہ فیصلہ بھی شاید درست نہیں تھا، اس دوران نہضۃ العلماء کی عوامی ساکھ کو مزید نقصان پہنچا۔ چنانچہ ایک بار پھر اس نے سیاست سے علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کب تک وہ اس فیصلے پر قائم رہتی ہے اور سماج و مذہب کی خدمت کے حوالے سے اپنے وقار کی بحالی میں کس حد تک کامیاب ہو پاتی ہے۔

13.4 محمدیہ تحریک (انڈونیشیا)

13.4.1 پس منظر

عام خیال یہ ہے کہ تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی تک مسلم تاجر اور صوفی انڈونیشیا کے ساحلوں پر فروکش ہونے لگے تھے۔ اسلام کی روایت کے مطابق مسلمان تاجر اور صوفی جہاں کہیں بھی گئے انہوں نے اپنے کردار و عمل اور دعوت سے وہاں کے لوگوں کو متاثر کیا۔ انڈونیشیا میں بھی مقامی باشندے (جو بیشتر بدھ اور ہندو دھرم کے ماننے والے تھے) تاجروں کے عمل اور صوفیا کی دعوت سے متاثر ہوئے اور سولہویں صدی کے آخر تک مشرق ہند کے متعدد جزائر میں عام لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مسلم صوفیا نے ان مقامات پر اپنے مدارس اور خانقاہیں قائم کیں جن میں اسلام کی وہ روایت پروان چڑھی جو اسلامی ہونے کے ساتھ ساتھ جنوب مشرقی ایشیا کی نمائندہ بھی ہے۔ اس اسلامی روایت کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (1) شہادت حق (عقیدہ توحید)، (2) پنج وقتہ نمازیں (3) سالانہ عشر و زکوۃ (4) رمضان کے روزے (5) مکہ مکرمہ کا حج۔

البتہ دیگر علاقوں کی طرح انڈونیشیا میں بھی اسلام اور مقامی مذہبی روایات کے میل جول سے ایک ایسی تہذیبی روایت پروان چڑھی جو اسی خطے کے ساتھ مخصوص ہے۔ سولہویں صدی کی آخری دہائی سے مغربی سامراج (ہالینڈ) انڈونیشیا میں داخل ہونا شروع ہوا اور دھیرے دھیرے پورے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ سامراج نے اس علاقے میں قومیت کے بیج بوئے جس کی وجہ سے مذہبی طبقے اور قوم پرستوں کے درمیان ٹکراؤ بھی ہوا البتہ سامراج کے خلاف دونوں نے مل جل کر جدوجہد کی۔ اسی دوران مذہبی اصلاح اور قرآن وسنت کی طرف واپسی کی تحریکوں کا بھی مسلم دنیا میں آغاز ہوا جس کے بڑے مبلغین جمال الدین افغانی اور مصر کے مفتی محمد عبدہٗ تھے۔

جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہٗ کی تحریک کے زیر اثر انڈونیشیا میں بھی اصلاح پسندوں کا ایک گروپ وجود میں آ گیا جس نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اسلام کی خالص مذہبی روایت میں انڈونیشیا کی مقامی مذہبی روایات کے جو عنصر شامل ہوگئے ہیں اور جو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں انہیں مسترد کیا جائے اور ان سے اسلام کی مذہبی روایت کو پاک کیا جائے۔ اسی طرح اس کا زور سیاسی آزادی اور اتحاد اسلامی پر بھی تھا۔ ان میں اہم نام حاجی عمر سعید کا آتا ہے جو شرکت اسلام پارٹی کے حوالے سے منظر عام پر آئے اور جنہوں نے اسلامی تجدید واصلاح کے ساتھ انڈونیشیا کی مکمل آزادی کے لیے تحریک چلائی البتہ شرکت اسلام کے اہداف میں سیاست چونکہ زیادہ نمایاں تھی اس لیے حاجی عمر سعید کے تجدیدی اصلاحی خیالات زیادہ فروغ نہیں پاسکے۔ البتہ اصلاح پسندوں نے مختلف ذرائع خاص طور پر اسکولوں کے قیام، اخبارات ورسائل اور علمی جرنلس وغیرہ کے ذریعے اپنے خیالات ونظریات کے فروغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ اصلاح پسندوں کے طبقے سے ہی تعلق رکھنے والے ایک مذہبی عالم حاجی احمد دحلان تھے جن کی کوششوں سے انڈونیشیا کی سب سے بڑی اور اہم اصلاح پسند تحریک وجود میں آئی جسے محمدیہ تحریک یا جمعیۃ محمدیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔

13.4.2 آغاز وارتقاء

جیسا کہ عرض کیا گیا بیسویں صدی کے آغاز میں سامراجی طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور مسلم دنیا میں اسلامی بیداری کی تحریکات کا آغاز تقریباً ساتھ ساتھ ہوا۔ انڈونیشیا کے مخصوص حالات میں شرکت اسلام پارٹی نہ صرف یہ کہ انڈونیشی مسلمانوں میں ڈچ سامراج کے خلاف سیاسی بیداری اور آزادی کے لیے جدوجہد کی تحریک تھی بلکہ اس کے جملہ مقاصد میں مسلم عوام کے درمیان اسلامی شعور کو بیدار کرنا اور انہیں اسلام کی تعلیمات کی طرف واپس لانا بھی شامل تھا۔ لیکن چونکہ یہ تحریک بنیادی طور پر سیاسی مقاصد کے لیے وجود میں آئی تھی اس لیے دھیرے دھیرے اس کی سرگرمیوں پر سیاست غالب آتی چلی گئی اور اسلامی شعور کی بیداری اور تجدید واصلاح کا اس کا ایجنڈا کہیں پیچھے رہ گیا۔ اس اہم موڑ پر شرکت اسلام سے وابستہ بعض ممتاز رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ مقامی مسلمانوں کی تعلیمی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ پارٹی کی ایک ذیلی تنظیم قائم کی جائے جس پر سیاست کا عنصر غالب نہ ہو اور جو انڈونیشی مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور تعلیمی وسماجی ترقی کے میدانوں میں کام کرے۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت شرکت اسلام کے ایک نمایاں اور سرگرم رہنما حاجی احمد دحلان نے 1 نومبر 1912ء کو جکارتا میں جمعیۃ المحمدیہ کے نام سے ایک مذہبی سماجی تنظیم قائم کی تاکہ اس کے ذریعہ انڈونیشیا کے مسلمانوں میں اسلامی شعور کو بیدار کیا جائے، ان کی تعلیمی ترقی کے لیے جدوجہد کی جائے اور سماجی ومذہبی اصلاح کے ذریعہ ان کے اندر اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جائے۔ چنانچہ اپنے قیام کے پہلے دن سے ہی جمعیت محمدیہ انڈونیشیا کے مسلمانوں میں اسلامی تعلیمات کے فروغ، ان کی مذہبی اصلاح اور ان کی تعلیمی ترقی کے کاموں میں

مصروف ہے۔اس تنظیم کے رہنماؤں نے اپنے طور پر اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ انڈونیشیا کے سماج میں مقامی مذہبی روایات کے زیر اثر اور سامراجی طاقتوں کی کوششوں سے غیر اسلامی افکار وخیالات کو جو غلبہ حاصل ہو گیا تھا، اس کے اثرات کو زائل کیا جائے، اصلاح کی کوششوں کے ذریعہ لوگون کے سامنے اسلام کی صحیح اور واضح تصویر پیش کی جائے اور تعلیم کے فروغ کے ذریعہ ان کے اندر روشن خیالی اور جدید دور کے تقاضوں اور ضروریات سے واقفیت پیدا کی جائے۔اس وقت جمعیت محمدیہ نہ صرف یہ کہ انڈونیشیا کی دوسب سے بڑی مذہبی جماعتوں میں سے ایک ہے بلکہ مسلم دنیا کی اصلاحی اسلامی تحریکات میں بھی اسے نمایاں مقام حاصل ہے۔بنیادی طور پر سماجی مذہبی جماعت ہونے کے باوجود انڈونیشیا کی سیاست پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔1998ء میں جنرل سوہارتو کی حکومت کے خلاف تحریک میں اس کے رہنماؤں کا رول بہت ہی اہم رہا ہے۔بعد کے سیاسی حالات میں بھی اس تنظیم کی قیادت سرگرم رہی ہے۔اس کے ایک رہنما امین رئیس عبدالرحمان واحد کی حکومت میں انڈونیشیا کی پارلیمنٹ کے اسپیکر رہ چکے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ انڈونیشیا کے مسلم سماج پر جمعیت محمدیہ کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔سیاسی امور میں شرکت کے باوجود اس تنظیم نے اپنے سماجی مذہبی اصلاح کی تحریک کے کردار کو بڑی حد تک برقرار رکھا ہے۔تنظیم کی اس کامیابی کے پیچھے اس کے ابتدائی رہنماؤں خاص طور پر حاجی احمد دحلان کی اس منصوبہ بندی اور حکمت عملی کا بھی بڑا ہاتھ ہے جس کے تحت قیام کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے سماج کے تمام طبقات کے لیے پالیسی اور منصوبے بنائے اور بہت جلد اسے ایک ہمہ گیر تحریک میں بدل دیا۔چنانچہ 1930ء میں محمدیہ تحریک کے رہنماؤں نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس کا مقصد انڈونیشیا کی سماجی اور مذہبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینا تھا اور اس جائزے کی بنیاد پر اپنی سفارشات پیش کرنی تھیں۔اس کمیٹی نے اس وقت اسلامی قوانین، سیاست، خواتین کے امور، بچوں، نوجوانوں، اسکاؤٹوں وغیرہ کی تعلیم، لائبریری، فن تعمیری، سماجی بہبود، صحت عامہ کے مسائل، اقتصادی ترقی اور اوقاف کے انتظامات وغیرہ امور کا تفصیلی مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے بعد تنظیم کی قیادت کے سامنے اپنی تجاویز پیش کیں۔اس مطالعے اور تجاویز کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی روشنی میں جمعیت محمدیہ کی قیادت کو اپنا آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے میں بڑی آسانیاں ہو گئیں۔چنانچہ تنظیم نے اپنے آپ کو ایک امبریلا (Umbrella) تنظیم کے طور پر آگے بڑھانا شروع کیا۔مثال کے طور پر اس نے خواتین میں اپنے کام کو بڑھانے اور موثر بنانے کے مقصد سے جمعیت عائشہ کے نام سے خواتین کا ایک الگ بازو قائم کیا۔ان کی تعلیمی اور تنظیمی بہبود کے منصوبے بنائے، اسی طرح خواتین اور مردوں کے درمیان مطلوبہ دوری کو بھی بنائے رکھنے کی کوشش کی۔خواتین میں طبی تعلیم کے حصول کی حوصلہ افزائی کی کیونکہ اس طرح خواتین میں مریضوں کی دیکھ بھال اور علاج کا کام زیادہ بہتر طور پر ہو سکے گا۔جمعیت عائشہ سے متعلق خواتین کے لیے ڈھیلا ڈھالا لباس پہننا اور سر پر اسکارف باندھنا لازمی ہے۔خواتین کی یہ تنظیم اپنی سرگرمیوں کے سبب عالمی سطح پر معروف ہے۔

13.4.3 بانی تحریک: حاجی احمد دحلان

جمعیت محمدیہ کے بانی ومؤسس حاجی احمد دحلان (پیدائشی نام محمد درویش) کا شمار جدید انڈونیشیا کے بڑے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔وہ ایک بڑے عالم دین، مصلح اور انقلابی تھے۔ان کا تعلق جکارتا کے ایک دیندار مسلم گھرانے سے تھا، ان کے والد اور نانا وہاں کی مسجدوں کے متولی اور صاحب حیثیت لوگ تھے۔1868ء میں وہ جکارتا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم انہوں نے گھر، مسجد اور

اسکول میں پائی اور اس کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لیے مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں انہوں نے عربی زبان وادب، اسلامی علوم (قرآن، حدیث، فقہ) اور تاریخ وفلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ حجاز میں قیام کے دوران ہی انہیں مسلم دنیا کے بڑے رہنماؤں اور علماء سے ملاقات اور استفادے کا موقع ملا یہیں پر انہوں نے مسلم دنیا کی اصلاحی تحریکات اور ان کے رہنماؤں کے افکار وخیالات کا مطالعہ بھی کیا اور ان کے اثرات قبول کیے۔ خاص طور پر جمال الدین افغانی اور محمد عبدہٗ کی اصلاحی فکر سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ جب وہ مکہ سے انڈونیشیا واپس لوٹے تو ان کے ذہن میں اپنے ملک میں اصلاح کا کام کرنے کے لیے ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ انہوں نے مسجد میں اپنے والد کی جگہ لی (بحیثیت متولی)۔ پورے جاوا جزیرے کا اس طرح سفر کیا کہ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور لوگوں میں اسلام کے پیغام کو عام کرتے تھے۔ سفر کے دوران انہوں نے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی جو مسلم سماج میں ترقی کے کاموں میں مصروف تھے یا ان کاموں کو کرنا چاہتے تھے۔ (دعوت اور تجارت کا یہ تصور انڈونیشیا کی جمعیت محمدیہ کا امتیازی وصف ہے)۔ اپنی فکر کی اشاعت کے لیے انہوں نے مدرسہ محمدیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا اور اس میں روشن خیال علماء کو طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لیے رکھا جس نے آگے چل کر جمعیت محمدیہ کے قیام کا راستہ ہموار کیا۔

حاجی احمد دحلان نے اپنی پوری زندگی جمعیت محمدیہ کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی باقی عمر کا بیشتر حصہ دعوتی افکار میں گزارا یہاں تک کہ 59 سال کی عمر میں جب ان کا انتقال ہوا تو اس وقت تک اس تحریک کی جڑیں انڈونیشی سماج میں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیچھے رفقاء اور شاگردوں کا ایک نمائندہ گروپ چھوڑا جس نے ان کے بعد ان کے اصلاحی کاموں کو آگے بڑھایا۔ چونکہ ان کا تعلق خود بھی علماء کے طبقے سے تھا اس لیے انڈونیشیا میں انہیں اپنے اصلاحی کام کے حوالے سے نسبتاً کم مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح انہوں نے خود کو مروجہ سیاست سے بھی کسی قدر دور رکھا اور سماجی تبدیلی کے حصول کے لیے کبھی بھی سخت گیر موقف کی حمایت نہیں کی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی برپا کردہ تحریک جمعیت محمدیہ بہت جلد پورے انڈونیشیا میں پھیل گئی۔

13.4.4 جمعیت محمدیہ کے اغراض ومقاصد:

1912ء میں جمعیت محمدیہ کے قیام کے وقت جن مقاصد کا حصول اس کا ہدف قرار پایا، ان کی مختصر تفصیل ذیل میں درج کی جا رہی ہے:

1- سب سے پہلا اور اہم مقصد مسلمانوں کی مذہبی اور سماجی اصلاح کرنا تھا۔

2- دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو غیر اسلامی رسوم وعقائد سے نجات دلائی جائے اور ان کے اندر سے کورانہ تقلید کے رجحان کو ختم کیا جائے۔

3- قرآن مجید کو ایک زندہ کتاب ہدایت کی شکل میں پیش کرنا اور لوگوں کو یہ بتانا کہ اس کی تعلیمات ملک وسماج کو درپیش مسائل کو حل کرنے میں بہترین رہنمائی کرتی ہیں۔

4- اسلامی اصولوں کو نظام تعلیم کی اساس بنانا اور ان اصولوں پر مبنی نظام تعلیم کے فروغ کے ذریعے ملک میں تعلیم کو وسیع پیمانے پر پھیلانا۔

5- مدارس کے نظام میں تجدید واصلاح کے ذریعہ اسلامی علوم کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کرنا اور اس کے ساتھ ہی ان تعلیمی اداروں میں جدید علوم وفنون کی تعلیم کو بھی متعارف کرانا۔

6- اسلامی نظام حیات کی سماج میں ترویج و اشاعت کے لیے کوشش کرنا اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق درست کرنا۔

7- مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور تعلیمی اصلاح کی غرض سے بڑے بڑے پیمانے پر تعلیمی و رفاہی ادارے قائم کرنا۔

8- مردوں کی طرح عورتوں کے لیے بھی دینی و عصری تعلیم کو ضروری قرار دینا اور ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کرنا۔ سماجی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی ان کے حقوق کی حفاظت کرنا۔

درج بالا مقاصد کے حصول کے لیے جمعیت محمدیہ کے بانی حاجی احمد دحلان، ان کے رفقاء کار اور تنظیم کے دیگر کارکنوں نے بھرپور محنت کی۔ پورے انڈونیشیا کے اندر بہت ہی کم عرصے میں انہوں نے مذہبی و عصری تعلیم کے جدید اداروں کا ایک جال سا بچھا دیا یعنی بڑے پیمانے پر اسلامی مدارس اور کتب خانے قائم کیے۔ عام لوگوں تک قرآن کی تعلیمات کو براہ راست پہنچانے کے مقصد سے تنظیم نے اس بات پر توجہ دی کہ قرآن مجید کے مقامی ملائی اور جاوی زبانوں میں ترجمے کیے جائیں اور پھر ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے۔ سماجی اصلاح کی سطح پر بھی جمعیت محمدیہ نے بڑے پیمانے پر کام کیا، اس نے مریضوں کے علاج کے لیے شفا خانے قائم کیے، سماج کے یتیم بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کے لیے یتیم خانے قائم کیے، ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے محتاج خانے قائم کیے۔ دیگر سماجی ضروریات کے لیے بھی بہت سے خیراتی ادارے قائم کیے۔ اسی طرح زکوٰۃ و صدقات کو وصول کرنے، ان کو ضرورت مندوں تک پہنچانے اور مفید کاموں میں لگانے کا انتظام بھی جمعیت محمدیہ نے کیا۔ اس نے طلبہ، خواتین، پیشہ ور طبقے اور مزدوروں کو منظم کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کے مقصد سے ان کی متعدد ذیلی تنظیمیں بھی بنائیں تاکہ زیادہ منظم انداز میں اور زیادہ بہتر طور پر تنظیم کے مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔

13.4.5 جمعیت محمدیہ کی بعض نمایاں خدمات:

جمعیت محمدیہ سے وابستہ رہنماؤں کو انڈونیشیا کے سماج اور وہاں کے مسائل کا اچھی طرح ادراک تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے وسائل، افرادی قوت اور سماجی و مذہبی حدود کو سامنے رکھتے ہوئے چار کاموں پر خصوصی توجہ دی:

(1) اسلام کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کرنا۔ انڈونیشیا میں جمعیت محمدیہ کی قیادت کو یہ بات بہت اچھی طرح معلوم تھی اور ہے کہ ملک کے مخصوص حالات میں اسلام کی جو مقامی روایت انڈونیشیا میں پروان چڑھی ہے اس پر ہندو اور بدھ مذہبی روایتوں کا گہرا اثر ہے۔ یہ اثر صرف ثقافتی و سماجی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بہت سے معاملات میں عقائد و اعمال پر بھی ان کا اثر ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود مقامی مسلمانوں میں ایسے افراد و عناصر موجود ہیں جو اپنے مخصوص مفادات کے تحت ان غیر اسلامی اثرات کو تقویت پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ البتہ محمدیہ کی قیادت نے مقامی طور پر مضبوط روایتی مذہبی قیادت سے ٹکراؤ اور تصادم کا راستہ اختیار کرنے یا براہ راست اس کی مخالفت کرنے کے بجائے اس سے گریز کا رویہ اپنایا اور عوام سے براہ راست تعلق قائم کر کے انہیں رسموں اور روایتوں میں الجھانے کے بجائے ان کے سامنے اسلام کی صاف ستھری اور سادہ تعلیمات کو پیش کیا۔ ان میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی کہ مذہب پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری نہیں بلکہ یہ سب کے لیے ہے، ہر کوئی اسے سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل کر سکتا ہے اور اس کے لیے قرآن و سنت کی تعلیمات کافی ہیں، کسی خارجی وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی وہ چیزیں جو انڈونیشی مسلمانوں میں مذہب کے حصے کے طور پر رائج ہوگئی تھیں حالانکہ وہ مذہبی عقائد کے خلاف تھیں، دھیرے

دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں۔

(2) جمعیت محمد یہ نے اپنی صلاحیتوں کو جس دوسرے کام پر لگایا وہ یہ کہ جدید افکار کی روشنی میں اسلامی نظریات کا مطالعہ کیا جائے اور آج کا مسلم سماج جدید نظریات کے سبب جن مسائل سے دوچار ہے، ان کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہالینڈ کی کالونی ہونے کی وجہ سے انڈونیشیا بھی مغربی استعمار کے پیدا کردہ مسائل سے دوچار ہوا۔ وہاں بھی جدید اور مشنری نظام تعلیم نے نئی جدید تعلیم یافتہ نسل کو نہ صرف مذہب سے دور اور بے زار کیا بلکہ ان میں ایسے خیالات کو فروغ دیا کہ ان کا مذہب جدید زمانے کی ضروریات اور مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ جمعیت محمد یہ کی قیادت نے دانستہ طور پر اس بات کے لیے کوشش کی کہ سماج کے اندر پائی جانے والی جدید وقدیم کی تقسیم ختم ہو۔ انہوں نے ایسے ادارے اور افراد تیار کیے جو اسلام کی سمجھ رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید زمانے کے افکار ونظریات اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل سے اچھی واقفیت رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق جدید مسائل کے حل پیش کیے اور اس حوالے سے بنیادی لٹریچر کی فراہمی کا کام کیا۔

(3) انڈونیشیا ایک طویل عرصے سے عیسائی ہالینڈ کی کالونی رہا تھا۔ اسے صرف جدید ذہن کے مسائل کا ہی سامنا نہیں تھا بلکہ وہاں مخالفین اسلام کی ایک ایسی مقدار موجود تھی جو اسلام پر مختلف جہتوں سے حملے بھی کرتی تھی اور اس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں بھی کرتی تھی۔ جمعیت محمد یہ نے انڈونیشیا کی مخصوص صورت حال کے تناظر میں اس جانب بھی توجہ دی اور ایسے اقدامات کیے جن کے ذریعہ مخالفین اسلام کے ذریعہ اسلام پر کیے جانے والے حملوں کا دفاع کیا جا سکے اور ان کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کی جارہی ہیں انہیں طشت ازبام کیا جا سکے۔ اس طرح مخالفین کے حملوں سے اسلام کا دفاع اور ان کی سازشوں سے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا جمعیت محمد یہ کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

(4) جمعیت محمد یہ نے جس حوالے سے انڈونیشیا میں اپنی شناخت کو سب سے زیادہ مستحکم کیا ہے وہ تعلیم کا میدان ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے خود تحریک کے بانی حاجی احمد دحلان کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اسلام سے مسلمانوں کی صحیح معنوں میں وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے نظام تعلیم کی اس طور پر اصلاح کی جائے کہ وہ ان کی مذہبی اور عصری دونوں طرح کی ضروریات کو پورا کرنے والا ہو۔ اس حوالے سے جمعیت محمد یہ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انڈونیشیا کے نظام تعلیم میں قدیم وجدید تعلیمی نظاموں کے درمیان پائی جانے والی دوری کو ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انڈونیشیا میں دو طرح کے تعلیمی نظام تھے ایک سرکاری اسکول جہاں مذہب اسلام کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا اور دوسرا دینی مدارس کا نظام جہاں سے جدید علوم کا گزر نا ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جدید تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے مذہبی تعلیم سے بے خبر رہتے تھے اور دینی مدارس کے طلبہ جدید علوم سے بے گانہ رہتے تھے۔ جمعیت محمد یہ نے ابتدا میں اس کے لیے کوشش کی کہ جدید طرز کے تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم کا انتظام ہو جائے اور دینی مدارس کے نصاب میں جدید علوم وفنون کو بھی متعارف کرایا جائے۔ لیکن جب سرکاری طور پر ان کوششوں کو کامیابی نہ ملی تو پھر انہوں نے مدارس محمد یہ کے نام سے ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جہاں دینی وعصری علوم وفنون کی تعلیم اعلیٰ معیار پر اور جدید اصولوں کے مطابق دی جاتی ہے۔ یہ مدارس پورے انڈونیشیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ملک کی تعلیمی ترقی میں نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔ جمعیت محمد یہ نے صرف ان تعلیمی اداروں کو قائم کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کو مؤثر اور Relavant بنائے رکھنے کے لیے اساتذہ کے تربیتی ادارے

بھی قائم کیے تاکہ ان مدارس کو مطلوبہ صفات کے حامل اساتذہ آسانی سے فراہم ہوں۔ مدارس کے علاوہ جمعیت محمدیہ نے جدید تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے بھی جدوجہد کی جس کے نتیجے میں ملک بھر میں جدید تعلیم کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فہرست موجود ہے جو اس کے قائم کردہ اور زیر انتظام ہیں۔

اس طرح دیکھا جائے تو جمعیت محمدیہ انڈونیشیا کی ایک ایسی مذہبی سماجی تنظیم ہے جس کی گرفت وہاں کے مسلم معاشرے پر کافی مضبوط ہے۔ اس کا ریکارڈ بہت ہی صاف ستھرا ہے، اس سے وابستہ افراد کی تعداد تین کروڑ تک پہنچتی ہے اور ان کی سرگرمیاں زیادہ تر رضا کارانہ ہوتی ہیں۔ 1949ء میں انڈونیشیا کی آزادی کے بعد حالانکہ اس تنظیم کے ڈھانچے اور طریقہ کار میں معمولی تبدیلیاں آتی رہی ہیں لیکن اس کی بنیادی صفات پہلے ہی جیسی ہیں۔ اس نے اپنے قیام کے ایک صدی کے سفر میں اس نے انڈونیشیا کے سماج پر دور رس اثرات چھوڑے ہیں۔ اس تنظیم نے عام لوگوں کی ایک ایسے نظریے کی طرف رہنمائی کی ہے جو علمی بھی ہے اور صاف ستھری اخلاقیات پر مبنی ہے۔ جمعیت محمدیہ کی یہی وہ طاقت ہے جو مشرق بعید کے مخصوص تمدنی اور ثقافتی تناظر میں اپنے کارکنوں کو پیش آمدہ معاملات میں نئے تجربے کرنے کی دعوت دیتی ہے اور تنظیم کو بامعنی بنائے رکھتی ہے۔

13.5 گولن تحریک یا خدمت تحریک

13.5.1 پس منظر

کمال اتاترک (مصطفیٰ کمال پاشا) جو جدید ترکی کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے ترکی کو استبداد سے نجات دلانے کے ساتھ اسے استعمار کی غلامی میں جانے سے بچایا۔ بلاشبہ مصطفیٰ کمال پاشا کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ترکی کی ایک ایسے وقت میں مسیحائی کی جب وہ مسلسل شکستوں سے دوچار تھا، البتہ اس نے ترکوں سے اس کی قیمت جو وصول کی وہ بہت بھاری تھی۔ ترکی میں خلافت کا ادارہ ہی ختم نہیں ہوا بلکہ اسے مسلم دنیا سے اس طرح کاٹ دیا گیا کہ اس کی شناخت ہی ختم ہونے لگی۔ جدید ترکی کی تشکیل یا ترکی کی تعمیر نو کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا نے جو چھ اصول- یعنی جمہوریت (ایک جماعتی جمہوریت)، قوم پرستی، عوام پسندی، قومی ملکیت، سیکولرزم (لادینیت) اور انقلابیت- وضع کیے وہ سب کے سب مذہب دشمنی پر مبنی یا اس کی طرف لے جانے والے تھے۔ جمہوری اصلاحات کے نام پر مدرسوں اور خانقاہوں کو بند کر دیا گیا، ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر ترکوں کو اپنے ہزار سالہ علمی سرمائے سے محروم کر دیا گیا۔ عربوں کی مخالفت میں عربی زبان پر پابندی عائد کر دی گئی۔ عورتوں کے لیے حجاب ممنوع قرار پایا اور مردوں کے لیے مغربی لباس کو ضروری قرار دے دیا گیا۔ اس طرح مصطفیٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں نے اپنے طور پر پوری کوشش کی کہ ترکی سے مذہب یعنی اسلام کو دیس نکالا دے دیا جائے۔ البتہ اس کے باوجود آج ہم دیکھتے ہیں کہ ترکی نہ صرف یہ کہ دنیا کے نقشے پر بحیثیت ایک مسلمان ملک موجود ہے بلکہ پچھلی دو دہائیوں کے دوران اس نے مسلم دنیا سے اپنے رابطے بھی استوار کیے ہیں اور اپنے ماضی کی کسی قدر بازیافت کی بھی کوشش کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب ترکی کی حکومت اپنی تمام مشنری کے ساتھ اسلام کے درپے آزار تھی، وہ کون سی قوت تھی جس نے ترکی کا اسلامی دفاع کیا؟ اس سوال کے جواب کے لیے جدید ترکی کی تاریخ و سیاست کا مطالعہ ہماری جس طرف نشان دہی کرتا ہے

وہ ہے جدید ترکی کا مرد درویش یعنی بدیع الزمان سعید نورسی (سعید نورسی اور ان کی تحریک کے بارے میں ہم پچھلی یونٹ میں پڑھ چکے ہیں) جس نے سیاست سے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے، قید و بند اور جلاوطنی کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ خود کو دین اسلام سے وابستہ رکھا بلکہ رسائل نور اور طلبہ نور کی شکل میں ایسے دیے روشن کیے جن سے چراغ پر چراغ جلتے چلے گئے اور آج کا ترکی نہ تو اسلام سے اپنے رشتے پر پشیماں ہے اور نہ ہی مسلم دنیا سے خود کو کاٹ لینے کے لیے کوشاں۔

استاد بدیع الزماں سعید نورسی کے اثرات یا طلبہ نور کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو جدید ترکی کا گزشتہ چند دہائیوں کے دوران اسلام پسندی کی جانب سفر اسی کی دین ہے۔ نجم الدین اربکان اور اب رجب طیب اردوگان کو ترکی میں اگر سیاسی اسلام کا نمائندہ اور روح رواں باور کیا جاتا ہے تو استنبول فاؤنڈیشن اور گولن تحریک کے حوالے سے فتح اللہ گولن کو سماجی اسلام کا نمائندہ اور روح رواں سمجھا جاتا ہے۔

13.5.2 آغاز وارتقا

ترکی اور بیرون ترکی گولن تحریک۔ یہ اس تحریک کا اصل نام نہیں ہے بلکہ صحیح معنوں میں ابھی تک اس تحریک کو کوئی نام ہی نہیں دیا جا سکا ہے، گولن اور ان کے پیروکار کئی بار اسے خدمت تحریک کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ترکی میں عوامی سطح پر اسے جماعت (گروپ) کے نام سے بھی جانا اور یاد کیا جاتا ہے۔ تعلیم اور خدمت کے حوالے سے موجودہ مسلم دنیا کی ایک اہم اور بڑی تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس تحریک کے پس منظر اور ابتدا کے بارے میں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ گولن تحریک اپنی اصل میں اور بنیادی طور پر بدیع الزماں سعید نورسی کی برپا کردہ نورسی تحریک کی توسیع ہے یا اس نے نورسی تحریک کے تعلیمی منصوبوں یا تعلیم کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے قریب کرنے کے منصوبے کو آگے بڑھانے کا عزم کر رکھا ہے۔ حالانکہ حالیہ چند برسوں کے دوران اس نوخیز تحریک نے اپنے فعال رہنما کی قیادت میں اپنے دائرہ کار کو وسعت دی ہے اس نے طلبہ کے لیے ہاسٹلوں اور اسکولوں کے قیام سے آگے بڑھ کر ذرائع ابلاغ، انسانی بنیادوں پر امداد، مذاہب کے مابین مکالمے اور پیشہ وروں کی تنظیموں کے قیام جیسے دیگر میدانوں میں بھی اپنے کام کو بڑھایا ہے۔

گولن تحریک کی ابتدا کے بارے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ 1960ء کی دہائی کے آخری برسوں میں اس کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا جب اس تحریک کے بانی فتح اللہ گولن نے ترکی کے تیسرے بڑے شہر ازمیر کے اطراف میں سمر اسلامک کلاسز (گرمیوں کی چھٹیوں میں دینی تعلیم) کا اہتمام کرنا شروع کیا۔ فتح اللہ گولن نے جس مدرسے میں وہ استاد تھے اس کے منتظمین اور کچھ مقامی تاجروں کے ساتھ مل کر مڈل اور ہائی اسکول کے طالب علموں، اس کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبا کے لیے بھی، سالانہ سمر کیمپ لگانا شروع کیا۔ ان کیمپوں میں سیکولر تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی مضامین کی تدریس کا بھی انتظام ہوتا تھا۔ 1970ء کی دہائی کے شروع میں فتح اللہ گولن کے معتقدین نے اس وقت ایک منظم جماعت یا گروپ کی شکل اختیار کرنا شروع کی جب انہوں نے گولن کی تعلیمات پر مبنی اجتماعات کا سلسلہ شروع کیا اور 'نور خانہ' کے نام سے طلبا، ان کے والدین اور کچھ مخیر حضرات پر مشتمل ایک یونٹ کی تشکیل عمل میں آئی۔ بعد میں 'نور خانوں' کی تعداد بڑھتی گئی اور انہوں نے تعلیم وہدایت کے ایسے مراکز کی شکل اختیار کر لی جہاں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا اور بڑی تعداد میں ایسے ماہرین تعلیم تیار ہوئے جنھوں نے فتح اللہ گولن کے تعلیمی فلسفے کے تحت وجود میں آنے والے اسکولوں کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ بعد ازاں گولن تحریک کی جڑیں ترکی میں اس وقت مزید مضبوط ہوئیں جب اس تحریک کے افراد نے اپنے لیڈر کی رہنمائی میں ایسے ہاسٹل بنانے شروع کیے جن میں یونیورسٹیوں اور جدید کالجوں

کے طلبا رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ ان ہاسٹلوں کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں رہائش پزیر طلبا کے درمیان اخوت وتعاون کا جذبہ فروغ پاتا تھا، وہ ایک دوسرے کی تعلیم میں مدد کرتے تھے، یکجا نماز ادا کرتے، اسلامی اقدار کا درس لیتے، قرآن مجید، سعید نورسی اور فتح اللہ گولن کی تحریروں کا مطالعہ کرتے۔ گولن تحریک کے یہ ہاسٹل اپنے آپ میں ایک نمونہ تھے اور بہت سے والدین کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کے بچے اس تحریک کے ہاسٹلوں میں رہ کر تعلیم حاصل کریں کیونکہ یہاں مقیم طلبا بہت سی اخلاقی اور سماجی برائیوں سے محفوظ ہوتے تھے۔ یہی طلبا آگے چل کر گولن تحریک کے ہر جگہ سفیر بن گئے اور اس کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ 1970ء کی دہائی میں گولن تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم پر امیر خاندانوں کی اجارہ داری ختم کرنے میں بھی اپنا کردار اس طرح ادا کیا کہ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبہ کے داخلے کے لیے تیاری کا کورس کرانا شروع کیا۔ ان کورسوں کی بدولت مڈل اور ملازم کلاس کے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو یونیورسٹیوں میں داخلے ملنے لگے۔

1980ء کی دہائی کے شروع میں جب ترکی کے اندر نئی لبرل پالیسی کے تحت نجی تعلیمی اداروں کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا تو گولن تحریک کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے ازمیر اور استنبول میں گولن کے تعلیمی افکار پر مبنی دو ہائی اسکول قائم کیے جہاں سیکولر تعلیم کے ساتھ اسلامی اقدار کو جمع کر دیا گیا تھا۔ ان کی کامیابی کے ساتھ آنے والے دہائیوں میں اس طرز کے اسکولوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ پہلے ترکی کے مختلف علاقوں میں یہ اسکول قائم ہوئے اور اب پوری دنیا میں گولن تحریک کے اسکولوں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک قائم ہو چکا ہے جو اپنی اعلیٰ معیاری تعلیم اور اخلاقی اصول وضوابط کے سبب ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تعلیم کے میدان میں مسلسل کامیابیوں کے ساتھ گولن تحریک نے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی قدم رکھنے شروع کیے خاص طور پر ذرائع ابلاغ پر اس تحریک نے زیادہ توجہ دی اس کے نتیجے میں ترکی اور ترکی سے باہر اس کے میڈیا ہاؤسز کا قیام عمل میں آیا۔ ترکی میں کئی اخبارات اور ٹیلی ویژن چینل گولن تحریک یا اس سے وابستہ لوگوں کی ملکیت ہیں۔ اس تحریک کے متعدد پبلشنگ ہاؤسز بھی ہیں جہاں سے فتح اللہ گولن اور ان کے ہم خیالوں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ ترکی سے باہر بھی کئی پبلشنگ ہاؤس اور اخبارات ورسائل گولن تحریک کے افراد کی ملکیت ہیں اور جو اس تحریک کے فروغ کے لیے کام کرتے ہیں۔ اسی طرح گولن تحریک نے اپنی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز خدمت خلق کے شعبے کو بنایا ہے اور اس حوالے سے اس کے افراد پوری دنیا میں مختلف مواقع پر آسمانی اور انسانی آفات میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ گولن تحریک اپنی تعلیمی اور سماجی خدمات کے حوالے سے موجودہ دور میں مسلم دنیا کی ایک اہم اور کامیاب تحریک بن کر ابھری ہے۔ اس کا نیٹ ورک بہت ہی منظم اور فعال ہے۔ ابھی حال کے دنوں میں اس نے تکثیری سماجوں کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بین المذاہب مذاکرات، ان کی اہمیت اور ضرورت پر لیکچرس اور کتابوں کی تیاری کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ یہ ایک عالمی نیٹ ورک کے طور پر کام کرتی ہے اور اپنے لبرل اسلامی خیالات کی بدولت مغرب میں بھی کافی مقبول ہے۔ حالانکہ بانی تحریک کے لبرل خیالات کے سبب ہی کئی بار تحریک اور بانی تحریک کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور امریکہ میں اس کے مرکز اور بانی کی موجودگی کے سبب یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ عالمی سامراج (استعمار) کا ایک مہرہ ہے جسے مسلمانوں میں رسوخ حاصل کرنے اور ان کو ان کے اصل مقصد سے ہٹانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

13.5.3 بانی تحریک: فتح اللہ گولن:

گولن تحریک کے بانی فتح اللہ گولن ہیں۔ وہ 1941ء میں ارض روم کے علاقے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد امام تھے۔ انہیں گاؤں سے قریب ایک سرکاری پرائمری اسکول میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا جہاں وہ تین برس تک پڑھتے رہے لیکن اس کے بعد ان کے والد کا تبادلہ ایک دوسری جگہ ہوگیا جہاں سکنڈری تعلیم کا انتظام نہیں تھا اس لیے فتح اللہ گولن کی رسمی تعلیم کا سلسلہ یہاں پر ختم ہوگیا البتہ انہوں نے گھر پر اپنے والد کی نگرانی میں اور ذاتی مطالعے کے ذریعے پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے والد نے انہیں نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اسباق پڑھائے بلکہ ان کی ایسی تربیت کی کہ مذہب اور مذہبی اقدار ہمیشہ کے لیے ان کی زندگی کا حصہ بن گئیں۔ اسی طرح بچپن سے ہی فتح اللہ گولن کو ایسے لوگوں کی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا جو مذہب، جدید دور کے تقاضوں اور اس میں مذہب کی معنویت پر غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں فتح اللہ گولن اپنے بعض غیر رسمی اساتذہ کے توسط سے بدیع الزماں سعید نورسی اور ان کی تعلیمات سے متعارف ہوئے۔

حالانکہ فتح اللہ گولن کو رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، اس کے باوجود علم سے انہیں لگاؤ تھا۔ اپنی ذاتی کوششوں سے انہوں نے نہ صرف یہ کہ دین کی بنیادی تعلیم حاصل کی بلکہ آزاد امیدوار کے طور پر سیکنڈری اسکول کا امتحان بھی پاس کیا۔ انہیں سائنس، فلسفے، ادب اور تاریخ جیسے علوم سے دلچسپی تھی۔ اسی طرح وہ رات کو دیر تک جاگتے رہتے اور جدید سائنسی علوم مثلاً فزکس، کیمیا، حیاتیات، فلکیات وغیرہ کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرتے۔ انہوں نے مغربی فکر کے بنیادی فلسفے اور اس کے اہم مفکرین جیسے کاموس، سارتر اور مارما کیوز اور اسی طرح مغربی ادب کے اساطین جیسے روسو، بالزاک، دوستوسکی، ڈارون اور ٹالسٹائی وغیرہ ادیبوں اور مفکروں کا مطالعہ کیا۔ 1959ء میں فتح اللہ گولن نے ترکی میں امامت کا سرکاری امتحان پاس کیا چونکہ انہوں نے اس امتحان میں غیر معمولی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے انہیں متعدد اہم مقامات پر امامت اور دینی تعلیم کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

اپنی نوجوانی کے دنوں میں ہی فتح اللہ گولن بدیع الزماں سعید نورسی کے تعلیمی حلقوں سے متعارف ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ ان سے وابستگی ایسی بڑھی کہ نورسی تحریک کے وہ ایک فعال رکن بن گئے۔ نورسی کے تعلیمی حلقوں میں ہی انہوں نے دور جدید کے تقاضوں اور اسلام کو ان سے ہم آہنگ کرنے کی تحریک کو سمجھا اور پھر اسے اپنی آئندہ کی زندگی کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے وقت اپنا رہنما بنایا۔ نورسی تحریک سے وابستگی کے زمانے میں ہی ان پر یہ راز بھی کھلا کہ نورسی تحریک کے طرز پر 'درس خانوں' کی تشکیل ہی کسی بھی دعوت وتحریک کی کامیابی کا راستہ ہموار کرسکتی ہے۔ چنانچہ فتح اللہ گولن اور ان کی تحریک کے طریقہ کار کا مطالعہ کرنے والا یہ پاتا ہے کہ ان کے اور استاذ بدیع الزماں سعید نورسی کے طریقہ کار میں بہت زیادہ مماثلت ہے۔ اسی لیے گولن تحریک کو جاننے اور سمجھنے کے لیے نورسی تحریک کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔

مسجد کے امام اور قرآنی اسکول کے استاد کے طور پر فتح اللہ گولن نے 1960ء کی دہائی کا ایک بڑا حصہ ادرنہ اور ازمیر کے شہروں میں گزارا۔ چونکہ اس زمانے تک وہ نورسی تحریک کا حصہ تھے اس لیے وہ جہاں بھی رہے نورسی فکر کے مطابق لوگوں میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے رہے۔ اس دوران ہی فتح اللہ گولن نے لوگوں کے گھروں میں اجتماعات (جسے جماعت کہا جاتا تھا) کا سلسلہ شروع کیا، یہیں سے انہیں گرمیوں میں سمر کیمپوں کے قیام کی ترغیب ملی جو آگے چل کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے مستقل رہائشی ہاسٹلوں کے قیام کی تحریک میں بدل گئی

کر دیا۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مہدوی تحریک سے وابستہ اس کے درویش کارکنوں نے مصری فوج کا مقابلہ بہادری اور شجاعت کے ساتھ کیا لیکن مصری فوج جو جدید اسلحے سے لیس تھی اور جس کی قیادت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی خلیفہ عبداللہ کی فوج اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی نتیجہ یہ نکلا کہ 1899ء (نومبر) کی ایک جنگ میں وہ کام آیا اور اس کی فوج شکست سے دوچار ہوئی اور سوڈان پر مصری برطانوی (مصر پر عملاً اس وقت برطانیہ کا قبضہ ہو چکا تھا، خدیو کی حکومت محض نام کی تھی) تسلط قائم ہو گیا۔ بعد کے سالوں میں 1908ء تک مہدوی تحریک کے درویشوں نے مختلف مقامات پر برطانوی قبضے کے خلاف متعدد مزاحمتیں اور بغاوتیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکیں، برطانوی حکام نے انہیں کچل دیا اور اس طرح مہدوی تحریک کا آغاز کے بیس پچیس برس کے بعد ہی خاتمہ ہو گیا۔

13.6.3 بانی تحریک: محمد احمد مہدی

مہدی سوڈانی کا شمار جدید مسلم دنیا کی نمایاں شخصیات میں ہوتا ہے۔ 12 / اگست 1844ء کو وہ شمال سوڈان کے لباب نامی جزیرہ میں کشتی سازی سے وابستہ ایک متوسط خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے، والدین نے ان کا نام محمد احمد رکھا، والد کا نام عبداللہ تھا جو حسنی سید تھے۔ بعد میں ان کا خاندان ام درمان کے نواح میں منتقل ہو گیا۔ انہوں نے شمالی سوڈان کے متعدد معروف اساتذہ کی نگرانی میں مذہبی تعلیم حاصل کی اور 1861ء میں سوڈان کے ایک معروف صوفی سلسلے سامانیہ سے وابستہ ہو گئے۔ محمد احمد مہدی نے اعلیٰ مذہبی تعلیم مصر کی مشہور درس گاہ جامع ازہر میں پائی اور کہا جاتا ہے کہ مصر میں قیام کے دوران انہوں نے جمال الدین افغانی سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کے اصلاحی افکار سے متاثر ہوئے۔ محمد احمد مہدی ایک مذہبی عالم اور اور صوفی بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی سوجھ بوجھ کے بھی حامل تھے۔ مذہبی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے اپنے علاقے میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے علاوہ وہ ملک کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر لوگوں کے درمیان دعوت و اصلاح کا کام بھی کرتے رہے جس کے نتیجے میں ان کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور سوڈان کے متعدد قبائل کے لوگ ان کے پیروکاروں میں شامل ہو گئے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اسلام کے احکامات و تعلیمات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے یہاں تک کہ اس معاملے میں وہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے سوڈان کے شہر بربرہ میں اپنے استاد کا پیش کیا ہوا کھانا محض اس وجہ سے کھانے سے انکار کر دیا کہ ان کے خیال میں اس میں ظلم کا شائبہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنے پیر و مرشد سے صرف اس وجہ سے قطع تعلق کر لیا کہ ان کے مرشد نے اپنے بچوں کی ختنہ کی تقریب میں ناچ گانے کا انتظام کیا تھا۔

1870ء میں محمد احمد مہدی اور ان کے خاندان کے لوگوں نے دریائے نیل کے ایک جزیرۂ آبا (Aba) میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں پر بھی انہوں نے درس و تدریس اور دعوت و تبلیغ کا اپنا مشن جاری رکھا۔ اسی دوران جب سوڈان پر مصر کے قبضے اور سوڈانی باشندوں پر ظلم و زیادتی کے سبب سوڈانی عوام میں مصری / برطانوی حکام کے خلاف بے چینی کی لہر پیدا ہوئی تو محمد احمد مہدی نے سیاسی سوجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے عوامی بے چینی کی اس تحریک کو آزادی کی تحریک میں بدل دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک محمد احمد مہدی خود کو مہدی موعود (منتظر) ہونے کا دعویٰ کر چکے تھے اور شمالی سوڈان میں ان کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ سوڈان پر مصری قبضے کے خلاف عوامی بے چینی کے زمانے میں محمد احمد مہدی نے اپنے پیروکاروں کو جزیرہ آبا میں منتقل ہو جانے کی دعوت دی تا کہ انہیں زیادہ بہتر طور پر منظم کیا جا سکے۔ اس کے بعد 1881ء میں مہدی سوڈانی نے سوڈان سے مصری بالادستی کے خاتمے کے مطالبے کو لے کر ایک عوامی تحریک کا آغاز کیا جس نے بہت جلد سوڈان

کی مکمل آزادی کی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ مہدی سوڈانی کے پیروکاروں اور مصری فوج کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں اور یکے بعد دیگرے عوامی جوش و جذبے کے سامنے مصری فوج کو شکستیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ دو سال کے اندر 1883ء کے آخر تک پورے سوڈان پر مہدی سوڈانی کا قبضہ ہو گیا۔

برطانوی قیادت والی مصری فوج کو شکست دینے اور خرطوم پر قبضہ کر لینے کے بعد مہدی سوڈانی نے دریائے نیل کے مغربی کنارے پر خرطوم کے بالمقابل ام درمان نامی شہر کو اپنا دار الحکومت بنایا اور حکومت کے استحکام کی کوششوں کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر اصلاح کا کام بھی شروع کیا۔ اس مقصد کے تحت سوڈان کے لیے نئے سکے ڈھالے گئے، وہ لوگ جو سابقہ حکومت میں زمینوں سے محروم کر دیے گئے تھے اور جن کی زمینوں پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا ان کی زمینیں ان لوگوں کو واپس کر دی گئیں۔ ان رسموں کو ختم کرنے کے اقدامات کیے گئے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھیں۔ ملک میں شراب اور دیگر نشہ آور چیزوں کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ عورتوں کو شرعی پردہ کرنے کی ہدایت دی گئی۔ شادی بیاہ اور مختلف تقریبات میں جو فضول خرچیاں ہوتی تھیں ان سے لوگوں کو روکا گیا۔ جہیز کے لین دین پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس حوالے سے مہدی سوڈانی اپنے پیروکاروں کو بیعت کراتے ہوئے ان سے جو حلف لیتے تھے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

''ہم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور یہ کہ ہم توحید کی خاطر آپ کی اطاعت کریں گے۔ ہم کسی کو خدا کا شریک نہیں بنائیں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے اور کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور کسی جائز کام میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ہم آپ کے ہاتھ پر عہد کرتے ہیں کہ دنیا پرستی کو خیر باد کہہ دیں گے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے کام کریں گے اور جہاد سے منہ نہیں موڑیں گے۔''

1885ء میں خرطوم پر قبضے کے بعد مہدی سوڈانی مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جانشین ان کے بیٹے عبداللہ ہوئے لیکن وہ حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں ناکام رہے۔ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر ان اسباب و وجوہ پر ڈال لی جائے جو سوڈان میں مہدوی تحریک کی کامیابی اور برطانوی قیادت والی مصری حکومت کی ناکامی کی ضامن بنیں۔

13.6.4 سوڈان میں مہدوی تحریک کی کامیابی کے اسباب:

وہ اسباب جن کی وجہ سے سوڈان میں مہدوی تحریک کو کامیابی ملی ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:

(1) مصری حکام کی جانب سے سوڈان میں حکومتی بد انتظامی اور سوڈان کے باشندوں پر ظلم و زیادتی۔ اس کی وجہ سے سوڈان کے باشندوں میں مصری حکمرانوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے اور انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔

(2) سوڈان پر قبضے کے بعد مصری حکومت نے وہاں غلاموں کی تجارت پر پابندی عائد کر دی، اس کی وجہ سے سوڈان کے بڑے بڑے تاجر مصری حکومت کے خلاف ہو گئے کیونکہ غلاموں کی تجارت سے وہ بڑا مالی فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مالی وسائل سے مہدوی تحریک کی مدد کی۔

(3) مصری فوج کمزور اور نااہل تھی۔ اس میں قیادت کا فقدان تھا۔ جو قیادت تھی وہ نکمے پن کا شکار تھی۔

(4) اسی دوران مصر میں عرابی پاشا کی بغاوت ہوگئی۔اس کے اثرات سوڈان بھی پہنچے۔مصر میں عرابی پاشا کی بغاوت کا فائدہ مہدوی تحریک کو پہنچا۔

(5) قاہرہ میں مہدوی تحریک کی نافرمانی اور بغاوت کی خبر پہنچی تو مصری حکومت نے سوڈان میں اپنی حکومت کو فوجی امداد نہیں بھیجی اور یہ سمجھتی رہی کہ سوڈان میں موجود اس کی فوج مہدی سوڈانی کی قیادت میں سوڈان کی آزادی کی تحریک کو آسانی کے ساتھ کچل دے گی۔

(6) سوڈان میں مہدوی تحریک کی کامیابی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت مصر کے اقتدار پر مسلط انگریزوں نے مصر اور سوڈان کے حوالے سے دوغلی پالیسی اختیار کی۔مصر میں اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے اس بات کو روا رکھا کہ سوڈان میں مہدوی تحریک زور پکڑتی رہے اور وہاں مصر سے آزادی کے خواہاں عناصر مضبوط ہوتے جائیں۔

13.6.5 مہدوی تحریک کا انجام:

مذکورہ صورت حال میں سوڈان کی مہدوی تحریک کو اپنے رہنما مہدی سوڈانی کی کرشماتی قیادت میں بلا شبہ زبردست کامیابیاں ملیں اور بہت جلد انہوں نے تقریباً پورے سوڈان پر قبضہ کر لیا۔لیکن قیادت کی جو خوبیاں مہدی سوڈانی کے اندر تھیں، ان کے جانشین بیٹے عبداللہ میں ان خوبیوں کا فقدان تھا۔اس کی قیادت میں مہدی سوڈانی کے پیروکاروں نے، جو درویش کہلاتے تھے، مصر پر حملہ ضرور کیا لیکن یہ حملہ ناکام رہا اور بدلے میں مصری فوج نے برطانوی جنرل لارڈ کچنر کی قیادت میں 1898ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔مہدوی درویشوں نے عبداللہ کی قیادت میں اس کا مقابلہ تو کیا لیکن شکست سے دوچار ہوئے خود عبداللہ بھی ایک جنگ میں ہلاک ہوگیا اور ایک بار پھر سوڈان پر برطانوی قیادت والی مصری فوج قابض ہوگئی۔لارڈ کچنر نے انتقام کے جذبے سے ام درمان میں مہدی سوڈانی کی قبر کھدوا کر ان کی ہڈیاں جلا ڈالیں۔اس کے باوجود مہدوی درویش 1908ء تک سوڈان میں ایک دکا بغاوتیں کرتے رہے البتہ انہیں ان میں کامیابی نہیں ملی۔

حالانکہ انگریزوں نے مہدی سوڈانی اور ان کے پیروکاروں کو بدنام کرنے کی تمام تر کوشش کی اس کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ مہدی سوڈانی، سوڈان کی تحریک بیداری کے اولین قائد تھے۔انہیں اور ان کی تحریک کو اب سوڈان میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ام درمان میں واقع ان کا مقبرہ آج کے سوڈان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

2.7 النہضۃ الاسلامیہ (تیونس)

مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ جن لوگوں کے مطالعہ اور غور وفکر کا محور ومرکز ہیں انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ ماضی قریب کی تاریخ میں یہاں کی آمر، غیر جمہوری اور خاندانی حکومتوں کے وہ تمام اقدامات مغربی طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے روا اور جائز رکھے جو خطے میں آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کے فروغ کو روکنے والے تھے۔کہنے کو تو پوری مغربی دنیا جمہوریت، آزادی، مساوات اور انسانی حقوق کے بقا وتحفظ اور فروغ کا خود کو چمپئن قرار دیتی ہے اور اس میں شبہ بھی نہیں کہ اپنے ملکوں میں ان کے فروغ وترقی میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے لیکن جب بات مسلم دنیا کی آتی ہے تو تمام مغربی طاقتیں اپنے ان اصولوں کو پس پشت ڈال دیتی ہیں اور ان لوگوں کی حمایت کرتی ہیں جو مسلسل ان کو پامال کرتے رہتے ہیں، ہاں مغربی دنیا کے اپنے آقاؤں کے مفادات کی نگرانی وحفاظت ضرور کرتے ہیں۔عرب دنیا

کے حکمرانوں کی مسلسل کوشش اور مغرب کی پشت پناہی کے باوجود 2011ء میں عرب دنیا میں آزادی، جمہوریت مساوات اور انسانی حقوق وغیرہ مسائل کو لے کر ایک عوامی بیداری کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں وہاں سے کئی آمریتوں کا خاتمہ بھی ہوا۔ عوامی بیداری کی اس تحریک کی جنم بھومی تیونس تھی۔ بلاشبہ عوامی بیداری کے نتیجے میں آنے والے انقلابات عرب دنیا کے کئی ملکوں میں بظاہر ناکام رہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس انقلاب کا آغاز تیونس سے ہوا تھا، وہ انقلاب پٹری سے اتارے جانے کی تمام ترکیبوں کے استعمال کے باوجود آج اپنی جنم بھومی میں سست رفتاری سے سہی کامیابی کی طرف گامزن ہے۔ عرب دنیا کے باقی ملکوں میں عوامی انقلاب ناکامی یا شورش کا شکار ہوگیا، لیکن تیونس میں یہ کامیاب ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تیونس میں انقلاب برپا کرنے میں اہم کردار ادا کرنے والی تحریک اور اس کی قیادت نے جلد بازی کے بجائے حکمت اور دوراندیشی سے کام لیا۔ اس طرز عمل کے نتیجے میں وہ اقتدار سے باہر ضرور ہو گئے لیکن تیونس کو ایک ایسا دستور دینے اور تیونس میں ایک ایسا سیاسی رجحان پروان چڑھانے میں ضرور کامیاب رہے جو بڑی حد تک آئندہ کے لیے تیونس میں جمہوریت کے فروغ و ترقی کے ضامن ہیں۔ بلاشبہ تیونس میں اس کا کریڈٹ کسی ایک جماعت کو اگر دیا جاسکتا ہے تو وہ النہضہ پارٹی ہے۔

13.7.1 النہضہ تحریک: پس منظر اور قیام

بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک عرب دنیا میں ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا کے مسلم نوجوانوں میں مذہب بے زاری کو فروغ دینے کی مختلف سطحوں پر کوششیں ہوتی رہیں البتہ انہیں کوششوں کے درمیان وہ کوششیں بھی ابھر کر سامنے آئیں جنہوں نے مسلم دنیا میں اسلامی احیاء کی تحریکات کی شکل اختیار کی۔ عرب دنیا کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو 'الاخوان المسلمون' کا نام ایک ایسی تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے، جس کا آغاز تو مصر سے ہوا لیکن اسلامی بے داری کے حوالے سے اس کے اثرات پوری عرب دنیا پر پڑے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج کی عرب دنیا پر کسی ایک فکر کا اثر اگر سب سے زیادہ ہے تو وہ الاخوان المسلمون کی فکر ہے اور جس کا سلسلہ عرب دنیا کی اب تیسری اور چوتھی نسل تک دراز ہو چکا ہے۔ اسلامی بیداری کے حوالے سے عرب دنیا میں جو بھی کام ہورہا ہے، اس کا نام 'الاخوان المسلمون' جیسا ہو یا نہ ہو لیکن وہ کسی نہ کسی حد تک اخوان کی تحریک سے متاثر ضرور ہے۔ عرب دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے تیونس کے حکمرانوں کو اس بات کی زیادہ فکر رہی ہے کہ وہ اپنے ملک کو بے حیائی اور مذہب سے دوری کے معاملے میں مغربی یورپی ملکوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ بنادیں۔ چنانچہ بورقیبہ رہے ہوں یا زین العابدین دونوں نے اس کی بھرپور کوشش کی کہ تیونس کو اسلامی اثرات سے بہت دور کر دیا جائے۔ ان کوششوں کے اثرات تیونس کے شہری علاقوں میں دیکھے بھی جاسکتے ہیں لیکن انہیں کوششوں کے درمیان بعض ایسی کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں جنہوں نے تیونس کی اسلامی اور مسلم شناخت کو باقی رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

1960ء کی دہائی کے آغاز میں تیونس کے کچھ اسلام پسند نوجوانوں نے جو بنیادی طور پر مصر کی الاخوان المسلمون سے متاثر تھے، اپنے ملک میں اسلامی بیداری لانے اور اسے فروغ دینے کے مقصد سے ایک چھوٹا سا گروپ Islamic Action (اسلامی عمل) کے نام سے تشکیل دیا اور تقریباً بیس سال تک خاموشی سے یہ لوگ کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے اپنے ایک رہنما راشد الغنوشی کی قیادت میں ''حرکتہ الاتجاہ الاسلامی'' کے نام سے 1981ء میں باضابطہ ایک جماعت تشکیل دی اور تیونس میں اسلامی بیداری کے فروغ کے لیے کام کرنے لگے۔ ایسا اس لیے ممکن ہوسکا کہ اس وقت کی بورقیبہ حکومت نے 1981ء میں پہلی بار تیونس میں سیاسی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت دی

تھی۔البتہ اسی دوران 1984ء میں تیونس میں سرکاری پالیسیوں کے سبب عوامی بے روزگاری اور غربت وافلاس کے سبب حکومت کے خلاف فسادات پھوٹ پڑے۔حکومت کو یہ شبہ تھا کہ ان فسادات کی پشت پر حرکۃ الاتجاہ الاسلامی کی قیادت اور کارکنوں کا ہاتھ ہے حالانکہ اس ضمن میں وہ شواہد فراہم کرنے سے ناکام رہی اور حرکۃ الاتجاہ الاسلامی کی قیادت نے بھی کسی طرح کی شمولیت سے انکار کیا۔اس کے باوجود حکومت نے تحریک کے رہنما راشد الغنوشی اور دیگر قائدین کو اس ناکردہ جرم میں گرفتار کرلیا اور تحریک کے کارکنوں کو کچلنے کی بھرپور کوشش کی۔لیکن اس کا نتیجہ الٹا نکلا، بلاشبہ تحریک کی قیادت اپنے رہنما سمیت جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دی گئی البتہ اس دوران ان کی عوامی مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور عام لوگوں میں اس تحریک کی شناخت یہ بنی کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو عام لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

حرکۃ الاتجاہ الاسلامی نے 1989ء میں اپنا نام بدل کر ''حرکۃ النہضہ'' کرلیا اور تب سے وہ اسی نام سے جانی جاتی ہے۔کہا جاتا ہے کہ النہضہ کی تشکیل میں سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار کا بڑا اہم کردار ہے اور اس کی قیادت خاص طور پر راشد الغنوشی پر ان دونوں کی فکر کا بہت زیادہ اثر ہے۔اس کے باوجود النہضہ تحریک کے مخالفین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک اعتدال پسند اسلامی جماعت ہے، یہ جمہوریت اور تکثیریت میں ہی یقین نہیں رکھتی بلکہ مغرب کے ساتھ ڈائلاگ (مذاکرات) اور مفاہمت وتعاون کی بھی بات کرتی ہے۔اپنے قیام کے بعد سے ہی النہضہ تحریک نے تیونس کے اندر ایک ایسی کثیر جماعتی جمہوریت کی حمایت کی ہے جس میں کم از کم لوگوں کو اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کی آزادی ہو۔1989ء میں تیونس میں ہونے والے انتخابات میں النہضہ تحریک پر پابندی عائد تھی البتہ اس تحریک سے وابستہ بعض افراد نے آزادانہ طور پر ان انتخابات میں حصہ لیا اور خود سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ان لوگوں کو ملک گیر سطح پر 17 فیصد سے زیادہ ووٹ ملے جو النہضہ کی عوامی مقبولیت کی دلیل ہے۔زین العابدین بن علی کی حکومت نے النہضہ کی قیادت کو پہلے ہی جلاوطنی پر مجبور کردیا تھا۔ایک بار پھر اس نے النہضہ کے عام کارکنوں کے خلاف کارروائی شروع کی، 1991 میں تحریک کے 25000 سے زائد کارکنوں کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا۔ان کے مراکز، اخبارات ورسائل پر پابندی عائد کردی گئی۔اس طرح 1980 کی دہائی کے اواخر اور 1990ء کی دہائی کے اوائل میں النہضہ تحریک زبردست ظلم وزیادتی کا شکار رہی۔یہاں تک کہ 2011ء کے عوامی انقلاب سے پہلے تیونس کے سیاسی منظرنامے پر النہضہ تحریک کا کوئی وجود نہیں تھا۔اس کی قیادت یا تو جیلوں میں رہی یا پھر بیرون ملک جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور رہی۔

2011ء کی عرب عوامی بیداری کے نتیجے میں آنے والے انقلاب نے عرب دنیا میں نئی سیاسی تبدیلیوں کا آغاز کیا۔تیونس سب سے پہلے سیاسی انقلاب سے دوچار ہوا اور صرف چند دنوں کے اندر زین العابدین بن علی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔بظاہر تیونس کا انقلاب ایک اچانک واقعہ تھا اور اس کی پشت پر کوئی منصوبہ بند گروپ یا تحریک نہیں تھی لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ تیونس کے انقلاب کو انجام تک پہنچانے میں النہضہ کے کارکنوں کا رول بہت اہم تھا۔یہی وجہ ہے کہ زین العابدین بن علی کے بعد کے تیونس کی تشکیل کا عمل جب شروع ہوا تو اس میں النہضہ تحریک کا کردار بہت اہم تھا۔تحریک کی جلاوطن قیادت ملک واپس لوٹی اور ملک کی جیلوں میں بند اس کے کارکنوں کو رہائی ملی۔انہوں نے تیونس کی بدلی ہوئی صورت حال میں خود کو منظم کیا۔نئے حالات میں ان کے خلاف رجعت پسندی اور دقیانوسیت کا جو پروپیگنڈا کیا جارہا تھا اس کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا، غیر مسلموں کے حقوق، خواتین کے حقوق وآزادی وغیرہ سے متعلق شبہات کا ازالہ کیا اور نتیجے میں جب تیونس کی دستور ساز اسمبلی کے لیے پہلے آزادانہ انتخابات ہوئے تو النہضہ تحریک تیونس کی سب سے بڑی اور مؤثر سیاسی جماعت بن کر ابھری، اس کی

قیادت میں نئی جمہوری حکومت قائم ہوئی اور تیونس کا نیا سیکولر جمہوری آئین بنا۔ حالانکہ تین سال کے بعد نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات میں النہضہ تحریک اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار نہ رکھ سکی، جس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ ملک میں امن وامان، اس کی تعمیر و ترقی اور روزگار کی فراہمی کے جو وعدے اس نے عوام سے کیئے تھے، وہ عوام کی خواہش کے مطابق پورے نہیں ہوسکے۔ اس کے باوجود النہضہ تیونس کی دوسری سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے اور ملک میں ایک مضبوط تعمیری اپوزیشن کا رول ادا کر رہی ہے اور مستقبل میں تیونس کی سیاسی زندگی میں اس کے فعال رول کی امید کی جاتی ہے۔

13.7.2 بانی تحریک: راشد الغنوشی

راشد الغنوشی انقلاب کے بعد کے تیونس میں ایک قدآور اور بااثر سیاسی رہنما بن کر ابھرے ہیں۔ ان کی قیادت میں النہضہ تحریک نے تیونس کی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے اور آیندہ کی تیونس کی سیاست میں ان سے ایک فعال کردار کی توقع کی جاتی ہے۔ راشد الغنوشی 1941ء میں تیونس کے جنوبی صوبے قلبس کے شہر الحمد میں پیدا ہوئے۔ 1961ء میں زیتونہ یونیورسٹی سے بی اے کے مساوی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد قاہرہ یونیورسٹی کے اسکول آف ایگریکلچر میں داخلہ لیا لیکن ناصر اور بورقیبہ کے درمیان اختلافات کے سبب جب تیونسی طلبہ کو مصر سے نکالا گیا تو وہ شام چلے گئے جہاں انہوں نے 1965 میں دمشق یونیورسٹی سے فلسفے کی ڈگری حاصل کی۔ قاہرہ اور دمشق میں قیام کے دوران اشتراکی نظریے سے متاثر ہوئے لیکن بہت جلد ان کی اسلام کی طرف واپسی ہوگئی۔ راشد الغنوشی نے فرانس کی سوربورن یونیورسٹی میں بھی ایک سال گزارا اور تیونس واپسی کے بعد سماجی اصلاح اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ 1981ء میں جب سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ملی تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر "حرکۃ الاتحاد الاسلامی" نامی سیاسی جماعت تشکیل دی۔ تحریک کے منشور میں اسے اسلامی اصولوں پر قائم ایک ایسی سیاسی جماعت کہا گیا تھا جو معاشی عدم مساوات کا خاتمہ چاہتی ہے، سماج کی اصلاح کی خواہاں ہے، کثیر جماعتی نظام چاہتی ہے اور جمہوریت کے بنیادی اصولوں اور اظہار رائے کی آزادی پر یقین رکھتی ہے۔ یہ بات حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھی اس لیے بہت جلد راشد الغنوشی کو گرفتار کرلیا گیا۔ 1984ء میں انہیں رہائی ملی لیکن 1987ء میں انہیں ایک بار پھر گرفتار کرلیا گیا اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ تاہم ایک سال بعد ہی انہیں رہا کر دیا گیا اور انہوں نے یورپ میں جلاوطنی اختیار کی۔ راشد الغنوشی نے دو دہائی سے زیادہ عرصہ جلاوطنی میں گزارے، البتہ انہوں نے اس دوران تیونس اور اس کے مسائل سے خود کو الگ نہیں رکھا اور حکومت پر مثبت تنقید کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ طویل جلاوطنی کے بعد جب وہ 2011ء میں تیونس واپس لوٹے تو ان کا والہانہ استقبال ہوا۔

راشد الغنوشی کی شناخت تیونس میں ہی نہیں پوری مسلم دنیا میں ایک ایسے مسلم مفکر کی ہے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں اور حالات وضروریات سے بھی کافی واقفیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اور حالات کے تقاضوں کے تحت دینی تعلیمات کی تعبیر و تشریح کو لے کر ان کی بعض آراء سے لوگوں نے اختلاف بھی کیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے ایک کثیر مذہبی دنیا کے کثیر مذہبی کے حوالے سے دینی تعلیمات کی تعبیر وتشریح میں جس حکمت عملی اور دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے شاید اسی کی وجہ سے تیونس میں جمہوریت پٹری سے اترنے نہیں پائی ہے اور وہاں جمہوریت کا سفر جاری ہے۔

راشد الغنوشی اصلاحات کے حوالے سے اسلامی اصولوں پر عمل کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سماجی انصاف کو یقینی بنانے

کے لیے نئے طریقے اختیار کیے جانے چاہئیں۔ تیونس کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ اس ملک کے لیے کوئی بھی سیاسی نظام اپناتے (اخذ کرتے) وقت یہاں کے حالات اور مقامی کلچر کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔ انہوں نے مزدوروں کی انجمنوں اور خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کی کھل کر حمایت کی ہے۔ ان کے مطابق خواتین مسلم سماج کا نصف حصہ ہیں اس لیے انہیں بھی تعلیم کے یکساں اور مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم اور ان کے سماجی کردار پر خاص توجہ دی ہے۔ اسی طرح راشد غنوشی کے یہاں شمولیت کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ سب کو قبول کرنے والا ہو۔ اس کی رواداری مثالی ہو اور اسلامی سماج میں غیر مسلموں کو اہم عہدوں پر فائز ہونے سے روکا نہ جائے۔ عملی طور پر جب ان کی سیاسی جماعت نے تیونس کے انتخابات میں حصہ لیا تو انہوں نے تیونس کے یہودیوں سے رابطہ کیا تھا، ان سے ملاقات کے لیے اپنی جماعت کے وفد بھیجے تھے اور ان کے ذریعے چلائے جانے والے بعض نرسنگ ہومز کو انہوں نے تحفے بھی بھیجے تھے۔

راشد غنوشی کے افکار و خیالات ان کی تقریروں، انٹرویوز اور تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بحیثیت ایک مسلم مفکر ان کی حیثیت مسلم ہے۔ عام طور سے ان کی تحریروں میں اسلامی ریاست میں عوامی آزادی، سیکولر اور سول سوسائٹی میں ہم آہنگی، اسلامی تحریک اور تبدیلی کا چیلنج، خواتین قرآنی تعلیمات اور اسلامی دنیا کی حقیقت، اسلامی ریاست میں شہریت کے حقوق، حقوق و فرائض کا فرق اور قومی یکجہتی، وغیرہ اہم اور اچھوتے مضامین کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

13.8 تیجانی تحریک

مسلم دنیا میں تجدید و اصلاح کی تحریکات ہر دور اور زمانے میں اٹھتی رہی ہیں۔ صوفی سلسلوں کے حوالے سے بھی اگر بات کی جائے اور ان کی تاریخ کا اگر باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ صوفیائے کرام کی کوششیں بنیادی طور پر اپنے زمانے کی اصلاحی تحریکات تھیں جو اس وقت کے مسلم سماج میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کر کے اسلام کے سیدھے راستے پر لوگوں کو چلانا چاہتی تھیں۔ آگے چل کر انہیں کوششوں نے ایک گروپ یا جماعت کی شکل اختیار کر لی اور اپنے بانی کے نام کی نسبت سے یا کسی اور نسبت سے یا کسی خاص نام سے مشہور ہوگئیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعد میں بعض صوفی سلسلوں میں بھی خرابیاں پیدا ہوگئیں اور ان کی اصلاح کے لیے انہیں میں سے کچھ لوگوں نے یا کچھ دوسرے لوگوں نے کوششیں کیں اور اس طرح نئے صوفی سلسلوں یا صوفی سلسلوں کے اندر نئے سلسلوں کی روایت آگے بڑھی۔ شمالی و مغربی افریقہ میں موجود تیجانیہ صوفی سلسلہ بھی ایک ایسی ہی سماجی اصلاحی کوشش تھی جس کا آغاز شمالی افریقہ میں ہوا، البتہ اسے مقبولیت زیادہ مغربی افریقہ کے علاقوں میں حاصل ہوئی۔ خاص طور پر سینی گال، گامبیا، موریطانیہ، مالی، چاڈ، نیجر (نائجر) گوئینا، شمالی نائیجریا اور سوڈان میں تیجانیہ صوفی سلسلے کے متبعین بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس صوفی سلسلے کے پیروکاروں کو تیجانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صوفی سلسلے میں تعلیم و ثقافت اور انفرادی اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تیجانی صوفی سلسلے کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے لیے تیجا ورد– جو قرآنی آیات اور ادعیہ نبویہ (نبیؐ کی دعائیں) کا ایک انتخاب ہے– کا صبح و شام اہتمام کرنا ضروری ہے جسے اس صوفی سلسلے کے نمائندے، جو مقامی اصطلاح میں مقدم کہلاتا ہے، سے سیکھا جاتا ہے۔

تیجانی تحریک اصلاح (یا صوفی سلسلے) کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شمالی افریقی ملک الجیریا کے علاقے میں ہوا۔ اس تحریک کے بانی سیدی احمد تیجانی تھے جو 1737/38ء میں عین مضیٰ (موجودہ الجیریا یا الجزائر میں ہے) نام کے مقام پر پیدا ہوئے اور جن کی زندگی کے آخری ایام مراکش کے شہر فاس میں گزرے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ تیجانیہ یا تیجانی تحریک بنیادی طور پر ایک ایسی تحریک اصلاح تھی جو شمالی افریقہ میں غریب ونادار مسلمانوں کے حقوق کے لیے وجود میں آئی، اسی طرح وہاں کے سماج میں روایتی خاندانی صوفی سلسلے نے جس طرح اپنی جڑیں پھیلا رکھیں تھیں اور جس طرح عام لوگوں کا ان کے ذریعہ مذہبی وروحانی استحصال ہو رہا تھا تیجانیہ صوفی سلسلہ اس کا بھی ایک ردعمل تھا۔ البتہ اس صوفی سلسلے میں زیادہ زور سماجی اصلاح اور عوامی سطح پر لوگوں میں اسلامی بیداری پیدا کرنے پر دیا گیا۔

شمالی ومغربی افریقہ میں تیجانی تحریک یا صوفی سلسلے کو ابتدا میں فروغ اس طرح حاصل ہوا کہ شیخ احمد تیجانی (بانی تحریک) نے اپنے بہت سے خلفاء کو مختلف ملکوں میں دعوت واصلاح کا کام کرنے کے لیے بھیجا۔ ان کے یہ خلفا جن علاقوں میں بھی گئے انہوں نے وہاں پر تیجانی تحریک کے مراکز قائم کیے۔ اس طرح بانی تحریک کی زندگی میں ہی اس صوفی سلسلے یا تحریک کے مراکز حجاز (مدینہ منورہ)، مصر، تیونس، موریطانیہ اور الجزائر کے علاقوں میں قائم ہوگئے تھے۔ اس کے باوجود تیجانیہ صوفی سلسلہ شمالی افریقہ کے علاقوں میں اپنی جڑیں زیادہ مضبوط نہیں کر سکا اور دوسرے صوفی سلسلوں کے مقابلے شمالی افریقہ میں اس کے اثرات کم ہیں۔ حالانکہ شمالی افریقہ میں ہی اس صوفی سلسلے کا بطور ایک اسلامی تحریک اصلاح آغاز ہوا تھا۔ تیجانیہ تحریک کو زیادہ فروغ مغربی افریقہ کے علاقوں میں حاصل ہوا اور آج بھی نہ صرف یہ کہ مغربی افریقی ملکوں میں یہ ایک بااثر صوفی تحریک ہے بلکہ اس کی توسیع کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

مغربی افریقہ میں تیجانی تحریک سب سے پہلے 1789ء کے آس پاس محمد العافی نامی ایک بزرگ کے ذریعہ متعارف ہوئی جن کا تعلق موجودہ موریطانیہ کے ایک بااثر اور علم وفضل میں مشہور قبیلے ایداؤعلی سے تھا اور جس کی اکثریت قادریہ صوفی سلسلے کی پیروکار تھی۔ محمد العافی کی کوششوں سے بہت جلد تیجانی تحریک نہ صرف ان کے قبیلے میں پھیل گئی بلکہ قبیلے کے زیر اثر اس تحریک کے اثرات مغربی افریقہ کے ایک بہت بڑے علاقے پر پڑے اور پھر دھیرے دھیرے یہ تحریک مغربی افریقہ کے بیشتر قبائل اور علاقوں میں پھیل گئی۔ تیجانی تحریک کے شیوخ نے مغربی افریقہ کے مختلف علاقوں میں، جو اب الگ الگ ملک ہیں، اپنی تحریک کے مراکز قائم کیے اور لوگوں میں اسلام کی دعوت پہنچانے کا کام کیا۔ جو قبیلے مسلمان ہو چکے تھے مگر ان کے اندر رسم ورواج کے طور پر بہت سی بدعات اور برائیوں نے جنم لے لیا تھا، ان کے اندر تیجانی تحریک کے افراد نے اصلاح کا کام کیا۔ انہیں برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی اور بتایا کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں۔ خاص طور پر ان کے اندر عقائد اور ارکان اسلام پر عمل کے رجحان کو فروغ دینے پر زور دیا۔ اسی طرح صبح وشام کے ذکر اور وقتاً فوقتاً محافل میلاد کے انعقاد کے ذریعہ انہیں ایک ایسے سلسلے کا حصہ بنا دیا جو انہیں جوڑے ہی نہیں رکھتا بلکہ ان کے اندر نصیحت ویاددہانی کو بھی فروغ دیتا ہے۔ چونکہ تیجانی تحریک بنیادی طور پر ایک سماجی اصلاحی تحریک تھی اور تصوف اور اس کی تعلیمات ووظائف کو اس نے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا تھا اس لیے اس میں دنیا بیزاری کا ماحول نہیں پایا جاتا۔ بلکہ تحریک کے عروج کے زمانے میں تیجانی تحریک کے بعض رہنماؤں نے مغربی افریقہ کے بعض علاقوں میں اپنی حکومتیں قائم کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی اور اسلامی اصولوں کی بنیاد پر کاروبار حکومت چلانے کی کوشش کی۔ تیجانی تحریک کے افراد نے مغربی افریقہ پر جب یورپی استعماری طاقتوں نے یلغار کی اس وقت بھی استعمار کے خلاف انہوں نے جدوجہد کی۔ اسی طرح مغربی افریقہ کے ملکوں میں جب

بیسویں صدی عیسوی کے دوران مغربی استعماری حکومتوں کے قبضے کے خلاف آزادی کی تحریکات چلیں اس وقت بھی تیجانی تحریک کے لوگوں نے جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔

13.8.1 تیجانی تحریک کے اذکار واعمال

تیجانی تحریک کے ارکان وافراد اپنے بعض اذکار واعمال کی وجہ سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔اور یہ اذکار واعمال انہیں مغربی وشمالی افریقہ کے دیگر صوفی سلسلوں اور تحریکوں سے نمایاں کرتے ہیں۔اس میں سب سے زیادہ اہمیت تیجانی ورد کو حاصل ہے۔جو کوئی بھی تیجانی تحریک کا حصہ بننا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقدم (تحریک کا روحانی نمائندہ) سے تیجانی ورد کی تعلیم حاصل کرے۔تیجانی تحریک کا یہ نمائندہ تحریک میں نو واردین کے سامنے ان فرائض کی تشریح ووضاحت کرتا ہے جو ان کے لیے ضروری ہیں۔ان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات یعنی عقائد وعبادات پر خاص زور دیا جاتا ہے۔انہیں والدین کی عزت واحترام کی تلقین کی جاتی ہے۔اسی طرح انہیں اس بات کی بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تیجانی صوفی تحریک کے علاوہ کسی بھی دوسری صوفی تحریک کی پیروی نہیں کریں گے۔

تیجانی تحریک میں نو واردین یا مبتدئین کو تیجانی ورد بھی سکھایا جاتا ہے۔اس ورد کو کرنے میں بالعموم دس سے پندرہ منٹ کا وقت لگتا ہے اور اسے روزانہ صبح اور شام میں دوبار کرنا ہوتا ہے۔تیجانی ورد "لاالہ الااللہ" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)، "استغفر اللہ" (میں اللہ سے عفوو درگزر کا طالب ہوں) اور اللھم صلی علیٰ سیدنا محمد و آلہ وسلم تسلیماً (یہ تینوں کلمات 100 بار پڑھنے ہوتے ہیں) کا مجموعہ ہے۔تیجانی مریدین کو ایک اور ورد بھی سکھایا جاتا ہے جسے "وظیفہ" (Wadifah) کہتے ہیں۔یہ ذکر (ورد) جماعت کے ساتھ بہ آواز بلند کیا جاتا ہے اور عام طور پر مسجدوں میں نماز مغرب کے بعد اس کا اہتمام ہوتا ہے۔اسی طرح نماز جمعہ کے بعد بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں۔کچھ لوگ نماز جمعہ کے بعد ایک دوسرے ذکر (ورد) کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ان اوراد کے علاوہ مریدین کو اس بات کی بھی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ جمعرات کی شام میں یا جمعے کو اوراد سے پہلے یا ان کے بعد مل بیٹھیں اور اللہ کا ذکر کریں۔اس طرح کے اجتماعی ذکر میں لوگ گروپ کے ساتھ "لا الہ الا اللہ" یا صرف "اللہ" کا ورد کرتے ہیں۔اس طرح کے اجتماعی ذکر کا طریقہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ امام یا کوئی ایک شخص ذکر کے الفاظ ادا کرتا ہے، مجلس کے بقیہ لوگ اسی کو دہراتے ہیں یا پھر کچھ مخصوص الفاظ میں اس کا جواب دیتے ہیں۔کبھی کبھی مریدین ایسے مذہبی اجتماعات منعقد کرتے ہیں جنہیں دائرہ (Circle) کہا جاتا ہے۔ان اجتماعات میں تحریک کے کسی بڑے خطیب یا ذاکر کو مدعو کیا جاتا ہے اور وہ سیرت یا کسی دوسرے مذہبی موضوع پر لوگوں سے خطاب کرتا ہے۔تیجانی تحریک کے بیشتر گروپوں میں ایک عوامی پروگرام مشترک ہے اور وہ ہے ہر سال 12 ربیع الاول کو میلاد النبی کے اجتماعات اور محفلوں کا اہتمام۔تیجانی تحریک کے تقریباً سبھی مراکز اس موقع پر اجتماعات کا اہتمام کرتے ہیں اور کئی مراکز میں شرکاء کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔12 ربیع الاول کے جلسے عام طور پر نصف شب سے کچھ پہلے شروع ہوتے ہیں اور صبح صادق تک جاری رہتے ہیں۔اس درمیان مذہبی تقریروں کے علاوہ، حمد ونعت اور اجتماعی ذکر کیا جاتا ہے۔میلاد کے سالانہ اجتماع کے علاوہ بھی مغربی افریقی ممالک میں مقامی سطح پر بھی لوگ چھوٹے پیمانے پر اور سال بھر میلاد کی محفلیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔اور اس طرح ان کے ذریعے ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔

13.8.2 بانی تحریک: سیدی احمد تیجانی

سید احمد تیجانی 1737/38 میں موجودہ الجزائر کے صحرائی علاقے میں عین مـضـی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد بن مختار (جو عالم دین تھے) اور والدہ کا نام عائشہ تھا۔ انہوں نے تعلیم کا آغاز قرآن مجید کے حفظ سے کیا، اس کے بعد فقہ مالکی کی تعلیم حاصل کی۔ تعلیم میں ہمیشہ نمایاں رہے۔ 21 برس کی عمر میں شیخ احمد تیجانی عین مـضـی سے ترک وطن کرکے مراکش کے شہر فارس چلے گئے تا کہ وہاں جامع قیروان کے علماء اور اساتذہ سے مزید تعلیم حاصل کرسکیں۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ سفر اور صوفی بزرگوں سے استفادے میں گزارا۔ کچھ عرصہ تعلیم وتربیت سے بھی وابستہ رہے۔ 1772ء میں جب ان کی عمر 36 برس تھی انہوں نے حج کا سفر کیا۔ اس سفر میں بھی انہوں نے مختلف علماء اور بزرگوں سے استفادہ کیا۔ اور حج سے واپسی کے کچھ دنوں بعد اپنی تحریک اصلاح شروع کی اور لوگوں کو تعلیم دیتے اور ان کی روحانی تربیت کرتے رہے۔ 80 سال کی عمر میں ان کا انتقال (1815ء) فاس، مراکش میں ہوا۔ اور وہیں اپنے زاویے کے قریب دفن ہوئے۔

معلومات کی جانچ

1۔ مہدوی تحریک کے بانی کا نام بتایئے۔

2۔ النہضۃ الاسلامیہ کا تعلق کس ملک سے ہے، یہ کب قائم ہوئی؟

3۔ تیجانیہ تحریک مغربی افریقہ میں سب سے پہلے کب متعارف ہوئی؟

13.9 خلاصہ

خلاصہ کلام یہ کہ اس اکائی میں جن مسلم تحریکات کا تعارف کرایا گیا وہ اپنی جغرافیائی حدود کے اعتبار سے کافی متنوع ہیں۔ اس میں سے دو نہضۃ العلماء اور جمعیت محمدیہ کا تعلق جنوب مشرقی ایشیا کے ملک انڈونیشیا سے ہے۔ انڈونیشیا کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ یہ مسلم دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ نہضۃ العلماء اور جمعیت محمدیہ دونوں ہی نہ صرف یہ کہ انڈونیشیا بلکہ پوری مسلم دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری تنظیمیں ہیں، گرچہ دونوں تنظیموں میں روایت اور جدیدیت کو لے کر اختلافات موجود ہیں لیکن دونوں ہی تنظیمیں اپنی سماجی، مذہبی اور تعلیمی خدمات کی وجہ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے دائرے بھی کافی وسیع ہیں۔ تیجانیہ، مہدوی اور النہضۃ کا تعلق براعظم افریقہ سے ہے اور ان کے میدانہائے عمل شمالی ومغربی افریقہ کے مسلم ممالک ہیں۔ پہلی دو تحریکیں (تیجانیہ اور مہدوی) صوفی پس منظر کے حامل ہیں اور افریقہ کے بعض علاقوں میں ان کا کافی اثر ہے۔ النہضۃ اسلامیہ جو موجودہ تیونس کی سب سے اہم مذہبی جماعت ہے، کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ یہ تیونس میں مصر کی اخوان المسلمین جیسی تنظیم ہے۔ عرب دنیا کی حالیہ عوامی بے داری میں اس کا اہم رول ہے اور اس کے رہنما راشد غنوشی کی قیادت میں موجودہ تیونس میں جمہوریت کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ گولن یا خدمت تحریک کا تعلق ترکی سے ہے۔ اس کے رہنما فتح اللہ گولن جدید ترکی میں اسلامی بیداری کے سب سے اہم رہنما سعید نورسی کے شاگرد ہیں۔ اس تحریک کا میدان عمل تعلیم، ذرائع ابلاغ اور بین مذہبی مذاکرے ہیں۔ خاص طور پر تعلیم اور بین مذہبی مذاکرات کے حوالے سے اس نے اہم کام کیے ہیں۔ گولن تحریک کے تعلیمی ادارے (اسکول) اپنے اعلیٰ تعلیمی معیار کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں اور دنیا کے بہت سارے ملکوں

میں ان کی شاخیں موجود ہیں۔

13.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ نہضۃ العلماء کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، تفصیل سے لکھیں۔

2۔ تحریک محمدیہ کے اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے اس کی خدمات کا جائزہ لیں

3۔ فتح اللہ گولن کا تعارف کرائیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ مہدوی تحریک کے بانی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیں۔

5۔ النہضۃ الاسلامیہ پر ایک مضمون لکھیں۔

6۔ تیجانی تحریک پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیں۔

13.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ انڈونیشیا: شاہد رزاقی

2۔ جدید ترکی میں اسلامی بے داری: عبید اللہ فہد

3۔ مغربی افریقہ میں اسلام: شیث محمد اسماعیل

اکائی 14: نیشن آف اسلام، ISNA, ICNA، IIIT، یورپی افتاء کونسل، دی اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر، ورلڈ اسلامک مشن

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ان تنظیموں اور اداروں سے متعارف کرانا ہے جو مسلم اقلیتی ممالک خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں قائم ہیں۔ ان میں چار یعنی نیشن آف اسلام، IIIT، ICNA اور ISNA کا تعلق امریکہ سے ہے اور یہ چاروں وہاں کے مسلمانوں کی نمایندگی کرتی ہیں جب کہ ان میں سے تین یعنی یورپی افتاء کونسل، اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر اور ورلڈ اسلامک مشن کا تعلق یورپ سے ہے۔ ان کے حوالے سے

ایک خاص بات یہ ہیکہ یہ بنیادی طور پر یورپ اور امریکہ میں موجود مسلمانوں کے تقریباً سبھی طبقات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ توقع کی جانی چاہیے کہ ان تنظیموں اور اداروں کا مطالعہ کرنے کے بعد طلبہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے حالات اور مسائل کو سمجھنے کے کسی قدر اہل ہوسکیں گے۔

14.2 تمہید

بیسویں صدی عیسوی کے دوران دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح امریکہ اور یورپ میں مقیم مسلمانوں کے درمیان بھی بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور انہوں نے بھی خود کو مختلف سطحوں پر منظم کرنا شروع کیا۔ اس طرح کی پہلی تنظیم "نیشن آف اسلام" ہے جو 1930ء میں امریکہ میں قائم ہوئی اور امریکہ کے کالے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے، بقیہ تنظیموں اور اداروں کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کے قائم کرنے والے یا جن کے وابستگان وہ لوگ ہیں جو دنیا کے دیگر ملکوں سے جا کر یورپ و امریکہ میں آباد ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنی ضروریات کے مطابق تنظیمیں اور ادارے قائم کیے۔ البتہ اب ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ صرف نقل مکانی کرنے والے مسلمانوں کی نمائندہ نہیں رہیں بلکہ ان سے یورپی مسلمان (جو نو مسلم ہیں) بھی وابستہ ہو رہے ہیں۔

14.3 نیشن آف اسلام

یوں تو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی آغاز میں ہی امریکہ میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا جا چکا تھا اور ایک طرح سے امریکی سماج سے غلامی کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن فی الحقیقت یہ سب صرف کاغذی کارروائیاں تھیں، امریکہ میں جو طبقہ عرصہ دراز سے غلام چلا آ رہا تھا غلامی کے خاتمے کے اعلان کے بعد بھی اس کے حالات میں کچھ بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ یہ اعلان نہ تو انہیں سماج کا معزز شہری بنا سکا نہ ہی انہیں ان کی قومی شناخت لوٹا سکا۔ اس کے بعد بھی وہ سماج کا اچھوت حصہ ہی بنے رہے اور انہیں نفرت وحقارت کی نگاہ سے ہی دیکھا جاتا رہا۔ سیاہ فاموں کا معاشی اور سماجی استحصال برابر جاری رہا۔ ان کے حالات کی اصلاح کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو سیاہ فاموں کے اندر مزاحمت پیدا ہوئی لیکن دوسری طرف ان کی معاشی اور سماجی حالت مزید دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ سماجی ومعاشی سطح پر عزت واحترام حاصل نہ کر پانے کی وجہ سے ان کے اندر وہ تمام برائیاں اور خرابیاں جڑ پکڑتی چلی گئیں جو کسی بھی بگڑے ہوئے سماج کا حصہ ہوا کرتی ہیں مثلاً چوری، ڈکیتی، نشہ، قمار بازی اور قحبہ گری وغیرہ غرض ہر طرح کی برائیاں ان کے سماج میں داخل ہوگئیں۔

امریکہ میں سیاہ فاموں کے حالات کو بدلنے، ان کی سماجی اصلاح اور انہیں باعزت مقام دلانے کے لیے جو کوششیں ہوئیں اور جو تحریکات چلیں ان میں ایک اہم نام "نیشن آف اسلام" (Nation of Islam) کا ہے۔ یہ تنظیم بنیادی طور پر سیاہ فاموں کو امریکی سفید فاموں کے مقابلے اٹھ کھڑا ہونے اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے مقصد سے قائم کی گئی۔ اس نے امریکہ میں سیاہ فاموں کے لیے اسلام کی ایک ایسی تشریح پیش کی جو انہیں نہ صرف یہ کہ عیسائی سفید فاموں سے علیحدہ شناخت عطا کرتی بلکہ ان سے برتر بھی ثابت کرتی ہے۔ نیشن آف اسلام کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ جب والس فارڈ (فرض) محمد نام کے ایک امریکی سیاہ فام رہنما نے سیاہ فام امریکیوں کی روحانی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے مہم چلائی۔ والس فرض محمد (ولادت: 1877ء وفات 1934ء) نے نیشن آف اسلام کے نام سے

باقاعدہ ایک تنظیم 1930ء میں ڈیٹرائٹ مشی گن میں قائم کی۔ انہوں نے تنظیم کے قیام کا مقصد یہ بتایا کہ امریکہ اور باقی دنیا میں سیاہ فام مردوں اور عورتوں کی روحانی، ذہنی، سماجی اور اقتصادی حالت کا احیاء کیا جائے۔ نیشن آف اسلام کے پیروکاروں کا ماننا ہے کہ والس فرض محمد مسیح اور مہدی تھے جن کا انتظار عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کو عرصۂ دراز سے تھا۔ والس فرض محمد نیشن آف اسلام قائم کرنے کے تھوڑے دنوں بعد ہی یعنی 1934ء میں نیشن آف اسلام کے پیروکاروں کے عقیدے کے مطابق روپوش ہوگئے یا غائب ہوگئے۔ البتہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اس تنظیم کی بنیادیں مضبوط کردی تھیں اور اپنے بعد تنظیم کی قیادت کے لیے افراد کی تربیت بھی کردی تھی۔

والس فرض محمد کے بعد نیشن آف اسلام کی قیادت علی جاہ پول (1975-1897) کے ہاتھ میں آئی۔ علی جاہ پول کا نام بدل کر والس فرض محمد نے علی جاہ محمد رکھ دیا تھا اور اسی نام سے انہیں شہرت بھی ملی۔ علی جاہ محمد فرض محمد کے ابتدائی پیروکارں میں سے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی میں نیشن آف اسلام کو نہ صرف یہ کہ امریکی سیاہ فاموں کا سب سے بڑا مذہبی وسیاسی پلیٹ فارم بنادیا بلکہ اس کی شہرت امریکہ اور امریکہ سے باہر بھی دور دراز علاقوں تک پھیلا دی۔ علی جاہ محمد نے بعد میں نیشن آف اسلام کے پیروکاروں میں بعض ایسے عقائد کی تبلیغ شروع کردی، جن کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً عقیدہ حلول یعنی والس فرض محمد کی شکل میں خدا خود انسانی شکل میں زمین پر آ گیا تھا۔ یہ اور کچھ دوسرے عقائد ایسے تھے کہ ان کے سبب تنظیم کے اندر اختلافات پیدا ہوئے۔ خود علی جاہ محمد کے بیٹے والس محمد (وارث دین محمد) کو بھی اپنے والد کے نظریات سے اختلاف تھا اور اس اختلاف کے سبب ہی انہیں نیشن آف اسلام کی رکنیت سے معطل کردیا گیا تھا۔ البتہ 1974ء میں تنظیم کی ان کی رکنیت بحال کردی گئی اور جب 25 فروری 1975 کو علی جاہ محمد کا انتقال ہوا تو اس کے اگلے دن والس محمد کو اتفاق رائے سے علی جاہ محمد کا جانشین اور نیشن آف اسلام کا سربراہ تسلیم کرلیا گیا جسے تنظیم میں سپریم منسٹر کہا جاتا ہے۔ والس محمد نے نیشن آف اسلام کی قیادت سنبھالنے کے بعد اس میں اصلاح کا آغاز کیا خاص طور پر عقائد کی ازسرِ نوتشکیل کا کام کیا اور نیشن آف اسلام کو اکثریتی سنی اسلام سے بہت ہی قریب کردیا۔ والس محمد نے تنظیم کا نام بھی بدل دیا اور 1978ء میں اسے ایک طرح سے ختم کردیا۔ البتہ نیشن آف اسلام کے بعض رہنما والس محمد کی اصلاحات سے مطمئن نہیں تھے انہوں نے اس سے اختلاف کیا اور اصلاحات کے خلاف مزاحمت بھی کی۔ اور جب اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو نیشن آف اسلام کو پھر سے زندہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح 1981ء میں لوئیس فرخان کی قیادت میں ایک بار پھر نیشن آف اسلام کی بحالی کا عوامی اعلان ہوا اور یہ کہا گیا کہ تنظیم کے بانی والس فرض محمد اور ان کے جانشین علی جاہ محمد کے اصول ونظریات کے مطابق نوتشکیل نیشن آف اسلام کو آگے بڑھایا جائے گا۔ 1995ء میں لوئس فرخان نے دس لاکھ سیاہ فاموں پر مشتمل Million Man March کے نام سے ایک بڑا عوامی جلوس نکالا اور اس طرح امریکہ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ نیشن آف اسلام کے پیروکاروں کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ کا اس وقت تک یہ سب سے بڑا عوامی جلوس تھا۔ بعد میں جب نیشن آف اسلام نے اپنے قیام کا ستر (70) سالہ جشن منایا تو والس محمد (جواب امام وارث دین محمد ہیں) اور منسٹر لوئس فرخان کے درمیان صلح وصفائی کی کوششیں ہوئیں۔ دونوں عوام کے سامنے گلے ملے اور تنظیم کے سالانہ اجلاس میں اتحاد اور صلح کا اعلان کیا۔

نیشن آف اسلام کے عقائد: نیشن آف اسلام کا قیام والس (وارث) فرض محمد کے ذریعہ عمل میں آیا انہوں نے اپنے شاگرد علی جاہ محمد کے لیے جو اسباق لکھے تھے ان کی اہمیت آج بھی تنظیم کے پیروکاروں کے لیے بہت زیادہ ہے۔ البتہ نیشن آف اسلام کے عقائد کا باضابطہ منصوبہ علی جاہ محمد کی کتاب Message to the Blackman of America (امریکہ میں سیاہ فام آدمی کے لیے پیغام) میں ملتا ہے۔

یہ کتاب 1965ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بیان کردہ عقائد کی تفصیل اس طرح ہے:

1- ہم ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں جس کا صحیح نام 'اللہ' ہے۔

2- ہم مقدس قرآن اور خدا کے تمام انبیاء کے صحائف پر یقین رکھتے ہیں۔

3- ہم بائبل پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس میں تحریف کی گئی ہے اور اس کی دوبارہ تشریح کی جانی چاہیے تاکہ انسانیت جھوٹوں میں نہ پھنسے جو اس میں داخل کیے گئے ہیں۔

4- لوگوں کی طرف بھیجے گئے اللہ کے نبیوں اور صحیفوں پر ہم یقین رکھتے ہیں۔

5- ہم مردہ کے زندہ ہو جانے پر یقین رکھتے ہیں- جسمانی طور پر زندہ ہونے پر نہیں- ذہنی طور پر زندہ ہو جانے پر۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ حبشیوں (Negroes) کو ذہنی طور پر زندہ ہونے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس لیے ان کو پہلے زندہ کیا جائے گا۔

مزید برآں ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم خدا کے چنے ہوئے لوگ ہیں، جیسا کہ لکھا گیا ہے کہ خدا مسترد اور نفرت کیے گئے لوگوں کو چنے گا۔ ان آخری دنوں میں امریکہ کے (نام نہاد) حبشیوں (Negroes) کے علاوہ ہم کسی کو اس تعریف پر پورا اترتا ہوا نہیں دیکھتے۔ ہم صالح کے دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

6- ہم حساب (Judgment) پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ پہلا حساب اس دن ہوگا جب خدا امریکہ میں ظاہر ہوگا۔

7- ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ تاریخ میں یہ وقت نام نہاد حبشیوں اور نام نہاد سفید فام امریکیوں کی علیحدگی کا وقت ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ سیاہ فام آدمی کو نام کے ساتھ ساتھ حقیقتاً آزاد ہونا چاہیے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسے ان ناموں سے بھی آزاد ہونا چاہیے جو اس پر اس کے سابق آقاؤں نے مسلط کیے تھے۔ وہ نام جو اس کی شناخت آقا کے غلام کے طور پر کرتے تھے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم واقعی آزاد ہوتے ہیں تو ہمیں اپنے لوگوں یعنی زمین کے سیاہ فام لوگوں کے نام استعمال کرنے چاہئیں۔

8- ہم تمام لوگوں کے لیے انصاف پر یقین رکھتے ہیں، خدا کے ماننے والے ہوں یا نہ ماننے والے، بطور انسان دوسروں کی طرح ہم بھی انصاف کے مستحق ہیں۔ ہم مساوات پر یقین رکھتے ہیں، مساوی لوگوں کی ایک قوم کے طور پر۔ ہم یقین نہیں رکھتے ہیں کہ ہم "آزاد کردہ غلاموں" کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کے مساوی ہیں۔

9- ہم یقین رکھتے ہیں کہ اختلاط (میل ملاپ) کی پیش کش منافقانہ ہے اور یہ پیش کش ان لوگوں نے کی ہے جو سیاہ فام لوگوں کو فریب سے یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ چار سو سال سے ان کی آزادی، انصاف اور مساوات کے کھلے دشمن اچانک ان کے "دوست" بن گئے ہیں۔ مزید برآں ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس فریب سے ان کا مقصد سیاہ فام لوگوں کو اس احساس سے دور رکھنا ہے کہ ان کی قوم کے سفید فام (لوگوں) سے علیحدگی کا وقت آ پہنچا ہے۔

10- ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں جو خود کو صالح مسلمان کہتے ہیں، دوسرے انسانوں کی جان لینے کے لیے جنگوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ ہم یقین نہیں رکھتے کہ اس قوم کو ان جنگوں میں حصہ لینے کے لیے ہمیں مجبور کرنا چاہیے کہ اس میں ہمارے حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں

ہوگا تاوقتیکہ امریکہ ہمیں ضروری علاقہ فراہم کرنے پر رضامند ہو جائے جہاں ہمارے پاس لڑنے کے لیے کچھ ہو۔

11- ہمیں یقین ہے کہ ہماری عورتوں کا احترام اور حفاظت ویسے ہی کی جانی چاہیے جیسے دوسری اقوام کی عورتوں کا احترام اور حفاظت کی جاتی ہے۔

12- ہم یقین رکھتے ہیں کہ اللہ ماسٹر (والس) فرض محمد کی شخصیت میں جولائی 1930ء میں ظاہر ہوا تھا، جو عیسائیوں کا ''مسیح'' اور مسلمانوں کا ''مہدی'' تھا۔

مزید اور آخر، ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ ہی خدا ہے اور اس کے علاوہ کوئی خدا نہیں اور وہ امن کی کائناتی (آفاقی) حکومت لائے گا (قائم کرے گا) جس میں ہم سب امن سے رہ سکیں گے۔

14.4 انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT) (بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی)

بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح مسلم دنیا میں بھی قومی بیداری اور آزادی کی تحریکات کا آغاز ہوا اور دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح مسلم ممالک بھی ایک ایک کرکے آزاد ہوتے گئے۔ مغربی استعمار کے قبضے کے دوران مسلم دنیا میں مغربی افکار و خیالات کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ ملا۔ مغرب کے زیر اقتدار ان ملکوں میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج ہوا جس میں مکمل تعلیم مغربی اصولوں کی بنیاد پر دی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی جدید تعلیم یافتہ نسل حریت پسندی اور قومی جذبات کی حامل ہونے کے باوجود اپنے فکر و خیال میں بیشتر مغربی تھی اور مغربی اصولوں کی بنیاد پر ہی اپنے ملکوں اور سماجوں کے مسائل حل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ردعمل میں مسلم دنیا میں اسلامی بیداری کی وہ تحریکات رونما ہوئیں جو مغرب کے مقابلے اسلامی اصولوں پر اپنے ملکوں اور سماجوں کی تشکیل کی خواہاں تھیں اور جنہیں مغرب نے اور اس کی دیکھا دیکھی اب مسلم دنیا کے بھی بعض ''دانشور'' سیاسی اسلام کی تحریکات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی دوران مغربی ایشیا میں تیل کی دولت کے سبب آنے والی خوش حالی نے نئی نسل کو جدید اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ کیا جس کے مواقع اس علاقے میں بہت کم تھے چنانچہ ان کی ایک بڑی تعداد نے مغربی یورپی ملکوں اور امریکہ کا رخ کیا جو جدید تعلیم کے بڑے مراکز باور کیے جاتے ہیں۔ ان میں ایک تعداد ان نوجوانوں کی بھی تھی جو اپنے ملکوں کی اسلامی بیداری کی تحریکات سے متاثر تھے۔ ان لوگوں نے مغرب میں نہ صرف یہ کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ مغربی نظام تعلیم کا بھی غائر مطالعہ کیا اور اس کا اسلام کے تعلیمی اصولوں سے مقابلہ بھی کیا۔

14.4.1 پس منظر اور قیام

مسلم دنیا کے انہیں طلبہ میں سے کچھ نے امریکہ میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) اور بعد ازاں ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس (AMSS) جیسی اسلام پسند طلبہ تنظیمیں قائم کیں۔ امریکہ میں ان کا مقصد جہاں ایک طرف یہ تھا کہ تعلیم کی غرض سے یہاں آنے والے مسلمانوں کو ان کی اسلامی شناخت سے جوڑے رکھا جائے وہیں ان کی خواہش یہ بھی تھی کہ اسلامی تعلیمات اور اصولوں کی روشنی میں ایک ایسے نظام تعلیم کو قائم اور رائج کیا جائے جو جدید ترین ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم طلبہ کی مذہبی ضروریات کو بھی پورا کرنے والا ہو۔ بالفاظ دیگر ایک ایسا نظام تعلیم جو مذہبی بیزاری کے ساتھ نہیں بلکہ مذہبی وابستگی کے ساتھ جدید تحقیقات کی طرف لے جانے والا ہو۔ مغرب میں موجود مسلم طلبہ کا یہ

احساس ہی تھا جس نے انہیں سب سے پہلے سماجی علوم کے حوالے سے خود کو منظم کرنے اور اپنی کوششوں کو آگے بڑھانے پر آمادہ کیا چنانچہ 1972ء میں ان لوگوں نے سماجی علوم کے مسلمان ماہرین کا ایک اتحاد ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس (AMSS) کے نام سے تشکیل دیا۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ سماجی علوم کے مسلمان ماہرین سماجی علوم کو اسلامی اصولوں کے مطابق فروغ دینے کی کوشش کریں اور اس کوشش کو 'اسلامائزیشن آف نالج' کا نام دیا گیا اور اس اصطلاح کو کافی مقبولیت بھی ملی۔ البتہ اسلامائزیشن آف نالج کا کام AMSS کے ذریعہ جس پیمانے پر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو پا رہا تھا کیونکہ کوششیں بیشتر منتشر اور بکھری ہوئی تھیں اور ان کو منظم کرنے کے لیے ادارہ جاتی شکل دینے کی ضرورت تھی۔ AMSS کی ایک بین الاقوامی کانفرنس سوئٹزرلینڈ کے شہر لوگانو میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں تنظیم کی سرگرمیوں خاص طور پر اسلامائزیشن آف نالج کے کام کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسے منظم اور مربوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا ادارہ وجود میں آئے جو کلی طور پر اسی کام کے لیے وقف ہو۔ چنانچہ اس کے لیے کوششیں شروع ہوئیں اور انہیں کوششوں کے نتیجے میں انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ IIIT (بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی) وجود میں آیا۔ IIIT کا باضابطہ قیام تو 1981ء میں عمل میں آیا البتہ اس کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی پہلی میٹنگ 8/اکتوبر 1980ء کو امریکی ریاست میری لینڈ کے شہر لین ہان میں منعقد ہوئی اور اس میٹنگ میں معروف مسلم اسکالر عبدالحمید ابوسلیمان کو IIIT کا صدر منتخب کیا گیا۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (بین الاقوامی ادارہ فکر اسلامی) کے بانیان میں عبدالحمید ابوسلیمان - جو 1988 سے لے کر 1998ء تک بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، ملائیشیا کے ریکٹر رہے - کے علاوہ اسماعیل راجی الفاروقی، ڈاکٹر طہ جابر العلوانی، ڈاکٹر جمال البرزنجی اور انور ابراہیم جیسے مسلم دنیا کے اہم اور نمایاں نام شامل ہیں۔ اسماعیل راجی الفاروقی، اس وقت تک امریکہ میں مسلم دانشور کی حیثیت سے اہم شناخت رکھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہی حقیقی معنوں میں سماجی علوم کے اسلامائزیشن کی تحریک شروع کی تھی۔ اس میٹنگ میں انہیں IIIT کا سکریٹری ٹریزرار اور ڈائرکٹر منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر جمال البرزنجی امریکہ میں مسلم طلبہ کی سرگرمیوں سے ہمیشہ وابستہ رہے، وہ SAAR (سلیمان عبدالعزیز الراجحی) فاؤنڈیشن اور صفا گروپ کے سربراہ بھی رہے۔ وہ امریکہ کے کامیاب مسلم تاجروں میں شمار ہوتے ہیں۔ طہ جابر العلوانی مسلم دانشوری کا بڑا نام ہیں، فقہ اور اصول فقہ ان کا میدان اختصاص ہے، فقہ کونسل آف نارتھ امریکہ کے بانی ہیں اسی طرح وہ قرطبہ (Cordoba) یونی ورسٹی، ورجینیا کے صدر ہیں۔ انور ابراہیم ملائیشیائی سیاست داں اور مسلم دانشور ہیں۔ 1998-1991 وہ ملائیشیا کے وزیر خزانہ اور 1998-1993 ملائیشیا کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔

بنیادی طور پر اگر دیکھا جائے تو انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ (IIIT) ایک پرائیویٹ یعنی غیر سرکاری، غیر منفعت بخش، علمی، ثقافتی اور تعلیمی ادارہ ہے، جس کا دائرہ کار عمومی طور پر اسلامی فکر اور تعلیم کے میدانوں تک وسیع ہے۔ 1981ء میں انسٹی ٹیوٹ کا قیام ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA) میں عمل میں آیا۔ یہ ادارہ کسی بھی طرح کے نظریاتی، سیاسی یا جماعتی وگروہی تعصب سے پاک اور آزاد ہے۔ ادارے کے مرکزی دفاتر امریکی ریاست ورجینیا کے شہر ہرن ڈن میں، جو دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی کے نواح میں ہے، واقع ہیں۔ IIIT کے روابط دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلے اداروں اور تنظیموں سے ہیں جو اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں میں اس کی معاونت کرتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے انتظامات ایک بورڈ آف ٹرسٹیز کے ذمہ ہیں جس کے ارکان میں سے ہی ادارے کے سربراہ (صدر) کا انتخاب ہوتا ہے۔

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ ایک ایسا علمی ادارہ ہے جو اسلامی تناظر میں تعلیمی وسماجی مسائل کے حل کے لیے کام کرتا ہے اس حوالے سے وہ تحقیقی پروجیکٹوں کی مدد کرتا ہے، علمی وثقافتی اجتماعات کا اہتمام کرتا ہے علمی کاوشوں کو شائع کرتا ہے اور تعلیم وتربیت کے کام میں مصروف ہے۔ اس ادارے نے عالمی سطح پر علم ودانش کے میدان میں اسلامی فکر کے حوالے سے غیر معمولی اثرات چھوڑے ہیں خاص طور پر تعلیم، قدیم علمی ورثے کی حفاظت اور سماجی علوم میں اس کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

14.4.2 IIIT کے اغراض ومقاصد:

انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ ایسے اساتذہ کو تیار کرے جو جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق اسلام اور اس کی تعلیمات کی تشریح وتوضیح طلبا کے سامنے کرسکیں اسی طرح اس نے اس کے لیے بھی کوشش کی ہے کہ ایسے دانشوروں کی کھیپ تیار کی جائے جو اسلام اور اس کی تعلیمات کو آج کی دنیا میں پیش آمدہ چیلنجوں کے مقابلے حل کے طور پر پیش کرسکیں۔ IIIT کی ویب سائٹ پر اس کے مقاصد کی وضاحت کچھ اس طرح کی گئی ہے:

-1 ادارے کا مقصد ایسے افراد کا تیار کرنا ہے جو اسلامی تعلیم، ثقافت اور علم (Knowledge) کے میدانوں میں کام کرسکیں۔

-2 ایک ایسا جامع Vision (نظریہ) اور طریقہ کار تشکیل دینا جو مسلمان دانشوروں کے لیے معاصر علمی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ لینے میں معاون ہو۔

-3 ایسا طریقہ کار وضع کرنا جو قرآن مجید اور سنت نبوی کی تفہیم کے لیے مناسب اور موزوں ہو۔

-4 ماضی اور حال کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا مناسب طریقہ کار وضع کرنا جو قدیم اسلامی ورثے اور جدید علمی روایت کے ساتھ معاملہ کرنے میں معاون ہو تاکہ مسلم امت اور وسیع معنوں میں انسانیت کے لیے ایک بہتر مستقبل تعمیر کیا جاسکے۔

-5 معاصر دنیا کے چیلنجوں اور مواقع کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسا مناسب طریقہ کار وضع کرنا جو امت اور عمومی طور پر دنیا کو خاص طور پر تعلیم کے شعبے میں درپیش چیلنجوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں معاون ہو۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ جو وسائل اختیار (استعمال) کرتا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

-1 تدریس (تعلیم)، اساتذہ کی تربیت، نصابی کتابوں کی اشاعت۔

-2 یونیورسٹیوں اور تحقیقی مراکز سے وابستہ محققین اور دانشوروں کی معاونت اور منتخب علمی وثقافتی کاموں کی انگریزی، عربی اور دنیا کی دیگر زبانوں میں اشاعت۔

-3 اسلامی فکر کے فروغ واستحکام کے لیے مطالعے اور تحقیق کروانا۔

-4 مخصوص علمی، دانشورانہ اور ثقافتی کانفرنسوں، سیمیناروں اور Study Circles (مطالعاتی گروپوں) کا انعقاد۔

بلا شبہ اپنے قیام کے بعد سے ہی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ اپنے وسائل کے مطابق اسلامی فکر کے احیاء اور فروغ کے کام میں مصروف ہے۔ اس نے متعدد ایسے مطالعے کروائے ہیں جو نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کو درپیش مختلف چیلنجوں کے حوالے سے مؤثر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اس ادارے نے اپنی توجہ اور مصروفیات کا اصل مرکز سماجی علوم کے شعبے کو بنایا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلام کے الہامی علم کو جدید انسانی علم سے مربوط کیا جائے اور ایسے امکانات تلاش کیے جائیں جو ان علوم کو امت مسلمہ اور پوری دنیا کے لیے زیادہ سے زیادہ نفع بخش بنا سکیں۔ اسلامائزیشن آف نالج کا انسٹی ٹیوٹ کا پروجیکٹ اپنے آپ میں اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ طویل عرصے تک اس کی اہمیت اور افادیت کو باقی رکھے گا۔ اس پروجیکٹ نے اس کے حامیوں اور مخالفین دونوں حلقوں میں ایک ہلچل پیدا کرنے میں ضرور کامیابی حاصل کی ہے۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ نے اپنی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے امریکہ اور امریکہ سے باہر بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے ذیلی اور ملحق ادارے قائم کیے ہیں، جو اپنے اپنے ملکوں میں آزادانہ طور پر مقامی اور عالمی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیقی و علمی کاموں میں مصروف ہیں۔ اس طرح کے مراکز دنیا کے 13 ملکوں میں قائم ہیں۔ ان کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ نے دنیا کی مختلف یونی ورسٹیوں اور تحقیقی مراکز کے ساتھ تحقیقی و علمی کاموں میں تعاون کے لیے مختلف معاہدے بھی کیے ہیں۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کا علم و تحقیق کے حوالے سے سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انگریزی، عربی اور دنیا کی دیگر مختلف زبانوں میں سیکڑوں کی تعداد میں علمی و تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ صرف اردو زبان میں انسٹی ٹیوٹ کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد 30 سے زائد ہے۔

14.5 اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ (ICNA)

دور جدید میں مغرب (مغربی یورپی ممالک اور امریکہ) اور مسلم دنیا کے درمیان روابط کی دو سطحیں رہی ہیں۔ پہلی سطح وہ تھی جب یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد افرادی قوت کی ضرورت نے ایشیائی ملکوں کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ معاشی ضرورت کے تحت یورپ و امریکہ کا رخ کرنے والے ان لوگوں میں ایک تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔ البتہ چونکہ ان کا قیام یورپ و امریکہ معاشی ضرورت کے تحت تھا اس لیے یہ اپنی نجی اور عائلی زندگی میں تو ضرور اسلامی اصولوں کے پابند رہے البتہ اپنے نئے مسکنوں پر یہ لوگ اسلام کی کوئی خاص چھاپ چھوڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مغرب کے ساتھ مسلمانوں کے رابطے کی دوسری سطح وہ ہے جب مغرب کی جدید ترقیات خاص طور پر علمی و فنی میدانوں کی ترقیات نے مسلم دنیا (برصغیر اور عرب ممالک) کے بہت سے نوجوانوں کو اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنی جانب متوجہ کیا۔ مغرب اور مسلمانوں کے درمیان رابطے کی یہ سطح مالک اور مزدور والی نہیں تھی۔ تعلیم کی غرض سے مغرب کا رخ کرنے والوں نے جب ان ملکوں میں سکونت اختیار کرنا شروع کی اس وقت بھی ان کا معاملہ بڑی حد تک برابری کی سطح پر تھا کیونکہ اب ان تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت مغرب کو تھی۔

تعلیم کی غرض سے مغرب کا رخ کرنے والے نوجوانوں میں ایک تعداد ایسے نوجوانوں کی بھی تھی جو اپنے ملکوں میں اسلامی بیداری کی جدید تحریکات (مثال کے طور پر برصغیر میں جماعت اسلامی اور عرب دنیا میں الاخوان المسلمون) سے متاثر تھے یا ان سے وابستہ رہ چکے تھے۔ جب یہ لوگ دوران تعلیم ہی یا تعلیم کے بعد مغربی ملکوں میں مستقل سکونت اختیار کرنے لگے تو انہیں ان کی مذہبی ضروریات نے اس بات پر آمادہ کیا کہ یہ اپنے نئے مسکنوں میں مسلمانوں کی نئی اجتماعیتیں تشکیل دیں تاکہ ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے اپنی مذہبی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ آغاز میں مغرب میں وجود میں آنے والی یہ اجتماعیتیں بیشتر طلبہ کی چھوٹی چھوٹی انجمنیں تھیں جنہوں نے بعد میں پیشہ ورانہ انجمنوں اور

ایسوی ایشنوں کی شکل اختیار کر لی یا ان کے وجود میں آنے کا پیش خیمہ بنیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم کی غرض سے جانے والے مسلم نوجوانوں نے اس طرح کی جو پہلی اجتماعیت قائم کی وہ شاید مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) تھی۔ امریکہ کی بیشتر مسلم پیشہ ورانہ اور دیگر اجتماعیتیں بنیادی طور پر مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی ہی یا تو توسیع ہیں یا اس کی شاخیں ہیں۔

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ بھی ایک ایسی ہی تنظیم ہے جس کی سرگرمیوں کا آغاز 1968ء میں ہوا اور جسے مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن سے وابستہ ان طلبہ اور افراد نے قائم کیا جن کا تعلق جنوبی ایشیا خاص طور پر برصغیر ہندو پاکستان سے تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں جن لوگوں نے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ قائم کی بنیادی طور پر وہ برصغیر کی جماعت اسلامی سے متاثر تھے یا اپنے ملکوں میں قیام کے دوران وہ اس سے وابستہ رہ چکے تھے۔ البتہ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کا باضابطہ قیام 1971ء میں عمل میں آیا، اس تنظیم کا مرکزی دفتر جمیکا، نیویارک میں ہے جس میں طلبہ کی اسلامی کلاسوں کے لیے کلاس روم، ایک ریڈنگ روم اور ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ تنظیم کے دفاتر ڈیٹ رائٹ مشی گن اور آک وِلے، اونٹاریو میں بھی قائم ہیں۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کو امریکی مسلمانوں کی ایک امبریلا تنظیم کی حیثیت حاصل ہے جس کے تحت مختلف سطحوں پر مختلف طرح کی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔ امریکی مسلم سماج میں اپنے اثرات کے اعتبار سے اس تنظیم کی جڑیں کافی مضبوط اور گہرائی تک جمی ہوئی ہیں۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے خواتین کا حلقہ 1979ء میں "Sisters Wing" کے نام سے قائم کیا جو امریکی خواتین میں کافی مقبول ہے۔ قرآن وسنت کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اقامت دین کے لیے جدوجہد کے ذریعے اللہ کی رضا کا حصول اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کا بنیادی مقصد ہے۔ تنظیم کے تحت مختلف پروگرام کے ذریعے مذکورہ مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے پروگراموں میں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ نسل و مذہب اور خطے کی تفریق کیے بغیر عام امریکیوں کو ان کے خالق و مالک کے بارے میں بتایا جائے۔ مسلمانوں کو ان کی امت وسط کی ذمہ داری کو یاد دلاتے ہوئے اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے کردار و عمل اور بات چیت کے ذریعہ شہادت (گواہی) کا فریضہ انجام دیں۔ لوگوں کی کوششوں کو منظم کیا جائے۔ لوگوں میں اسلام کے فہم اور بلندی کردار کو جلا بخشنے کے لیے تعلیمی و تربیتی پروگرام منعقد کیے جائیں۔ ہر طرح کے ظلم واستحصال اور بداخلاقی کی مخالفت کی جائے اور شہری آزادی اور سماج میں سماجی ومعاشی انصاف کے لیے ہونے والی کوششوں کا ساتھ دیا جائے۔ پورے شمالی امریکہ میں لوگوں کے درمیان انسانیت کے رشتے کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جائے اور جو تنظیمیں اور ادارے بھی اتحاد امت اور اس طرح کے پروگراموں کے لیے کام کرتے ہیں ان کے ساتھ تعاون کیا جائے۔

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے وقت گزرنے کے ساتھ امریکی مسلمانوں کے ایک ایسے پلیٹ فارم کی شکل اختیار کر لی ہے جہاں سے امریکی معاشرے میں اسلام کی صاف ستھری تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس نے امریکی سماج میں موجود متعدد مسائل پر بھی توجہ دی ہے اور خود کو بڑی حد تک امریکی مسلمانوں کے مسائل سے بھی وابستہ رکھا ہے۔ اس تنظیم نے امریکہ میں مسلمانوں کے درمیان اخوت کے جذبے کو پروان چڑھایا ہے اور انہیں نسلی وعلاقائی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی امت کا شعور ان میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ہر بھلے برے وقت میں ایک دوسرے کے کام آتی ہے۔ امریکہ جہاں لوگوں کی اکثریت زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے مقصد سے گئی ہوئی ہے، اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے ان لوگوں کو مسجد سے جوڑا ہے، انہیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ اسلامی

سرگرمیوں میں حصہ لیں اور امریکی سماج میں ایک باکردار اور باعمل مسلمان کی حیثیت سے خود کو متعارف کرائیں۔ تنظیم نے اپنے دروازے سرحدوں کی تعیین کے بغیر سبھی کے لیے کھلے رکھے ہیں۔ اس نے اسلام کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے پمفلٹ اور کتابوں کے علاوہ جدید ترین ابلاغی ذرائع کی خدمات بھی حاصل کی ہیں اور امریکی سماج میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے پائی جانے والی غلط فہمیوں کے ازالے کی بھرپور انداز میں کوشش کی ہے۔ اس نے غیر مسلموں کو اسلام کے بارے میں معلومات فراہم کرنے اور ان کے سوالات کا جواب دینے کے لیے ایک Toll-Free (مفت) ٹیلی فون نمبر دے رکھا ہے، جس پر فون کرکے وہ نہ صرف یہ کہ اسلام کے بارے میں اپنی غلط فہمیاں دور کرسکتے ہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اپنے سوالوں کے جواب بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے امریکی ذرائع ابلاغ میں جو غلط فہمیاں در آئی ہیں ان کی مانیٹرنگ کے لیے بھی اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے مسلم الرٹ نیٹ ورک کے نام سے ایک تنظیم بنائی ہے یہ اپنی نوعیت کی انتہائی اہم اور امریکہ میں مسلمانوں کی سب سے پرانی میڈیا مانیٹرنگ تنظیم ہے۔ بیسٹ ورڈس کے نام سے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کا اشاعتی ادارہ کام کرتا ہے اس کا کام اسلام کے بارے میں لٹریچر کی اشاعت ہے۔ اسی ادارے کے تحت تنظیم کا ماہانہ ترجمان میسج انٹرنیشنل (Message International) 1989ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ تنظیم کی ویب سائٹ پر آن لائن سوالات کرنے اور جواب حاصل کرنے کی سہولت بھی فراہم ہے۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ اس کے سالانہ اجتماعات ہیں۔ ان اجتماعات میں امریکہ بھر سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ دور کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے بین المذاہب مکالمے کی اہمیت کو بھی محسوس کیا ہے اور امریکہ میں موجود مختلف عیسائی و دیگر گروپوں کے ساتھ مذہبی مکالمے کے پروگراموں میں بھی شرکت کی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام والے امریکی معاشرے میں اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے لوگوں میں دولت کی ہوس کو صحیح رخ دینے کے مقصد سے مسلم سیونگ اینڈ انویسٹمنٹ کے نام سے ایک ایسا مالیاتی ادارہ قائم کیا ہے جو نہ صرف یہ کہ موجودہ دنیا میں رائج سودی نظام کی برائیوں سے پاک ہے بلکہ اس کا ایک بہتر متبادل بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ادارہ امریکی مسلم سماج کے ان لاکھوں لوگوں کے لیے ایک محفوظ مالی پناہ گاہ کے طور پر سامنے آیا ہے جو اپنی دولت کو سود کی آلائش سے پاک بھی رکھنا چاہتے ہیں اور جہاں ان کی سرمایہ کاری کی بنیادی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی خدمات کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے امریکہ میں موجود مسلمانوں کا ایک ڈاٹا بیس نظام قائم کر رکھا ہے جس میں امریکی مسلمانوں کے پتے، پیشے اور دلچسپی کے خاص میدانوں کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ اس طرح بوقت ضرورت ایک دوسرے تک پہنچنا بھی آسان ہوتا ہے۔

اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی رکنیت عام ہے اور امریکہ میں مقیم کوئی بھی مسلمان مرد، عورت اس کا رضا کار بن سکتا ہے۔ اس تنظیم کی قیادت کا انتخاب ہر سال خفیہ رائے دہی کے ذریعہ تنظیم کے رضا کار کرتے ہیں۔ یہی لوگ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی شوریٰ (Advisory) کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ تنظیم کی شوریٰ اپنے اجلاس میں اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں کی منصوبہ بندی اتفاق رائے یا کثرت رائے سے کرتی ہے۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ نے تنظیم کی رکنیت کو صرف اپنے ساتھ ہی مخصوص اور محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کا ہر کارکن کسی بھی دوسری تنظیم کے ساتھ کام کرسکتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہو۔ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ کی مالیات کی فراہمی کا بڑا ذریعہ اس

کے رضا کاروں سے حاصل ہونے والی مالی اعانتیں ہیں۔ یہ تنظیم امریکہ سے باہر کسی تنظیم یا ادارے سے مالی تعاون حاصل نہیں کرتی۔

معلومات کی جانچ

1۔ نیشن آف اسلام کب قائم ہوئی اور اس کے بانی کا نام بتائیں۔

2۔ نیشن آف اسلام کا دوبارہ احیا کس نے کیا اور کب کیا؟

3۔ ICNA کے انگریزی ترجمان کا نام کیا ہے؟

14.6 اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (ISNA)

سابقہ مضمون میں ہم یہ جان چکے ہیں کہ مغربی یورپ اور شمالی امریکہ کے ملکوں کا رخ کرنے والوں میں مسلمان محنت کش اور طلبہ دونوں طرح کے لوگ تھے۔ البتہ 1950ء کی دہائی میں اور اس کے بعد امریکہ میں خاص طور پر مسلم طلبہ کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والے یہ نوجوان امریکہ گئے تو اس مقصد سے تھے کہ وہاں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے اور پھر واپس اپنے ملکوں کو لوٹ آئیں گے۔ البتہ امریکہ پہنچ جانے کے بعد جب مستقبل کے لیے انہیں زیادہ بہتر امکانات امریکہ میں ہی نظر آئے تو ان کی ایک بڑی تعداد نے تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے ملکوں کو واپسی کے بجائے امریکہ ہی میں سکونت کو پسند کیا اور اس طرح امریکہ دھیرے دھیرے مسلمانوں کی ایک نسل کا وطن بنتا چلا گیا۔ چونکہ تعلیم کی غرض سے امریکہ جانے والوں میں ایک تعداد ان طلبہ کی بھی تھی جو اپنے ملکوں کی اسلامی اجتماعیتوں (مسلم جماعتوں/تنظیموں) سے یا تو متاثر تھے یا ان سے وابستہ رہ چکے تھے، اس لیے انہوں نے امریکہ پہنچنے کے بعد بھی اجتماعیت کی ضرورت کو محسوس کیا اور بہت جلد بعد ہی امریکہ میں مسلم طلبہ کے چھوٹے چھوٹے حلقے وجود میں آنے لگے۔ طلبہ کے انہیں حلقوں نے آگے چل کر امریکہ میں مسلمانوں کی پہلی اجتماعیت یا طلبہ تنظیم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (MSA) کی شکل اختیار کی جو باضابطہ 1963ء میں قائم ہوئی اور جس کے بطن سے ہی امریکہ کی دیگر مسلم تنظیموں اور جماعتوں نے جنم لیا۔

کسی بھی طلبہ تنظیم کے ساتھ کام کرنے اور اس سے وابستگی کی ایک عمر ہوتی ہے اور دوران تعلیم ہی یہ وابستگی زیادہ مؤثر اور کارگر رہتی ہے۔ مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن سے وابستہ رہ چکے وہ طلبہ جو اب عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہوگئے تھے، اب انہیں ایک بار پھر ایسی اجتماعیت کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو ان کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی پیشہ وارانہ زندگی کے لیے سازگار بھی ہو اور اس میں معاون بھی ثابت ہو، چنانچہ اب امریکہ میں مسلمانوں کی پیشہ ورانہ انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کا دور شروع ہوا۔ لہٰذا اس طرح سے امریکہ میں مسلمانوں کی اولین پیشہ ورانہ تنظیمیں مثلاً اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن (1968)، ایسوسی ایشن آف مسلم سائنٹسٹ اینڈ انجینیئرس (1969) اور ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس (1972) وجود میں آئیں۔ البتہ جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے یہ مختلف شعبوں سے وابستہ مسلم ماہرین کی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں تھیں اور امریکہ میں مسلمانوں کا کوئی مشترک اور متحدہ پلیٹ فارم نہیں تھا اور ان کے درمیان ربط و تعاون کا بھی کوئی باضابطہ نظم نہیں تھا۔ اس لیے امریکہ میں مسلمانوں کی ایک ایسی امبریلا تنظیم کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جو ان کے درمیان باہمی ربط و تعاون کا ذریعہ بھی ہو اور انہیں یکجا و متحد بھی رکھ سکے۔ امریکی مسلمانوں کا یہ خواب 1982ء میں اس وقت پورا ہوا جب

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ (INSA) کا قیام عمل میں آیا۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ بنیادی طور پر ایک امبریلا آرگنائزیشن (تنظیم) ہے اور اس تنظیم میں بیشتر وہ گروپ شامل ہیں جو کسی نہ کسی طور پر مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے پروردہ ہیں۔ اسنا (اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ) 1982ء میں امریکہ کی چار مسلم تنظیموں کی مشترکہ کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

1- مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن آف دی یو ایس اینڈ کنیڈا

2- اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن

3- ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹس

4- ایسوسی ایشن آف مسلم سائنٹس اینڈ انجینئرس

مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے ان اہم گروپوں کے علاوہ بھی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے قیام کے وقت مختلف چھوٹے چھوٹے گروپ، مساجد اور ادارے اس میں شامل ہوئے۔ اس کے قیام کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور جس طرح یہاں کے حالات بدل رہے ہیں اس میں ان کی ایک ایسی وسیع البنیاد تنظیم ہونی چاہیے جس کی جڑیں امریکی مسلم سماج کے تمام طبقوں میں ہوں اور جسے تمام امریکی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم کہا جا سکے۔ بلاشبہ اسنا (اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ) کے وفاق میں شامل مختلف امریکی گروپ اور تنظیمیں اپنے حجم، رکنیت، قومیت، نسل اور قیادت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں۔ البتہ ان اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی شکل میں امریکی مسلمانوں، ان کے اسلامی مراکز و مساجد اور تنظیموں و اداروں کا ایک ایسا اتحاد قائم ہے جس کی کثرت میں وحدت کا رنگ ہے اور جو حقیقی معنوں میں اسے امریکی مسلمانوں کی قومی تنظیم بنا کر پیش کرتا ہے، اس طرح یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اسنا (I S N A) ہی فی الحقیقت امریکی مسلمانوں کا سماجی آئینہ ہے۔

1982ء میں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے قیام کے بعد سے ہی اس تنظیم کا مرکزی دفتر امریکی ریاست انڈیانا میں پلین فیلڈ کے مقام پر قائم ہے۔ یہاں پر تنظیم کا عمومی سکریٹریٹ بھی قائم ہے اور سکریٹریٹ کے دفاتر کے ساتھ ہی ایک خوبصورت مسجد بھی ہے۔ اس پورے کامپلکس کو تنظیم سے وابستہ افراد کے عطیات کے علاوہ متحدہ عرب امارات کے مالی تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ابتداء یہ عمارت شہر کے کنارے زرعی علاقے میں تعمیر کی گئی تھی لیکن اب یہ پورا علاقہ انڈیاناپولس (ریاست انڈیانا کا دارالحکومت) کی شہری حدود میں داخل ہو چکا ہے۔ تنظیم کے مرکزی دفتر کا نقشہ ایک مسلمان ماہر تعمیرات نے بنایا ہے۔ اسنا سکریٹریٹ کے تمام دفاتر کی نگرانی تنظیم کا سکریٹری جنرل کرتا ہے اور سکریٹری جنرل براہ راست تنظیم کے منتخب صدر کو جوابدہ ہوتا ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی سرگرمیاں مختلف زمروں میں تقسیم ہیں اور سبھی شعبوں کے الگ الگ ڈائرکٹر ہوتے ہیں جو متعلقہ شعبوں کے کاموں کو دیکھتے اور ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ تنظیم کے تحت جن اہم شعبوں میں کام ہو رہا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں۔ اسلامی تعلیمی مراکز، اسلامی اسکولوں کا شعبہ، رکنیت اور فیلڈ سروس کا شعبہ، کنونشن اور آڈیو ویژول

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے دستور کے مطابق تنظیم میں دو پالیسی ساز ادارے ہیں ایک مجلس شوریٰ اور دوسرا مجلس انتظامیہ۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کی تعداد 24 ہوتی ہے۔ ان میں سے سات ممبران کا انتخاب اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کی جنرل باڈی کرتی ہے۔ پانچ ارکان کا انتخاب اسنا کے مختلف حلقوں (Chapters) اور ملحقات کے صدور کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ شوریٰ کے چھ ارکان کا تعلق تنظیم کے سابق دفتری کارکنوں سے ہوتا ہے۔ انہیں میں ان تنظیموں کے صدور بھی شامل ہیں جن تنظیموں پر کہ اسنا مشتمل ہے۔ مجلس شوریٰ میں اسنا کا صدر، نائب صدور (برائے امریکہ اور کناڈا) نارتھ امریکن ٹرسٹ فنڈ، اسنا کے اشاعتی ادارہ اور کمیونٹیز اسلامک ٹرسٹ فنڈ کے چیرمین اور اسنا سے ملحق درج ذیل تنظیموں: مسلم عرب یوتھ ایسوسی ایشن، مسلم یوتھ آف نارتھ امریکہ، کونسل آف اسلامک اسکولس آف نارتھ امریکہ، مسلم چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور ملائیشین اسلامک اسٹڈی گروپ کے صدور بحیثیت عہدہ شامل ہوتے ہیں۔

اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ، ملک کے مختلف مسلم سماجوں -خواہ ان کا تعلق مقامی مسلمانوں سے ہو یا وہ نقل مکانی کر کے امریکہ میں آباد ہونے والے ہوں- کے لیے مختلف طرح کے کام اور پروگرام کرتی ہے۔ اس حوالے سے اس کا ایک اہم کام اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ اسی طرح اسنا کے پلیٹ فارم سے سن رسیدگی، اخلاقیات، گھریلو تشدد وغیرہ مسائل پر بھی بات چیت کے پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ اسنا کا ایک اہم کام امریکہ میں مختلف مساجد کو جوڑنا اور ایک دوسرے سے قریب لانا بھی ہے حالانکہ ابھی تک مساجد کی بہت کم تعداد نے اسنا کی رکنیت حاصل کی ہے البتہ اس کا یہ اقدام امریکہ کی مختلف چھوٹی کمیونٹیز کو باہم جوڑنے میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ، امریکی مسلمانوں کا ایک وسیع اور بڑا اجتماعی پلیٹ فارم ہے۔ بعض اندازوں کے مطابق اسے چار لاکھ سے زائد امریکی مسلمانوں کی رکنیت اور حمایت حاصل ہے۔ ابھی تک اس تنظیم کے ارکان کی اکثریت اور قیادت ان مسلمانوں پر مشتمل رہی ہے جنہوں نے ترک وطن کر کے امریکہ کو اپنا وطن بنایا ہے یعنی وہ وہاں کے اصل باشندے نہیں ہیں۔ البتہ حالیہ دنوں میں اسنا کے لیے ایک خوش آیند بات یہ رہی ہے کہ اس تنظیم کے ڈھانچے میں بھی ان کی شمولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اسنا کا ترجمان انگریزی زبان میں ''اسلامک ہورائزن'' کے نام سے شائع ہوتا ہے (یہ پندرہ روزہ رسالہ ہے)۔ اس رسالے میں اسنا کی تنظیمی سرگرمیوں، مقامی مسلمانوں کے حالات اور امریکی مسلمانوں کو درپیش مسائل پر مضامین کو شائع کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسنا ہر سال موسم گرما میں اپنے سالانہ اجتماع کا انعقاد کرتی ہے۔ ان اجتماعات سے خطاب کے لیے امریکہ اور بیرون امریکہ سے بھی مسلم علماء، دانشوروں اور رہنماؤں کو مدعو کیا جاتا ہے۔

امریکہ ایک بہت بڑا ملک ہے اور اس کے مختلف علاقوں میں آباد مسلمانوں کے حالات اور ضروریات مختلف ہیں۔ تنہا اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ یا اس جیسی ایک دو اور تنظیمیں ہی نہ تو ان سب تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں اور نہ ہی ان کے تمام مسائل کو ایڈریس کر سکتی ہیں۔ اسنا کے علاوہ بھی کئی تنظیمیں امریکہ میں مصروف عمل ہیں اور اپنے اپنے حصے کے کام کر رہی ہیں توقع ہے کہ ان کے درمیان باہم اتفاق اور تعاون کی فضا قائم رہے گی۔

14.7 یورپی افتا کونسل

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں مزدوروں کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ گئی جو مقامی آبادی سے پوری نہیں ہوتی تھی اس لیے تیسری دنیا خاص طور پر ایشیا اور شمالی افریقہ سے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد نے یورپی ملکوں کا رخ کیا۔ یورپ کا رخ کرنے والے ان مزدوروں میں ایک بڑی تعداد مسلمان مزدوروں کی بھی تھی۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ کے بعد کی دہائیوں میں مسلم ممالک کے نوجوانوں کی ایک تعداد نے بھی یورپ اور امریکہ کا رخ کیا تاکہ وہ وہاں جدید علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ یورپ وامریکہ پہنچنے والے ان مزدوروں اور طلبہ میں سے بہت سوں نے انہیں ملکوں کو اپنی مستقل سکونت کے لیے پسند کر لیا جہاں وہ تعلیم حاصل کرنے یا مزدوری کرنے کے مقصد سے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا اور آج یورپ وامریکہ میں مسلمان قابل ذکر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کا رخ کرنے والے مزدور اور طلبہ وہاں گئے تو روزی کمانے اور تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے تھے البتہ چونکہ وہ مسلمان تھے اور ان میں بہت سے پورے طور پر باعمل مسلمان بن کر اپنی زندگیاں گزارنا چاہتے تھے، اس لیے یورپ وامریکہ کے اجنبی سماج میں داخل ہونے کے فوراً بعد سے ہی ان کے سامنے کھانے پینے سے لے کر عبادت اور تجارت تک مختلف قسم کے مسائل سر اٹھانے لگے کیونکہ ان مسلمانوں کی اکثریت اپنے مذہب کی تعلیمات پر کاربند رہنا چاہتی تھی خاص طور پر حلال وحرام کے مسائل اس کے لیے بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں ان تارکین وطن نے اپنے اپنے ملکوں کے علماء سے نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے رجوع کیا اور ایک طویل عرصے تک یوں ہی کام چلتا رہا۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں آباد مسلم اقلیت کو جس طرح کے مسائل درپیش تھے ان میں متعلقہ ملکوں کے علماء سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنے میں بڑی دشواریاں اور پیچیدگیاں تھیں، چنانچہ ایک مرحلے میں یورپ وامریکہ میں وہاں آباد مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایشیائی وافریقی ملکوں سے مسلمان علماء کو درآمد کیا گیا تاکہ وہ ان کی مذہبی زندگی میں رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مسجدوں میں امامت کے فرائض بھی انجام دیں اور ان کی نئی نسل کو دین کی بنیادی تعلیمات سے بھی آگاہ کریں۔ ماضی قریب تک بیشتر صورت حال ایسی ہی تھی۔ البتہ اس میں دشواری یہ تھی کہ جن علماء کو یورپ وامریکہ میں مسلمانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مدعو کیا جاتا تھا بالعموم وہ یورپی زبان وثقافت اور یورپی ماحول وضروریات سے نابلد ہوتے تھے جس کی وجہ سے کئی بار مسائل حل ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ پچھلی کچھ دہائیوں کے دوران یورپ وامریکہ کے مسلمانوں میں اس رجحان کو تقویت ملی کہ چونکہ یورپ وامریکہ میں آباد مسلمانوں کی مذہبی ضروریات اور حالات دنیا کے دیگر بالخصوص مسلم علاقوں سے مختلف ہیں اس لیے یہاں پر مذہبی ضروریات اور حالات دنیا کے دیگر بالخصوص مسلم علاقوں سے مختلف ہیں اس لیے یہاں پر مذہبی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ایسے علما اور مسلم دانشوروں کی خدمات حاصل کی جائیں جو ان کے حالات وضروریات کو جانتے اور سمجھتے ہوں اور ان کے مطابق فیصلے لینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح جو لوگ یورپ و امریکہ میں مذہبی فرائض وامور میں رہنمائی انجام دے رہے ہوں ان کی تربیت وہاں کے حالات وضروریات کے مطابق کی جائے۔ یورپی افتاء کونسل (European Council for Fatwa and Research، المجلس الاوربی للافتاء والبحوث) ایک ایسے ہی ادارے کے طور پر قائم کی گئی ہے جو یورپ اور امریکہ میں آباد مسلمانوں کی مذہبی امور میں رہنمائی وہاں کے حالات وضروریات کے مطابق کرے۔

یورپی افتاء کونسل یورپی مسلمانوں کا ایک ایسا ادارہ ہے جو، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، ان کی مذہبی امور میں ہدایت ورہنمائی

کے لیے قائم کیا گیا ہے۔کونسل کا صدر دفتر آئرلینڈ کے دارالحکومت اور سب سے بڑے شہر ڈبلن میں ہے۔ یورپی افتاء کونسل ایک آزاد اور مخصوص مہارت کی حامل تنظیم ہے اور جو مسلمان علماء اور دانشوروں کے ایک گروپ پر مشتمل ہے۔ 1997ء میں اتحاد تنظیمات اسلامی، یورپ کی تحریک پر برطانیہ کے دارالحکومت لندن میں 30-29 مارچ کو علماء و دانشوروں کا ایک اجلاس ہوا جس میں دنیا کے مختلف ملکوں سے 15 سے زائد اکابر علماء نے شرکت کی۔ علماء کے اسی اجلاس میں یورپی افتاء کونسل کے قیام کا فیصلہ ہوا اور اس کے دستور اساسی کا مسودہ بھی منظور کیا گیا۔ یورپی افتاء کونسل کے قیام سے درج ذیل مقاصد کا حصول پیش نظر تھا:

14.7.1 اغراض ومقاصد

1- یورپ کے مسلم علماء اور دانشوروں کو ایک ساتھ لانا اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنا

2- یورپ میں مسلمانوں کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہی مسائل میں اتحاد و یکسانی پیدا کرنے کوشش کرنا

3- ایسے اجتماعی فتوے جاری کرنا جو یورپ میں مسلمانوں کی فقہی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں، ان کے مسائل کو حل کرنا اور یورپی سماجوں سے ان کے ارتباط اور تعلق کے ضابطے اور اصول وضع کرنا

4- یورپ میں مسلم اقلیت کو جو فقہی مسائل درپیش ہیں ان پر تحقیق اور مطالعہ کرنا اور انہیں اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق حل کرنے کی کوشش کرنا

5- یورپی مسلمانوں کی نئی نسل میں اسلامی شریعت کے تیئں بیداری پیدا کرنا، اسلامی شریعت کے لیے عقلی بنیادیں فراہم کرنا اور فتووں کو عقلی انداز میں اس طرح پیش کرنا کہ وہ سبھی کے لیے قابل قبول ہوسکیں۔

مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے یورپی افتاء کونسل ذیل کے ذرائع استعمال کرتی ہے:

الف: کونسل کے ارکان پر مشتمل ایسی خصوصی کمیٹیاں تشکیل دینا جو کونسل کے مقاصد کے حصول میں معاون ہوں

ب: فتویٰ جاری کرنے والی ان اکیڈمیوں اور ایجنسیوں پر اعتماد کرنا جو واقعات و حالات کے مطابق صحیح فیصلے لیتی ہیں اور مناسب فتوے جاری کرتی ہیں۔

ج: مختلف فقہی اکیڈمیوں اور علمی اداروں میں فقہی امور سے متعلق ہونے والی تحقیقات اور مطالعوں سے استفادہ کرنا

د: اس بات کے لیے کوشش کرنا کہ یورپی حکومتیں سرکاری طور پر یورپی افتاء کونسل کو تسلیم کرلیں اور اسلامی قانون و شریعت کے حوالے سے جو امور بھی ان کے سامنے آئیں، ان میں وہ یا ان کی عدالتیں یورپی افتاء کونسل سے رجوع کریں۔

ہ: یورپ میں جو علماء اور دعاۃ کام کر رہے ہیں، ان کی تربیت کا انتظام کرنا اور ان کے لیے ایسے کورسز اور نصاب تیار کرنا جو یورپی مسلمانوں اور معاشروں کی ضروریات پوری کرتے ہوں۔

و: فقہی مسائل کے مطالعہ و تحقیق کے لیے سیمینار منعقد کرنا۔

ذ: یورپی زبانوں میں مسلمانوں سے متعلق مختلف امور میں رائے دینا اور ان کے لیے مناسب مشوروں کو جاری کرنا۔

ح: ایک ایسا رسالہ شائع کرنا جس میں کونسل کی تحقیقات اور مطالعوں کو مختلف یورپی زبانوں میں شائع کیا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یورپی افتاء کونسل مغرب خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں آباد مسلم اقلیتوں کے ایک نمائندہ ادارے کے طور پر ابھری ہے۔ اس نے حالیہ دنوں میں مسلسل ایسے اقدامات کیے ہیں جو یورپی ملکوں میں آباد مسلم اقلیت کے مختلف طبقات کے درمیان الفت و یگانت پیدا کرنے میں معاون و مددگار رہوں۔ عام طور پر یورپی افتاء کونسل کی کوشش یہ رہتی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فقہی مسالک کی حدود میں رہتے ہوئے فقہ کے بنیادی -قرآن، سنت، اجماع اور قیاس- اور ثانوی -مثلاً استحصاب وغیرہ- مآخذ سے استفادہ کرے اور ان کی روشنی میں ہی کوئی فتویٰ صادر کرے۔ حالانکہ بعض حلقوں کی جانب سے یورپی افتاء کونسل پر اخوان المسلمون اور خاص طور پر اس کے ایک رہنما ڈاکٹر یوسف القرضاوی- جو ان دنوں قطر میں مقیم ہیں- کے زیر اثر کام کرنے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے خود کو بڑی حد تک مسلکی ودیگر تعصبات سے محفوظ رکھا ہے اور یورپ وامریکہ میں مسلمانوں کے ایک ایسے ادارے کے طور پر ابھری ہے جس کے فتوے اور رائیں زیادہ تر لوگوں کے لیے قابل قبول ہیں۔ اس پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ یورپ میں قائم ہونے اور نام یورپی افتاء کونسل ہونے کے باوجود کونسل میں غیر یورپی علماء ودانشوروں کا غلبہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یورپی افتاء کونسل کو یورپی مسلمانوں کی نمائندہ کونسل کی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اگر اس میں ابھی تک پوری طرح کامیابی نہیں ملی ہے تو اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ یورپ میں ابھی بھی اسلامی علوم وفنون اور افتاء وقانون کے حوالے سے مہارتوں کی وہ فراوانی نہیں ہے جو مغربی، جنوبی یا جنوب مشرقی ایشیا کے علاقوں میں ہے اس لیے یورپی افتاء کونسل کی ایک طرح سے یہ مجبوری ہے کہ وہ غیر یورپی علماء، دانشوروں اور ماہرین قانون کی مہارتوں سے فائدہ اٹھائے اور انہیں کونسل کا ممبر بنائے۔

14.8 اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر

افکار وخیالات کی تبلیغ وتشہیر کے حوالے سے مرکزی مقامات کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ بیسویں صدی کے دوران مغربی یورپ خاص طور پر برطانیہ کو اس حوالے سے بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اس ملک کی اسی خصوصیت اور خاص طور پر یہاں ملنے والی آزادی کے پیش نظر دنیا کے مختلف افکار ونظریات کے حاملین اور مذاہب وثقافت کے نمایندوں نے برطانیہ کو اپنے افکار وخیالات کی اشاعت کے مرکز کے طور پر منتخب کیا اور یہاں بہت سی انجمنیں، تنظیمیں، ادارے اور مراکز قائم کیے۔ مسلمانوں نے بھی برطانیہ میں درجنوں کی تعداد میں تنظیمیں، ادارے اور مراکز قائم کیے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے دائروں میں مصروف عمل ہے۔ البتہ 1970ء کی دہائی میں عالمی حالات جس طرح تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے، دنیا کے نقشے پر ایک نیا عالمی نظام وجود میں آرہا تھا اور افکار ونظریات کی جنگ ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی، ان حالات میں جماعت اسلامی پاکستان سے وابستہ یا متاثر کچھ افراد نے اسلامی نظام کو مغرب میں متعارف کروانے اور اسے ایک متبادل نظام کے طور پر پیش کرنے کے مقصد سے برطانیہ میں ایک اسلامی مرکز قائم کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ 1973ء میں ان لوگوں نے برطانیہ کے شہر لیسٹر شائر میں اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے ایک مرکز کی بنیاد رکھی۔ اس وقت کے عالمی منظرنامے پر جس طرح کی تبدیلیاں رونما

ہو رہی تھیں اور آنے والے دنوں میں جس طرح کی تبدیلیوں کے واقع ہونے کے امکانات تھے، انہیں نظر میں رکھتے ہوئے فاؤنڈیشن کے قائم کرنے والوں نے اس کا خاص اور بنیادی مقصد یہ قرار دیا کہ اسلامی نظام اور اس کے قیام و نفاذ کے حوالے سے آزادانہ تحقیقات کی یورپ کے ماحول میں حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ اپنے قیام کے وقت سے ہی اس خاص مقصد کے حصول کی کوششوں میں سرگرداں ہے البتہ اس کے ساتھ ہی فاؤنڈیشن کی قیادت نے برطانیہ میں مسلمانوں خاص طور پر مسلم نوجوانوں کی تعلیمی و علمی ضروریات کو بھی اپنے پیش نظر رکھا اور ایسے اقدامات کیے کہ نوجوان طبقہ اس سے وابستہ ہو۔ چنانچہ ان کوششوں کے نتیجے میں مسلم نوجوانوں کی ایک سرگرم اور فعال ٹیم اسلامک فاؤنڈیشن کو میسر آئی جس نے اس کے پروگراموں خاص طور پر تحقیقی پروجیکٹوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جس کی وجہ سے اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کا ہی نہیں آج پورے مغربی یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے ایک اہم اور بڑے تحقیقی و تعلیمی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اسلامی اقتصادیات، عیسائی مسلم تعلقات، بین المذاہب مکالمے اور مسلم مسائل پر اس کی تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کا قیام 1973ء میں لسٹر میں عمل میں آیا۔ اس کے بانی اور محرک اول جماعت اسلامی پاکستان کے ایک بڑے رہنما پروفیسر خورشید احمد تھے۔ فی الحقیقت ان کی کوششوں سے ہی برطانیہ میں اسلامک فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا تھا اور وہی اس کے ڈائرکٹر بھی رہے تا آں کہ پاکستان میں صدر ضیاء الحق کی حکومت قائم ہونے کے بعد وہ منصوبہ بندی کے امور کے وزیر بن کر پاکستان واپس لوٹ گئے۔ اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کے ہی ایک دوسرے رہنما خرم مراد کو اسلامک فاؤنڈیشن کا ڈائرکٹر بنایا گیا۔ 1997ء میں ان کے انتقال کے بعد سے ڈاکٹر مناظر احسن فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ جماعت اسلامی اور اس کے بانی کی فکر سے متاثر ضرور ہیں البتہ جماعت اسلامی پاکستان سے ان کا کوئی رسمی تعلق نہیں ہے۔

اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ، لیسٹر کے ایک چھوٹے سے مکان میں قائم ہوئی۔ برطانیہ میں یہ فاؤنڈیشن خیراتی مقاصد کے لیے قائم کی جانے والی تنظیموں کے قانون کے تحت ایک تعلیمی ادارے کے طور پر رجسٹرڈ ہے۔ 1976ء میں یعنی قیام کے تین سال بعد یہ فاؤنڈیشن لیسٹر میں ہی اٹھارہویں صدی عیسوی میں تعمیر شدہ ایک منشن میں منتقل ہوگئی، جسے کرایے پر حاصل کیا گیا تھا اور جو نسبتاً ایک کشادہ جگہ تھی۔ 1980ء میں اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ نے لیسٹر کے نواح میں تقریباً دس میل کی دوری پر ایک علاقائی ہیلتھ سروس سے چھوٹا سا ایک کانفرنس سینٹر خرید لیا۔ اس طرح فاؤنڈیشن کو قیام کے 7 برس بعد اس کی اپنی عمارت میسر آئی۔ فاؤنڈیشن کے لوگوں نے اس کا نام مارک فیلڈ دعوہ سینٹر رکھا اور اسلامک فاؤنڈیشن کے دفاتر یہیں منتقل کر دیے۔ بعد میں یہاں پر مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد اسلام کے حوالے سے اعلیٰ اور معیاری تعلیم کی فراہمی ہے۔ مارک فیلڈ دعوہ سینٹر میں ہی اسلامک فاؤنڈیشن اپنی مختلف کانفرنسوں اور کورسوں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔

اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ، جیسا کہ معلوم ہے، ایک خیراتی ادارے کے طور پر رجسٹرڈ تنظیم ہے اور اپنی مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے مسلم دنیا کے اصحاب خیر کے مالی تعاون پر انحصار کرتا رہا ہے۔ خاص طور پر خلیجی ملکوں کے اصحاب خیر سے ماضی میں اسے خاص تعاون ملتا رہا

ہے۔ مارک فیلڈ کانفرنس سینٹر کی خریداری بھی اسی طرح کی ایک اعانت کے ذریعہ ممکن ہوسکی تھی۔ البتہ بیسوی صدی عیسوی کی آخری دہائی کے آخری برسوں میں جس طرح عالمی حالات میں تبدیلیاں رونما ہونی شروع ہوئیں ان سے اسلامک فاؤنڈیشن کی مالی اعانت بھی متاثر ہوئی۔ اس طرح کی صورت حال کے پیش نظر فاؤنڈیشن کے ارباب حل وعقد نے ایک منظم منصوبے کے تحت اپنے مالی انحصار کو کم کرنا شروع کیا اور فاؤنڈیشن کے لیے ایسے وسائل تلاش کیے جن سے کہ فاؤنڈیشن مالی طور پر خود کفیل ہوجائے۔ مثال کے طور پر اسلامک فاؤنڈیشن مختلف اسلامی موضوعات پر کورسز کا اہتمام کرتی ہے، ان کورسز سے اسے خاصی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ اب اس کی وہ مطبوعات ہیں جو اپنے تحقیقی معیار اور مواد کی وجہ سے یورپ اور امریکہ کے علمی حلقوں میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ آغاز کار میں اسلامک فاؤنڈیشن تقریباً 20 مساجد اور کمیونٹی سینٹروں کا اہتمام بھی کرتی تھی اسی طرح اسے برمنگھم کے اسپارک ہِل اسلامک سینٹر کے مالکانہ حقوق بھی حاصل ہیں البتہ فاؤنڈیشن نے ان کی ذمہ داری اسلامک مشن برطانیہ کو دے رکھی ہے۔

اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کا شاید پہلا مسلم ادارہ ہے جس نے برطانیہ کے اعلیٰ سطحی تعلیمی اداروں اور مراکز کے ساتھ باہمی تعاون کے تعلقات استوار کیے ہیں۔ اس نے لیسٹر پولی ٹیکنک کے ساتھ کثیر ثقافتی تعلیم اور لیسٹر یونی ورسٹی کے ساتھ اسلامی اقتصادیات جیسے موضوعات پر کام کیا ہے۔ اسلامک فاؤنڈیشن کے پہلے ڈائرکٹر پروفیسر خورشید احمد نے برمنگھم کے سلی اوک کالج میں اسلام کے مطالعے اور عیسائی مسلم تعلقات کے مراکز کے قیام میں کلیدی رول ادا کیا۔ البتہ 1980ء کی دہائی سے اسلامک فاؤنڈیشن نے اپنی توجہات کا خصوصی مرکز تحقیقی مطالعات کی اشاعت کو بنایا اور اب اس کے مستقل ارکان کی اکثریت اسی میدان میں کام کر رہی ہے۔ فاؤنڈیشن کے تحقیقی کاموں کے معیار کو دیکھتے ہوئے برطانیہ و دیگر مغربی ممالک کی بعض سرکاری و غیر سرکاری ایجنسیوں نے بھی اس کے تحقیقی کاموں میں تعاون کیا ہے اور کئی تحقیقی پروجکٹ بھی اسے دیے ہیں۔ اسلامک فاؤنڈیشن کی جانب سے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کے حالات اور عیسائی مسلم تعلقات پر ماضی میں تسلسل کے ساتھ بلیٹن شائع ہوتے رہے ہیں۔ یورپ میں مسلم خاندانوں خاص طور پر مسلم بچوں اور بچیوں کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے اسلامک فاؤنڈیشن نے مسلم بچوں کے لیے کتابوں کے ایک سلسلے کی اشاعت بھی جاری رکھی ہے۔ اسی طرح اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ نے مستقل اسلامی موضوعات پر نظریاتی کام کرنے کے ساتھ ساتھ مسلم دنیا کے بعض خاص علاقوں کی صورت حال پر بھی تحقیقی کام کروائے ہیں اور اس طرح کے کئی قابل قدر کام شائع بھی ہوچکے ہیں۔ چونکہ فاؤنڈیشن کے بانی ڈائرکٹر ایک معروف مسلم ماہر اقتصادیات کی شناخت رکھتے ہیں اس لیے اسلامی اقتصادیات کو اسلامک فاؤنڈیشن کے کاموں میں ترجیحی حیثیت حاصل رہی ہے۔ گزشتہ برسوں کے دوران اسلامک فاؤنڈیشن نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر قرآن ''تفہیم القرآن'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے بڑے ہی اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسی طرح اسلامک فاؤنڈیشن اپنے شش ماہی علمی مجلّے Encounters کے ذریعہ مغرب میں اسلام اور اسلامی تحریکات و شخصیات کے حوالے سے جو غلط فہمیاں یا شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں، ان کے ازالے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ مغرب کی علمی دنیا میں اس مجلّے کو اسلام کے حوالے سے ایک اہم اور معتبر علمی مجلّے کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح فاؤنڈیشن سے مسلم ورلڈ بک ریویو کے نام سے ایک اہم سہ ماہی مجلّہ 1980 سے شائع ہو رہا ہے۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق شائع ہونے والی کتابوں اور موضوعات پر اسلامی نقطہ نظر کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلم دنیا میں اقتصادی مطالعات کے فروغ کے لیے اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ ''ریو آف اسلامک اکونامکس'' کے نام سے ایک اور مجلّہ بھی شائع کرتا ہے۔

البتہ اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کے کارناموں میں شاید سب سے اہم اور بڑا کارنامہ 2000ء میں مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر

ایجوکیشن کا قیام ہے۔ یہ مغرب میں اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد ادارہ ہے جو برطانیہ میں اسلام کو ایک اسلامی ادارے میں پڑھنے اور سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور وہ بھی برطانیہ کے اعلیٰ تعلیمی معیار کے مطابق۔ مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن کو اب برطانیہ کے ایک اہم تعلیمی ادارے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ گلوسسٹ شائر یونیورسٹی سے ایسوسی ایٹ کالج کے طور پر وابستہ ہے اور ایم فل، پی ایچ ڈی اور ماسٹرس کے پروگراموں کے علاوہ کئی پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اور سرٹی فیکٹ کورسز بھی یہاں چلائے جاتے ہیں۔ حالانکہ مارک فیلڈ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ایجوکیشن میں بنیادی طور پر تعلیم، تحقیق اور تربیت میں اعلیٰ معیار کے حصول پر خاص توجہ دی جاتی ہے البتہ اس کے ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ نے مختلف ثقافتوں اور مذاہب کے مابین مکالمے کی کوششوں کے حوالے سے بھی ایک مثبت رول ادا کیا ہے۔

اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ کی خدمات کا ایک اہم میدان کتابوں کی اشاعت رہا ہے۔ 1973ء میں اپنے قیام کے فوراً بعد سے ہی اس نے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ قرآن، حدیث، سیرت، قانون وفقہ، عیسائی مسلم تعلقات، خواتین اور خاندان، احیاء اسلامی، اسلامی معاشیات، اسلامی تعلیم اور بچوں سے متعلق 400 سے زائد کتابیں اسلامک فاؤنڈیشن نے شائع کی ہیں۔ اپنی مطبوعات کو زیادہ بہتر طور پر چھاپنے اور ان کی تجارت کو اچھی طرح انجام دینے کے لیے فاؤنڈیشن نے کوبے پبلشنگ لمیٹڈ کے نام سے اشاعتی ادارے کو مزید منظم کیا ہے۔ اسی طرح اسلامک فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کا ایک اہم میدان 'نیو مسلم پروجکٹ' ہے۔ 1993ء میں فاؤنڈیشن کے ذمہ داروں نے یہ محسوس کیا کہ یورپ میں جو لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں ان کی رہنمائی اور تعلیم وتربیت کا کوئی منظم اور معقول انتظام نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے یہ پروجکٹ شروع کیا۔ پروجکٹ کی کامیابی یہ ہے کہ اس نے قیام کے بعد سے ہی نومسلموں کی سماجی اور مذہبی ضروریات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور اس حوالے سے اس نے نومسلموں کے تجربات کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا ہے۔

برطانیہ کے مسلم حلقوں میں اسلامک فاؤنڈیشن کو عام طور پر جماعت اسلامی پاکستان کا برطانوی اظہار سمجھا جاتا ہے۔ یہ سچ بھی ہے کہ فاؤنڈیشن کا قیام جماعت اسلامی پاکستان کے ایک اہم رہنما کے ذریعہ عمل میں آیا اور اس کے دوسرے ڈائرکٹرز بھی جماعت اسلامی پاکستان کے ایک بڑے رہنما تھے۔ البتہ جماعت اسلامی پاکستان کے ساتھ ان کے یہ تعلقات ذاتی وانفرادی نوعیت کے تھے۔ تنظیمی سطح پر اسلامک فاؤنڈیشن کا جماعت اسلامی پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مسلم سوسائٹی سے باہر کی دنیا میں اسلامک فاؤنڈیشن برطانیہ نے اپنی ایک علیحدہ علمی اور اسلامی مفادات کے نمائندے کی شناخت بنائی ہے اور اسے برقرار رکھنے میں آج بھی بڑی حد تک کامیاب ہے۔

14.9 ورلڈ اسلامک مشن

برصغیر میں برطانوی استعمار کے دوران مختلف استعماری طاقتیں یہاں کے محنت کشوں کو مزدوری کی غرض سے دنیا بھر کی اپنی کالونیوں میں لے گئیں۔ بہار واترپردیش کے مشرقی اضلاع سے تعلق رکھنے والے ان ہندوستانیوں میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی تھی۔ یہ لوگ گئے تو تھے وقتی طور پر محنت ومزدوری کے مقصد سے البتہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنی ضروریات کے تحت انہیں ملکوں میں آباد ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جب استعماری طاقتوں سے آزادی کا دور شروع ہوا تو ان ہندوستانیوں کی ایک تعداد کو یورپی ملکوں میں آباد ہونے کا موقع ملا۔ بلاشبہ یورپی وامریکی ملکوں میں آباد ہونے والے ان ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی محنت اور کام کی خوبی کے سبب نہ صرف یہ کہ اپنی مالی مشکلات پر قابو پایا بلکہ ان میں خوش حالی بھی آئی۔ البتہ جن ملکوں میں یہ آباد ہوئے تھے وہاں عیسائیت کی سرپرستی جس طرح کی جارہی

تھی اور عیسائی مشنریاں جس پیمانے پر سرگرم تھیں، ان کے پیش نظر خود ان کے لیے دین پر عمل پیرا رہنے میں جو پریشانیاں اور مشکلات تھیں وہ تو اپنی جگہ سب سے بڑا مسئلہ ان کی آنے والی نسلوں کے لیے درپیش تھا کہ کس طرح مذہب اسلام سے ان کے رشتے کو برقرار رکھا جائے کیونکہ جو پہلی نسل یہاں سے گئی تھی وہ زیادہ تر ان پڑھ یا بہت ہی معمولی پڑھی لکھی تھی۔ ان حالات میں یورپی و امریکی مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو جن لوگوں نے سمجھا اور انہیں پورا کرنے کی کوشش کی ان میں سنی بریلوی مسلمانوں (اہل سنت والجماعت) سے تعلق رکھنے والی ایک نمایاں شخصیت شاہ عبدالعلیم صدیقی کی تھی جو مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے خلیفہ بھی تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے مغرب میں آباد برصغیر کے مسلمانوں میں دعوت واصلاح کا کام بڑے پیمانے پر کیا۔ البتہ ان کی یہ کوشش ذاتی تھی ان کے بعد ان کے صاحب زادے شاہ احمد نورانی نے بھی ان کی جاری کردہ روایت کو باقی رکھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خدمت وتبلیغ دین کی کوشش کو انفرادی نہ رکھتے ہوئے اجتماعی شکل دی اور اس حوالے سے ان کا ایک بڑا کارنامہ مغرب میں آباد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ انہوں نے ورلڈ اسلامک مشن (الدعوۃ الاسلامیہ العالمیہ) کے نام سے ایک ایسی تنظیم قائم کی جو مسلمانوں کی مذہبی وروحانی ضروریات کو بھی پورا کرے اور انہیں منظم بھی رکھے۔

مغرب میں آباد برصغیر کے مسلمانوں کو دوہرے چیلنج کا سامنا تھا۔ ایک طرف ان کی اور ان کی آنے والی نسلوں کی مذہبی تعلیم وتنظیم کا کوئی نظم نہیں تھا اور دوسری طرف عیسائی مشنریاں جدید ترین وسائل کے ساتھ میدان عمل میں تھیں۔ اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان کی تعلیم وتنظیم ضروری تھی چنانچہ مولانا شاہ احمد نورانی نے 1973 میں ورلڈ اسلامک مشن کو قائم کر کے اس ضرورت کو پورا کیا۔ انہوں نے جنوری 1973ء میں حج کے موقع پر دنیا کے مختلف ملکوں سے اپنی فکر کے مذہبی علماء اور رہنماؤں کو مکہ مکرمہ میں اکٹھا کیا۔ کئی دنوں تک اس موضوع پر بحث وگفتگو اور مشاورت ہوتی رہی کہ مغرب کی جانب سے لادینیت کی یلغار کو کیسے روکا جائے، وہ کون سے طریقے اختیار کیے جائیں کہ مسلمانوں میں مذہب اسلام کے احترام کا جذبہ پیدا ہو اور وہ نامساعد حالات میں بھی اسلامی طرز زندگی اختیار کریں۔ مسلسل کئی دنوں کے غور وخوض، بحث و تمحیص اور بات چیت کے بعد یہ طے پایا کہ 'اہل سنت والجماعت' کی عالمی سطح پر ایک تنظیم قائم کی جائے۔ اس تنظیم کے ذریعہ جہاں ایک طرف مسلمانوں کو قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب دی جائے وہیں دوسری طرف اسلام کے خلاف لادینی قوتوں کی جانب سے جس طرح کی یلغار ہے اس پر روک لگائی جائے۔ چونکہ 'ورلڈ اسلامک مشن' کا قیام ایک عالمی تنظیم کے طور پر عمل میں آ رہا تھا اس لیے اس کے قائم کرنے والوں نے مناسب سمجھا کہ اس کا مرکزی دفتر برطانیہ میں ہو چنانچہ دسمبر 1973ء میں بریڈفورڈ (برطانیہ) میں ورلڈ اسلامک مشن کا مرکزی سکریٹریٹ قائم ہوا۔ (اس وقت تنظیم کے مرکزی دفاتر مانچسٹر برطانیہ میں ہیں اور تقریباً 24 ملکوں میں اس کی شاخیں سرگرم ہیں)۔ ورلڈ اسلامک مشن کے قیام میں جن علماء نے کلیدی رول ادا کیا ان میں شاہ احمد نورانی کے علاوہ سید معروف حسین، شاہ عارف قادری نقش بندی اور مولانا ارشد القادری کے نام نمایاں ہیں۔ ورلڈ اسلامک مشن کے رہنماؤں نے تنظیم کو موثر وفعال بنانے اور بڑے پیمانے پر اس کا تعارف کرانے کے مقصد سے اپریل 1974ء میں شاہ احمد نورانی کی قیادت میں سینٹ جارج ہال میں اس کی پہلی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس میں برصغیر ہند وپاک کے علاوہ عراق، یمن، برطانیہ وافریقہ وغیرہ ملکوں سے تقریباً ایک سو مذہبی علماء اور رہنماؤں نے شرکت کی تھی اور ان کی موجودگی میں ہی ورلڈ اسلامک مشن کے اصول وضوابط ترتیب دیے گئے۔ اس کانفرنس کے موقعے پر 'اہل سنت والجماعت' کے علماء نے یہ عہد کیا کہ جس طرح برصغیر کے ملکوں میں وہ لوگ دعوت واصلاح کا کام کر رہے ہیں اسی طرح یورپ وامریکہ کے مسلمانوں کو بھی دعوت واصلاح کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر انہوں نے یہ عہد بھی کیا کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں دفاع اسلام کی ضرورت پیش آئے تو ورلڈ اسلامک مشن اپنے فرض کو پورا کرے گا۔اس کانفرنس کے موقع پر ہی ورلڈ اسلامک مشن کے اغراض و مقاصد بھی طے کیے گئے جو کچھ اس طرح تھے۔

14.9.1 اغراض و مقاصد

-1 مشن کی دعوت بنی نوع انسان کے لیے ہوگی۔ مسلم غیر مسلم کی تمیز کیے بغیر ترجیحاً مسلمانوں کی اصلاح اور انہیں اسلامی احکام کا پابند بنانے کی کوشش کرے گا۔

-2 کسی بھی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے کے لیے نہ کسی طرح کا لالچ دیا جائے گا اور نہ جبر بلکہ شعوری بنیاد پر تبدیلی لانے کے لیے ماحول پیدا کیا جائے گا تا کہ وہ دیگر مذاہب کے مقابلے میں اس کی آفاقی خوبیوں کی بدولت اسلام قبول کرے۔

-3 مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے قلوب میں اسلام کی تاریخ، عقائد اور فرائض اور پیغمبر اسلامؐ کے فضائل و کمالات اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

-4 معاشرے میں خواتین کا ہمیشہ سے اہم کردار رہا ہے، اس لیے مسلم خواتین کو تربیت اولاد، فرائض عائلی، محاسن اخلاق اور اسلامی معاشرت کی بنیادی تعلیم دی جائے تا کہ وہ اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرسکیں۔

-5 نومسلم افراد کو اسلامی معاشرے میں ضم کرکے امتیاز مٹایا جائے۔نومسلموں کو نئے حالات کے تحت جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ان میں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

-6 روزمرہ پیش آنے والے مسائل کے درست حل کے لیے دارالافتاء قائم کیا جائے جو جید مفتیان کرام کی نگرانی میں کام کرے اور سوالات کے جواب دے۔

-7 اسلامک ریسرچ اکیڈمی تشکیل دے کر اسلام پر تحقیقی کام کو مزید آگے بڑھایا جائے۔

مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے ورلڈ اسلامک مشن آج بھی متحرک وفعال ہے۔اس نے سیکڑوں کی تعداد میں پمفلٹ اور کتابچے دنیا کی مختلف زبانوں میں مختلف موضوعات پر شائع کیے ہیں جنہیں عام طور پر مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔خاص طور پر قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کو سب کے لیے سہل الحصول بنایا گیا ہے۔اسی طرح مشن کے ذمہ داروں نے اس کے لیے فنڈز کی اہمیت کو شروع ہی میں محسوس کرلیا تھا چنانچہ انہوں نے فنڈز (مالیات) کی فراہمی کے لیے ایسے طریقے وضع کرنے کی کوشش کی جن سے کہ مشن سے وابستہ افراد کسی سے متاثر ہوئے بغیر صحیح سمت میں کام کرسکیں۔مشن کی مالیات کے لیے ممبر شپ فیس کے علاوہ متعلقین باقاعدگی سے اس کی مالی اعانت کرتے ہیں۔

ورلڈ اسلامک مشن بظاہر ایک عالم گیر تنظیم ہے، البتہ مشن کے ذمہ داروں نے شروع میں ہی اس بات کو محسوس کرلیا تھا کہ کسی ایک مرکز سے دنیا بھر کے مراکز کو نہیں چلایا جاسکتا۔چنانچہ انہوں نے دنیا کے مختلف ملکوں میں مشن کے مراکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ باہمی روابط کے باوجود ہر ملک کے مرکز کو ایک مکمل اور خودمختار یونٹ کی حیثیت حاصل ہو۔اسی طرح تمام یونٹس (مراکز) اپنی سرگرمیوں اور کاموں کو اپنے وسائل سے انجام دیں۔آج یورپ اور امریکہ کے بیشتر ممالک میں ورلڈ اسلامک مشن ایک رجسٹرڈ ادارے کے طور پر کام کر رہا

ہے۔ مثال کے طور پر اس نے کناڈا، ساؤتھ امریکہ، فرانس، ناروے، بلجیم، ہالینڈ، جرمنی، آسٹریا، ماریشس، کینیا، تنزانیہ، ساؤتھ افریقہ، سنگا پور وغیرہ ملکوں سمیت دنیا کے 24 ملکوں میں اپنے مراکز قائم کیے ہیں۔ یہ علیحدہ یونٹ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔

معلومات کی جانچ

1۔ ISNA کب قائم ہوئی اور اس کے مرکزی دفاتر کہاں ہیں؟

2۔ اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر کے بانی ڈائرکٹر کا نام کیا ہے؟

3۔ ورلڈ اسلامک مشن کا قیام کب عمل میں آیا، اس کے لیے پہلا اجلاس کہاں ہوا؟

14.10 خلاصہ

یہ اکائی اپنی نوعیت کے اعتبار سے سابقہ اکائیوں سے بالکل الگ ہے۔ اس میں ان تنظیموں اور اداروں کا تعارف کرایا گیا ہے جو مسلم تو ضرور ہیں لیکن وہ یورپ و امریکہ کے مسلم اقلیتی ملکوں میں قائم ہیں۔ نیشن آف اسلام، ICNA, ISNA اور IIIT کا تعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ہے۔ ان میں نیشن آف اسلام امریکہ کے سیاہ فام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے جب کہ ISNA امریکہ میں موجود مختلف چھوٹی بڑی تنظیموں، اداروں، مساجد اور اسلامی مراکز کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق ہے جو ان کے وسیع تر اتحاد کے لیے کوشاں ہے۔ ICNA برصغیر کی جماعت اسلامی سے متاثر مسلمانوں کی تنظیم ہے، اس نے نومسلم امریکیوں میں بھی اپنے لیے کافی جگہ بنائی ہے۔ IIIT امریکہ میں مسلمانوں کا ایک اہم بلکہ مسلم دنیا کا اہم فکری ادارہ ہے اور ماضی قریب میں یہ اپنے اسلامائزیشن آف نالج نامی پروجیکٹ کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ان کے علاوہ یورپی افتاء کونسل، اسلامک فاونڈیشن لسٹر اور ورلڈ اسلامک مشن یورپ کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والے ادارے ہیں۔ ان کے حوالے سے خاص بات یہ ہے کہ ان کے مراکز برطانیہ میں ہیں۔ یورپی افتاء کونسل مغرب میں آباد مسلمانوں کو درپیش مذہبی مسائل کے حل کرنے میں مصروف ہے تو اسلامک فاؤنڈیشن نے مغرب میں مسلمانوں کے ایک اعلیٰ معیاری علمی ادارے کی امیج بنائی ہے۔ اس کی تحقیقات اور علمی کاموں کو مسلمانوں میں ہی نہیں یورپ کے بھی علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ورلڈ اسلامک مشن بنیادی طور پر برصغیر کے اہل سنت والجماعت (بریلوی مسلمانوں) کی ایک عالمی تنظیم ہے اور اپنے مخصوص فکری پس منظر کے ساتھ یورپ و امریکہ میں موجود سنی مسلمانوں کی قیادت و اصلاح کے کام میں مصروف ہے۔

4.11 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے

1۔ نیشن آف اسلام اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک مضمون لکھیں۔

2۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے

3۔ یورپی افتاء کونسل کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے کاموں کا جائزہ لیں۔

4۔ ورلڈ اسلامک مشن اور اس کے اغراض و مقاصد کا تعارف کرائیں۔

5۔ ICNA کا تفصیلی تعارف کرائیں۔

14.12 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ متعلقہ تنظیموں اور اداروں کی ویب سائٹس

اکائی 15 : رابطہ عالم اسلامی، آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس ایسسکو، الاتحاد الاسلامی لعلماء المسلمین، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلامی نظریاتی کونسل

اکائی کے اجزاء

15.1	مقصد
15.2	تمہید
15.3	رابطہ عالم اسلامی
15.4	آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس
15.5	ایسسکو
15.6	اسلامی نظریاتی کونسل
15.7	ادارہ تحقیقات اسلامی
15.8	خلاصہ
15.9	نمونے کے امتحانی سوالات
15.10	مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

15.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو جدید مسلم دنیا کی بعض ان تنظیموں اور اداروں سے واقف کرانا ہے جو اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ان میں تین رابطہ عالم اسلامی، تنظیم تعاون اسلامی اور ایسسکو کی حیثیت بین الاقوامی تنظیموں کی ہے۔ان کا دائرہ کار پوری دنیا ہے۔دو کا تعلق پڑوسی ملک پاکستان سے ہے۔یہ دونوں پاکستان حکومت کے سرکاری اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔اسلامی نظریاتی کونسل، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک نظریاتی ادارہ ہے جو اسلامی امور میں حکومت پاکستان کو سفارشات پیش کرتا اور اس کی رہنمائی کرتا ہے جبکہ ادارہ تحقیقات اسلامی جدید مسائل اور امور کی تحقیقات کے لیے ایک سرکاری ادارہ ہے۔توقع ہے کہ ان کے مطالعے سے طلبہ کو ان کے تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ ان کے کام کرنے کے طریقے سے بھی واقفیت حاصل ہوگی۔

15.2 تمہید

بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جب دنیا کے مختلف علاقے یورپی استعمار سے آزاد ہونا شروع ہوئے تو مسلم دنیا کے بھی بہت سے علاقوں کو آزادی ملی۔ 1960ء کی دہائی کے دوران مسلم دنیا میں رابطہ عالم اسلامی اور تنظیم تعاون اسلامی دو بڑی مسلم تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ ان میں رابطہ عالم اسلامی کی حیثیت غیر سرکاری مذہبی تنظیم کی ہے تو تنظیم تعاون اسلامی دنیا بھر کے مسلم ملکوں کا مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ ایسسکو تنظیم تعاون اسلامی کا ایک ذیلی ادارہ ہے اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کے طرز پر کام کرتا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کو پاکستان میں حکومت کے اسلامی امور میں نگراں ادارے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ حکومت پاکستان کی اسلام سے متعلق امور میں رہنمائی کرتی ہے جب کہ ادارہ تحقیقات اسلامی جدید پیش آمدہ مسائل میں اپنی تحقیقات کے ذریعہ خدمت کے کام میں مصروف ہے۔

15.3 رابطہ عالم اسلامی

15.3.1 پس منظر اور قیام

بیسوی صدی عیسوی کے وسط میں مسلم دنیا کئی طرح کے چیلنجز سے دوچار تھی۔ ان میں ایک بہت بڑا چیلنج مسلم دنیا کے حریت پسندوں اور جدید تعلیم یافتہ طبقات میں اشتراکیت کا فروغ تھا، اس کے ساتھ عرب قومیت کا عفریت بھی ابھی تک سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے دین پسند حلقے میں ایک عجیب طرح کی بے چینی اور خوف پایا جاتا تھا کیونکہ عرب قومیت ہو یا اشتراکیت دونوں کا نشانہ اسلام اور دین پسند مسلمان بنتے تھے۔ جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی کی کوششوں کی ناکامی کے بعد مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کی خواہش تو دین دار مسلمانوں میں ضرور پائی جاتی تھی لیکن اس کے لیے عملی جدوجہد کے لیے کوئی بھی خود کو تیار نہیں کر پاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1960ء کی دہائی کے آغاز میں سعودی عرب کی جانب سے اس وقت کے ولی عہد شاہ فیصل کی قیادت میں جب اتحاد اسلامی کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے لیے کوششیں شروع ہوئیں تو اس پر لبیک کہنے والوں میں مسلم دنیا کے دین پسند حلقے، تنظیمیں اور گروپ پیش پیش تھے۔ جب کہ مسلم دنیا کے حکمراں قبضے میں اتحاد اسلامی کے اس نعرے کی کچھ زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی۔

مسلم دنیا کے اتحاد و یکجہتی کی یہ خواہش ایسی شدید تھی کہ جب 1962ء کے موسم حج میں سعودی عرب کی حکومت نے اسلامی اتحاد کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے مسلم دنیا کے دانشوروں، سیاست دانوں اور علماء دین کو مکہ مکرمہ آنے کی دعوت دی تو ان کی ایک بڑی تعداد اس پر غور و خوض کے لیے وہاں جمع ہوگئی۔ حج کے بعد مسلم دنیا کے علماء، دانشوروں اور سیاست دانوں کا اجتماع مکہ مکرمہ میں ہوا۔ اس میں 111 علماء دانشوروں اور سیاست دانوں نے شرکت کی اور اتحاد اسلامی کے مسائل پر غور و خوض اور بحث و مباحثے کے بعد بالآخر 18 رمئی 1962ء کو رابطہ عالم اسلامی (Muslim World League) کا قیام عمل میں آیا۔ قیام کے بعد رابطہ عالم اسلامی ایک بین الاقوامی مسلم تنظیم قرار پائی، اسے مسلمانوں کی عوامی اور ثقافتی تنظیم کا نام دیا گیا اور اس کا مقصد کسی خاص حکومت یا گروپ کا آلۂ کار بننے اور اس کے لیے کام کرنے کے بجائے عام مسلمانوں کی خدمت بتایا گیا۔ اس موقع پر رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے جو بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ یہ تنظیم اسلام کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچائے گی، اس کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کرے گی، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق تمام مسائل پر بحث و مباحثے کا

اہتمام کرے گی اور مسلم ملکوں کے درمیان باہمی تعاون کو بڑھانے کے لیے کام کرے گی۔

18 رمئی 1962ء کو مکہ کے جس اجتماع میں رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اسی میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اس تنظیم کا مستقل دفتر مکہ مکرمہ میں ہوگا اور اس کی ایک مجلس تاسیسی ہوگی۔ اس اجلاس کے موقع پر ہی 21 علماء، دانشوروں اور قابل ذکر شخصیات کو مجلس تاسیسی کے رکن کے طور پر منتخب کیا گیا۔ بعد میں مجلس تاسیسی کے ارکان کی تعداد بڑھا کر 60 کردی گئی۔ رابطہ عالم اسلامی نے اپنے قیام کے پہلے دن سے ہی اس بات کی کوشش کی ہے کہ تنظیم میں سنی مسلمانوں کے تمام معاصر فقہی مکاتب فکر کو نمایندگی حاصل رہے۔ البتہ چونکہ اس تنظیم کا قیام مکہ میں عمل میں آیا اور اس کی پشت پر سعودی عرب کی کوششیں کارفرما رہی ہیں اس لیے شروع سے ہی تنظیم پر سعودی عرب کے علماء کا غلبہ ہے۔ مجلس تاسیسی کا پہلا صدر سعودی عرب کے مفتی اعظم محمد بن ابراہیم الشیخ (وفات 1969ء) کو بنایا گیا جب کہ رابطہ عالم اسلامی کا پہلا جنرل سکریٹری مکہ کے ایک سعودی تاجر محمد سرور الصبان (1972-1898) کو منتخب کیا گیا۔ 1969ء میں مفتی اعظم کے انتقال کے بعد مجلس تاسیسی کا صدر سعودی عرب کے معروف عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو بنایا گیا۔

رابطہ عالم اسلامی کا قیام چونکہ سعودی عرب کی کوششوں سے اور مکہ مکرمہ میں عمل میں آیا، مکہ ہی میں اس کے مرکزی دفاتر بھی ہیں اور سعودی عرب ہی اس کی مالیات فراہمی کا انتظام بھی کرتا ہے اس لیے اس تنظیم کا سعودی عرب کے زیراثر رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ خاص طور پر اس کا سکریٹریٹ سعودی عرب کے شہریوں کی نگرانی میں رہا ہے۔ 1962ء سے 1972ء تک سعودی تاجر محمد سرور الصبان رابطہ کے سکریٹری جنرل رہے۔ 1972ء سے 1976ء تک محمد صالح القزاز اس اہم عہدے پر فائز رہے ان کے بعد 1976ء سے 1983ء تک محمد علی الحرکان سکریٹری جنرل رہے۔ 1983ء میں عبداللہ عمر نصیف رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل بنے۔ پھر ڈاکٹر عبداللہ صالح العبید تنظیم کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ فی الحال رابطہ کے سکریٹری جنرل عبداللہ عبدالمحسن الترکی ہیں۔ اس کے باوجود رابطہ عالم اسلامی کی ایک خاص بات یہ رہی ہے کہ اس میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کو نمایندگی دی گئی ہے اور وہ مجلس تاسیسی میں اپنے علاقوں اور فقہی رجحانات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اس لیے اس تنظیم کی ایک علاحدہ شناخت بھی کسی نہ کسی درجے میں برقرار رہی ہے اور کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ تنظیم کی سرگرمیاں سعودی مفادات سے متصادم بھی ہوئی ہیں۔

15.3.2 رابطہ عالم اسلامی کی سرگرمیاں

رابطہ عالم اسلامی کی ایک بہت بڑی کامیابی یہ رہی کہ اس تنظیم نے اپنے قیام کے بہت جلد بعد ہی عالم اسلام کے علماء و دانشوروں کی نمایندہ تنظیم کی حیثیت اختیار کرلی اور اس سے پہلے مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے حوالے سے جو کام کرنے میں دیگر بین الاقوامی اسلامی تنظیمیں مثلاً جنرل اسلامک کانفرنس (یروشلم)، اسلامک ورلڈ کانگریس یعنی مؤتمر عالم اسلامی (کراچی) اور انٹرنیشنل اسلامک آرگنائزیشن (جکارتہ) بڑی حد تک ناکام رہی تھیں، اس نے ان کی نہ صرف جگہ لے لی بلکہ بہتر کارکردگی کا بھی مظاہرہ کیا۔ حالانکہ عربوں کی سرد جنگ (1957-1967) کے دوران رابطہ عالم اسلامی کا زیادہ زور ناصرازم اور بعث ازم کے حوالے سے اشتراکیت اور عرب قوم پرستی کے خلاف محاذ آرائی پر رہا لیکن 1967ء کے بعد کی صورت حال میں جب مصر اور سعودی عرب کے تعلقات میں کسی قدر بہتری آنی شروع ہوئی تو رابطہ عالم اسلامی نے اپنے اغراض و مقاصد کے دیگر پہلوؤں پر بھی توجہ دینی شروع کی۔ بعد میں جب مسلم دنیا کی نمایندہ سیاسی تنظیم ''تنظیم اسلامی کانفرنس''

(موجودہ نام تنظیم تعاون اسلامی) کا قیام عمل میں آیا تو رابطہ عالم اسلامی نے اپنی علاحدہ اور آزاد شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے اسلامی ثقافتی تنظیموں کا ایک وسیع نیٹ ورک بنانے پر خصوصی توجہ دی۔ اسی دوران رابطہ عالم اسلامی نے اپنی مجلس تاسیسی کے کردار اور دائرۂ اختیار میں بھی مزید وسعت پیدا کی۔ اس کے بعد ہی رابطہ عالم اسلامی نے پوری مسلم دنیا میں 22 مقامات پر اپنے ذیلی دفاتر اور بیورو قائم کیے۔ خاص طور پر ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں، وہاں پر موجود مسلمانوں کی تنظیموں اور ایجنسیوں سے روابط اور تعاون کو فروغ دیا۔

1970ء کی دہائی کے شروع میں رابطہ عالم اسلامی نے اپنی سرگرمیوں کا دائرہ مزید وسیع کر دیا اور اسے بڑھا کر باہمی تعاون، اسلام کی دعوت، فقہ سے متعلق امور اور سماجی بہبود کے کاموں تک وسعت دے دی۔ چنانچہ 1974ء میں رابطہ عالم اسلامی نے دنیا بھر سے مسلم تنظیموں کے 140 وفود کو ایک کانفرنس میں مدعو کیا اور اس کانفرنس میں ہی براعظمی سطح پر کونسلوں کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی کانفرنس کے موقع پر 28 اقلیتی مسلم معاشروں میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت مقامی کونسلیں تشکیل دی گئیں اور انہیں باہم مربوط و منظم رکھنے کے لیے ایک کوآرڈینیشن کمیٹی بھی بنائی گئی۔ 1974ء کی کانفرنس کے ایک برس بعد یعنی 1975ء میں رابطہ عالم اسلامی نے عالمی مساجد کونسل تشکیل دی جس کا خاص مقصد یہ تھا کہ دعوتی کاموں میں باہمی تعاون کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو۔ رابطہ کے تحت قائم اس کونسل کی زیر نگرانی متعدد علاقائی اور مقامی مساجد کونسلیں کام کر رہی ہیں۔

اسلامی قوانین کی توضیح و تشریح ایک مسلسل عمل ہے، اس کی ضرورت ہر دور اور ہر زمانے میں محسوس کی جاتی رہی ہے چنانچہ 1962ء میں رابطہ عالم اسلامی کے قیام کے بعد سے ہی اس کے مختلف فورموں میں اس ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا رہا کہ ایک ایسی بین الاقوامی فقہی کونسل کا قیام عمل میں آئے جس میں تمام مکاتب فکر کے نمایندے ہوں اور جو اسلامی دنیا کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق اسلامی قوانین کی وضاحت اور تشریح کا کام کرے اور ساتھ ہی جس کے فیصلے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ مختلف وجوہ سے رابطہ عالم اسلامی کے تحت اس طرح کی فقہی کونسل کے قیام میں مسلسل تاخیر ہوتی رہی البتہ 1976ء میں رابطہ عالم اسلامی نے اسلامی فقہ اکیڈمی قائم کر کے ایک بڑی کامیابی حاصل کی۔ مسلم دنیا، پورے یورپ اور دیگر غیر مسلم اکثریتی علاقوں میں متعدد فقہ اکیڈمیاں اس کے تحت قائم ہوئیں یا جو پہلے سے موجود تھیں انہوں نے خود کو اسلامی فقہ اکیڈمی سے وابستہ کر لیا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اسلامی فقہ اکیڈمی کا دائرہ کار مسلمانوں کے فقہی امور ہیں۔ اس لیے اکیڈمی سالانہ بنیاد پر اپنے اجتماعات منعقد کرتی ہے اور ان میں مسلمانوں کو درپیش فقہی مسائل زیر غور آتے ہیں۔ غور و خوض اور بحث و مباحثے کے بعد اسلامی فقہ اکیڈمی درپیش فقہی امور میں جو فیصلے کرتی ہے بالعموم انہیں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

آسمانی و انسانی آفات سے دنیا کے اور مسلمانوں کے مختلف سماج اکثر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ ان آفات سے متاثر ہونے والے سماجوں میں فلاح و بہبود اور امداد کا کام کرنے کے لیے رابطہ عالم اسلامی نے انٹرنیشنل اسلامک ریلیف آرگنائزیشن کے نام سے اپنی ایک ذیلی تنظیم بنائی ہے جو ریلیف اور سماجی فلاح و بہبود سے متعلق اس کے کاموں کو دیکھتی اور انجام دیتی ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام رابطہ عالم اسلامی کے ایجنڈے میں پہلے دن سے شامل ہے۔ رابطہ کے تحت مختلف علاقوں میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کے لیے دعاۃ کو بھیجا جاتا ہے۔ ان دعاۃ کی تعلیم و تربیت کے لیے رابطہ عالم اسلامی نے سعودی عرب، مصر اور خلیج کی دیگر ریاستوں کی مختلف جامعات میں دعوتی تربیتی مراکز قائم کیے ہیں۔ ان مراکز میں سرکاری سطح پر یا نیم سرکاری سطح پر دعوت کا کام کرنے کے لیے کارکنوں کو تربیت دی جاتی ہے۔ 1973ء میں رابطہ عالم اسلامی

کے تحت دعوتی کام کرنے والے کارکنوں کی تعداد صرف 49 تھی، 1990ء میں دعوتی کارکنوں کی تعداد بڑھ کر 816 ہوگئی تھی۔

کسی بھی تنظیم کے تعارف، فروغ اور ترقی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے کاموں اور سرگرمیوں کی نشر و اشاعت کا بڑے پیمانے پر اہتمام ہو۔ نشر و اشاعت کی ضرورت کو رابطہ عالم اسلامی نے بھی اپنے قیام کے فوراً بعد محسوس کیا اور پھر ایک منصوبے کے تحت اپنے اشاعتی پروگرام کو ترقی دی۔ چنانچہ سب سے پہلے 1963ء میں رابطہ عالم اسلامی نے تنظیم اور اس کی سرگرمیوں کو عربی داں حلقوں میں متعارف کرانے کے لیے ایک ماہانہ جرنل ''مجلۃ رابطۃ العالم الاسلامی'' عربی زبان میں نکالنا شروع کیا۔ 1987ء میں اس کا نام بدل کر ''الرابطۃ'' کر دیا گیا۔ لیکن چونکہ رابطہ عالم اسلامی کا دائرہ کار پوری دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا ہوا ہے اس لیے صرف عربی زبان میں جرنل کی اشاعت کافی نہیں تھی۔ چنانچہ انگریزی زبان کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے رابطہ عالم اسلامی نے انگریزی زبان میں بھی ایک ماہانہ جرنل نکالنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جرنل ''جرنل آف دی مسلم ورلڈ لیگ'' (Journal of the Muslilm World League) کے نام سے 1973ء سے شائع ہو رہا ہے۔ 1983ء میں جب عبداللہ عمر نصیف کو رابطہ عالم اسلامی کا سکریٹری جنرل بنایا گیا، اس کے بعد اس کے علمی کاموں کو کافی فروغ ملا خاص طور پر فقہ، ذرائع ابلاغ اور تعلیم کے شعبوں پر انہوں نے خاص توجہ دی اور ان کی ترقی کے لیے مختلف اقدامات بھی کیے۔

15.4 تنظیم تعاون اسلامی/آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس

اتحاد و اتفاق پر اسلامی تعلیمات میں بہت زیادہ زور دیا گیا ہے جب کہ انتشار اور تفرقہ بازی سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ان کے یہاں اتحاد و تعاون کی کمی پائی جاتی ہے۔ ماضی قریب میں مسلمانوں میں کئی ایسی نمایاں شخصیات گزری ہیں جنہوں نے مختلف سطحوں پر مسلمانوں کے درمیان اتحاد و تعاون کے لیے کوششیں کیں۔ اس حوالے سے سب سے نمایاں نام جمال الدین افغانی کا سامنے آتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی اتحاد اسلامی (مسلمانوں کے درمیان سیاسی اتحاد) کی کوششوں میں صرف کر دی۔ البتہ ان کی کوششیں سراہی تو ضرور گئیں لیکن عملاً انہیں کامیابی نہیں ملی۔ جمال الدین افغانی کے بعد بھی مسلم دنیا میں اس اتحاد و تعاون کے لیے مختلف کوششیں ہوئی ہیں۔ خاص طور پر بیسویں صدی عیسوی کی تیسری دہائی اور اس کے بعد کی دہائیوں میں اس طرح کی کئی کوششیں ہوئیں لیکن ان کوششوں میں مسلم دنیا میں اس وقت پروان چڑھنے والے قومیت، اشتراکیت اور سیکولرزم جیسے نظریات اور ان کی بنیاد پر وجود میں آنے والے اختلافات مسلسل رکاوٹ بنتے رہے۔ البتہ 1962ء میں سعودی شہزادے اور ولی عہد- جو بعد میں سعودی عرب کے بادشاہ بھی بنے- فیصل کی کوششوں سے رابطہ عالم اسلامی کے قیام نے مسلم دنیا میں ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی خواہش کو مہمیز دی۔ اس دوران مشرق وسطی کے سیاسی حالات نے اسے مزید تقویت دی۔ خاص طور پر 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شرمناک شکست سے مسلم دنیا سخت صدمے سے دوچار ہوئی اور مسلم دنیا کے سیاسی حلقوں میں بھی مسلمانوں کے کسی وسیع تر اتحاد کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔ 1969ء میں ایک یہودی کے ذریعہ مسجد اقصیٰ کے ایک حصے میں آگ لگائے جانے کے واقعے نے ایک اسلامی سربراہی کانفرنس کی راہ بالکل ہموار کر دی۔ 25-22 ستمبر کو مراکش کے دارالحکومت رباط میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں 24 مسلم ملکوں نے شرکت کی۔ مسلم سربراہوں کی رباط کانفرنس میں مسلم دنیا کے سیاسی رہنماؤں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ مسلم دنیا کے عوام میں اپنے مشترکہ مفاد کے لیے اتحاد و یکجہتی کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے اس احساس نے ہی بعد میں

تنظیم اسلامی کانفرنس (اب اس کا نام تنظیم تعاون اسلامی ہے) کی شکل اختیار کی۔ مسلم ممالک کے سربراہوں کے اسی اجلاس میں یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مشترکہ مفادات کے حصول کی غرض سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم ناگزیر ہے۔

تنظیم اسلامی کانفرنس کا باضابطہ قیام مئی 1971ء میں عمل میں آیا البتہ اس کے قیام کا فیصلہ 1969ء کے رباط میں ہونے والے سربراہی اجلاس میں ہی کر لیا گیا تھا۔ اس وقت مسلم دنیا کے سیاسی حالات کے مدنظر تنظیم اسلامی کانفرنس کی حیثیت گرچہ سیاسی زیادہ تھی لیکن اس کے ابتدائی اہداف میں تنظیم کے رکن ملکوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کے فروغ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تنظیم کے رکن ممالک کے درمیان اقتصادی، سماجی، ثقافتی، علمی اور دیگر وسیع میدانوں میں باہمی تعاون کو بڑھایا جائے۔ قیام کے بعد تنظیم اسلامی کانفرنس کا ایک اہم ہدف یہ بھی رہا کہ دیگر بین الاقوامی تنظیموں سے روابط قائم کر کے نسلی امتیاز و تفاوت اور استعمار کو اس کی تمام شکلوں میں بالکل جڑ سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور دنیا میں امن و سلامتی کے لیے انصاف پر مبنی جو کوششیں بھی ہوں ان کی حمایت کی جائے۔ تنظیم تعاون اسلامی کا ابتدا سے ہی اس پر اصرار رہا ہے کہ وہ مسلم دنیا کی تمام اقتصادی، سماجی اور ثقافتی اقدار کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔

تنظیم تعاون اسلامی میں سب سے زیادہ اہمیت رکن ممالک کے سربراہی اجلاس کو حاصل ہے جو وقفے وقفے سے مختلف ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ اب تک تنظیم تعاون اسلامی کے کئی سربراہی اجلاس ہو چکے ہیں۔ پہلا سہ روزہ اجلاس 25-22/ستمبر 1969ء کو مراکش کے شہر رباط میں ہوا۔ اس اجلاس میں 24 مسلم ملکوں نے شرکت کی تھی۔ تنظیم کا دوسرا سربراہی اجلاس 24-22 فروری 1974ء کو پاکستان کے شہر لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں 36 مسلم ملکوں کے وفود نے شرکت کی۔ تیسرا سربراہی اجلاس 28-25/جنوری 1981ء کو سعودی عرب کے شہر طائف مکہ میں منعقد ہوا۔ اس سربراہی اجلاس میں 38 مسلم ملکوں نے شرکت کی تھی۔ تنظیم تعاون اسلامی کا چوتھا سربراہی اجلاس 19-16/جنوری 1984ء کو مراکش کے شہر کاسابلانکا میں منعقد ہوا، اس میں 42 مسلم ملکوں نے شرکت کی۔ پانچواں سربراہی اجلاس 28-26/جنوری 1987ء کو خلیجی ملک کویت میں منعقد ہوا۔ اس سربراہی اجلاس میں کل 44 ملکوں نے شرکت کی تھی۔ تنظیم کا چھٹا سربراہی اجلاس مغربی افریقی ملک سینگال کے شہر دارکا میں 11-9/دسمبر 1991ء کو منعقد ہوا۔ اس میں شریک ملکوں کی تعداد 45 تھی۔ تنظیم تعاون اسلامی کا ساتواں سربراہی اجلاس ایک بار پھر مراکش کے شہر کاسابلانکا میں 15-13/دسمبر 1994ء کو منعقد ہوا۔

1997ء میں تنظیم اسلامی کانفرنس کا پہلا غیر معمولی اجلاس پاکستان کے شہر اسلام آباد میں 24-23/مارچ کو اس کی گولڈن جبلی تقریبات کے موقع پر ہوا۔ تنظیم کا آٹھواں اجلاس 11-9/دسمبر 1997ء ایران کے دارالحکومت تہران میں ہوا۔ اس کانفرنس میں 55 مسلم ملکوں کے وفود نے شرکت کی۔ نواں سربراہی اجلاس خلیجی ملک قطر کے دارالحکومت دوحہ میں 13-12/نومبر 2000ء کو ہوا۔ قطر کے دارالحکومت دوحہ میں بھی تنظیم کا دوسرا غیر معمولی سربراہی اجلاس 5-4/مارچ 2003ء کو ہوا۔ دسواں سربراہی اجلاس 17-16/اکتوبر 2003 کو ملائیشیا کے دارالحکومت پتراجایا میں ہوا۔ 8-7/دسمبر 2005ء کو تنظیم اسلامی کانفرنس کا تیسرا غیر معمولی سربراہی اجلاس سعودی عرب کے شہر مکہ میں منعقد ہوا۔ تنظیم کا گیارہواں سربراہی اجلاس 14-13/مارچ 2008 کو سینی گال کے شہر داکار میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد تنظیم کا چوتھا غیر معمولی اجلاس 15-14/اگست 2012 کو سعودی عرب کے شہر مکہ میں ہوا۔ تنظیم کا بارہواں سربراہی اجلاس 7-6/فروری 2013 کو مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں منعقد ہوا جس میں 56 مسلم ملکوں کے وفود نے شرکت کی تھی۔

تنظیم تعاون اسلامی کی سربراہ کانفرنسیں ہی اس کا سب سے اہم پالیسی ساز ادارہ ہیں، ان کانفرنسوں میں مسلم دنیا کے سیاسی رہنما تنظیم کی اندرونی صورت حال اور بیرونی دنیا کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے لیتے ہیں۔ تنظیم تعاون اسلامی کے سربراہ اجلاس کے موقع پر ہی بالعموم اس کے چیرمین کا بھی انتخاب عمل میں آتا ہے جو اس ملک کا سربراہ حکومت ہوتا ہے جہاں کہ اجلاس ہوتا ہے۔ یہ انتخاب عام طور پر تین برس کے لیے ہوتا ہے۔ تنظیم تعاون اسلامی میں دوسرے درجے کی یا دوسری سطح کی پالیسی سازی کا کام رکن ممالک کے وزراء خارجہ کی سالانہ میٹنگوں میں ہوتا ہے ان میٹنگوں میں تنظیم کے رکن ممالک کے وزراء خارجہ بین الاقوامی سیاسی سرگرمیوں اور مسلم دنیا پر ان کے اثرات کو مسلم ممالک کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب تک ان میٹنگوں میں عام طور پر مسئلہ فلسطین، سویت یونین کی افغانستان میں مداخلت، اس کے بعد کے افغانستان کے حالات، ایران-عراق جنگ، خلیجی جنگ، موجودہ عراق کے حالات، دیگر ملکوں میں مسلم اقلیتوں کے مسائل اور جنوبی وشمالی افریقہ کے حالات زیر بحث آتے رہے ہیں، ان مسائل کے حوالے سے مسلم ملکوں کے وزراء خارجہ اپنی میٹنگوں میں کسی معقول حل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تنظیم تعاون اسلامی کا تیسرا بڑا اور اہم ادارہ اس کا وہ تنظیمی ڈھانچہ ہے جو جدہ میں واقع تنظیم کے سکریٹریٹ، تنظیم کی مختلف ایجنسیوں اور متعدد ملکوں میں پھیلے اس کے مراکز پر مشتمل ہے۔ سکریٹریٹ کا سربراہ سکریٹری جنرل ہوتا ہے، اس کا انتخاب پانچ برس کے لیے رکن ملک کے وزراء خارجہ کے اجلاس میں ہوتا ہے۔ تنظیم کا سکریٹری جنرل پیشہ ور ڈپلومیٹ (سفارت کار) ہوتا ہے۔ اس کی مدد کے لیے چار معاون سکریٹری ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ سکریٹریٹ کا پورا عملہ بنیادی طور پر اس کی معاونت کے لیے ہوتا ہے۔ سکریٹری جنرل کا انتخاب دوسری میقات کے لیے بھی ہو سکتا ہے لیکن دو بار سے زیادہ کوئی اس عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا۔

15.4.1 تنظیم تعاون اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ

تنظیم تعاون اسلامی کا دائرہ کار پوری مسلم دنیا کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور اقتصادی امور و معاملات تک وسیع ہے۔ یہ تنظیم مسلم دنیا کے اتحاد و یکجہتی کے علاوہ مختلف معاملات میں خواہ ان کا تعلق سماج و سیاست سے ہو، مذہب و ثقافت سے ہو یا اقتصادی امور سے ہو، میں بھی مسلم دنیا کے متحدہ فورم کی حیثیت سے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے، گو اس تنظیم کے قیام کو ابھی نصف صدی بھی پوری نہیں ہوئی اس کے باوجود چونکہ اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اس لیے اس مختصر عرصے میں ہی اس نے ایک کثیر المقاصد تنظیم کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اس تنظیم کے انتظامی امور کو منظم کرنے کے لیے ایک بھرپور تنظیمی ڈھانچہ وجود میں آچکا ہے۔

15.4.1.1 رکنیت

تنظیم تعاون اسلامی کے رکن ملکوں کی تعداد 57 ہے۔ ان میں سے 56 (ایک فلسطین کو چھوڑ کر) ملک ایسے ہیں جو اقوام متحدہ کے بھی رکن ہیں۔ کئی ملک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی خاطر خواہ تعداد اقلیت کے طور پر موجود ہے، ان ملکوں کو تنظیم میں مشاہد کا درجہ دیا گیا ہے مثلاً روس اور تھائی لینڈ وغیرہ۔ اسی طرح کئی عالمی تنظیموں مثلاً اقوام متحدہ، افریقی اتحاد کی تنظیم اور عرب لیگ کو بھی تنظیم میں مشاہد کا درجہ حاصل ہے۔ بہت سی ان غیر سرکاری تنظیموں کو بھی تنظیم تعاون اسلامی میں مشاہد کا درجہ حاصل ہے جو مسلم پس منظر کی حامل ہیں، مثلاً رابطہ عالم اسلامی، اسلامک کال سوسائٹی (لیبیا) ورلڈ مسلم کانگریس اور ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ وغیرہ۔

15.4.1.2 ڈھانچہ

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا تنظیم تعاون اسلامی کی اعلیٰ سطحی پالیسیاں عام طور پر اس کے سربراہ اجلاس کے دوران رکن ملکوں کے سربراہان یا ان کے نمائندے مرتب کرتے ہیں۔اب تک تنظیم کے 12 باضابطہ سربراہ اجلاس اور چار غیر معمولی اجلاس ہو چکے ہیں۔ان اجلاسوں کے دوران مسلم سربراہان حکومت ومملکت مسلم دنیا کے حالات ومسائل کا جائزہ لینے کے ساتھ بین الاقوامی سیاسی ودیگر سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیتے رہے ہیں۔تنظیم تعاون اسلامی میں دوسری سطح کی پالیسیاں، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، رکن ملکوں کے وزراء خارجہ کے سالانہ جلسوں (میٹنگوں) میں طے کی جاتی ہیں۔وزراء خارجہ کے ہر اجلاس میں مسلم دنیا کے حالات کا عمومی سطح پر جائزہ لیا جاتا ہے، البتہ وزراء خارجہ کے اجلاس کی اصل توجہ کا مرکز بین الاقوامی سیاست، معیشت، معاشرت اور ثقافت سے متعلق امور ومعاملات ہوتے ہیں۔

تنظیم تعاون اسلامی میں تین مستقل اعلیٰ سطحی کمیٹیاں ہیں۔

1- اطلاعات وثقافت سے متعلق کمیٹی۔

2- سائنسی اور تکنیکی تعاون سے متعلق کمیٹی۔

3- اقتصادی اور تجارتی تعاون سے متعلق کمیٹی۔

ان کمیٹیوں کا بنیادی کام ان تجاویز اور قراردادوں کے عملی نفاذ پر نظر رکھنا ہوتا ہے جنہیں تنظیم تعاون اسلامی اپنے مختلف اجلاس میں منظور کرتا ہے۔ان کمیٹیوں کے ذمہ ان امکانات کا جائزہ لینا اور مطالعہ کرنا بھی ہوتا ہے جو مسلم ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات کو استوار کرنے اور مضبوطی فراہم کرنے میں معاون ہو سکتے ہوں۔اسی طرح مختلف میدانوں کے ماہرین پر مشتمل یہ کمیٹیاں ایسے منصوبے اور تجاویز بھی پیش کرتی ہیں جو رکن ملکوں میں پائی جانے والی مختلف صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکیں اور انہیں ترقی دے سکیں۔تنظیم تعاون اسلامی کے سربراہ اجلاسوں میں یا وزراء خارجہ کی سالانہ ودیگر میٹنگوں میں جو ایجنڈا ہوتا ہے، اس کی منظوری کے حصول سے قبل یہ کمیٹیاں اپنی اپنی سطح پر اور اپنے اپنے دائرکار میں باریک بینی سے مطالعہ کرتی اور جائزہ لیتی ہیں تا کہ ان میں کوئی ایسی چیز شامل نہ ہونے پائے جو تنظیم یا اس کے رکن ممالک کے مفاد کے برعکس یا ان کو نقصان پہنچانے والی ہو۔

تنظیم تعاون اسلامی کا سکریٹریٹ سعودی عرب کے ساحلی شہر جدہ میں ہے۔سکریٹریٹ کا سربراہ یا سب سے بڑا افسر سکریٹری جنرل ہوتا ہے۔سکریٹری جنرل کا تعلق پیشہ ور ڈپلومیٹ (سفارت کار) طبقے سے ہوتا ہے اور اس کا انتخاب 5 برس کے لیے ہوتا ہے (پہلے چار برس کے لیے ہوتا تھا) اور رکن ملکوں کے وزراء خارجہ اپنے اجلاس میں اسے منتخب کرتے ہیں۔پہلے سکریٹری جنرل کے انتخاب کی تجدید نہیں ہو سکتی تھی لیکن 1991ء کے داکار (سینی گال) سربراہ اجلاس میں تنظیم کے چارٹر میں ترمیم کر دی گئی اور اب ترمیم شدہ چارٹر کی رو سے سکریٹری جنرل کا انتخاب دوسری میقات کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔تنظیم تعاون اسلامی کے سکریٹری میں چار معاون (مددگار) سکریٹری ہوتے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) عمومی سکریٹری برائے سیاسی امور

(2) یروشلم، فلسطین اور مسلم اقلیتوں کے امور کا سکریٹری

(3) سکریٹری برائے ثقافتی وسماجی امور اور اتحاد اسلامی فنڈ

(4) اقتصادی، انتظامی اور مالی امور کا سکریٹری

15.4.1.3 مالیات

کسی بھی تنظیم و جماعت کے جاری و باقی رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مالیات کا شعبہ بہت ہی مضبوط ہو۔ خاص طور پر بین الاقوامی سطح کی تنظیموں کو چلانے کے لیے مالیات کے شعبے کا مستحکم ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اصولی طور پر اور تنظیم تعاون اسلامی کے چارٹر کی رو سے اس تنظیم کے مالی اخراجات رکن ملکوں کے تعاون سے پورے ہوتے ہیں۔ تنظیم کے تعاون کو رکن ملکوں کی فی کس آمدنی کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً ایسا ہوتا رہا ہے کہ تنظیم کے رکن متعدد ممالک اپنے اوپر عائد (لازم) ہونے والا مالی تعاون ادا نہیں کر پاتے / یا نہیں کرتے جس کی وجہ سے تنظیم کو کئی بار مالی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ 1986ء میں تنظیم تعاون اسلامی کے اس وقت کے سکریٹری جنرل نے تنظیم کی مالیات کو لے کر ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ اس رپورٹ کے ذریعہ 1987ء کے سربراہ اجلاس کو اس بات پر متنبہ کیا گیا تھا کہ رکن ملکوں کی جانب سے بروقت مالی تعاون نہ حاصل ہونے کی وجہ سے تنظیم کو مستقل طور پر مالی پریشانیاں درپیش رہتی ہیں۔ اور اگر تنظیم کے رکن ممالک اپنے اوپر عائد ہونے والا مالی تعاون ادا نہیں کرتے تو وہ اور ان کا پورا عملہ تنظیم کے دفاتر کو بند کرنے اور اپنی سابقہ ذمہ داریوں پر واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ البتہ اس وقت سعودی عرب نے مالی تعاون کی یقین دہانی کرا کے معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ سعودی عرب پہلے بھی تنظیم تعاون اسلامی کی برے وقتوں میں مالی مدد کرتا رہا ہے اور آئندہ بھی توقع یہی ہے کہ تنظیم کو اس کا اضافی مالی تعاون حاصل ہوتا رہے گا۔ واضح رہے کہ سعودی عرب نے جدہ میں تنظیم کے سکریٹریٹ کے عملے کی رہائشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا ایک سابق رہائشی محل بھی اسے دے رکھا ہے۔

15.4.2 ذیلی تنظیمیں اور ادارے

تنظیم تعاون اسلامی نے اپنے قیام کے بعد سے متعدد ذیلی تنظیمیں اور ادارے قائم کیے ہیں۔ تنظیم کچھ دیگر اداروں اور تنظیموں کے قیام کی مزید خواہاں بھی ہے۔ ان اداروں میں کچھ ایسے ہیں جو اپنے میدانوں میں کافی مؤثر رول ادا کر رہے ہیں۔ اس کی مثال کے لیے اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) جدہ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ادارے یا تنظیمیں ایسی بھی ہیں جو وقتی طور پر قائم تو ہو گئیں لیکن عملاً زیادہ مؤثر نہیں ہیں۔ چونکہ اکثر تنظیم تعاون اسلامی کو مالی دشواریاں پیش آتی رہتی ہیں اس لیے بھی بہت سی ضروری تنظیمیں اور ادارے قائم نہیں ہو پا رہے ہیں، خاص طور پر عالمی عدالت انصاف۔ البتہ اس کا خوش آیند پہلو یہ ہے کہ جو تنظیمیں اور ادارے اس کے تحت پہلے سے قائم ہو چکے ہیں وہ آیندہ بھی کام کرتے رہیں گے اور انہیں بند نہیں کیا جائے گا۔

15.4.2.1 القدس کمیٹی

1975ء میں تنظیم تعاون اسلامی کی ایک مخصوص کمیٹی القدس قائم ہوئی۔ اس کا صدر دفتر مراکش میں ہے۔ کمیٹی میں شامل چودہ ارکان سال میں دو بار مراکش کے شاہ کی صدارت میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ کمیٹی یروشلم کی آزادی کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کا خاص کام دنیا کی توجہ

مسلمانوں (فلسطینی) کے ان حقوق کی طرف مبذول کرانا ہے جنہیں اسرائیل نے غصب کر رکھا ہے۔ یا اسی طرح اقوام متحدہ کی ان قراردادوں کی طرف توجہ دلانا ہے جو اسرائیل کے دفاع میں پیش کی گئی ہیں۔ 1976ء میں اسی کمیٹی سے ملحق القدس فنڈ کو قائم کیا گیا، جس کا مقصد یہ ہے کہ فلسطین کو یہودی ملک بنانے کی جو کوشش اسرائیل کی جانب سے ہو رہی ہے، ان کے خلاف جدوجہد کی جائے یا اس مقصد کے لیے ہونے والی دوسری کوششوں کی حمایت کی جائے۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ رضا کارانہ طور پر حاصل ہونے والے عطیات ہیں۔

15.4.2.2 اسلامی اتحاد فنڈ

تنظیم تعاون اسلامی کا ایک اہم ادارہ اسلامی اتحاد فنڈ ہے۔ اس کا قیام 1974ء میں عمل میں آیا تھا اور اس کا مقصد، اسلامی مقاصد، اقدار اور ثقافت کے فروغ کے لیے کام کرنے والے اداروں اور جامعات (یونیورسٹیوں) کو فنڈ فراہم کرنا تھا، اس فنڈ کا استعمال اس کے علاوہ بھی کئی امدادی اور خیراتی سرگرمیوں کے لیے ہوتا ہے۔

ESRICS: (Statistical, Economic and Social Research and Training Centre for Islamic Countries, Ankara, Turkey)

(شماریاتی، اقتصادی اور سماجی تحقیقی و تربیتی مرکز برائے اسلامی ممالک)

SESRIC تنظیم تعاون اسلامی کا ایک مؤثر اور سرگرم ذیلی ادارہ ہے۔ اس ادارے کو 1977ء میں انقرہ میں قائم کیا گیا۔ یہ مسلم دنیا اور بقیہ دنیا کے اعداد و شمار حاصل کرنے کے بعد ان کی روشنی میں مسلم دنیا کے لیے اقتصادی پالیسیاں بناتا ہے۔ یہ ادارہ ایک علمی رسالہ ''جرنل آف ایکونامک کوآپریشن امنگ اسلامک کنٹریز'' کے نام سے شائع کرتا ہے۔

☆ **اسلامی مرکز برائے پیشہ ورانہ تکنیکی تربیت و تحقیق:** اس ادارے کا قیام 1977ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں عمل میں آیا۔ اس کے قیام کا خاص مقصد مسلم ملکوں میں افرادی قوت کو پیشہ وارانہ تربیت دے کر ترقی دینا ہے۔

☆ **اسلامی مرکز برائے تجارتی ترقی و فروغ:** یہ ادارہ 1983ء میں مراکش کے شہر کاسابلانکا میں قائم ہے اور اس کا خاص مقصد تنظیم تعاون اسلامی کے رکن ملکوں کے درمیان تجارتی تعلقات اور سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

☆ **اسلامی ترقیاتی بینک:** تنظیم تعاون اسلامی کے فریم ورک میں جو ادارے وجود میں آئے ان میں سب سے اہم ادارہ جدہ کا اسلامی ترقیاتی بینک ہے۔ اس کا قیام بھی 1974ء میں عمل میں آیا۔ یہ بینک مسلمانوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی کے لیے مسلم ملکوں، اور دیگر مسلم علاقوں میں بھی کام کرتا ہے۔ تیسری دنیا کے ملکوں کو جو ایجنسیاں امداد و تعاون فراہم کرتی ہیں اسلامی ترقیاتی بینک ان میں سے زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کر رہا ہے۔

☆ **انٹرنیشنل اسلامک نیوز ایجنسی اور اسلامک اسٹیٹس براڈ کاسٹنگ آرگنائزیشن:** ذرائع ابلاغ سے متعلق ان دونوں اداروں کو زیادہ شہرت تو نہیں مل سکی لیکن تنظیم تعاون اسلامی کے یہ دونوں ادارے ایسے ہیں کہ ان پر توجہ دی جائے۔ انٹرنیشنل اسلامک نیوز ایجنسی 1979ء میں جدہ میں وجود میں آئی۔ یہ ایجنسی روزانہ عربی، انگریزی اور فرانسیسی (تنظیم تعاون اسلامی کی دفتری زبانیں) زبانوں میں اپنے نیوز بلیٹن جاری

کرتی ہے۔اسلامک اسٹیٹس براڈ کاسٹنگ آرگنائزیشن کا قیام 1975 میں عمل میں آیا۔تنظیم کا یہ ادارہ مسلم دنیا کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اسلامی پروگرام تیار کرتا ہے۔مختلف مسلم ملکوں میں بنائے گئے اسلامی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں پر مشتمل اس کے پاس ایک قیمتی کیسٹ لائبریری ہے۔ان پروگراموں کی نقلیں تنظیم کے رکن ملکوں کو فراہم کی جاتی ہیں یا وہ خود حاصل کرتے ہیں۔

☆ **اسسکو (ISESCO):** تنظیم تعاون اسلامی ڈھانچے کا ایک اہم ادارہ ہے۔یہ 1982ء میں مراکش کے دارالحکومت رباط میں قائم ہوا اور اس کا مقصد اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسکو (Unesco) کے طرز پر مسلم ملکوں کے درمیان تعلیم، سائنس اور ثقافت کے میدانوں میں تعاون کو فروغ دینا ہے۔(اسی یونٹ میں اسسکو پر الگ سے ایک مضمون شامل ہے)

15.4.3 تنظیم تعاون اسلامی کی سرگرمیاں:

تنظیم تعاون اسلامی کی تاریخ جس نے ابھی نصف صدی بھی نہیں مکمل کی ہے اس دوران اس کی قراردادوں کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ بات بہت واضح طور پر سامنے لاتا ہے کہ اس مختصر سی مدت میں تنظیم تعاون اسلامی نے مسلم دنیا بالخصوص مسلم ممالک کو درپیش مسائل کو بین الاقوامی سطح پر اٹھانے والے ایک فطری فورم کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔اس دوران مسلمانوں کو جو مسائل بھی درپیش آئے ہیں ان کے سلسلے میں تنظیم تعاون اسلامی نے بین الاقوامی رائے عامہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس میں اسے کامیابی بھی ملی ہے۔البتہ تنظیم کے سربراہ اور وزراء خارجہ کے اجتماعات میں کچھ مخصوص مسائل ہی تسلسل کے ساتھ اٹھائے جاتے رہے ہیں جس کا سبب تنظیم کا ایک خاص پس منظر ہے، جس میں وہ قائم ہوئی۔سیاسی سطح پر تنظیم تعاون اسلامی نے اب تک سب سے زیادہ قراردادیں فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کی مخالفت میں منظور کی ہیں۔اس کا اصرار ہے کہ فلسطینیوں کے حقوق کو تسلیم کیا جائے اور تنظیم آزادی فلسطین کو (پی ایل او) ان کا مکمل نمائندہ مانا جائے۔اس کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ یروشلم کو عربوں کے اقتدار میں دے دیا جائے۔

تنظیم تعاون اسلامی اپنے قیام کے بعد سے ہی اس کوشش میں بھی رہی ہے کہ فلسطینی علاقوں میں جاری تصادم کا خاتمہ ہو جائے، اسی غرض سے تنظیم نے 1981ء میں اسلامک پیس کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی ہے جس کی صدارت ابتدا میں سکریٹری جنرل اور بعد میں لیبیا کے صدر کے ہاتھ میں رہی۔البتہ یہ کمیٹی اپنے مقصد میں اب تک ناکام ہی ہے جس کا بنیادی سبب اسرائیل کا ہٹ دھرمی والا رویہ ہے۔ افغانستان پر سوویت یونین نے جب 1979ء میں قبضہ کیا تو اس کے خلاف عالمی رائے عامہ ہموار کرنے میں تنظیم تعاون اسلامی نے بہت ہی مؤثر کردار ادا کیا یہاں تک کہ اس مسئلہ پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں منظوری کے لیے جو بھی قراردادیں پیش کی گئیں، ان کی سالانہ تیاری کا کام تنظیم کی افغانستان کمیٹی کے ذریعہ ہی انجام دیا جاتا رہا۔مسلم دنیا سے متعلق دیگر مسائل میں بھی تنظیم تعاون اسلامی مستقل طور پر دلچسپی لیتی رہی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صومالیہ میں خانہ جنگی کو ختم کرانے کے لیے تنظیم کے جنرل سکریٹری نے اپنی مصالحت کارانہ خدمات پیش کیں۔1992ء میں جب ایودھیا کی چار سو سال سے بھی زیادہ قدیم بابری مسجد کو ہندو جنونیوں نے شہید کر دیا اور اس کے بعد بھڑک اٹھنے والے فرقہ وارانہ فسادات میں جب حکومت ہند یہاں کے مسلمان باشندوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی تو تنظیم کی اس مذمت کا حکومت ہند پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا لیکن ہندوستانی مسلمانوں کو کچھ ڈھارس یوں بندھی کہ کم از کم عالم اسلام زبانی طور پر ان کے غم میں شریک ضرور ہے۔ بوسنیا پر سربوں کے مظالم کے خلاف تنظیم تعاون اسلامی نے سخت نوٹس لیا اور اس کی کوشش کے نتیجے میں پوری مسلم دنیا میں بوسنیائی مسلمانوں کی

حمایت میں احتجاجات ہوئے۔ ملائیشیا، پاکستان اور ایران نے اس مسئلے پر خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ان کی کوششوں کے نتیجے ہی میں تنظیم نے بوسنیائی مسلمانوں کے تحفظ کے لیے انھیں فوجی امداد دینے کی بات بھی کہی۔ البتہ اس میں اسے ناکامی ہوئی، وجہ تنظیم اسلامی کانفرنس کا وہ ڈھیلا ڈھالا اسٹرکچر ہے، جس کے تحت وہ کسی بھی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی۔

ثقافتی میدان میں تنظیم تعاون اسلامی کی سرگرمیاں آغاز ہی سے حوصلہ افزا رہی ہیں۔ تنظیم نے اپنے قیام کے کچھ ہی دنوں بعد سے مسلمانوں کے مختلف خطوں میں تعلیم کے فروغ میں دلچسپی لینی شروع کی۔ تنظیم نے اسلامی اتحاد فنڈ کے توسط سے ملائیشیا، نائیجیریا، یوگنڈا، بنگلہ دیش اور پاکستان میں اسلامی جامعات کے قیام میں تعاون کیا ہے۔ اسلام سے متعلق مختلف موضوعات پر مطبوعات کی فراہمی کے لیے تنظیم نے مسلم دنیا اور مغرب دونوں جگہوں پر گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ دنیا کے وہ مسلم معاشرے جو کسی ملک سے جنگ یا خانہ جنگی سے دوچار ہوئے یا پھر مختلف قسم کی آفات ارضی وسماوی کا شکار ہوتے رہے ہیں ان کی مدد کبھی کبھی تنظیم تعاون اسلامی نے براہ راست خود کی ہے اور بیشتر اوقات اقوام متحدہ کے تعاون سے، خصوصیت کے ساتھ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے پناہ گزیناں کے توسط سے مالی امداد کرتی رہی ہے۔ البتہ تنظیم تعاون اسلامی کے مالی تعاون کا زیادہ تر حصہ افریقہ کے ساحلی علاقوں تک محدود رہا ہے۔ بہت کم مواقع پر دیگر علاقوں میں مالی معاونت کا کام کیا گیا ہے۔

تنظیم تعاون اسلامی نے اپنی مختصر مدت کارکردگی کے باوجود دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیتوں کا بھی خیال رکھا ہے اور اکثر و بیشتر ان کی حمایت میں بھی آواز اٹھاتی رہی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دنیا کی ان مسلم اقلیتوں کی حمایت میں جو اکثریت کے مظالم کا شکار ہوتی رہی ہیں یا جنھیں مستقل طور پر دبایا اور کچلا جاتا رہا ہے۔ تنظیم بلغاریہ، فلپائن اور ہندستان کی مسلم اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کو لے کر مستقل طور پر فکرمند رہی ہے اور جہاں تک ہوسکا ہے ان کی حمایت میں ان ممالک پر دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ تنظیم نے چین میں وہاں کی کمیونسٹ حکومت کے ذریعہ مشرقی ترکستان کے مسلمانوں پر مظالم کو رکوانے میں اپنے اثرات کو مؤثر طور پر استعمال کیا ہے اور اس میں اسے کچھ کامیابیاں بھی ملی ہیں۔

سرگرمیوں کا ایک بہت ہی وسیع دائرہ رکھنے کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی جانی چاہیے کہ تنظیم اسلامی کانفرنس کا رول اب تک سیاسی نوعیت کا ہی رہا ہے اور اس کی قریب ترین نظیر سابقہ برطانوی کالونیوں کے اتحاد کامن ویلتھ میں ملتی ہے، جسے دنیا کا کمزور ترین سیاسی اتحاد کہا جاتا ہے۔ تنظیم تعاون اسلامی کے رکن ممالک کے مفادات کی گوناگونی اور سرد جنگ کے دوران کمیونسٹ اور سرمایہ دار بلاکوں میں ان کی تقسیم نے اس اتحاد کو مضبوطی نہیں بخشی ہے، جس کی ضرورت متقاضی تھی، اس پر اس طرح کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ یہ سعودی عرب کی خارجہ پالیسی کا پروپیگنڈا کرنے والی ایک تنظیم ہے یا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں مسلم ممالک یکجا ہو کر صرف باتیں بناتے ہیں۔

تنظیم تعاون اسلامی کی سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات بہت واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ سیاست کی بہ نسبت اس کی خدمات ثقافت کے میدان میں زیادہ نمایاں رہی ہیں کیونکہ سیاسی معاملات کو لے کر کئی بار مسلم ملکوں کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آئے ہیں تاہم یہ کہا جائے گا کہ تنظیم تعاون مسلم دنیا کا وہ پہلا اور واحد متحدہ پلیٹ فارم ہے جہاں اس کے رہنما اور قائدین نہ صرف اکٹھا ہوتے ہیں بلکہ باہمی مسائل پر گفتگو بھی کرتے ہیں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے جو تنظیم تعاون اسلامی نے اپنے وجود کی مختصر سی مدت میں انجام دیا ہے۔

15.5 ایسسکو (ISESCO)

3.5.1 پس منظر اور قیام

عالمی سطح پر مسلمانوں میں بے داری آئے، ان کے اندر اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور اس کے نتیجے میں مسلمان بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں دنیا کی دیگر اقوام کا مقابلہ کر سکیں، یہ خواب اور خواہشیں انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے ہی متعدد مسلم رہنماؤں اور دانش وروں کی رہی ہے۔ البتہ مسلم دنیا کا زوال اس طرح کا تھا اور استعماری طاقتوں نے انہیں اس بری طرح تقسیم کر دیا تھا کہ خواہش اور کوشش کے باوجود ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کے اتحاد و تعاون کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ بیسویں صدی عیسوی میں 1960ء کی دہائی اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس دہائی میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ پہلے 1962ء میں مکہ میں رابطہ عالم اسلامی کے قیام نے مذہبی علماء اور دانش وروں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کیا اور بعد ازاں دہائی کے آخر یعنی 1969ء میں تنظیم اسلامی کانفرنس (اب تنظیم تعاون اسلامی) کے قیام نے مسلم دنیا کے درمیان سیاست، معیشت، تعلیم اور ثقافت وغیرہ میدانوں میں تعاون کی راہیں ہموار کیں۔ حالانکہ تنظیم تعاون اسلامی کے قیام سے لے کر اس کا کردار بنیادی طور پر سیاسی رہا ہے۔ اس کے اجلاسوں کی روداد اور کارکردگی کے مطالعے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی تقریباً پانچ دہائیوں کے دوران زیادہ تر سیاست ہی اس پر چھائی رہی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تنظیم کا قیام مسئلہ فلسطین کے تناظر میں عمل میں آیا جو بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے اور اس کے بعد میں تنظیم کے رکن ممالک یکے بعد دیگرے مختلف سیاسی مسائل میں الجھتے یا الجھائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ تنظیم تعاون اسلامی نے سیاست کے علاوہ کسی دوسرے میدان میں کام نہ کیا ہو۔ تنظیم تعاون اسلامی کے متعلق مضمون میں ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ تنظیم تعاون اسلامی نے سیاسی امور و مسائل کے علاوہ مسلم دنیا کی تعمیر و ترقی میں معاون بعض دیگر اہم امور پر بھی توجہ دی ہے اور ایسے متعدد ذیلی ادارے اور تنظیمیں قائم کی ہیں جن کے توسط سے مسلم ملکوں کے درمیان آپسی لین دین اور تعاون کو فروغ دیا جا سکے۔ ایسسکو یعنی اسلامی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم، ایک ایسی ہی تنظیم ہے جسے تنظیم تعاون اسلامی نے قائم کیا ہے اور جو تنظیم کے رکن ملکوں کے درمیان تعلیمی و ثقافتی میدانوں میں باہمی تعاون کو فروغ دینے میں مصروف ہے۔

ایسسکو (ISESCO) تنظیم تعاون اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے کے اندر اس کی سرپرستی میں قائم ہونے والا ایک اہم ادارہ ہے۔ مسلم دنیا میں اور خاص طور پر تنظیم تعاون اسلامی کے رکن ملکوں کے درمیان تعلیم، سائنس اور ثقافت جیسے اہم شعبوں میں باہمی تعاون کو فروغ حاصل ہو، یہ خواہش تنظیم تعاون اسلامی کے قیام کے وقت سے ہی اس کی قیادت اور رہنماؤں کے ذہن میں موجود تھی جس کا اندازہ اس کے چارٹر کے مطالعے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جب جب اور جیسے جیسے حالات و ضروریات نے مواقع فراہم کیے تنظیم تعاون اسلامی کے زیر سایہ ذیلی تنظیمیں اور ادارے قائم ہوتے چلے گئے۔ البتہ تعلیم، سائنس اور ثقافت کے میدانوں میں مسلم دنیا کے درمیان تعاون کو فروغ ملے، اس خواہش کے پورا ہونے کا وقت 1978ء میں اس وقت شروع ہوا جب تنظیم تعاون اسلامی کے رکن ملکوں کے وزراء خارجہ نے اپنے نویں سالانہ اجلاس میں کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی کے تعاون سے مکہ مکرمہ میں ہونے والی ایک تعلیمی کانفرنس کی سفارشات کا نوٹس لیتے ہوئے سینی گال کے شہر داکار میں ایک بین الاقوامی تنظیم برائے تعلیم، سائنس اور ثقافت کے قیام کے امکان کا جائزہ لینے کے لیے ایک قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ تنظیم کا سکریٹریٹ اس کی کاپیاں (نقلیں) تمام رکن ممالک کے متعلقہ شعبہ جات کو بھیج دے تاکہ وزراء خارجہ کے آئندہ اجلاس میں پوری تیاری

کے ساتھ بین الاقوامی تنظیم برائے تعلیم، سائنس اور ثقافت کے قیام کے امکانات پر غور کیا جاسکے۔ اس کے بعد تنظیم کے وزراء خارجہ کے دو مسلسل اجلاسوں مراکش (1979) اور پاکستان (1980) میں اس پر غور و خوض ہوتا رہا اور بالآخر تنظیم تعاون اسلامی کے تیسرے سربراہ اجلاس میں ایسسکو (اسلامی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم) کے قیام کا حتمی فیصلہ ہوا۔ یہ اجلاس 28-25 جنوری 1981ء سعودی عرب کے شہر مکہ میں ہوا تھا۔

5-3 مئی 1982ء کو ایسسکو کا تاسیسی اجلاس مراکش کے ثقافتی دارالحکومت فاس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں پوری مسلم دنیا سے ماہرین تعلیم، سائنس و ثقافت اور دانش وروں نے شرکت کی اور پروفیسر عبدالہادی بوطالب کو ایسسکو کا پہلا اور بانی ڈائرکٹر جنرل منتخب کیا گیا۔ اسی اجلاس میں تنظیم کا منشور بھی بنا اور اس کے مقاصد اور ان کے حصول کے لیے طریقہ کار بھی طے کیا گیا۔

15.5.2 ایسسکو کا منشور

ایسسکو کا منشور 1982ء میں اس کے تاسیسی اجلاس منعقدہ فاس، مراکش میں منظور ہوا، بعد میں ایسسکو کے منشور میں 1986ء، 1991، 1994، 1997، 2006، 2009 اور 2012 کے اجلاسوں میں بعض ترمیمات کی گئیں۔

15.5.2.1 منشور کا سرنامہ

☆ رکن ملکوں کی حکومتیں اس بات میں یقین رکھتی ہیں کہ اسلام امن و رواداری کا ایک مذہب، ایک ایسے طریقہ زندگی اور ایک ایسی روحانی، انسانی، اخلاقی، ثقافتی اور تہذیبی قوت کی نمایندگی کرتا ہے جس نے مسلم دنیا کی تشکیل اور انسانی تہذیب کے فروغ میں تعمیری رول ادا کیا ہے اور اب بھی ادا کر رہا ہے۔

☆ اسلامی حدود میں رہتے ہوئے اتحاد و یکجہتی ترقی اور خوشحالی کے حصول کے لیے رکن ملکوں کی توقعات اور مسلم امت کی خواہشات کو پورا کرتی ہے۔

☆ رکن ملکوں کو تعلیم، سائنس، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کے میدانوں میں درپیش چیلنجوں کی پیش بندی کرتے ہوئے اور امت کی درخشاں وراثت کو نظر انداز کیے بغیر ترقی و خوش حالی کے حصول میں ان میدانوں کی اہمیت سے آگاہ رہتے ہوں۔

☆ ان قریبی رشتوں سے آگاہ رہتے ہوئے جو مسلم دنیا کے تمام لوگوں کو تہذیبی اتحاد اور مشترکہ روحانی، اخلاقی اور ثقافتی اقدار کے ذریعہ متحد کرتے ہیں اور مطالبہ کرتی ہیں کہ تہذیبی روابط کی حوصلہ افزائی کی جائے اور مشترکہ تہذیبی، ثقافتی اور علمی رشتوں کو فروغ دیا جائے۔

☆ اتحاد و یکجہتی، تعاون باہمی اور مساوات کے اصولوں کو عمل میں لاتے ہوئے تاکہ رکن ملکوں کے درمیان تعاون کو مضبوط کیا جائے اور اس طرح تمام مناسب وسائل کو استعمال کرتے ہوئے تعلیم، سائنس، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کو ترقی دی جائے۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ذیل کے منشور کو منظوری دیتی/پیش کرتی ہیں:

ایسسکو کے منشور کی رو سے اس کا نام (Islamic Educational, Scientific and Cultural Organization) ہے۔ اور اس کا مخفف (ISESCO) ہے۔ اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ یہ ایک مخصوص بین الاقوامی تنظیم ہے جو تنظیم تعاون اسلامی کے فریم ورک میں رہتے ہوئے کام کرتی ہے خاص طور پر تعلیم، سائنس، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کے میدانوں میں۔ اس کے صدر دفاتر مراکش کے

دارالحکومت رباط میں ہیں اور ضرورت کے مطابق یہ اپنے ذیلی دفاتر اور مراکز کسی بھی دوسرے ملک میں قائم کر سکتی ہے۔ اس تنظیم میں تین زبانوں یعنی عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں کام ہوتا ہے۔ منشور کی دفعہ 4 کے تحت ایسسکو کے مقاصد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

15.5.3 مقاصد:

الف: تنظیم کا مقصد رکن ملکوں کے درمیان تعاون کو مضبوط کرنا، فروغ دینا اور مستحکم کرنا ہے۔ خاص طور پر تعلیم، سائنس، ثقافت اور ذرائع ابلاغ کے میدانوں میں/ مزید برآں مسلم دنیا کی تہذیبی حوالے کے اندر رہتے ہوئے اور انسان اسلامی اقدار کی روشنی میں ان (چیزوں) میدانوں کو ترقی دینا۔

ب: رکن ممالک کے باشندوں اور ان کے علاوہ لوگوں کے درمیان بھی باہم مفاہمت کو مستحکم کرنا اور مختلف وسائل خاص طور پر تعلیم، سائنس، ثقافت اور ابلاغ کے وسائل کے ذریعہ دنیا میں سلامتی اور امن کے حصول میں تعاون دینا۔

ج: اسلام اور اسلامی ثقافت کی صحیح صورت کو عام کرنا، تہذیبوں ثقافتوں اور مذاہب کے درمیان مکالمے کو فروغ دینا، اسلام کے تہذیبی تناظر میں آزادی اور انسانی حقوق کے ساتھ امن اور انصاف کی قدروں کو فروغ دینے کے لیے کام کرنا۔

د: ثقافتی شناخت کو بچاتے اور آزادی خیال کی حفاظت کرتے ہوئے رکن ممالک کے درمیان ثقافتی اختلاف کے پہلوؤں کی حمایت اور ثقافتی روابط کی حوصلہ افزائی کرنا۔

ہ: تعلیم، سائنس، ثقافت اور ابلاغ کے میدانوں میں تنظیم تعاون اسلامی کے مخصوص اداروں کے درمیان اور ایسسکو کے رکن ممالک کے درمیان ربط و تعاون کو استوار کرنا اور یکساں مقاصد رکھنے والی کے سرکاری و غیر سرکاری اداروں کے درمیان، خواہ ان کا تعلق تنظیم کے ممبر ملکوں سے ہو یا وہ تنظیم سے باہر کے ملکوں سے متعلق ہوں، تعاون اور شرکت کو فروغ دینا۔

و: نصابہائے تعلیم، سائنسی تحقیقات اور علمی مطالعات میں اسلامی ثقافت کے نشانات منزل کو شہرت دینا، اس کی خصوصیات کو نمایاں کرنا اور اس میں لوگوں کی مزید دلچسپی پیدا کرنا۔

ز: رکن ممالک کے تعلیمی نظاموں کو باہم مربوط کرنے کے لیے کام کرنا۔

ح: اسسکو کے غیر رکن مسلم ملکوں کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی اداروں کی کوششوں کی حمایت کرنا۔

15.5.4 مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے وسائل

اسسکو کے مذکورہ بالا مقاصد کو بروئے کار لانے اور انہیں زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کے لیے اس کے منشور کے مطابق ذیل کے وسائل استعمال کیے جائیں گے:

1- اسلامی ثقافت کے فروغ اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے عربی، جو کہ قرآن مجید کی زبان ہے، کی تعلیم و تدریس کو دنیا بھر کے غیر عربی بولنے والے حلقوں میں وسعت دینے کے لیے منصوبہ سازی کرنا اور مناسب پروجیکٹوں کی مدد کرنا۔

2- تنظیم کے مقاصد کے حصول اور رکن ممالک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے یونیورسٹیوں، تحقیقی مراکز اور خاص مہارت رکھنے والے اداروں میں چیئر، ادارے اور شعبہ جات کے قیام میں مدد کرنا، ان کے لیے لائحۂ عمل اور طریقۂ کار تیار کرنا اور ان کے درمیان سرگرم تعاون کی حوصلہ افزائی کرنا۔

3- وہ افراد، تنظیمیں اور جماعتیں جو اسلامی ثقافت، اس کی اساسیات اور امتیازات کی توسیع و فروغ میں مصروف ہیں ان کی سائنسی اور تعلیمی سرگرمیوں کو ترقی دینا۔ رکن ملکوں کی تعلیمی تکنیکی اور عملی تربیت کے پروگراموں کی تیاری میں مدد کرنا۔ اور رکن ملکوں کے محققین اور موجدین کی حوصلہ افزائی کرنا۔

4- رکن ممالک میں تعلیم کی ترقی اور فروغ کے لیے درکار تحقیقی کام، مطالعات اور تربیتی پروگراموں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

5- رکن ملکوں کے ساتھ نیز ان قومی، علاقائی اور بین الاقوامی اداروں اور تنظیموں کے اشتراک سے جو تعلیم سائنس، ثقافت اور ابلاغ کے میدانوں میں کام کر رہی ہیں، کانفرنسوں، کپموزیموں، تربیتی پروگراموں، سیمیناروں اور ورکشاپوں کا اہتمام کرنا۔

6- اسلام اور اسلامی ثقافت اور انسانی تہذیب کے تئیں ان کی خدمات کی مناسب تشہیر کے لیے میکنزم تیار کرنا۔

7- رکن ممالک میں مہارت رکھنے والے اداروں کے اشتراک و تعاون سے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی مقابلوں کا انعقاد۔

معلومات کی جانچ

1۔ رابطہ عالم اسلامی کب اور کہاں قائم ہوئی؟

2۔ رابطہ کے انگریزی جرنل کا نام بتائیں۔ یہ کب سے شائع ہو رہا ہے؟

3۔ تنظیم تعاون اسلامی کا پالیسی ساز ادارہ کون سا ہے؟

4۔ تنظیم تعاون اسلامیکا مستقل سکریٹریٹ کس ملک میں ہے؟

5۔ ایسسکو کے بانی ڈائرکٹر جنرل کا نام بتائیں۔

15.6 اسلامی نظریاتی کونسل

15.6.1 پس منظر اور قیام

1947ء میں پاکستان کا قیام مذہب کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ آزادی کے بعد جب اس ملک کی آئین سازی ہوئی تو اس میں مذہب (اسلام) کا کردار بہت اہم رہا۔ چنانچہ اسلام کو پاکستان کی ریاست اور حکومت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ آزادی کے بعد پاکستان اسلامی جمہوریہ بھی بن گیا اور اس کے آئین کی اساس بھی اسلام کی بنیادی تعلیمات پر قائم ہوئی۔ البتہ قانون سازی ایک مستقل عمل ہے جو حالات و ضروریات کے مطابق تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے اس لیے ایک بار آئین سازی کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد بھی اس کی ضرورت ہمیشہ باقی

رہتی ہے کہ آئین کے تحت جو قانون سازی حالات وضروریات کے تحت ہورہی ہے، وہ آئین کے مطابق اور اس کے اصولوں کے تحت ہورہی ہیں یا نہیں۔ عام طور پر اس طرح کی نگرانی کا کام عدالت عالیہ کے ذمہ ہوتا ہے کہ وہ آئین کی تشریح کرے اور اس کے تحت ہونے والی قانون سازی کے بارے میں بتائے کہ وہ آئین کی روح کے مطابق ہے یا نہیں۔ پاکستان بنا تو مذہب کی بنیاد پر تھا لیکن اس کے عدالتی اور دیگر بنیادی ڈھانچے برطانوی دور کا ہی تسلسل تھے اس لیے پاکستانی قیادت کو اس کی ضرورت پڑی کہ وہ پاکستان میں ایک ایسا آئینی ادارہ تشکیل دے جو پاکستان کی قومی وصوبائی اسمبلیوں میں ہونے والی قانون سازی پر نظر رکھے کہ وہ قرآن وسنت (اسلامی شریعت کے بنیادی مآخذ) کے مطابق ہو رہی ہے یا نہیں۔ اسی طرح اس کی ذمہ داری یہ بھی ہو کہ ریاست کا صدر، صوبوں کے گورنر اور وفاقی وصوبائی اسمبلیاں اگر کسی قانون کی شرعی حیثیت کے بارے میں دریافت کریں تو ان کی صحیح جانب رہنمائی کرے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں پاکستان کے اندر وفاقی حکومت کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں آیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا ایک آئینی ادارہ ہے۔ اس کا قیام 1962ء میں عمل میں آیا اور اس کونسل کی تشکیل پاکستانی آئین کی دفعہ 204 کے تحت اس مقصد سے کی گئی کہ وہ پاکستانی پارلیمنٹ کی اس حوالے سے رہنمائی کرے کہ وہ جو قانو سازی کرتی ہے اور جو قانون بناتی ہے وہ قرآن وسنت سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔ اس وقت اس ادارے کا نام ''اسلامی مشاورتی کونسل'' (Advisory Council of Islamic Ideology) رکھا گیا۔ 1973ء میں جب پاکستان میں نیا آئین بنا تو اس وقت نئے آئین کے مطابق اسلامی مشاورتی کونسل کا نام بدل کر ''اسلامی نظریاتی کونسل'' (Council of Islamic Ideology) رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد 1977ء میں ایک بار پھر کونسل کی تشکیل نو عمل میں آئی جب جنرل ضیاء الحق نے پاکستان کا اقتدار سنبھالا۔ سابق صدر پرویز مشرف کے زمانے میں بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار میں بعض تبدیلیاں کی گئیں البتہ ان کی نوعیت جزوی ہی رہی اور کونسل کا بنیادی ڈھانچہ وہی رہا جو 1973ء میں بنا تھا۔ کونسل کی ویب سائیٹ پر اس کے بارے میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

15.6.2 تعارف:

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جو قانون ساز اسمبلی کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ کوئی بھی قانون اسلام میں قرآن وسنت کے مطابق ہے یا نہیں۔

15.6.3 کونسل کی تاریخ:

اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام اسلامی مشاورتی کونسل کے طور پر یکم اگست 1962ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 1962ء کی دفعہ 199 کے تحت عمل میں آیا۔ آئین کی دفعات 207-199 اس کے قیام، کارکردگی، اصول وضوابط اور ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام سے متعلق ہیں۔ اسلامی مشاورتی کونسل کی دوبارہ تشکیل 1973ء میں پاکستان کے آئین 1973 کی دفعہ 228 کے تحت عمل میں آئی اور آئین 1973 کی دفعات 231-228 میں اس کے قیام، دائرہ عمل، طریقہ کار اور اصول وضوابط وغیرہ کا تعین کیا گیا ہے۔ 1962ء میں قیام کے بعد سے ہی کونسل کا صدر دفتر لاہور میں رہا لیکن 1977ء کے فوجی انقلاب کے بعد 26 ستمبر 1977ء کو لاہور سے پاکستان کے قومی دارالحکومت اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ البتہ اسلامی نظریاتی کونسل کے دفتر کو اس کی اپنی عمارت ستمبر 1995 میں میسر آئی جہاں اب کونسل کے مختلف دفاتر موجود

ہیں۔1962ء میں قیام کے بعد سے اسلامی مشاورتی کونسل کی 190 سے زیادہ میٹنگیں ہو چکی ہیں، اس نے پاکستان کے متعدد قوانین پر نظر ثانی کی ہے، اسی طرح کونسل نے قومی اسمبلی کو قانون سازی سے متعلق متعدد سفارشات پیش کی ہیں اور اب تک کونسل کی جانب سے قومی اسمبلی کو 90 سے زائد رپورٹیں پیش کی جا چکی ہیں۔ حال کے دنوں میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے دائرہ کار کو قانون پر نظر ثانی، پارلیمنٹ کو سفارشات پیش کرنے اور صدر، گورنر، قومی وصوبائی اسمبلیوں کی درخواست پر انہیں مشورہ دینے سے بڑھا کر تحقیق (ریسرچ) کرانے، مجلات اور کتابیں شائع کرنے اور سمینار اور کانفرنس کرانے تک وسیع کر دیا ہے۔

15.6.4 اسلامی نظریاتی کونسل کے اغراض ومقاصد:

آئین پاکستان کی دفعہ 30 کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے فرائض مندرجہ ذیل ہوں گے:

-1 اسلامی نظریاتی کونسل کے فرائض ہوں گے:

الف: پاکستانی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کو ایسی سفارشات پیش کرنا جو پاکستانی مسلمانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن وسنت کے مطابق اسلام کے اصولوں اور تصورات پر عمل پیرا ہونے کی حوصلہ افزائی کریں اور ان میں اس کی اہلیت پیدا کریں۔

ب: قومی اسمبلی، صوبائی اسمبلیوں، صدر یا گورنروں کی جانب سے اگر کوئی سوال کونسل کو بھیجا جائے کہ کوئی مجوزہ قانون کہیں اسلامی تعلیمات یا اس کے اصول وضوابط کے خلاف تو نہیں ہے، تو اس صورت میں انہیں مشورہ دینا۔

ج: ایسی سفارشات پیش کرنا جو موجودہ قوانین کو اسلامی اصولوں کے مطابق بناتی ہوں مزید برآں ان کوششوں کو روبہ عمل لانے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کرنا۔

د: پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کی رہنمائی کے لیے اس طرح کے اسلامی احکامات کو مناسب شکل میں مدون کرنا۔

-2 اگر کہیں پر پارلیمنٹ، صوبائی اسمبلیوں، صدر مملکت یا گورنروں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی قانون کی منظوری کو عوامی مفاد میں اسلامی نظریاتی کونسل کا مشورہ یا تجویز آنے تک نہیں ٹالا جاسکتا تو ایسی صورت میں قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل کے مشورے سے پہلے ہی منظوری دی جاسکتی ہے۔ البتہ اس صورت میں بھی ضروری ہے کہ قانون کو اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس اس کی رائے یا مشورہ لینے کے لیے بھیجا جائے گا کہ آیا وہ قانون اسلامی احکام کے مطابق ہے یا نہیں اور اگر اس پر کونسل کا کوئی مشورہ آتا ہے تو متعلق ادارہ اس پر دوبارہ غور کرے گا۔

-3 اسلامی نظریاتی کونسل اپنی حتمی رپورٹ تشکیل کے سات برس کے اندر اندر پیش کرے گی اور ایک سالانہ عبوری رپورٹ بھی پیش کرے گی۔ یہ رپورٹ خواہ حتمی ہو یا عبوری دونوں صورتوں میں قومی اسمبلی کے دونوں ایوانوں میں اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی بحث ومباحثے کے لیے پیش ہوگی اور اس پر یہ بحث رپورٹ پیش ہونے کے چھ مہینے کے اندر ہوگی۔ اور پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں رپورٹ پر غور کرنے کے بعد حتمی رپورٹ پیش کیے جانے کے دوسال کے اندر اندر قانون کو اس کے مطابق بنائیں گی۔

15.6.5 کونسل کی ساخت اور میعاد:

اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کی کم سے کم تعداد 8 ہوگی اور زیادہ سے زیادہ تعداد 20 ہوسکتی ہے۔ جس میں کونسل کا چیئرمین (سربراہ) بھی شامل ہے۔ ان ارکان کا تعلق پاکستان میں موجودہ مختلف مکاتب فکر سے ہوگا، انہیں اسلام کے اصول واحکام اور فلسفے کا قرآن و سنت کی روشنی میں متعد بہ علم ہونا چاہیے یا انہیں پاکستان کے معاشی، سیاسی، قانونی یا انتظامی مسائل کی اچھی سمجھ ہو، ان میں کم از کم دو ارکان سپریم کورٹ/ہائی کورٹ کے موجودہ یا سبکدوش جج ہونے چاہئیں اور ایک رکن کا عورت ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح کم از کم چار ارکان ایسے ہونے چاہیے جو کم سے کم پندرہ سال سے اسلامی تحقیق و ہدایت میں مصروف ہوں۔

کونسل کی مدر کار تین برس ہوتی ہے اور کونسل کے ارکان کا تقرر صدر مملکت وزیر اعظم کی سفارش پر کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کا ایک اہم آئینی ادارہ ہے جس کا کام پاکستان میں قانون سازی کے عمل پر نظر رکھنا، اسلامی احکامات کے مطابق آئین سازی کے لیے سفارشات پیش کرنا اور اگر آئین سازی سے متعلق ادارے اور افراد اس سے کسی قانونی معاملے میں رائے اور مشورہ طلب کریں تو مشورہ دینا ہے۔ کونسل کی اب تک کی کارکردگی کو اگر دیکھا جائے تو پچھلی چھ سے زائد دہائیوں کے دوران اس نے پاکستان میں اقتصادی، تعلیمی، معاشی اور ذرائع ابلاغ سے متعلق قوانین کے ڈرافٹ کی تیاری میں نہ صرف مدد و معاونت کی ہے بلکہ قوانین کے ڈرافٹ بھی تیار کیے ہیں۔ ان شعبوں کے علاوہ بھی کونسل نے عدلیہ اور دیگر عمومی معاملات میں بھی اپنی سفارشیں پارلیمنٹ کو پیش کی ہیں۔

قوانین کے ڈرافٹ کی تیاری کے لیے یا سفارشات کو بہتر بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان سے باہر کے بھی ماہرین کا تعاون حاصل کرتی رہی اور خود کو صرف پاکستان تک محدود نہیں رکھا ہے۔ اس حوالے سے ایک مثال شام کے سابق وزیر اعظم، رابطہ عالم اسلامی کے سابق صدر اور سابق سعودی شاہ خالد بن عبدالعزیز کے مشیر کار ڈاکٹر معروف الدوالیبی کی دی جاسکتی ہے، جن کی مدد اسلامی نظریاتی کونسل قوانین کی ڈرافٹنگ کے لیے حاصل کرتی رہی ہے۔ اسی طرح حالیہ دنوں میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے دائرہ کار کو مزید وسعت دے کر اسلامی امور سے متعلق تحقیق و تصنیف اور کانفرنسوں اور سیمناروں کو منعقد کر کے ان چیزوں کی اشاعت کو اپنی سرگرمیوں میں شامل کر کے ایک اہم سنگ میل عبور کیا ہے۔ خاص طور سے اسلامی نظریاتی کونسل کی جانب سے اجتہاد کے نام سے ایک اہم علمی مجلّے کا جاری ہونا اس کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوسکتا ہے۔ البتہ یہاں پر یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ پاکستان جیسے ملک میں جہاں اسلام ریاست کا مذہب ہی نہیں بلکہ ریاست کا وجود ہی مذہب کی بنیاد پر عمل میں آیا، وہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل کی اب تک کی کارکردگی کو خاطر خواہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خاص طور پر اسلامی قانون سازی کے حوالے سے اس سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں وہ ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہیں۔ اس پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا رہا ہے کہ اس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی نہیں ہوتی یا جو افراد کسی مکتب فکر کی نمائندگی کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں وہ اس کے حقیقی نمائندے نہیں ہوتے۔ اسی طرح پاکستانی پارلیمنٹ نے بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے مشوروں اور سفارشات کو ابھی تک وہ اہمیت نہیں دی ہے جو انہیں ملنی چاہیے۔

15.7 ادارہ تحقیقات اسلامی

15.7.1 پس منظر اور قیام

بالیدہ فکر اذہان اور بالغ نظر افراد ہر دور اور ہر زمانے میں مطالعہ و تحقیق کی اہمیت کو نہ صرف سمجھتے رہے ہیں بلکہ اپنی اپنی سطح پر اور اپنی استطاعت کے مطابق علم و تحقیق کی سرپرستی اور فروغ و اشاعت کا کام بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اسلامی روایت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت ہی واضح طور پر یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ روز اول سے ہی یہاں علم و تحقیق کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ اسلامی تہذیب و ثقافت کے دور عروج میں مسلمان علماء اور مفکرین نے علم و تحقیق کے تمام ہی مروج میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ البتہ جب ان کے زوال کا آغاز ہوا تو سیاسی زوال سے بھی پہلے علم و تحقیق کے میدان جمود کا شکار ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ جو علوم و فنون خالص اسلام اور مسلمانوں سے وابستہ تھے ان میں بھی ایسا جمود و تعطل پیدا ہوا کہ کئی سو برس تک کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے اندر ایک نئی بے داری کا آغاز ہوا۔ مسلمان مفکرین اور مصلحین نے مسلمانوں کو اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت کی جانب متوجہ کیا یہاں تک کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران علم و تحقیق کے حوالے سے بھی ایک نئی تحریک نے جنم لیا اور ضروریات زمانہ کے تحت فکر و تحقیق کے نئے دروازے وا ہوئے۔ بیسویں صدی کے وسط میں پاکستان کا قیام ایک اسلامی ریاست کے طور پر عمل میں آیا۔ چنانچہ قیام کے ساتھ ہی پاکستان کو ایسی ضرورتیں درپیش ہوئیں جن میں اسے اسلامی تعلیمات کی رہنمائی درکار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے کچھ ہی دنوں بعد ایسے کئی ادارے وجود میں آئے جن کا مقصد حکومت پاکستان کی مختلف امور میں نگرانی و رہنمائی کرنا تھا تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے بھٹکنے نہ پائے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان ایک ایسا ہی ادارہ ہے جس کا قیام اس لیے عمل میں آیا کہ اسلامی امور کے حوالے سے اعلیٰ معیاری تحقیقات فراہم کر کے حکومت پاکستان کی نفاذ اسلام کی کوشش میں معاونت کرے۔

برصغیر کے نامور مفکر شاعر اور یہاں کے مسلم سماج کی اصلاح کے لیے بے حد فکر مند رہنے والے علامہ اقبال کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ بلاشبہ اپنی شاعری کے حوالے سے وہ شاعر مشرق ہیں البتہ ان کی شخصیت کے بعض دیگر اہم پہلو بھی ہیں۔ وہ اجتہاد کو، جس کی بنیاد مطالعہ و تحقیق ہے، مسلم امت کی نشأۃ ثانیہ کے لیے ناگزیر خیال کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسی زمانے میں لاہور شہر میں ایک ادارہ اسلامی تحقیق کے لیے قائم کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اسلامی مطالعہ و تحقیق کی اہمیت کو مزید شدت کے ساتھ محسوس کیا جانے لگا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے 1949ء میں ہی اس تعلق سے ایک قرارداد منظور کی تھی۔ اس قرارداد کی روشنی میں اپریل 1952ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام کی ایک تجویز دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوئی۔ بعد ازاں 1956ء کے دستور کی دفعہ 197 کے تحت اس ادارے کے قیام کے بنیادی اقدامات کیے گئے۔ 1958ء میں حکومت پاکستان کی وزارت تعلیم کے ذریعہ تشکیل شدہ آرگنائزنگ کمیٹی نے ادارے کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس کے بعد مارچ 1960ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی کے قیام کے لیے قانونی نوٹیفکیشن جاری ہوا۔ البتہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا عملاً اور باقاعدہ قیام 1962ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور 1962 کی دفعہ 207 کے تحت عمل میں آیا۔

ادارہ تحقیقات اسلامی آغاز کار میں وزارت تعلیم کے تحت تھا لیکن 1965ء میں ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ اس کے انتظامی معاملات

وزارت قانون اور پارلیمانی امور کی وزارت کے حوالے کر دیے گئے۔ بعد ازاں ادارہ تحقیقات اسلامی کو 1979ء میں ایک نوٹی فکیشن کے ذریعے حکومت پاکستان کی وزارت مذہبی و اقلیتی امور کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ 1980ء میں اسلامک یونیورسٹی قانون کے نوٹی فکیشن کے ذریعہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا کنٹرول اسلامک یونیورسٹی کو دے دیا گیا اور اس کے بورڈ آف گورنرز کا نام بدل کر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کونسل کر دیا گیا۔ 1985ء میں جب ایک قانون کے ذریعہ اسلامی یونیورسٹی کو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی بنایا گیا تو ادارہ تحقیقات اسلامی کو اس میں ضم کر دیا گیا۔ اور اس وقت سے ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے ایک ادارے (شعبے) کے طور پر کام کر رہا ہے۔

15.7.2 اغراض و مقاصد

1960ء میں ادارہ تحقیقات اسلامی کا قیام اس مقصد سے عمل میں آیا تھا کہ یہاں پر اسلام اور اس سے متعلق امور پر تحقیقی کام ہوگا، اسلام اور اسلامی تعلیمات کو عصر جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے انہیں سائنٹفک اور عقلی انداز میں پیش کیا جائے گا اور ساتھ ہی تاریخ و ثقافت اور سائنس و فلسفے کے میدانوں میں مسلمانوں کے کارناموں کو عام کیا جائے گا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ادارہ تحقیقات اسلامی اپنے مقاصد کے حصول کی کوششوں میں مصروف ہے۔ ذیل میں ادارے کے اغراض و مقاصد کی مختصر تفصیل درج کی جا رہی ہے:

1- ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک ذیلی تحقیقی ادارے کے طور پر ان شعبہ جات میں تحقیق کے کام میں مصروف ہے جن کا تعین ادارے کی کونسل نے کیا ہے۔

2- اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں طریقہ تحقیق کے تعین اور اس کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔

3- موجودہ دور میں جو سائنسی و علمی ترقیات ہو رہی ہیں، ان کے تناظر میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی تشریح کرتا ہے۔

4- اسلام سے متعلق علوم کے فروغ کے لیے جس تحقیقی مواد کی فراہمی کو ضروری سمجھا جاتا ہے ادارہ تحقیقات اسلامی کتابوں، کتابچوں، مونوگراف، تحقیقی رپورٹوں اور تحقیقی جرنلس (مجلات) کی اشاعت کے ذریعہ اس طرح کے مواد کی فراہمی میں مصروف ہے۔

5- ادارہ تحقیقات اسلامی ایک ایسا ادارہ ہے جہاں اسلام کے بارے میں پیدا ہونے والے مختلف شکوک و شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے۔

6- مسلم معاشروں کو درپیش مسائل کی تشخیص کے لیے ادارہ تحقیقات اسلامی مطالعاتی گروپ مقرر کرتا ہے۔

7- مسلم معاشروں میں موجود مختلف مکاتب فکر کے درمیان ہم آہنگی اور باہمی افہام و تفہیم کو فروغ دینے کے مقصد سے سیمناروں، کانفرنسوں، سمپوزیموں اور ورکشاپوں کا انعقاد بھی ادارہ تحقیقات اسلامی کے مقاصد میں شامل ہے۔

8- مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے دیگر ضروری اقدامات کرنا بھی ادارہ تحقیقات اسلامی کے مقاصد میں شامل ہے۔

15.7.3 ادارہ تحقیقات اسلامی کی سرگرمیاں:

جیسا کہ اس کے مقاصد سے ظاہر ہے، ادارہ تحقیقات اسلامی کا اصل دائرہ کار فکر و تحقیق ہے، اور اس نے اپنے قیام کی پچھلی پانچ سے زائد دہائیوں کے دوران اپنی سرگرمیوں کو انہیں کاموں تک محدود رکھا ہے جن کا تعلق غور و فکر اور تحقیق سے ہو۔ 1960 کے بعد، خواہ وہ وزارت

تعلیم کے تحت رہا ہو، مذہبی واقلیتی امور کی وزارت کے زیرِ انتظام ہو یا اب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا حصہ ہو، ادارہ تحقیقات اسلامی نے اپنی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم رکھا ہے۔ پہلا حصہ تحقیقی مراکز کا ہے اور دوسرا حصہ تحقیقی جرنلس کی اشاعت کا ہے۔

15.7.4 ادارہ تحقیقات اسلامی میں تحقیقی شعبہ جات:

ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحت دس شعبہ جات کو تحقیق وتصنیف کے لیے شناخت کیا گیا ہے ان میں سے چار میں باضابطہ تحقیقی کام ہو رہا ہے جب کہ چھ شعبوں میں کام شروع ہونا باقی ہے۔

1- **قرآن اسٹڈیز:** یہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا سب سے اہم شعبہ ہے چونکہ قرآن مجید ہی اسلامی تعلیمات کی بنیاد ہے اس لیے ادارے نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اس شعبے میں تحقیق کے کام کو آگے بڑھایا جائے۔

2- **علم حدیث وسنت (حدیث وسنت اسٹڈیز):** یہ ادارہ تحقیقات اسلامی کا دوسرا اہم شعبہ ہے۔ چونکہ ادارے کے جملہ مقاصد میں اسلام کے جدید دور کے حالات میں عملی تعبیر وتشریح شامل ہے اور اس حوالے سے حدیث وسنت کو اسلامی فقہ کے بنیادی ماخذ کا درجہ حاصل ہے اس لیے حدیث کے متن اور اس سے متعلق علوم میں مطالعہ وتحقیق کی غرض سے یہ شعبہ قائم کیا گیا ہے، اس شعبے کے تحت ''برصغیر میں مطالعہ حدیث'' کے موضوع پر ایک کانفرنس بھی ہو چکی ہے۔

3- **سیرت ومغازی اسٹڈیز:** ادارہ تحقیقات اسلامی نے سیرت رسولؐ کے مطالعہ وتحقیق کے لیے ایک الگ شعبہ سیرت ومغازی اسٹڈیز کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس شعبے کے تحت تحقیق کار اللہ کے رسولؐ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کام کر رہے ہیں تا کہ مسلمانوں کو اللہ کے رسولؐ کے اسوے کو اپنانے کی ترغیب ملے۔ اس کی اپنی سیرت لائبریری بھی ہے جہاں سے کوئی بھی استفادہ کر سکتا ہے۔

4- **فقہ اینڈ لا اسٹڈیز:** اس شعبے کے قیام کا مقصد اسلامی قانون کے میدان میں تحقیق کو فروغ دینا ہے تا کہ مسلم قانون دانوں (فقہا) کی خدمات کو نمایاں کیا جائے، معاصر قانونی مسائل پر تحقیق کی جائے، حکومتی اداروں کی قانونی مسائل میں اسلامی نقطہ نظر سے مدد کی جائے اور انفرادی واجتماعی شکل میں جو قانونی مسائل پوچھے جائیں ان کا جواب فراہم کیا جائے۔

ان چار باضابطہ شعبوں کے علاوہ اسلامی افکار، تاریخ اسلامی، اسلامی سائنس وفلسفہ، معاصر مسلم امت، تصوف اور اسلام کے تعلیمی افکار کے شعبہ جات بھی قائم ہیں البتہ ان میں ابھی کام نہیں ہو رہا ہے۔

15.7.5 ادارہ تحقیقات اسلامی سے شائع ہونے والے تحقیقی مجلات:

ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحت انجام پانے والی تحقیقی و دیگر علمی سرگرمیوں کی نشر واشاعت کے لیے ضروری تھا کہ علمی مجلات اور اخبارات شائع کیے جائیں تا کہ عام لوگ بھی ادارے کی تحقیقات اور علمی خدمات سے متعارف ہوں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ادارہ تحقیقات اسلامی اس تعلق تین علمی مجلات انگریزی، عربی اور اردو زبانوں میں شائع کرتا ہے۔ اسی طرح اخبار تحقیق کے نام سے ایک نیوز بلیٹن بھی شائع کرتا ہے۔

1- **اسلامک اسٹڈیز:** ادارہ تحقیقات اسلامی اپنے قیام کے وقت سے ہی اسلامک اسٹڈیز کے نام سے ایک علمی مجلّہ انگریزی زبان میں شائع کرتا ہے، اسے عالمی شہرت حاصل ہے اور علمی حلقوں میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مجلّہ اسلامک اسٹڈیز میں تحقیقی مضامین، تبصرے، تبصرہ جاتی مضامین اور کتابوں پر تبصرے وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں اور ان کا دائرہ قرآن، حدیث، تفسیر، سیرت، علم کلام، فقہ اسلامی، مذہب، فلسفہ، علم بشریات، سماجیات، ثقافت، تہذیب، سیاست، معیشت، زبان وادب اور تاریخ تک وسیع ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں کئی عالمی شہرت یافتہ دانشور شامل ہیں۔

2- **الدراسات الاسلامیۃ:** ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحت الدراسات الاسلامیۃ کے نام سے عربی زبان میں یہ علمی مجلّہ 1965ء سے شائع ہو رہا ہے، اسلامی علوم میں ہونے والی تحقیقات کو عربی زبان میں شائع کر کے یہ مجلّہ ان سے استفادے کو پوری مسلم دنیا میں عام کرنے میں مصروف ہے۔ اس تحقیقی مجلّے کے موضوعات بھی اسلامک اسٹڈیز کی طرح کثیر الجہات ہیں اور اس میں اسلامی علوم سے متعلق تقریباً تمام ہی موضوعات پر تحقیقی مضامین ومقالات شائع ہوتے ہیں۔

3- **فکر ونظر:** ادارہ تحقیقات اسلامی کا اردو زبان میں شائع ہونے والا جرنل ہے۔ اس کا شمار برصغیر ہندو پاک کے اہم علمی وتحقیقی مجلات میں ہوتا ہے۔ یہ 1963ء سے شائع ہو رہا ہے اور اس میں اسلامی علوم اور تہذیب و تاریخ کے حوالے سے گراں قدر علمی مقالات شائع ہوتے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں برصغیر کی ممتاز علمی شخصیات شامل ہیں۔ یہ سہ ماہی جریدہ ہے اور اس میں شائع ہونے والے مقالات کے موضوعی اشاریے (Index) بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس جریدے کا امتیاز یہ ہے کہ اسلامی حدود میں رہتے ہوئے یہ آزادی اظہار کا حامی ہے اور کسی خاص مکتب فکر کی ترجمانی نہیں کرتا۔ جن موضوعات پر اس جریدے میں مضامین شائع کیے جاتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

1-	قرآن مجید	تاریخ وتفسیر، فنی وعلمی مباحث
2-	حدیث وسنت	تاریخ، متون، اصول، اطلاق
3-	فقہ واجتہاد	تاریخ، روایت، اصول، ارتقا، اطلاق، فقہ الاقلیات
4-	تاریخ اسلامی	مصادر، مباحث، جدید علم تاریخ اور اسلامی تاریخ
5-	اسلامی تہذیب	تاریخ، موضوعات، عصری مباحث
6-	اسلام اور مغرب	علمی وفکری روایات، تہذیبی تقابل، عصری مسائل
7-	اسلام اور فنون لطیفہ	اسلامی تعلیمات، تعامل، مذہب وجمالیات کا باہمی تعلق، تقابل، ادب
8-	اسلام اور جدید مباحث	بین الاقوامی معاہدے، جغرافیائی حد بندی، عالمی معیشت، عالم گیریت، حقوق انسانی، خواتین کا سیاسی وسماجی کردار

معلومات کی جانچ

1۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام کب عمل میں آیا، اس کا تعلق کس ملک سے ہے؟

2۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا تعارف کرائیں۔

3۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کب سے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے؟

4۔ ادارہ تحقیقات اسلامی سے شائع ہونے والے دو تحقیقی مجلّات کے نام لکھیں۔

15.8 خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس اکائی میں مسلم دنیا کی ان تنظیموں اور اداروں کا تعارف کرایا گیا جو سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے پہلی تین یعنی رابطہ عالم اسلامی، تنظیم تعاون اسلامی اور ایسسکو بین الاقوامی تنظیمی ہیں، اور یہ تین مسلم دنیا کے نمائندہ مذہبی سیاسی اور ثقافتی پلیٹ فارموں کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کا دائرہ کار پوری مسلم دنیا ہے۔ تینوں ہی تنظیمیں اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہیں کہ رابطہ عالم اسلامی نے مذہبی طور پر مسلم دنیا کو جوڑنے کی کوشش کی ہے اور اس میں سنی مسلم دنیا کے تمام ہی مکاتب فکر کو جگہ دی گئی ہے۔ تنظیم تعاون اسلامی جو پہلے تنظیم اسلامی کانفرنس کے نام سے جانی جاتی تھی وہ مسلم دنیا کا مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم ہے جو سرکاری طور پر مسلم دنیا کو متحد رکھنے اور اس کی آواز کو عالمی سطح پر مؤثر بنانے کے لیے کام کرتا ہے۔ ایسسکو تنظیم تعاون اسلامی کا ایک ذیلی ادارہ ہونے کے باوجود اس لیے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیم یونیسکو کے طرز پر ثقافت اور تعلیم کے میدانوں میں سرگرم عمل ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی دونوں حکومت پاکستان کے سرکاری ادارے ہیں اور ان کا قیام اس مقصد سے عمل میں آیا ہے کہ یہ پاکستان کو اس کی نظریاتی بنیادوں سے بھٹکنے نہ دیں اور حکومت پاکستان کی اس حوالے سے رہنمائی کرتے رہیں کہ اس کے اقدامات مذہب اسلام کے اصول اور تعلیمات کے خلاف نہ جانے جائیں۔

15.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1 رابطہ عالم اسلامی کے قیام اور سرگرمیوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ جائزہ لیں۔

2۔ تنظیم تعاون اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے سے بحث کریں۔

3۔ ایسسکو کے مقاصد اور ان کو بروئے کار لانے کے طریقوں پر ایک مضمون لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا تفصیلی تعارف کرائیں۔

5۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔

15.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ متعلقہ تنظیموں اور اداروں کی ویب سائٹس

2۔ اخبارات ورسائل میں شائع مضامین

بلاک: 4 مسلم مفکرین و مصلحین

فہرست

16.3 سید جمال الدین افغانی

انیسویں صدی عیسوی کے عالم اسلام میں جو چند نمایاں اور ممتاز شخصیات پیدا ہوئیں اور جن کے افکار و آثار پوری اسلامی دنیا پر محسوس کیے گئے سید جمال الدین افغانی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ قدامت پسند روایتی ماحول میں پیدا ہونے، پرورش پانے اور روایتی تعلیم کے حصول کے باوجود جمال الدین افغانی ایک روشن دماغ رکھتے تھے، جنھوں نے اپنی فہم وفراست کے ذریعہ عالم اسلام میں ترقی پسندی، روشن فکری سیاسی آزادی اور اتحادی اسلامی کے وہ بیج بوئے جو بعد میں چل کر اپنی اپنی جگہ پر تناور درخت بن گئے۔ انہوں نے کتابیں تو نہیں لکھیں لیکن علمی وفکری تربیت کے ذریعہ بڑی تعداد میں ایسے افراد تیار کر دیے جن میں کا ہر فرد جمال الدین افغانی کے فکر وعمل کے کسی نہ کسی گوشے کا علم بردار تھا۔ ان کا تعلق ایک ایسے زمانے سے رہا جب ایک طرف مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا تو دوسری طرف مغربی استعمار اپنے انتہائی عروج پر تھا، جمال الدین افغانی نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ مسلمانوں میں ملی بے داری اور سیاسی آزادی کا شعور پیدا کیا اور ایک ایسے وسیع تر اسلامی اتحاد کے لیے کوشش کی جو مسلم دنیا کو پھر کبھی استعماری چنگل میں نہ جانے دے۔

16.3.1 ابتدائی زندگی

سید جمال الدین افغانستان کے دارالحکومت کابل سے قریب سعد آباد نام کے ایک گاؤں میں شعبان 1254ھ مطابق اکتوبر/نومبر 1838ء کو پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سید صفدر تھا۔ بعض ایرانی مصنف ان کی جائے پیدائش ایران میں ہمدان کے قریب واقع اسد آباد کو بتاتے ہیں۔ جمال الدین افغانی نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کابل افغانستان میں گزارے اور اس زمانے میں مروج تعلیم وہیں پر حاصل کی۔ ایک برس ہندوستان میں رہ کر جدید تعلیم حاصل کی جہاں سے حج کے لیے مکہ معظمہ گئے واپسی پر کچھ دنوں کے لیے کابل میں سرکاری ملازمت بھی کی لیکن وہ انہیں راس نہیں آئی مجبوراً ملک چھوڑ کر نکلنا پڑا اور جو ایک بار نکلے تو پھر پوری عمر انہیں کہیں بھی قرار نصیب نہیں ہوا۔ سید جمال الدین افغانی کی زندگی کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو وہ ہمیں تین ادوار میں منقسم دکھائی دیتی ہے۔ پہلا دور ان کی زندگی کا ابتدائی دور ہے یہ 1838ء سے لے کر 1868ء تک تیس برس پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران انہوں نے تعلیم حاصل کی، حج کا سفر کیا اور اسی دوران تین بار وہ ہندوستان بھی آئے۔ البتہ اس دور میں ان کی حیثیت افغانستان کی حکومت میں ایک ملازم کی رہی۔ جہاں رہتے ہوئے انھیں جو بھی مواقع ملے اس میں انھوں نے سدھارنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر تعلیم اور صحت کے شعبے ان کی توجہ کا مرکز رہے، اسی طرح انہوں نے رسل ورسائل، فوج اور دیگر محکموں کو بھی جدید اصولوں پر مرتب کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ان کوششوں سے ہی افغانستان کا پہلا اخبار ''شمس النہار'' جاری ہوا۔ ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان جیسے پس ماندہ ملک میں پیدا ہونے کے باوجود سید جمال الدین افغانی اپنی زندگی کے ابتدائی دور سے ہی زمانے اور حالات کے تقاضوں سے باخبر تھے اور اس بات کے خواہاں تھے کہ افغانستان ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک بنے۔

16.3.2 دوسرا دور (1869-1882ء) عالم اسلام میں اصلاح احوال کی کوششیں

سید جمال الدین افغانی کی زندگی کا دوسرا دور بڑا ہنگامہ خیز رہا۔ اس دوران انہوں نے عالم اسلام کے مختلف ملکوں کے اسفار کیے۔ اب تک جن اصلاحات کے لیے کوششیں انہوں نے افغانستان میں کی تھی اب وہ عالم اسلام کے بڑے اور اہم ملکوں میں ان اصلاحات کو

جاری اور نافذ کرنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ جمال الدین افغانی کابل حکومت کی ملازمت چھوڑنے کے بعد ہندوستان آئے، البتہ ہندوستان میں ان کا یہ قیام بہت ہی مختصر رہا۔

ہندوستان کے بعد سید جمال الدین افغانی کی پہلی منزل قاہرہ تھی جہاں انہوں نے صرف 40 دنوں کے قیام میں وہ بڑا کارنامہ انجام دیا کہ جس نے آئندہ کے مصر کی تشکیل میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ قاہرہ میں قیام کے دوران جمال الدین افغانی نے اپنے افکار و خیالات کی اشاعت کے لیے جامعہ ازہر کا انتخاب کیا۔ وہ اکثر جامعہ ازہر جاتے اور مختلف علمی موضوعات پر وہاں کے طلبہ و اساتذہ سے گفتگو کرتے، کچھ لوگ ان کے گھر بھی آ جاتے جہاں ان کا درس ہوتا تھا۔ جمال الدین افغانی علمی مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے سیاسی نظام اور مسائل پر بھی بات کرتے۔ خاص طور پر انگریزوں کی سیاست پر ان کی تنقید بہت ہی شدید ہوا کرتی تھی، بہت سے مصری نوجوان جمال الدین افغانی کے حلقۂ اثر میں آئے اور ان کے ان شاگردوں نے ہی آگے چل کر مصر کی سیاسی بے داری اور قومی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ قاہرہ میں قیام کے دوران جمال الدین افغانی کی کوشش یہ رہی کہ کسی طرح سے علماء کے طبقے میں در آنے والے جمود کو توڑا جائے اور طلبہ کے درمیان روشن خیالی اور ملی و سیاسی شعور کو فروغ دیا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی تھیں جو مصر کے حکمراں اور اس کے انگریز مشیروں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں اس لیے افغانی کو مصر بدر کر دیا گیا۔

مصر سے نکل کر جمال الدین افغانی عثمانی حکومت کے دارالحکومت استنبول پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک طرف قدامت پسند علماء کے اندر روشن خیالی کو فروغ دینے کی کوشش کی تو دوسری طرف ترکی کی تحریک اصلاح کی حمایت کر کے ایک دستوری حکومت کے قیام پر زور دیا۔ حکمراں طبقے اور عوام دونوں میں جمال الدین افغانی کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا، لیکن جمود پسند بااثر علماء اور جاہ پسند امراء کو جمال الدین افغانی کے اصلاح پسند خیالات پسند نہ تھے مجبوراً افغانی کو دو سال بعد استنبول بھی چھوڑنا پڑا اور وہ ایک بار پھر مصر پہنچ گئے۔

جمال الدین افغانی مصر میں اپنے دوسرے قیام کے دوران آٹھ برس سے زیادہ مصر میں رہے۔ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ مصر عالم اسلام میں کسی بھی تبدیلی کا دروازہ ہے اس اہمیت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے نہ صرف یہ کہ مصر میں طویل قیام کا منصوبہ بنایا بلکہ وہاں کے تعلیمی نظام خاص طور پر جامعہ ازہر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ شاگردوں اور ہم خیالوں کا ایک ایسا گروہ بھی تیار کر دیا جس نے مصر میں تعلیمی اصلاح، سیاسی بے داری اور ایک ایسے صحافتی مشن کا آغاز کیا جس کے دور رس اثرات مصر کی سیاست پر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام پر پڑے۔ اس طرح اس کی حیثیت ایک ایسے مشعل راہ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے جس کے اجالے میں ایک پورا کارواں تعمیر و ترقی کے راستے پر آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ البتہ جس سیاسی بے داری، دستوریت اور اتحاد اسلامی کی دعوت جمال الدین افغانی دے رہے تھے وہ نام نہاد مصری حکمراں اور اس کے برطانوی پشت پناہوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ایک بار پھر انہیں اگست 1879ء میں مصر سے نکال دیا گیا۔ اس بار انہیں یہاں سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔

جمال الدین افغانی کا ہندوستان کا یہ چوتھا سفر تھا اور اس سفر میں وہ سب سے طویل عرصہ یعنی تقریباً تین برس ہندوستان میں مقیم رہے اور اس کا بھی بڑا حصہ حیدرآباد میں گزرا۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران جمال الدین افغانی نے خود کو سیاسی امور سے بالکل الگ رکھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ حیدرآباد کی نظام حکومت بظاہر براہ راست انگریزوں کی عملداری میں نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اہم فیصلے انگریز

حکام ہی کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں جمال الدین افغانی کا قیام دو برس رہا، اس دوران انہوں نے خود کو علمی مباحثوں، مضمون نویسی، مذہبی اصلاح اور طریقۂ تعلیم میں اصلاح جیسے امور تک محدود رکھا۔ دورانِ قیام ہی انہوں نے حیدرآباد میں مسلمانوں کے لیے ایک ایسی یونی ورسٹی کے قیام کی تجویز رکھی جس میں مکمل تعلیم ان کی مادری زبان (اردو) میں ہو۔ اس پر عمل چالیس برس بعد ہوا جب جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی۔ گو جمال الدین افغانی حیدرآباد کے قیام کے دوران سیاست سے کنارہ کش رہے لیکن ان کی تحریروں، تقریروں اور علمی مجالس کے سبب جس طرح روز افزوں ان کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا اس سے نظام اور انگریز دونوں حکومتیں خطرہ محسوس کرتی تھیں اس لیے انہیں حیدرآباد سے کلکتہ منتقل کر دیا گیا جو ایک طرح سے نظر بندی جیسا معاملہ تھا۔

جمال الدین افغانی کی زندگی کا یہ دوسرا دور نہ صرف ہنگامی ہے بلکہ اس دوران ہی پہلی بار ان کی شخصیت مشرق میں سیاسی آزادی کے نقیب کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ انہوں نے مسلمانوں کے جمود کو توڑنے کی پیہم کوشش کی اور نظریہ وعمل کا ایک ایسا خاکہ پیش کیا جس میں مسلمانوں کے اتحاد کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ مغرب کی بالادستی کو ختم کیا جا سکتا تھا بلکہ اسلام کی عظمت رفتہ کی بازیافت بھی ہو سکتی تھی۔

16.3.3 تیسرا دور (1883۔1897ء) نیا میدان عمل یورپ:

سید جمال الدین افغانی شاید پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مغربی استعمار کے غلبے اور اس کے نتیجے میں آنے والے خطرے کو محسوس کیا اور اپنی پوری زندگی مسلم دنیا کو اس خطرے سے آگاہ کرنے اور اس کے خلاف محاذ بنانے میں صرف کر دی۔ البتہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنی جدوجہد کے دوران جمال الدین افغانی کو یہ ادراک بھی ہوا کہ استعمار کے زیر تسلط یا زیر اثر مسلم ملکوں میں جمہوریت اور آزادی کی کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں، اس لیے زندگی کے تیسرے مرحلے میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یورپ میں قیام کر کے اپنی جدوجہد کو مہمیز دیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے پیرس (فرانس) کا انتخاب کیا۔

ہندوستان سے نکلنے کے بعد جمال الدین افغانی چند دنوں لندن میں قیام کے بعد پیرس منتقل ہو گئے اور آنے والے تین برس تک پیرس ہی جمال الدین افغانی کی جدوجہد کا مرکز رہا، جہاں مصر سے اخراج کے بعد ان کے بہت سے شاگرد بھی اکھٹا ہو گئے تھے جن میں محمد عبدہ اور سعد زغلول کے نام نمایاں ہیں۔ یورپ میں قیام کے دوران جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی زبوں حالی، اسلامی اخوت واتحاد اور مسلم ممالک کی آزادی کے حوالے سے نہ صرف یہ کہ اخبارات ورسائل میں مضامین لکھے، یورپ کے ارباب حل وعقد سے ملاقاتیں کیں بلکہ ''العروۃ الوثقیٰ'' کے نام سے ایک ایسی جمعیۃ بھی قائم کی جس کا مقصد وسیع ترین الاسلامی اتحاد کے لیے کوشش کرنا تھا۔ اس جمعیۃ کے پلیٹ فارم سے ہی انہوں نے ہفتہ وار جریدے العروۃ الوثقی (پہلا شمارہ 13/مارچ 1884 اور آخری شمارہ اکتوبر 1884ء میں شائع ہوا) کی اشاعت شروع کی جس کے صرف اٹھارہ شماروں نے جدید مسلم دنیا میں استعماری طاقتوں کے خلاف جدوجہد اور بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا کی جس کی مثال ماضی قریب میں کہیں اور نہیں ملتی۔

16.3.4 رسالہ العروۃ الوثقی کے اغراض ومقاصد:

سید جمال الدین افغانی نے العروۃ الوثقیٰ کے پہلے شمارے میں اس کے اغراض ومقاصد کو بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

''مشرقی قوموں کی بربادی کی اب کوئی حد نہیں رہی اور وہ انتہا درجہ تباہ حال ہو چکی ہیں۔ خصوصاً مسلمان جن میں کے بہت سے تاجدار اپنے تاج وتخت سے محروم کر دیے گئے، ان میں بے شمار صاحب جاہ وعزت تھے جو ذلیل ہو گئے۔ بے شمار ارباب شوکت وجلال تھے جو حقیر ہو گئے اور بے شمار اصحاب دولت ومال تھے جو فقیر ہو گئے... ان کا کوئی طبقہ، کوئی فرقہ اور کوئی گروہ ایسا نہیں جو اس عام تباہی وبربادی سے محفوظ ہو..''

''یہ رسالہ بقدر امکان مشرقی قوموں کے لیے ان ضروری کاموں کو صاف صاف بیان کرے گا جن میں کسی بھی طرح کمی کرنا ان کی بربادی، کمزوری اور تباہی کا سبب ہے، اور ان راستوں کی طرف علانیہ رہنمائی کرے گا جن پر چلنا تلافی مافات کے لئے ازحد ضروری ہے۔ نیز آئندہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی صورتیں بھی پیش کرتا رہے گا۔''

''یہ رسالہ مشرق وسطیٰ کے اعلیٰ طبقے کی نگاہوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرے گا اور ان شبہوں اور وہموں کو دور کرے گا جن کی وجہ سے ہدایت وکامیابی کا راستہ ان پر ملتبس ہو گیا ہے۔ ان کے ان وسوسوں کو رفع کرے گا جن کی بنا پر وہ مرض کے علاج وشفا کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں اور عام طور پر وہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصیبت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور تدارک وتلافی کا زمانہ گزر چکا ہے۔''

''یہ رسالہ سمجھائے گا کہ تمام مشرقی قوموں کے لیے باہمی امداد واعانت کا طریقہ نہایت ضروری ہے اور یہی ان کے سیاسی روابط اور وطنی تعلقات کا محافظ ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اسی طریقے کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ آج قوی نے ضعیف کو دبا رکھا ہے۔''

''یہ رسالہ اعدائے مشرق کی محبت اور خیر خواہی کی اس منقش چادر کو جو رنگا رنگ ملاطفت اور نرم خوئی سے رنگین ہے، چاک کر کے جو کچھ پس پردہ ہے، اس کو علانیہ دکھا دے گا، اور حریص وطماع مغرب، مشرق کی تاریکی وغفلت میں آہستہ آہستہ جس مخفی راہ سے چل رہا ہے اس پر کافی روشنی ڈالے گا۔''

''یہ رسالہ اس امر کی خاص کوشش کرے گا کہ مشرقی قوموں پر جو غلط الزام لگائے جاتے ہیں اور خاص کر مسلمانوں پر جو جھوٹی تہمتیں لگا کر ان کو بدنام کیا جاتا ہے، ان کی اچھی طرح پردہ دری کرے اور اصلی حقیقت کو سمجھائے۔ نیز بعض ناواقفوں کے اس خیال کی تردید کرے گا جو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ترقی وتمدن کے برکات سے اس وقت تک مستفید نہیں ہو سکتے، جب تک کہ وہ انہی اصولوں پر کاربند رہیں گے جن پر آج سے سیکڑوں برس پہلے کاربند ہو کر ان کے اسلاف نے فائدہ اٹھایا تھا۔''

''یہ رسالہ تمام مشرقی اقوام کو سیاسی حوادث عامہ سے باخبر کرنے کی ہر وقت کوشش کرے گا اور ان کے متعلق سیاسی جماعتیں جو طرز عمل اختیار کرتی رہیں گی، ان کے انکشاف اور پردہ دری سے غافل نہ ہو گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مشرقی قوموں کے باہمی تعلقات کی تقویت اور استحکام اور ان کے افراد میں باہمی محبت والفت کی تلقین وتحکیم کی خاص طور پر رعایت رکھے گا اور ان کے منافع مشترکہ کی تائید وحفاظت کو اپنا سب سے بڑا فرض سمجھے گا۔''

(عبدالغفار، آثار جمال الدین افغانی، ص 173۔ 175ء بحوالہ شاہد حسین رزاقی، افغانستان کے پہلے مرد مجاہد سید جمال الدین افغانی: حیات وافکار، ص105۔107)

العروۃ الوثقیٰ کے مدیر سیاسی سید جمال الدین افغانی تھے جبکہ اس کے محرر اول ان کے شاگرد رشید محمد عبدہٗ تھے۔ رسالے کا پہلا شمارہ 13 مارچ 1884 کو شائع ہوا۔ لیکن آٹھ مہینے سے بھی کم جاری رہنے والے اس ہفتہ وار رسالے نے عربی و مسلم صحافت پر اپنے دیرپا نقوش ثبت کیے کہ آج بھی اسے ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسے مسلم دنیا میں بے پناہ مقبولیت اور شہرت ملی۔ اس کے مضامین عربی رسائل و جرائد میں ہی نہیں نقل کیے جاتے تھے بلکہ فرانسیسی اور انگریزی رسائل بھی ان کے ترجمے شائع کرتے تھے۔ اس طرح حریت و آزادی کی تحریک میں انھوں نے ایک نئی جان ڈالنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سامراجی مخالفین نے ان کے راستے میں اتنی مشکلات کھڑی کیں کہ صرف اٹھارہ شماروں کے بعد اس کی اشاعت بند کردینی پڑی۔ اس مختصری مدت میں انھوں نے مسلمانوں کو ان کے ماضی و حال سے واقف کرایا تو علماء کے طبقے کو ان کے فرائض یاد دلاتے ہوئے تقلید کے مضر اثرات سے بھی آگاہ کیا۔

16.3.5 ایران و ترکی میں

سید جمال الدین افغانی نے تین سال پیرس میں قیام کے بعد چند مہینے روس میں گزارے جہاں ان کی کوشش رہی کہ برطانوی استعمار کے خلاف روس اور افغانستان کا اتحاد بن جائے۔ لیکن اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے اپنی توجہ ایران پر مرکوز کی جہاں ان کو ابتدائی کامیابیاں بھی ملیں البتہ ان کی روز افزوں مقبولیت سے گھبرا کر شاہ ایران ''ناصر الدین شاہ'' بھی ان کا مخالف ہوگیا اور انہیں ایران چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ وہ ترکی گئے جہاں سلطان عبدالحمید نے جو خود اتحاد اسلامی کے علم بردار تھے، بظاہر ان کا استقبال کیا لیکن ترکی میں جمال الدین افغانی کا قیام اس اعتبار سے ثمر بار نہ رہا کہ انہیں آزادی حاصل نہ رہی اور ایک طرح سے انہوں نے اپنی زندگی کے باقی ایام یہاں پر محصوری میں گزارے اور بالآخر 9/مارچ 1897ء کو ٹھوڑی کے سرطان کی بیماری میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا۔ وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی، لیکن دسمبر 1944ء میں ان کی لاش افغانستان لائی گئی اور کابل کے نواح (علی آباد) میں 2 جنوری 1945ء کو دفن کر کے ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمال الدین افغانی ایک روشن خیال وسیع المشرب مسلمان عالم و رہنما تھے جنھوں نے اپنی پوری عمر مذہبی عقلیت، رد دہریت، آزادی و جمہوریت اور اتحاد اسلامی کی کوششوں میں صرف کی۔ جدید تاریخ میں انہوں نے سب سے پہلے مسلم ممالک کا ایک بلاک بنانے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ وہ بلاشبہ عہد جدید میں عالم اسلام کے ہی نہیں مشرق کے ایک بڑے مفکر تھے اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اولین بنیاد گزار بھی۔

16.4 مفتی محمد عبدہ

انیسویں صدی عیسوی کے مفکرین و مصلحین میں ایک نمایاں نام شیخ محمد عبدہ کا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سید جمال الدین افغانی کے خوشہ چینوں میں سے تھے اور افغانی کی شخصیت کا ان پر گہرا اثر تھا، اس کے باوجود انہوں نے عالم عرب میں فکر و عمل کے ایک نئے اور زیادہ متوازن منہج کی تبلیغ و اشاعت کا کام کیا۔ جس کے اثرات نہ صرف عالم عرب میں بلکہ برصغیر اور مشرق بعید تک ہر جگہ دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے دفاع اسلام، اصلاح تعلیم، مذہبی اصلاح اور اخلاقیات کے اعلیٰ اصولوں کی آبیاری کے لیے مسلسل اور تمام عمر کوشش کی۔ ان

کی خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے نتائج کے جلد حصول یا انتظار کے بجائے ہر حال میں اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ اور اپنی فکر کو قرآنی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے پیش کیا۔ انہوں نے اندھی تقلید کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور تفکر و تدبر کے قرآنی پیغام کو تمام کرنے میں لگے رہے۔

16.4.1 ابتدائی زندگی:

محمد عبدہ مصری کسانوں کے ایک متوسط اور کسی قدر خوش حال گھرانے میں 1849ء/1266ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام محمد والد کا نام عبدہ اور دادا کا نام حسن خیر اللہ تھا۔ ان کا خاندان مصر کے صوبے بحریہ کے ایک گاؤں محلات نصر میں آباد تھا۔ گھر والوں نے ان کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے گاؤں کے مکتب میں داخل کر دیا جہاں انہوں نے ضروری نوشت وخواند کے بعد بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ مزید دینی تعلیم کے حصول کے لیے انہیں طنطا بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے احمدی مسجد میں جاری مدرسے میں داخلہ لیا۔ اس زمانے کے دیگر مدارس کی طرح اس مدرسے کا طریقہ تعلیم بھی فرسودہ تھا جس میں ذہین وطباع محمد عبدہ کی ذہنی تسکین کا سامان نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ کر گاؤں واپس چلے آئے۔ کھیتی باڑی کرنے کا ارادہ کیا لیکن والد کا اصرار تھا کہ وہ تعلیم جاری رکھیں۔ اتفاق سے ایک قریبی عزیز شیخ خضر درویش کی صحبت اور تلقین نے انہیں ایک بار پھر حصول تعلیم کی طرف قائل کر دیا۔ ایک بار پھر طنطا کی احمدی مسجد کے مدرسے میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی وہاں سے قاہرہ کی مشہور دینی درس گاہ جامع ازہر منتقل ہوگئے۔

جامع ازہر کا بھی نصاب ونظام تعلیم شیخ محمد عبدہ کی آرزوؤں کے مطابق نہ تھا وہاں بھی وہی قدیم نصاب اور متن کی شرح اور شرح کے حاشیہ پر تقریر کا سلسلہ رائج تھا۔ جدید علوم اور طریقہ تعلیم کا یہاں دور دور تک گزر نہیں تھا۔ ازہر کے اساتذہ میں سے صرف ایک شیخ حسن الطویل کی مجلس درس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں شیخ محمد عبدہ کی ذہنی آسودگی کا کسی قدر سامان فراہم ہوتا تھا اور جس نے ان کے اندر حصول تعلیم کے شوق کو باقی رکھا اور وہ ذاتی مطالعے میں مصروف رہے۔ اسی دوران مصر کی سرزمین پر مشرق کے اس نابغہ روزگار کا ورود مسعود ہوا جس نے ویران ذہنوں اور اجڑے دلوں کو علم وادب کی بارش سے سرسبز وشاداب کر دیا اور جس کا نام سید جمال الدین افغانی تھا۔

سید جمال الدین افغانی کی عبقری اور ہمہ تن فکر وعمل شخصیت نے مصر میں تشنگان علم اور ان کے مداحوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا۔ اس افغانی حلقے کے ارکان میں سب سے نمایاں نام شیخ محمد عبدہ کا تھا۔ انہیں جمال الدین افغانی کی علمی مجالس میں ذہنی آسودگی اور ایک نئی زندگی ملی۔ انہوں نے پایا کہ افغانی نہ صرف یہ کہ روایتی علم کو بھی ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بلکہ عہد جدید میں مسلمانوں کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور یورپ کے علمی کارناموں کی بھی قدر کرتے ہیں۔ لہذا شیخ محمد عبدہ نے یہاں سے وہ علمی وفکری غذا حاصل کی جس نے انہیں آیندہ کے مصر کے رجال عظیم میں شامل کر دیا۔ خود استاذ کو بھی اپنے شاگرد کی صلاحیتوں کا علم تھا اس لیے جب وہ مصر چھوڑ کر جانے لگے تو فرمایا ''میں جا رہا ہوں لیکن اپنے پیچھے شیخ محمد عبدہ کو چھوڑے جا رہا ہوں، وہ تنہا مصر کے لیے کافی ہیں۔''

16.4.2 شیخ محمد عبدہ میدان عمل میں

جمال الدین افغانی کی صحبت میں شیخ محمد عبدہ کو زندگی کا راز ملا اور انہوں نے اپنی آیندہ کی زندگی کے لیے وہیں سے ایک لائحہ عمل بھی

مرتب کر لیا جو اصلاح اور تفہیم وتفسیر قرآن مجید سے عبارت تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے 1877ء میں جامعہ ازہر سے عالمیت کی سند حاصل کی اور پھر وہیں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ جامعہ ازہر میں ان کے ذمہ منطق، فلسفہ اور توحید کی تعلیم تھی البتہ گھر پر وہ بعض ذہین اور طالب علم کے شوقین طلبہ کو ابن مسکویہ کی ''تہذیب الاخلاق'' اور فرانسیسی مصنف Guizot کی تاریخ تمدن یورپ کے عربی ترجمے کا درس دیتے تھے۔ 1878ء میں محمد عبدہ دار العلوم مصریہ میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے تو انہوں نے تاریخ پر لیکچر دینے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی اہتمام کیا کہ طلبہ کو قوموں کے عروج وزوال کے فلسفے کو بھی سمجھایا جائے چنانچہ انہوں نے مقدمہ ابن خلدون پر متعدد لیکچر دے۔ اسی دوران شیخ محمد عبدہ کو مدرسہ الالسنہ (Language College) میں عربی زبان وادب کا استاد مقرر کر دیا گیا۔ یہاں بھی انہوں نے زبان وادب کی تعلیم محض دینے کے بجائے اس بات کی کوشش کی کہ ان کے طلبہ کے اندر زبان وادب کا صحیح مذاق پیدا ہو جائے۔ اسی طرح انہوں نے طلبہ کے درمیان مضمون نگاری کا شوق بھی پیدا کیا۔ وہ خود بھی بہترین مضمون نگار تھے اور اس زمانے میں بھی ان کے مضامین مصر کے مؤقر اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے تھے۔

1879ء میں جب سید جمال الدین افغانی کو مصر سے ملک بدر کیا گیا تو اس کا عتاب ان کے شاگرد محمد عبدہ پر بھی نازل ہوا اور انہیں ملازمت سے برطرف کر کے ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ملازمت سے برطرفی کے اسباب میں جمال الدین افغانی سے تعلق کے علاوہ یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ ترقی پسند خیالات کے حامل تھے اور سیاسی موضوعات پر بھی مضامین لکھتے تھے۔ بعد میں ان کی نظر بندی ختم کر کے حکومت کے سرکاری اخبار ''الوقائع المصریہ'' میں ملازمت دی گئی بلکہ کچھ ہی دنوں بعد انہیں اس اخبار کا مدیر اعلیٰ (چیف ایڈیٹر) بھی بنا دیا گیا۔ انہیں مصر کے سنسر بورڈ کا چیر مین بھی بنایا گیا۔ البتہ ان کی زیادہ توجہ ''الوقائع المصریہ'' پر تھی جہاں ان کی کوششوں سے خبروں کے ساتھ ساتھ ادبی، سماجی اور اصلاحی مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ان مضامین میں انہوں نے مصر کے نظام تعلیم کی اصلاح کی بات کی۔ اسی طرح سماجی سطح پر جو رسوم ورواج شریعت کے خلاف تھے ان کی اصلاح کی جانب بھی انہوں نے توجہ دلائی البتہ اس دوران ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا کہ انہوں نے مصری عوام کے اندر حب الوطنی اور حقوق طلبی کے جذبات کو بے دار کیا جس نے آگے چل کر مصر کی سیاسی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

1881ء میں مصر میں عرابی پاشا کی بغاوت، اس کی ناکامی اور پھر ملک پر انگریزوں کے مکمل تسلط کا اثر شیخ محمد عبدہ پر بھی پڑا، انہیں ملازمت سے الگ کر کے تین برس کے لیے ملک بدر کر دیا گیا۔ وہ بیروت چلے گئے لیکن جلد ہی جمال الدین افغانی کی دعوت پر انہوں نے فرانس کا رخ کیا جہاں انہوں نے استاد کے ساتھ مل کر العروۃ الوثقیٰ کے نام سے ایک اخبار نکالا، البتہ جب حالات کی نامساعدت کے سبب صرف آٹھ مہینے اور اٹھارہ شماروں کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا تو جمال الدین افغانی نے تو ایران کا رخ کیا اور شیخ محمد عبدہ بیروت لوٹ آئے۔

16.4.3 مصلح محمد عبدہٗ

بیروت واپسی کے بعد شیخ محمد عبدہٗ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جس کا بنیادی حوالہ مذہبی اور تعلیمی اصلاح ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہیں سے ان کا راستہ استاد سے الگ ہو جاتا ہے پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے الفاظ میں:

''مفتی مرحوم کی اس بہت ہی مختصر سوانح میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس میں انقلاب کی گھن گرج سنائی دے، یا افغانی جیسی 'آتش

زن شخصیت کی چنگاریاں نظر آئیں۔ حقیقت یہ ہے استاد اور شاگرد کی شخصیتوں کا یہی فرق تھا، افغانی انقلابی تھے، محمد عبدہٗ مصلح تھے، افغانی اپنی جدو جہد کا ثمرہ بہت جلد چاہتے تھے، محمد عبدہ تعلیم و اصلاح کی تخم ریزی کر کے نتائج کا انتظار کر سکتے تھے۔ افغانی میدان سیاست کے مرد تھے، محمد عبدہ کا خیال تھا کہ پہلے ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہیے، ذہنی بے داری ہی پائدار سیاسی انقلاب کا ہراول بن سکتی ہے۔'' (اشخاص و افکار ص 37-136)

قیام بیروت کے اس زمانے میں ہی محمد عبدہٗ نے کافی غور و خوض کے بعد اپنی زندگی کا آئندہ لائحہ عمل مرتب کیا۔ اس کا آغاز انہوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ کیا۔ بیروت کے مدرسہ سلطانیہ میں پڑھانے کے علاوہ شیخ محمد عبدہٗ دو مسجدوں میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ یہیں پر انہوں نے نہج البلاغہ اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی شرحیں لکھیں۔ افغانی کے فارسی رسالے ''ردالدہریین'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ 1888ء میں شیخ محمد عبدہٗ کو مصر لوٹنے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں انہیں حصہ کی ابتدائی دیوانی عدالتوں کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اس دوران انہوں نے جامعہ ازہر کی اصلاح کا منصوبہ بھی بنایا جسے ابتدائی کامیابی بھی ملی۔ 1899ء میں شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی اعظم مقرر کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مفتی اعظم کا عہدہ ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، البتہ ان کی شخصیت نے اس عہدے کو نیا وقار اور اہمیت عطا کی۔ مفتی اعظم رہتے ہوئے انہوں نے متعدد اہم امور پر اپنی رائے ظاہر کی۔ مثال کے طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ایک استفتا کے جواب میں انھوں نے عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے غیر مسلموں سے امداد و اعانت لینے کو جائز قرار دیا۔ ایک دوسرے فتوے میں مسلمانوں کے لیے یہودیوں اور عیسائیوں کا ذبیحہ حلال قرار دیا۔ ایک اہم فتویٰ یہ دیا کہ ڈاک خانوں کے سیونگ بینکوں میں جمع رقم پر سود لینا (منافع وصول کرنا) جائز ہے۔ 1900ء میں انہیں جمعیت الخیریہ الاسلامیہ کا صدر بنایا گیا۔ جس کا مقصد امیروں میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کر کے نادار مسلمانوں کی مدد کرنا تھا۔ اس زمانے میں ''لجنۃ الاحیاء العربیۃ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے صدر بھی شیخ محمد عبدہٗ تھے اور اس کا مقصد قدیم اور نادر عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت تھا۔ فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''المدونۃ'' کی اشاعت اسی انجمن نے کی۔

مصر کے تعلیمی نظام میں جس طرح کی اصلاح کے خواہاں محمد عبدہ تھے اس کو زیادہ بہتر کرنے کے مقصد سے انہوں نے برطانیہ اور فرانس کا سفر کیا اور خاص طور سے برطانیہ کے تعلیمی اداروں آکسفورڈ اور کیمبرج کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا۔ البتہ ان کا المیہ یہ رہا کہ مصر کے علماء کا طبقہ انہیں تجدد پسند خیال کرتا تھا اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ انہیں روایت پسند اور دقیانوسی سمجھتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں جانب سے ان کی مخالفت ہوتی رہی۔ عمر کے آخری حصے میں وہ ایک بار پھر یورپ جانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے اسکندریہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ بیمار پڑے اور چند ہی دنوں کی بیماری کے بعد 11 رجولائی 1905ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

16.4.4 شیخ محمد عبدہ کی خدمات اور کارنامے:

شیخ محمد عبدہ ایک کامیاب استاد، مصنف اور صحافی کے ساتھ عظیم مصلح تھے۔ ان کی اصلاح کا دائرہ محدود نہیں بلکہ بہت ہی وسیع تھا۔ انہوں نے عقیدے سے لے کر تعلیم، زبان و ادب غرض مختلف میدانوں میں اصلاح کا عظیم کارنامہ انجام دیا اور ان کے اثرات پورے عالم اسلام پر پڑے۔ ذیل میں ان کے بعض اہم کارنامے مختصراً بیان کیے جاتے ہیں:

1۔ **اصلاح عقائد:** شیخ محمد عبدہ کا تعلق جس دور سے تھا اس وقت پوری مسلم دنیا میں بدعات و خرافات کا چرچا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے صحیح

اسلامی عقائد کی تعلیم کو عام کیا۔ مسلمانوں کو باطل افکار ونظریات سے آگاہ کر کے ان کے اثرات سے بچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے تقلید کی قید سے فکر اسلامی کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کی، وہ خود مالکی فقہ کے پیرو تھے لیکن مفتی اعظم بننے کے بعد انہوں نے حنفی فقہ کے مطابق فیصلے دینے شروع کیے۔ البتہ استفادہ سبھی فقہی مسالک سے کرتے تھے۔

2۔ **تعلیم کی اصلاح:** شیخ محمد عبدہ کا بڑا کارنامہ نظام تعلیم کی اصلاح ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مصر میں جاری فرسودہ تعلیمی نظام کی ہر سطح پر اصلاح کے خواہاں تھے۔ خاص طور پر ان کی تعلیمی اصلاح کا مرکز جامعہ ازہر تھی، جس کے لیے انھوں نے بھر پور کوشش بھی کی۔ اس سلسلے میں ان کو ابتدائی کامیابی بھی ملی۔ بعد میں جامعہ ازہر کے نصاب ونظام تعلیم میں جو اصلاحات ہوئیں وہ انہیں خطوط پر ہوئیں جن کا خاکہ شیخ محمد عبدہ نے بنایا تھا۔ عالم اسلام کے کئی دیگر تعلیمی اداروں نے بھی اصلاح تعلیم کے حوالے سے شیخ محمد عبدہ کے افکار کو اپنے لیے رہنما بنایا۔

3۔ **عربی زبان وادب کی اصلاح:** شیخ محمد عبدہ زبان وادب کی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے مدرسہ السنہ کی معلمی سے لے کر قیام بیروت تک ہر جگہ زبان وادب میں اصلاح کی نہ صرف ضرورت کو اجاگر کیا بلکہ ایسے اقدامات بھی کیے جن سے ان کی اصلاح ہو سکے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے شاگردوں کو مضمون نگاری کی مشق کرائی۔ نہج البلاغہ اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی شرحیں بھی اسی کوشش کا نتیجہ تھیں۔

4۔ **تحریک تفہیم قرآن:** محمد عبدہ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو براہ راست کتاب ہدایت قرآن مجید سے جوڑنے کی کوشش کی۔ قیام بیروت کے دوران وہ وہاں کی دو مسجدوں میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ اسی طرح نجی مجلسوں میں بھی وہ فہم قرآن کی دعوت دیتے۔ تفسیر المنار جسے بعد میں ان کے شاگرد محمد رشید رضا نے مکمل کیا، اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

5۔ **دفاع اسلام:** اسلام کے خلاف اہل یورپ کی زہر افشانی کوئی نئی چیز نہیں۔ شیخ محمد عبدہ کا زمانہ بھی اس سے خالی نہیں تھا، اسلام کے خلاف جب بھی کوئی ناروا بات سامنے آتی تو محمد عبدہ علمی سطح پر اس کا جواب دیتے چنانچہ فرانس کے وزیر خارجہ ہانوتو اور عربی جریدہ 'الجامع' کے عیسائی مدیر فرح انطون نے جب اسلام کے عقیدۂ توحید اور مسلمانوں کی رواداری اور علم پروری کے خلاف مضامین لکھے تو شیخ محمد عبدہ نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے نہایت ہی مدلل جواب لکھے جو بعد میں ''الاسلام والنصرانیۃ مع العلم والمدنیۃ'' کے نام سے کتاب شکل میں بھی شائع ہوئے۔

6۔ **سیاسی اصلاح:** شیخ محمد عبدہ کی اصلاحات میں سیاسی اصلاح کی اہمیت اس لیے ہے کہ وہ عوام وخواص کی ذہنی بے داری کے ذریعہ ان کے سیاسی شعور کو ایک ایسی سطح پر لے جانا چاہتے تھے جہاں وہ سیاسی آزادی کا مطالبہ بھی کر سکیں اور اپنے لیے وہ حقوق ومراعات بھی حاصل کر سکیں جو قوموں کی سیاسی واجتماعی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ نے بہت مختصر زندگی پائی اس کے باوجود مضامین ومقالات اور شاگردوں کی صورت میں ایک ایسی روایت اپنے پیچھے چھوڑی جنہوں نے ان کے بہت سے ادھورے کاموں کو مکمل کیا مثلاً سید محمد رشید رضا نے ان کے مذہبی واصلاحی افکار کی اشاعت المنار کے ذریعہ پورے عالم اسلام میں کی۔ جامعہ ازہر کی اصلاح وہ جن خطوط پر کرنا چاہتے تھے یہ کارنامہ ان کے ایک دوسرے شاگرد شیخ مصطفیٰ المراغی کے ہاتھوں عمل پزیر ہوا۔ ان کے لبرل اور اصلاح پسند خیالات کی ترجمانی شکیب ارسلان تاعمر کرتے رہے۔ اسی طرح سیاسی اصلاحات کو عملی

جامہ پہنانے کا بیڑہ سعد زغلول پاشا نے اٹھایا اور آخر کار مصر کو سیاسی آزادی سے ہم کنار کیا۔

16.5 سید محمد رشید رضا

انیسویں صدی عیسوی میں اتحادی اسلامی، مسلم بے داری اور فکر اسلامی کے احیاء کے جو چراغ سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ نے جلائے تھے، بیسویں صدی عیسوی میں اتحاد و اصلاح کے ان کے مشن کو جس شخصیت نے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا ان کا نام سید محمد رشید رضا ہے۔ وہ ایک ایسے عالم، مفکر اور مصلح کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں جس نے حالات کی مشکلات کے باوجود مذہبی بے داری، اسلامی اخلاق اور عقیدے کی پاکیزگی کی دعوت کو عام کرنے میں اپنی پوری زندگی لگا دی۔ رشید رضا عربی زبان و ادب کے زبردست عالم اور خطیب تھے۔ علم کلام اور حدیث و بلاغت کے وہ امام تھے اور قرآن مجید کی ان کی تفسیر (تفسیر المنار) جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ بہترین انداز میں کرتی ہے۔ رسالہ المنار کی شکل میں اسلامی علوم وفنون کا انہوں نے گویا ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کر دیا۔ اسی طرح سید محمد رشید رضا نے اسلام پر غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دے کر دفاع اسلام کی بھی عظیم خدمت انجام دی۔

16.5.1 ابتدائی زندگی:

سید محمد رشید رضا ۱۹ رستمبر ۱۸۶۵ء کو لبنان کے شمالی شہر طرابلس۔ جو ان دنوں طرابلس الشام کہلاتا تھا اور شام ہی کا حصہ تھا۔ کے ساحلی قصبے قلمون میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان خوش حال تھا اور علم وتقویٰ میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ رشید رضا کی ابتدائی تعلیم قصبے کے مکتب میں ہوئی جہاں انہوں نے ناظرہ، قرآن مجید پڑھنے کے علاوہ لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیت حاصل کی۔ اس زمانے کی روایت کے مطابق اس کے بعد انہوں نے الفیہ ابن مالک (عربی گرامر کا ایک منظوم کتابچہ) صحیح مسلم (حدیث کی کتاب) اور مقامات حریری (عربی ادب کی کتاب) کے کچھ حصے یاد کیے۔ سید رشید رضا نے اعلیٰ مذہبی تعلیم طرابلس میں مدرسہ اسلامیہ سے حاصل کی۔ اس زمانے میں اس مدرسہ کے مہتمم (ناظم) شیخ حسین الجسر تھے۔ یہ ایک شامی عالم تھے جنہوں نے دفاع اسلام میں ایک رسالہ لکھا تھا اور جسے انہوں نے سلطان عبدالحمید کے نام سے معنون کیا تھا اور اسی لیے رسالہ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے مغربی علماء کے اسلام پر اعتراضات کے جواب دیے تھے۔ سید رشید رضا نے عقلی اور ادبی علوم کی تکمیل انہیں سے کی۔ حدیث وفقہ کی کتابیں شیخ محمود نشابہ سے پڑھیں اور نیل الاوطار کا کچھ حصہ شیخ عبدالغنی رافعی سے پڑھا۔ یہیں پر انہوں نے ترکی زبان بھی سیکھی، امام غزالی کی مشہور کتاب احیاء علوم الدین ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ کتاب تھی اور اسے بہت ہی ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔

16.5.2 عملی زندگی کا آغاز

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد سید محمد رشید رضا نے دعوت وارشاد کو اپنے لیے میدان عمل کے طور پر منتخب کیا اور اس کی تیاری کچھ دنوں عبادت وریاضت میں مصروف رہ کر کی۔ انہوں نے اس کام کا آغاز اپنے آس پاس کے معاشرے میں موجود بدعات وخرافات کے خلاف آواز اٹھا کر کیا۔ اس طرح سلسلۂ مولویہ (مولانا روم کی طرف منسوب صوفی سلسلہ) کے ذریعہ رقص وسرود اور اباحیت کا جو بازار گرم تھا اس کے خلاف بھی رشید رضا نے تحریک چلائی۔ فارغ اوقات میں وہ کتابوں اور اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرتے یا بیروت سے شائع ہونے

والے اخبار کے لیے مضامین لکھتے۔ طبیعت میں موزونی تھی اس لیے کبھی کبھار شعر بھی کہتے تھے۔ اسی دوران انہیں سید جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالے ''العروۃ الوثقیٰ'' کے بعض شمارے بھی پڑھنے کو ملے، جس کے مطالعے نے ان کے ذہن وفکر کا انداز ہی بدل دیا۔ اس کے مطالعے نے جہاں ایک طرف انہیں مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی بدحالی سے آگاہ کیا وہیں دوسری طرف ان کی رہنمائی اس راستے کی طرف کی جو مسلمانوں کو اس بدحالی سے نکال سکتا تھا۔ چنانچہ سید رشید رضا نے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ سے ملنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمال الدین افغانی سے ملاقات اور استفادہ تو ان کے حصے میں نہ تھا البتہ شیخ محمد عبدہٗ سے ان کی ملاقات ہوئی اور بالآخر قاہرہ پہنچ کر انہوں نے شیخ محمد عبدہٗ سے نہ صرف یہ کہ علمی اخذ و استفادہ کیا بلکہ ایک طرح سے ان کے رفیق کار بن گئے اور دعوت و اصلاح کے کام میں ان کی ہر ممکن معاونت کرنے لگے۔

16.5.3 کارنامے:

سید رشید رضا عربی زبان و ادب کے ممتاز عالم اور زبردست خطیب تھے۔ وہ روایتی علوم میں مہارت رکھنے کے علاوہ جدید علوم اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ رسالہ 'العروۃ الوثقیٰ' زیادہ دنوں جاری نہیں رہ سکا تھا لیکن اس کے اثرات بے پناہ تھے اس لیے سید رشید رضا نے بھی شیخ محمد عبدہ کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ایک رسالہ قاہرہ سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

المنار: سید محمد رشید رضا نے صحیح اسلامی عقائد کی دعوت اور مسلمانوں کی اصلاح کے مقصد سے 'المنار' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کا پہلا شمارہ 17 / مارچ 1898ء کو شائع ہوا۔ البتہ ہفتہ وار اخبار ایک سال ہی جاری رہ سکا۔ آئندہ سال انہوں نے اسے ماہانہ رسالے میں تبدیل کر دیا اور اس کے بعد یہ رسالہ اگست 1935ء میں ان کی وفات تک مسلسل جاری رہا۔ اس دوران اس نے عربی صحافت کا ہی ایک معیار قائم نہیں کیا بلکہ پوری مسلم دنیا میں مقبولیت حاصل کی۔ 'المنار' کا مقصد توحید خالص اور اتباع سنت کی دعوت دینا تھا، اسی طرح عصری افکار اور اسلامی شریعت میں تطبیق پیدا کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ رسالے میں عام طور پر مضامین مسلمانوں کی دینی صلاح و فلاح جیسے موضوعات پر ہوتے۔ ان میں عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح اور جدید علوم کی تحصیل و ترغیب پر بھی زور رہتا۔ مسلمانوں کی سماجی، مذہبی، سیاسی اور معاشی بدحالی پر تبصرے بھی ہوتے تھے۔ غیر مسلموں کی جانب سے اسلام پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے رسالے میں ان کا جواب بھی دیا جاتا تھا۔ اسی طرح مسلم دنیا کے مختلف گوشوں سے جو سوالات اور استفتاء آتے تھے ان کے جواب بھی شائع کیے جاتے تھے۔ المنار کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی اس میں شیخ محمد عبدہٗ کی تفسیر کے اجزاء پابندی سے شائع ہوتے تھے۔ ان کے بعد بھی سید رشید رضا نے تفسیری سلسلہ جاری رکھا۔ المنار کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسے پوری مسلم دنیا میں پڑھا جاتا تھا اور اس کے اثرات عرب دنیا کے علاوہ ملائشیا، انڈونیشیا سے لے کر ہندوستان تک ہر جگہ پڑے۔ ہندوستان سے نواب محسن الملک، مولانا شبلی نعمانی اور ان کے شاگردوں کے مضامین المنار میں شائع ہوتے تھے۔

جامعہ اسلامیہ: رشید رضا کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ سید جمال الدین افغانی کے افکار سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ عرب دنیا کے اتحاد کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے اتحاد کے بہت بڑے داعی اور مبلغ تھے۔ ان کی تجویز تھی کہ مسلمانوں کے خلیفہ (عثمانی سلطان) کی سرپرستی میں 'الجامعہ الاسلامیہ' کے نام سے ایک وسیع تر انجمن قائم کی جائے۔ اس انجمن کا مقصد ایک کتاب (قرآن کریم) ایک قانون (شریعت

اسلامی) اور ایک زبان (عربی زبان) کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کو متحد کرنا تھا اور تجویز کے مطابق عثمانی سلطان کی سرپرستی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ (USA) کی طرز پر مسلم ممالک کا ایک وفاق بنانا مطلوب تھا جس کے رکن تمام ہی ملک اپنے اندرونی نظم ونسق میں پوری طرح خودمختار ہوں۔ لیکن سید رشید رضا کی یہ تجویز ان لوگوں کے مقاصد میں رکاوٹ بنتی جو عرب دنیا میں قومیت کا نہ صرف بیج بو رہے تھے بلکہ پوری قوت سے اس کی آبیاری بھی کر رہے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے اس تجویز کی (خاص طور پر مصر کے قوم پرستوں نے پرزور انداز میں مخالفت کی چنانچہ تجویز سے آگے بڑھ کر اسے عمل کا جامہ پہننے کا موقع نہیں ملا۔

جمعیۃ الدعوۃ والارشاد: شیخ محمد عبدہ کی طرح سید محمد رشید رضا بھی جامعہ ازہر کے نظام تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ اس طرح وہ سرکاری نظام تعلیم پر بھی نکتہ چینی کرتے رہتے تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ عربی مدارس کے رائج نظام تعلیم کی اصلاح ہو اور اس میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جو ان کے نظام ونصاب تعلیم کو جدید زمانے کی ضروریات اور تقاضوں سے نہ صرف ہم آہنگ کر سکے بلکہ ایسے افراد تیار کر سکے جو دین اور زمانہ شناسی میں یکساں مہارت رکھتے ہوں۔ سید رشید رضا کے خیال میں دین کی صحیح تبلیغ ودعوت کا کام صرف وہی علما کر سکتے ہیں جو قدیم وجدید دونوں طرح کے علوم میں پوری پوری مہارت رکھتے ہوں۔ اس حوالے سے المنار میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے لیکن روایتی علماء کا جمود اور دقیانوسی خیالات اس جانب پیش رفت میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ البتہ 1908ء میں جب ترکی میں ایک نیا انقلاب آیا اور نوجوان ترکوں کی قیادت والی حکومت نے ایک نیا آئین نافذ کیا تو سید رشید رضا کو ترکی میں روشنی اور امید کی ایک کرن نظر آئی اور انہیں لگا کہ ترکی کی نئی حکومت میں نئے آئین کے تحت ایسے امکانات ہو سکتے ہیں جن میں ایک ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آئے جہاں اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تعلیم وتدریس کا بھی انتظام ہو۔ اس مقصد کو لے کر سید رشید رضا نے ترکی کا سفر کیا اور تقریباً ایک برس تک قسطنطنیہ میں قیام پزیر بھی رہے لیکن حکومت نے دار العلوم کے قیام کے لیے بعض ایسی شرائط لگا دیں جو سید رشید رضا کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی حکومت سے دل برداشتہ ہو کر رشید رضا قاہرہ لوٹ آئے اور فیصلہ کیا کہ قاہرہ میں اپنے طور پر مطلوبہ دار العلوم قائم کیا جائے۔ 12/ربیع الاول 1330ھ/3 مارچ 1912ء کو سید رشید رضا نے جمعیۃ الدعوۃ والارشاد کے نام سے ایک ایسے تعلیمی وتربیتی ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد اسلامی تعلیم اور مذہبی تربیت کے رائج طریقے میں اصلاح کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد ایسے داعی اور مبلغ تیار کرنا تھا جو مسلم ملکوں میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کے خلاف جدوجہد کر سکیں اور ان کے روز بروز بڑھتے ہوئے اثرات کو روک سکیں۔ چنانچہ یہ ادارہ قائم ہوا اور عرب ممالک کے علاوہ دور دراز کے مسلم ملکوں سے بھی طالب علم اپنی علمی وتربیتی پیاس بجھانے کے مقصد سے یہاں آئے لیکن یہ ادارہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران یہ انگریز اور عصری حکومت کے عتاب کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

16.4.5 تصنیف وتالیف

سید محمد رشید رضا کا شمار جدید اسلامی دنیا کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے مختلف موضوعات پر کثرت سے لکھا۔ تفسیر سے لے کر کلام وفلسفے تک متعدد موضوعات پر ان کی تصانیف موجود ہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

تفسیر المنار: سید رشید رضا کی علمی زندگی کا سب سے نمایاں کارنامہ ان کی تفسیر المنار ہے۔ اس تفسیر کا آغاز ان کے استاد شیخ محمد عبدہ نے ان کی

درخواست پر کیا تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ شیخ عبدہٗ جامعہ ازہر میں قرآن مجید کا درس دیتے تھے، رشید رضا ان کے نوٹس لے کر پہلے مرتب کرتے اور پھر شیخ عبدہٗ کو دکھاتے جس میں حسب ضرورت وہ تصحیح یا ترمیم واضافہ کرتے۔ المنار میں سید رشید رضا اسے شیخ محمد عبدہ کی تفسیر کے طور پر شائع کرتے۔ سورہ فاتحہ، سورہ عصر اور تیسویں پارے کی سورتوں کی تفسیر اس طرح المنار میں شائع ہوئی۔ 1905ء میں شیخ محمد عبدہٗ کے انتقال کے بعد سید رشید رضا نے تفسیر کا سلسلہ جاری رکھا اور سورہ یوسف تک اسے لکھ پائے تھے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ تفسیر المنار کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے زمانہ حال کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ سلف کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کے اثرات کو اس تفسیر میں صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی لغوی اور نحوی مشکلات کو حل کرنے کے علاوہ قرآن مجید کے اعجاز پر اس میں بہت ہی اچھے انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ تفسیر 12 حصوں میں ہے اور نامکمل ہے۔

تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہٗ: یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں شیخ محمد عبدہ کی زندگی اور خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جمال الدین افغانی کی حیات وخدمات پر بھی اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں شیخ محمد عبدہٗ کے مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے اور تیسری جلد میں ان کے بارے میں علما اور اکابرین کے تاثرات، مضامین اور تعزیتی پیغامات وغیرہ جمع کر دیے گئے ہیں۔

الامامۃ والخلافۃ العظمیٰ: پہلی عالمی جنگ کے بعد دنیا بھر کے مسلمانوں کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ خلافت کی بقا کا تھا۔ ہندوستان میں اس کے لیے باقاعدہ تحریک چلی، عرب دنیا میں بھی اسے حل کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ سید محمد رشید رضا نے خلافت کے مسئلے کے حوالے سے اپنے رسالے المنار میں ''الامامۃ والخلافۃ العظمیٰ'' کے عنوان سے متعدد مضامین لکھے جنہیں 1922 میں کتابی شکل میں یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ ان مضامین میں اسلام کے نظام حکومت پر ان کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے پہلے خلافت کے مسئلے کا علمی سطح پر جائزہ لیا ہے اور پھر کچھ تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کتاب میں خلافت کے حوالے سے رشید رضا کا موقف بنیادی طور پر تقلیدی ہے۔ اسی طرح خلافت کے قیام اور تنظیم نو کے لیے انہوں نے جو تجاویز پیش کیں وہ ان کے خلوص اور نیک ارادے کا مظہر تو ضرور تھیں لیکن حقیقت کی دنیا میں ان پر عمل کرنا شاید ممکن نہیں رہا تھا۔

ان کے علاوہ "ذکری مولد النبی"، "الوحی المحمدی"، شبہات النصاریٰ وحجج الاسلام، نداء للجنس اللطیف، الوھابیون والحجاز وغیرہ بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کے فتاویٰ کو بھی مرتب کر کے چھ جلدوں میں شائع کیا گیا۔

سید محمد رشید رضا ان کے علاوہ بھی متعدد علمی و عملی کام انجام دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مختلف مقامات کے سفر بھی کیے۔ ہندوستانی محدثین کی ان کے دل میں بہت ہی عزت تھی۔ شبلی سے ان کی خط وکتابت رہتی تھی اور شبلی کی دعوت پر انہوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا اور 1912 میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاس کی صدارت کی۔ 22 اگست 1935 کو حرکت قلب بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہوا۔

16.6 حسن البناء

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم دنیا بہت سے مسائل اور مشکلات سے دوچار ہوئی۔ مصر چونکہ

مسلم دنیا کا ایک بڑا اور اہم ملک ہے اس لیے وہ بھی ان مسائل ومشکلات سے اچھوتا نہیں رہا بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ درست ہو کہ عالم اسلام میں جدید تبدیلیوں کا دروازہ کہا جانے والا یہ ملک مسلم دنیا سے وابستہ بیشتر مسائل کی اولین آماجگاہ بھی رہا ہے۔اس دوران مصر میں جن مسائل نے سر اٹھایا اہمیت کے لحاظ سے ان میں چار مسائل بنیادی نوعیت کے تھے۔اوّل مصری وطنیت یا مصریوں کی وطن پرستی کا مسئلہ، دوم اسلامی خلافت یعنی خلافت کا خاتمہ اور اس کے احیاء کی کوششیں، سوم عرب قومیت کا مسئلہ جس میں مصر کو لیڈر کی حیثیت حاصل رہی اور چہارم قدیم وجدید کی کشمکش ،اس مسئلے سے بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مصر دو چار رہا اور مختلف نقطہائے نظر رکھنے والے افراد نے اپنے طور پر اس کو سمجھنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کی کوششیں کی۔ان مسائل کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس دوران مصر میں علمی، فکری اور ثقافتی سطح پر ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور مقامی و بین الاقوامی عوامل اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا کر رہے تھے۔اس میں شبہ نہیں کہ مصر کے ان حالات میں مختلف شخصیات وافراد نے اپنے اپنے علمی وفکری دائروں میں رہتے ہوئے مسائل کے حل پیش کیے اور مختلف چھوٹے بڑے حلقوں میں انہیں پذیرائی بھی ملی۔انھیں میں ایک نام امام حسن البناء کا ہے جن کی فکر اور عملی اقدام نے صرف مصر ہی نہیں عالم عرب کی سب سے منظم اور بڑی مذہبی و سماجی تحریک ''الاخوان المسلمون'' کو جنم دیا۔

16.6.1 ابتدائی حالات:

امام حسن البناء 17/ اکتوبر 1906 (1321ھ) کو مصر کے ساحلی شہر اسکندریہ کے قریب ایک چھوٹے سے قصبے محمودیہ میں پیدا ہوئے۔ان کا خاندان ایک متوسط درجے کا کاشت کار مگر خوش حال خاندان تھا البتہ ان کے والد احمد عبدالرحمان نے جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کی تھی اور گھڑی سازی کا کام کرتے تھے اس لیے ساعاتی (گھڑی ساز) کہلاتے تھے،انہوں نے محمودیہ میں سکونت اختیار کرلی تھی اور گھڑی سازی کے علاوہ علمی دلچسپیاں بھی جاری رکھی تھیں۔ان کے دن کا ایک حصہ فقہ وحدیث کے مطالعے اور قرآن مجید کی تدریس میں صرف ہوتا تھا،انہوں نے مسند احمد بن حنبل اور مسند ابی داؤد الطیالسی کی تبویب (ابواب بندی) کی اور وہ شائع بھی ہوئیں۔

حسن البناء کی شخصیت کی تشکیل وتعمیر میں ان کے والد کا بڑا حصہ رہا، روحانیت کی طرف میلان اور مطالعے کا شوق انہیں اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔اس زمانے کی روایت کے مطابق حسن البناء کی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا جہاں ان کے والد نے بچپن میں ہی انہیں قرآن مجید حفظ کرادیا تھا۔گھریلو تعلیم وتربیت کے ساتھ انہیں محمودیہ کے ایک پرائمری اسکول ''مدرسۃ الرشاد الدینیہ'' میں داخل کرایا گیا۔ بعد میں انہیں مدرسہ الںداد یہ میں داخلہ دلایا گیا۔اسکول کی رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی و مذہبی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ 1920 میں مدارس اعدادیہ کے خاتمے کے بعد حسن البنانے دمنھور کے ٹیچرس ٹریننگ اسکول میں داخلہ لیا۔یہاں سے تین سال کا کورس کرنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم قاہرہ (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لیا اور 1927 میں یہاں سے فارغ ہوئے۔اسی سال انہیں اسماعیلیہ-انگریزوں کی چھاؤنی تھی اور ہر جگہ انگریزی اثرات دیکھے جاسکتے تھے-کے مدرسہ امیریہ (گورنمنٹ اسکول) میں استاد مقرر کردیا گیا۔

16.6.2 معلم وداعی

حسن البناء کو شرافت ونجابت خاندانی ورثے میں ملی تھی۔والد کی تعلیم وتربیت نے اس میں مزید نکھار پیدا کردیا۔ان کا فطری

رجحان بھی روحانیت کی جانب تھا اور یکے بعد دیگرے ایسے حالات بھی بنتے گئے کہ ان کی شب بے داریاں طویل ہوتی گئیں۔ مصری قوم خاص طور پر اور ملت اسلامیہ عمومی طور پر ان کی فکر کا محور بن گئیں۔ ابھی ان کی عمر صرف چودہ برس تھی کہ انہوں نے مسلمانوں میں مذہبی بے داری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے فروغ کے لیے حصافیہ سلسلے میں شمولیت اختیار کی۔ بعد ازاں جب قاہرہ منتقل ہوئے تو الجمعیۃ الحصافیہ الخیریہ کے نام سے ایک رفاہی انجمن قائم کی۔ اس انجمن کے توسط سے انہوں نے حالات کے سدھار کے لیے کوشش شروع کی۔ اپنے وقت کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک حصہ مطالعے اور تعلیم کے لیے اور دوسرا حصہ دعوت وتبلیغ کے لیے۔ انہوں نے لوگوں کو بتایا کہ اسلامی سماج کو جو برائیاں گھن کی طرح کھائے جارہی ہیں ان کا واحد علاج یہ ہے کہ مسلمان قرآن مجید، حدیث رسولؐ اور سیرۃ رسول کے زندگی بخش سرچشموں کی طرف رجوع کریں۔

ہمیں معلوم ہے کہ 1927 کے اواخر میں حسن البناء استاد بن کر اسماعیلیہ منتقل ہوگئے جو انگریزوں کی چھاؤنی تھی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے پہلے حالات کا جائزہ لیا۔ انہوں نے خود کو نہ صرف یہ کہ ایک کامیاب معلم کے طور پر تیار کیا بلکہ اصلاح ودعوت کے لیے ایک نئے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا جو اسماعیلیہ کے قہوہ خانے تھے اور جہاں اکثر وہ لوگ بیٹھا کرتے تھے جن کو مذہب اور مذہبیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ تدریس کے فارغ اوقات میں حسن البناء ان قہوہ خانوں کا رخ کرتے اور وہاں موجود لوگوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرتے۔ کچھ ہی دنوں بعد اسماعیلیہ میں ان کے ہم خیال نوجوانوں کا ایک گروپ تیار ہوگیا۔ اسماعیلیہ میں حسن البناء کا قیام اکتوبر 1933 تک (چھ برس) رہا، اس کے بعد ان کا تبادلہ دار الحکومت قاہرہ ہوگیا جہاں کچھ دنوں بعد اپنی دعوتی مصروفیات کے سبب انہوں نے معلمی سے استعفادے دیا۔

16.6.3 الاخوان المسلمون:

ہم پہلے ہی یہ جان چکے ہیں کہ حسن البناء کے زمانے کے مصر میں مسلمانوں کے سماجی ومذہبی حالات بہت خراب ہو چکے تھے۔ برائی اور بے حیائی کا ہر طرف بازار گرم تھا۔ حسن البناء کی تعلیم وتربیت جس ماحول میں اور جس انداز سے ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ ان حالات میں مطمئن نہ بیٹھتے بلکہ ان کو بدلنے اور سماج کو صحیح اسلامی خطوط پر لانے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ دمنہور کے زمانہ طالب علمی سے ہی حسن البناء نے اس طرح کی کوشش شروع کر دی تھی جب انہوں نے خود کو حصافی صوفی سلسلے سے جوڑا۔ بعد ازاں قاہرہ میں انہوں نے "الجمعیۃ الحصافیہ الخیریہ" قائم کر کے گویا ایک طرح سے اپنی تنظیمی صلاحیت کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ قاہرہ کی مساجد میں وعظ وتلقین کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔

البتہ حسن البناء نے دعوت کا اصل کام اور زیادہ منظم انداز میں اسماعیلیہ میں بطور معلم تقرر کے بعد شروع کیا۔ اسماعیلیہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں ہی حسن البناء نے اپنے آس پاس کے سماج اور اس میں موجود برائیوں کا بغور مطالعہ کیا تا کہ دعوت وتبلیغ کا جو کام وہ وہاں کرنا چاہتے تھے اس کے لیے ایک لائحۂ عمل مرتب کر سکیں چنانچہ انہوں نے اپنی دعوت کا آغاز قہوہ خانوں سے کیا اور بہت جلد انہیں اس میں کامیابی بھی ملنی شروع ہوگئی۔ صرف چند مہینوں کی کوشش کے بعد مارچ 1928 میں ان کے گھر پر چھ مخلص افراد نے باہم مل کر یہ عہد کیا کہ ان کا جینا مرنا اوران کی تمام تر تگ ودو کا محور ومرکز اسلام ہوگا۔ انہوں نے اپنے اس نئے بننے والے گروپ کے لیے نام "الاخوان المسلمون" منتخب کیا۔

اسماعیلیہ میں چھ برس قیام کے دوران حسن البناء اوران کے ساتھیوں نے اصلاح و دعوت کے کام کو نہایت خلوص اور تن دہی کے ساتھ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ایک سال کے اندر اسماعیلیہ میں الاخوان المسلمون نے ایک مسجد اور ایک مرکز کی بنیاد رکھ دی اور اس کی شاخیں سوئز کے علاقے اور اسکندریہ میں بھی قائم ہوگئیں۔ دارالحکومت قاہرہ میں بھی الاخوان کا ایک مرکز قائم ہو گیا اور 1933-1934 کے اوائل میں جب حسن البناء قاہرہ منتقل ہوئے تو ان کا استقبال کرنے کے لیے ہم خیال رفقاء کا ایک گروپ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ حسن البناء کے قاہرہ پہنچ جانے کے بعد الاخوان المسلمون کی سرگرمیوں میں بہت زیادہ تیزی آگئی اور اس کے دعاۃ اور مبلغین پورے مصر میں پھیل گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں اس تحریک نے پورے مصر میں اپنی جڑیں مستحکم کرلی۔

الاخوان المسلمون کی ابتدائی تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اپنے قیام کے فوراً بعد کے دنوں میں یہ تحریک ایک مذہبی اور سماجی تنظیم تھی جو مصر کے اندر مذہبی بیداری اور اصلاح کے عمل کے ذریعہ لوگوں میں اعلیٰ اسلامی اخلاق پیدا کرنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کے قیام کے ابتدائی دنوں میں سیاسی مقتدرہ نے اس تنظیم (تحریک) کے ساتھ کسی طرح کی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور اسے کھل کر کام کرنے دیا۔ البتہ 1936 کے بعد کے حالات میں جب اخوان کی قیادت نے فلسطین کے مسئلے کو لے کر عربوں کے مفادات کے حوالے سے بات کرنا شروع کی تو پہلی مرتبہ مصر کی سیاسی اشرافیہ نے اس کا نوٹس لینا شروع کیا۔ دوسری طرف اخوانی قیادت نے بھی جب فلسطین کے حوالے سے عرب امور میں دلچسپی لینا شروع کی تو اپنے مذہبی و سماجی اصلاح کے کردار کو زیادہ دنوں برقرار نہیں رکھ پائی اور دھیرے دھیرے سیاسی مسائل میں الجھتی چلی گئی۔

اخوان کی روز افزوں مقبولیت اور سیاسی امور میں اخوانی قیادت کی دلچسپی دو ایسے امور تھے جس نے مصر میں عملاً بااختیار انگریزوں کے کان کھڑے کر دیے۔ قاہرہ کے برطانوی سفارت خانے اور انگریز اعلیٰ حکام کی جانب سے مصری حکومت پر دباؤ پڑنے لگا کہ اخوان کی مقبولیت پر بند لگایا جائے۔ چنانچہ اس وقت کے مصری وزیر اعظم حسین سری پاشا نے الاخوان المسلمون کے دو ہفت روزہ اخبارون 'التعارف' اور 'الشعاع' اور ماہانہ رسالے المنار پر پابندی عائد کر دی، ان کا پریس ضبط کر لیا اور ملک بھر کے اخبارات کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ اخوان کی خبریں شائع نہ کی جائیں۔ اسی طرح یہ کوشش بھی کی گئی کہ اخوانی قیادت کو منتشر کر دیا جائے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران مصری حکومت کا رویہ حسن البناء اور ان کی تنظیم الاخوان المسلمون کے حوالے سے مزید سخت ہو گیا۔ حسن البناء اور کئی دیگر اخوانی قائدین کو اس دوران تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے قید و بند میں بھی رکھا گیا۔ اس بات کی بھی کوشش کی گئی کہ اخوان کی سرگرمیوں کو پوری طرح دبا دیا جائے لیکن اس میں انہیں کامیابی نہیں ملی۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد الاخوان المسلمون اور مصری حکومت کی باہمی کشمکش میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ خاص طور پر فلسطین میں اسرائیل کے ناجائز قیام کو لے کر اگر ایک طرف اخوانی قیادت انتہا پسندی کی طرف مائل ہوتی گئی تو دوسری طرف مصری حکومت پر انگریزوں اور دوسری طاقتوں کا دباؤ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا، نتیجتاً نقراشی پاشا (وزیر اعظم مصر) نے 8 دسمبر 1948 کو الاخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے بعد پورے مصر میں اخوانیوں کے خلاف حکومتی کارروائیاں شروع ہوگئیں اور بڑے پیمانے پر انہیں گرفتار کیا گیا۔ اسی دوران نقراشی پاشا ایک نوجوان کے ہاتھوں قتل ہوا (اس کا الزام اخوان پر ڈالا گیا)، جس کے بعد 12 فروری 1949 کو شبان المسلمین کے مرکز کے سامنے سڑک پر گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

حسن البناء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علم سے زیادہ عمل کے آدمی تھے۔ خود انہوں نے بھی ایک موقعے پر کہا تھا کہ "اصنف الرجال" (میں رجال کار تیار کرتا ہوں) اس لیے 43 برس کی مختصر عمر میں انہوں نے کوئی بڑا علمی سرمایہ تو اپنے پیچھے نہیں چھوڑا البتہ الاخوان المسلمون کو مضبوط بنیادیں ضرور فراہم کر دیں کہ نوے برس بعد آج بھی یہ عالم عرب کی سب سے زیادہ منظم، بڑی اور فعال تنظیم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صرف 22-20 برس کے عرصے میں وہ مصر کے اندر ایک عظیم ذہنی و فکری انقلاب برپا کرنے میں کامیاب رہے۔ حسن البناء نے اپنے پیچھے جو مختصر علمی سرمایہ چھوڑا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

1- **مذکرات الدعوۃ والداعیۃ (دعوت اور داعی کی ڈائری):** یہ ڈائری دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں ان کی اپنی سرگزشت ہے اور دوسرے حصے میں اخوان کی سرگرمیوں، پروگراموں اور رودادوں کا ذکر ہے۔

2- **رسائل الامام الشہید:** یہ استاذ حسن البناء کے لکھے ہوئے آٹھ رسائل کا مجموعہ ہے جن کے نام اس طرح ہیں (1) رسالة التعليم (2) رسالة الجهاد (3) دعوتنا فی طورٍ جدید (4) الرسائل الثلاث (5) بین الامس و الیوم (6) رسالة الموتمر الخامس (7) الاخوان المسلمون تحت رایة القرآن (8) مشکلتنا فی ضوء النظام الاسلامی۔

3- **خطب حسن البناء:** جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ امام حسن البناء کی تقریروں اور خطبوں کا مجموعہ ہے۔

4- **مقالات حسن البناء:** امام حسن البناء الاخوان المسلمون کے رفقاء اور کارکنوں کے لیے ہدایات اور مشورے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھ کر بھی دیتے تھے۔ اس مجموعے میں ان کے انہیں مختصر مقالات و مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

5- **الماثورات:** یہ مسنون دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے جسے حسن البناء نے ترتیب دیا تھا اور اس کے آخر میں ان کی ایک طویل دعا "ورد الرابطہ" کے نام سے جسے اخوانی کارکن نماز مغرب شروع کرنے سے پہلے مل کر پڑھتے ہیں۔

16.7 سید قطب

عالم عرب کی جدید اسلامی بیداری میں جن شخصیات کا کردار بہت ہی اہم ہے ان میں ایک نمایاں نام سید قطب کا ہے۔ بطور اسلامی دانشور اور فکری رہنما، ان کے اثرات عالم عرب کی نئی جدید تعلیم یافتہ نسل پر بہت زیادہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب عرب دنیا میں مادیت، دہریت اور اشتراکیت جیسے افکار و نظریات کا سیلاب آیا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بہت جلد پوری عرب دنیا خاص طور پر اس کا نوجوان طبقہ اس کی لپیٹ میں آ جائے گا، فکر و نظر کے اس سیلاب پر بند باندھنے اور اس کا مقابلہ اسی فکری سطح پر کرنے کی جن لوگوں نے کامیاب کوششیں کیں، سید قطب ان میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ حالانکہ بعض مغربی مفکرین اور اسکالروں کے تجزیات کی حمایت میں مسلم دنیا میں بھی 'اہل فکر و دانش' کا ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کے خیال میں سید قطب کی فکر اور تحریروں میں اسلامی انتہا پسندی کے عناصر موجود ہیں، جو اپنے مطالعہ کرنے والوں کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان پر یہ بھی الزام ہے کہ صرف عرب دنیا کے ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا کے انتہا پسند عناصر اپنے لیے فکری غذا سید قطب کے لٹریچر میں تلاش کرتے ہیں۔ بہر حال سید قطب ایک مثالی داعی، بے باک مبلغ، دانشور عالم، ممتاز ادیب اور بے لاگ ناقد کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں اور انہوں نے مسلمانوں کی خاص طور پر جدید تعلیم

یافتہ عربوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اس لیے ان کی شخصیت کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

16.7.1 خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی:

سید قطب کا اصل نام سید ہے، قطب ان کا خاندانی نام ہے، ان کے والد کا نام حاجی ابراہیم قطب تھا۔ ان کی پانچ اولاد میں (دو بیٹے تین بیٹیاں) سید قطب سب سے بڑے تھے، ان کے خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب سے ان کے ایک بزرگ ہجرت کر کے مصر آگئے اور یہاں بالائی مصر میں سکونت اختیار کی۔ ایک روایت -مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حوالے سے- یہ بھی ہے کہ اصلاً ان کا خاندان ہندوستان یا وسط ایشیا کا رہنے والا تھا جو کسی زمانے میں جزیرۃ العرب میں آباد ہو گیا تھا۔ بہرحال ان کا خاندان بالائی مصر کا ایک معزز اور دین دار گھرانہ تھا۔ سید قطب بالائی مصر کے ضلع اسیوط کے 'موشا' نامی گاؤں میں 1906 میں پیدا ہوئے۔ والدہ فاطمہ حسین عثمان کو چونکہ قرآن مجید سے بہت ہی گہرا تعلق تھا اس لیے بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس زمانے کے مصر کے دیندار گھرانوں میں یہ عام رواج تھا کہ بچوں کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کے حفظ سے ہوتا تھا۔ خاص طور پر اگر کوئی خاندان اپنے بچوں کو جامعہ ازہر جیسے مؤقر ادارے میں تعلیم دلانے کا خواہاں ہوتا تو اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے بچوں کو قرآن مجید کا حافظ بنائے۔

سید قطب کی تعلیم کے لیے ان کے والدین نے مدرسے کے بجائے اسکول کا انتخاب کیا اس کی وجہ یہ تھی اسکول کا تعلیمی نظام زیادہ منظم اور ماحول صاف ستھرا تھا۔ چھ سال کی عمر میں سید قطب کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے انتہائی محنت کر کے اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دس برس کی عمر میں مکمل قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔ بعد ازاں ان کے والدین گاؤں چھوڑ کر دارالحکومت قاہرہ آ گئے، اس طرح سید قطب کے لیے آگے کی تعلیم کے مراحل آسان ہو گئے۔ قاہرہ میں سید قطب کو 'تجہیزیہ دارالعلوم' میں داخل کرایا گیا۔ یہاں ان بچوں کو داخلہ دیا جاتا تھا جو دارالعلوم کالج (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) میں داخلہ لینے کے خواہش مند ہوتے تھے۔ 'تجہیزیہ دارالعلوم' میں تعلیم کی تکمیل کے بعد 1929 میں سید قطب نے دارالعلوم کالج میں داخلہ لیا۔ واضح ہو کہ اس زمانے میں دارالعلوم کالج قاہرہ میں جدید علوم وفنون کا اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ یہاں سے انہوں نے 1933/34 میں بی اے ایجوکیشن یا بی اے کی ڈگری ایجوکیشن میں ڈپلوما کے ساتھ حاصل کی۔

16.7.2 سید قطب کی عملی زندگی:

سید قطب دارالعلوم سے تعلیم کی تکمیل کے بعد کچھ دنوں مصر کے معروف علمی وادبی رسائل وجرائد سے وابستہ رہے جن میں الاہرام اور العالم العربی وغیرہ شامل ہیں۔ اس زمانے میں ان کی زیادہ توجہ عربی زبان وادب پر تھی اس لیے تنقید، افسانہ اور شاعری جیسی اصناف ادب میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔ کچھ دنوں تک دمیاط اور حلوان کے ابتدائی مدرسوں میں انہوں نے تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ 1939 میں سید قطب کو مصر کی وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف اسکولز مقرر کیا گیا۔ مصر کے تعلیمی نظام میں انسپکٹر آف اسکولز کا عہدہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اس لیے یہ گویا سید قطب کے لیے دنیاوی اعتبار سے ایک بڑی یافت (حصول) تھی۔ اس دوران ہی سید قطب کی الاخوان المسلمون سے قربت بڑھی اور انہوں نے اس تحریک کے منشور اور منہاج کا مطالعہ کیا۔ اس کے طریقہ کار اور اصول ومقاصد کو سمجھنے کی کوشش کی، گویا ایک طرح کی اخوان کے ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی اسی وقت استوار ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ہی ان کی مشہور زمانہ کتاب ''العدالۃ الاجتماعیۃ فی

الاسلام'' 1947 میں منظر عام پر آئی اس کا اردو ترجمہ ''اسلام میں عدل اجتماعی'' (ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی) اور انگریزی ترجمہ Social Justice in Islam کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔

اسی دوران جب کہ وہ وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز تھے۔ 1948 کے اوائل میں مصری حکومت کی جانب سے انہیں امریکہ بھیجا گیا جہاں ان کا قیام عرصہ دو برس سے زیادہ رہا اور اس دوران انہوں نے نہ صرف یہ کہ امریکی نظام تعلیم و تربیت کا مطالعہ کیا۔ جو ان کی مفوضہ ذمہ داری تھی۔ بلکہ اسی دوران انہیں اس کا بھی موقع ملا کہ وہ مغرب بالخصوص امریکہ کے معاشرے اور تہذیب و ثقافت کو قریب سے دیکھیں اور ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اس کا اظہار ان کی کتاب ''امریکا التی رأیت'' (امریکہ جسے میں نے دیکھا) میں انہوں نے بہت اچھی طرح کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کا تأثر یہ بھی تھا کہ مصر جس مشرقی تہذیب و ثقافت کا حصہ ہے اور یہاں جس طرح کے حالات اور ماحول ہیں ان میں امریکی نظام تعلیم و تربیت مصری معاشرے کے لیے موزوں نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اسلام کے مشرقی نظام اور تہذیب و ثقافت کا مقابلہ امریکی قیادت والے مغربی نظام اور اس کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ کیا ہے۔

امریکہ سے واپسی کے بعد سید قطب کی الاخوان المسلمون کی تحریک اور کاموں میں دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی اور 1951 کے اوائل میں انہوں نے باضابطہ طور پر الاخوان المسلمون میں شمولیت اختیار کرلی۔ انہیں اخوان کی مجلس عاملہ کا رکن اور شعبہ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنایا گیا، بعد میں وہ اخوان کے جریدے ''الاخوان المسلمون'' کے ایڈیٹر بھی منتخب ہوئے۔ اسی دوران 1952 میں مصر سے شاہ فاروق کی موروثی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ آزاد حکام جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی، شروع کے دنوں میں انہوں نے اخوان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ اخوان پر 1948 سے جو پابندی عائد تھی اسے ختم کردیا گیا اور انہیں کام کرنے کی آزادی دی گئی۔ البتہ مصر میں الاخوان المسلمون کے لیے یہ مہلت عمل بہت مختصر ثابت ہوئی، بہت جلد آزاد حکام جن کی قیادت جمال عبدالناصر کے ہاتھ میں تھی انہوں نے اخوان پر شکنجے کسنے شروع کیے۔ اسی دوران اکتوبر 1954 میں جنرل ناصر پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس کا الزام اخوان پر عائد کیا گیا اور سید قطب شہید سمیت الاخوان المسلمون کی اعلیٰ قیادت کو گرفتار کرکے جیل میں ڈال دیا گیا۔ انہیں 15 سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ 1946 میں عراق کے اس وقت کے صدر عبدالسلام عارف نے اپنے دورۂ مصر کے دوران صدر (جنرل) ناصر سے سید قطب کی رہائی کی درخواست کی، جس کے بعد انہیں رہا کردیا گیا۔ لیکن اس رہائی کے ایک سال کے اندر ہی سید قطب کو دوبارہ گرفتار کرلیا گیا اور اس بار ان پر حکومت کا تختہ پلٹنے کا الزام عائد کیا گیا اور ان کی کتاب 'معالم فی الطریق' کی ایک عبارت:

''جس طرح اسلام کے صدر اوّل میں اسلامی معاشرہ ایک مستقل اور جداگانہ معاشرے کی صورت میں ترقی و نمو کے فطری مراحل طے کرتا ہوا بام عروج کو پہنچا تھا اسی طرح آج بھی ویسا ہی صحیح اسلامی معاشرہ وجود میں لانے کے لیے اس طریق کار کو اختیار کیا جانا لازم ہے۔ اس اسلامی معاشرے کو اردگرد کے جاہلی معاشروں سے الگ رہ کر اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا۔''

کو اس بغاوتی انقلاب کی بنیاد قرار دیا۔ اور دو سال قید و تشدد کے بعد 25 راگست 1966 میں سید قطب اور ان کے دو ساتھیوں کو موت کی سزا دے دی گئی۔

16.7.3 علمی وادبی کارنامے:

سید قطب کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے علمی وادبی سفر کے دوران مختلف مراحل سے گزرے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی ادبی زندگی کا آغاز بچوں کے لیے تاریخی کہانیاں لکھ کر کیا اور ایک سکہ بند ادیب کے طور پر مصر اور تمام عالم عرب میں اپنی حیثیت کو تسلیم کرایا۔ آگے چل کر جب انہوں نے سیاست وصحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ان کی حیثیت ایک ایسے سیاسی وسماجی ناقد کی بنی جو اپنے اصولوں سے نہ تو سمجھوتا کرتا ہے اور نہ ہی انہیں توڑتا ہے۔ زندگی کے آخری مرحلے میں حالانکہ ان کا زیادہ تر وقت قید میں گزرا، لیکن مصری سماج میں ان کی شناخت ایک اسلامی مفکر، داعی اور مفسر قرآن کے طور پر قائم ہوئی۔ انہوں نے 22 سے زیادہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں سے چند کا یہاں پر مختصر تعارف دیا جارہا ہے۔

1- **مشاہد القیامۃ فی القرآن (قرآن میں مناظر قیامت):** سید قطب کی یہ شہرہ آفاق کتاب ہے۔ اردو سمیت دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس میں انہوں نے قیامت کے مناظر کا بیان کیا ہے جو ان کے مطابق قرآن مجید کی 114 سورتوں میں سے 80 سورتوں میں 150 مقامات پر بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں جنت ودوزخ وغیرہ کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے کہ انہیں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب عربی ادب کا بھی ایک شاہکار ہے۔

2- **التصویر الفنی فی القرآن:** اس کتاب میں سید قطب نے قرآن کے ادبی محاسن کو اجاگر کیا ہے۔ اور انہوں نے قرآن کی جادو بیانی، حتی تخیل، نظم کلام، قرآنی قصوں، قرآن کے انسانی نمونوں، قرآن کی وجدانی منطق اور قرآن کے طریقہ دعوت وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

3- **العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام:** یہ کتاب اسلام کے عادلانہ سماجی نظام سے متعلق ہے۔ اس میں سید قطب نے اسلام کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے اس کے سماجی عدل پر روشنی ڈالی ہے۔ سید قطب اس میں ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جو مغرب سے مرعوبیت کا شکار ہیں، جنہیں مغرب کی ہر ادا اچھی لگتی ہے اور جو اسلام کی ایک ایک چیز میں کیڑے نکالنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس کتاب کے دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے ''اسلام میں عدل اجتماعی'' کے نام سے کیا ہے۔

4- **معالم فی الطریق:** یہی وہ کتاب ہے جس کی بعض عبارتوں کو بنیاد بنا کر سید قطب کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس کتاب میں سید شہید نے انسانیت کی زبوں حالی، اقدار کے فقدان اور روحانی دیوالیہ پن پر ماتم کیا ہے اور قاری کو ایک ایسی قیادت کی ضرورت کا احساس دلایا ہے جو جدید ترقیات کی نہ صرف حفاظت کرنے والی ہو بلکہ اسے مزید آگے بڑھائے اور جو انسانیت کے سامنے اعلیٰ اخلاق واقدار کی ایسی مثال پیش کرے جس سے اس وقت کی دنیا ناآشنا تھی۔ آخر میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے ایسا نمونے کا نظام اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی دوسرا نظام پیش نہیں کرسکتا۔ اس کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے جسے ''جادہ ومنزل'' کے نام سے مولانا خلیل حامدی نے کیا ہے۔

5- **تفسیر ''فی ظلال القرآن'':** یہ سید قطب کا شاہکار ہے۔ عربی زبان میں یہ تفسیر آٹھ (8) جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اردو میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ خلیل حامدی نے اس کی چھ خصوصیات بیان کی ہیں:

(i) بلند پایہ ادبی اسلوب جس میں سید قطب اکثر قدیم مفسرین اور محدثین سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

(ii) تمام معروف تفاسیر سے انہوں نے استفادہ کیا ہے اور ان سے اخذ کردہ معلومات کو اپنی تفسیر میں اس عالمانہ انداز سے سمو دیا ہے کہ یہ تفسیر ادبی مقالات کا مجموعہ نہیں بلکہ معلومات کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے۔

(iii) اسرائیلیات سے یہ تفسیر مکمل طور پر خالی ہے۔

(iv) معتزلہ، خوارج اور اشاعرہ، ماتریدیہ اور فقہ کے مختلف مکاتب فکر کے نزاعات سے جو عام عربی تفسیروں کے اندر ملتے ہیں، یہ تفسیر خالی ہے۔

(v) پوری جامعیت اور تفصیل کے ساتھ ہر بحث کو ادا کیا ہے، اس کے بعد کسی اور کتاب کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

(vi) پوری تفسیر کے اندر ایک ایسی شفاف اور پاکیزہ روح جلوہ گر نظر آتی ہے جو یقین واذعان کی دولت اور ایمان وعقیدہ کی گہرائی اور صبر وعزیمت کی نعمت سے لبریز ہے۔ اس چیز نے تفسیر کو ایک متحرک زندگی اور رواں دواں اسلامی تحریک کی کتاب ہدایت کی شکل دے دی ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ سید رشید رضا کے جاری کردہ اخبار کا نام بتائیں، یہ اخبار انھوں نے کب جاری کیا؟

2۔ حسن البناء کی قائم کردہ تنظیم کا نام بتائیں، یہ کس سن میں قائم ہوئی؟

3۔ سید قطب کی مشہور زمانہ تفسیر کا نام بتائیں۔

16.8 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اس اکائی میں جدید مسلم دنیا کے ان اکابر مفکرین ومصلحین کا تعارف کرایا گیا ہے جو اتحاد امت اور اتحاد اسلامی کی اس فکر سے وابستہ رہے جس کے سرخیل سید جمال الدین افغانی ہیں۔ اس میں شک نہیں جمال الدین افغانی کی شخصیت عبقری اور مختلف الجہات تھی، جو بھی ان کے حلقہ اثر میں داخل ہوا اس نے ان کی کسی نہ کسی خصوصیت میں امتیاز حاصل کیا۔ حالانکہ اس اکائی میں جمال الدین افغانی کے علاوہ صرف انہیں شخصیات کا تعارف کرایا گیا ہے جو مصر اور لبنان سے متعلق ہیں۔ جمال الدین افغانی نے ایک روایت پسند معاشرے میں آنکھیں کھولنے کے باوجود روشن خیالی کے دیے پوری مسلم دنیا میں روشن کیے اور اتحاد اسلامی کے پیغام کو آخر دم تک عام کرتے رہے۔ ان کے شاگرد محمد عبدہ نے روشن خیالی کے ساتھ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کو اپنا مشن بنایا۔ سید رشید رضا نے افغانی اور محمد عبدہ دونوں سے استفادہ کیا تھا، انہوں نے افغانی کے اتحاد اسلامی اور عبدہ کے اصلاحی مشن دونوں کو آگے بڑھاتے ہوئے جدید ذہن کے شکوک وشبہات بھی دور کرنے کی کوشش کی اور اس طرح دفاع اسلامی کا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ حسن البناء عالم عرب کی سب سے بڑی اور منظم تنظیم الاخوان المسلمون کے بانی رہنما اور عظیم قاصدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔ انہوں نے مصری اور عرب نوجوانوں میں اسلامی بیداری پیدا کر کے انہیں

مغربیت کا شکار ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب کہ سید قطب نے الاخوان المسلمون کے پلیٹ فارم سے عرب نوجوانوں میں ایک ایسی انقلابی اسلامی فکر پیدا کی جس سے اختلاف تو ممکن ہے لیکن جس کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

16.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ سید جمال الدین افغانی کی اصلاحی کوششوں پر ایک مضمون لکھیں۔

2۔ العروۃ الوثقی کے اغراض و مقاصد کا جائزہ لیں۔

3۔ مفتی محمد عبدہ کی خدمات پر ایک نوٹ لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ سید رشید رضا کے تصنیفی کارناموں کو بیان کریں۔

5۔ حسن البناء کی حیات و خدمات کا تعارف کرائیں۔

6۔ سید قطب کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیں۔

16.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ تاریخ فکر اسلامی: محمد اجتباء ندوی

2۔ نئی عرب دنیا: یونس نگرامی

3۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (سوم و چہارم): ثروت صولت

4۔ جادہ و منزل: خلیل احمد حامدی

5۔ حسن البناء کی ڈائری: حسن البناء

6۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے معمار: علی رہنما

اکائی 17: عبدالرحمان کواکبی، شکیب ارسلان، علی شریعتی، آیت اللہ خمینی

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد مسلم دنیا کے مفکرین و مصلحین میں سے چار اہم شخصیات کا تعارف کرانا ہے ان میں سے دو (عبدالرحمان کواکبی اور شکیب ارسلان) کا تعلق شام و لبنان کے مردم خیز علاقے سے ہے۔ عبدالرحمان کواکبی کو اگر جدید عرب قومیت کے اولین بنیاد کاروں میں شمار کیا جاتا ہے تو شکیب ارسلان جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی کی روایت کا حصہ رہے ہیں۔ دو دیگر شخصیات سرزمین عجم ایران سے متعلق ہیں اور جدید ایران میں اسلامی فکر و عمل کے بنیادی ستون شمار کیے جاتے ہیں۔ علی شریعتی نے اگر ایک طرف اسلامی انقلاب کے لیے فکری بنیادیں استوار کیں تو امام خمینی نے اسے عملی جامہ پہنا کر حقیقت میں بدلنے کا کام کیا۔ امید ہے کہ اس اکائی کے مطالعے سے طلبہ کو عالم اسلام کے جدید فکری رجحانات اور رویوں کو سمجھنے اور جاننے کا موقع ملے گا۔

17.2 تمہید

جدید مسلم دنیا پر مذکور چاروں مسلم رہنماؤں کا اثر بہت زیادہ ہے۔ عبدالرحمان کواکبی عرب قوم پرستوں کے ہیرو باور کیے جاتے ہیں تو امیر شکیب ارسلان نے علم و ادب سے وابستہ جدید عربی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ علی شریعتی کو ایرانی اسلامی انقلاب کو فکری غذا فراہم کرنے والے مفکر و معلم کی حیثیت حاصل ہے تو امام خمینی مذہبی قیادت کا وہ حوالہ ہیں جس نے دین و دنیا کی تفریق کو مٹا کر علماء کو میدان سیاست میں لا کھڑا اور یہ ثابت کیا کہ کوئی انقلاب مذہبی بنیادوں پر بھی کامیاب ہو سکتا ہے۔

17.3 عبدالرحمان کواکبی

اٹھارہویں اورانیسویں صدی عیسوی کے دوران دنیا بھر میں مسلمانوں کا زوال، پسماندگی، معاشی بدحالی، سیاسی بدانتظامی اور علمی و تعلیمی معیار میں گراوٹ جیسے امور اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی وعلمی قیادت اس دوران عمومی طور پر ناکارہ اور کم کوشی کا شکار ہوچکی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسی دوران مسلم دنیا کے مختلف گوشوں اور خطوں میں چند ایسی آوازیں بھی اٹھتی رہیں جنہوں نے اپنے طور پر اس کی بھرپور کوشش کی کہ مسلمانوں کا زوال ختم ہواور وہ پسماندگی اور بدحالی سے نکل کر آسودگی وخوشحالی کے میدانوں میں قدم رکھیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہی وہ چند منتشر اور بکھری ہوئی کوششیں تھیں جن کی خاکستر سے مسلم دنیا میں احیاء و بیداری کی تحریکات نے جنم لیا اور انہیں کے سبب مسلم دنیا آزادی کے نئے دور میں داخل ہوئی۔ شامی عالم و دانشور اور سیاسی رہنما عبدالرحمان الکواکبی کا شمار عہد جدید کے ان گنے چنے مسلم دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے امت اسلامیہ کو زوال وپستی سے نکالنے اور اتحاد وترقی کے راستے پر ڈالنے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں صرف کیں۔

17.3.1 ابتدائی زندگی

عبدالرحمان الکواکبی کا تعلق شام کے مشہور شہر حلب سے تھا۔ ان کا خاندان حلب کے معروف معزز، علم دوست اور دولتمند خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، چونکہ نسبی طور پر بھی ان کا تعلق اللہ کے رسولؐ کے اہل بیت سے تھا اس لیے لوگوں میں ان کا احترام بہت زیادہ تھا۔ سید عبدالرحمان 1855 میں حلب (شام) جو ان دنوں عثمانی حکومت کا حصہ تھا، میں پیدا ہوئے۔ (پروفیسر اجتباء ندوی نے ان کی تاریخ پیدائش 1265 مطابق 1848 لکھی ہے) ان کا گھرانہ ایک ممتاز علمی گھرانہ تھا اور حلب میں ایک مدرسہ ''المدرسۃ الکواکبیۃ'' کے نام سے اس کے اہتمام میں چلتا تھا۔ اس مدرسے کا نصاب تعلیم مصر کے جامعہ ازہر کے مطابق تھا۔ عبدالرحمان کواکبی کے والد اس مدرسے کے علاوہ جامع اموی میں بھی درس دیتے تھے اور اپنے زمانے میں حلب کے نامور عالم دین تھے۔ البتہ عبدالرحمان کواکبی کے والدین (پہلے والدہ اور پھر بعد ازاں والد) ان کی کم عمری میں ہی اس دارفانی سے رخصت ہوگئے اس لیے ان کی پرورش اور تعلیم وتربیت ان کی خالہ کے زیرسایہ ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم خاندانی مدرسے ''مدرسہ کواکبیہ'' میں ہوئی۔ ان کے والد جب تک زندہ رہے اپنے بیٹے کو الگ سے گھر پر بھی کچھ پڑھاتے تھے، سید عبدالرحمان کواکبی نے ابتدائی تعلیم کے بعد عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ ریاضی اور سائنس جیسے علوم میں بھی مہارت حاصل کی۔ اسی طرح انہوں نے فارسی اور ترکی زبانیں بھی سیکھیں تاکہ ان زبانوں میں اسلامی علوم وادب کا جو سرمایہ ہے اس سے بھی کماحقہٗ مستفید ہوسکیں۔ سید عبدالرحمان کواکبی کو علم تاریخ سے خاص لگاؤ تھا اور اسلامی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں ان کے مطالعہ میں رہ چکی تھیں۔ عثمانی سلطنت کے قوانین کا انہوں نے خصوصی مطالعہ کر رکھا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنی طالب علمی کی زندگی سے ہی مختلف ملکوں، براعظموں اور قدموں کے حالات، پس منظر اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس نے بعد کے زمانے میں انہیں نہ صرف عربوں بلکہ دیگر اقوام عالم کے احوال و ظروف سے متعلق اپنا ذہن بنانے اور ایک رائے قائم کرنے میں مدد کی۔

17.3.2 عملی زندگی :

عبدالرحمان الکواکبی کی زندگی کے ابتدائی احوال کے مطالعے کے دوران ہم یہ جان چکے ہیں کہ ان کا خاندان حلب (شام) کا ایک معزز، باا ثر اور ذی علم خاندان تھا۔اس خاندان کا شمار حلب کے اشراف میں ہوتا تھا،اس لیے رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد عملی زندگی کے آغاز کے لیے ان کے پاس مواقع کی کمی نہیں تھی، چنانچہ انہوں نے مختلف جگہوں پر الگ الگ حیثیتوں سے الگ الگ کام کیے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شروع کے دنوں میں انہوں نے حلب کے سرکاری اخبار میں کام کیا،اس طرح انہیں عملی زندگی کے آغاز میں ہی صحافت کا تجربہ حاصل ہوگیا جوان کی زندگی بھر کام آتا رہا۔اس کے بعد انہوں نے حلب کے محکمۂ شرعیہ میں ملازمت کرلی جس کی وجہ سے انہیں سرکاری کام کاج کے طور طریقوں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملی۔ بعدازاں عبدالرحمان الکواکبی حلب کی بلدیہ (میونسپل کارپوریشن) سے وابستہ ہوگئے اور میونسپل پریزیڈنٹ (میئر) کے مددگار بنائے گئے۔البتہ ان دنوں عثمانی سلطنت میں بدعنوانی جس طرح عام تھی اور انتظام حکومت میں جس طرح کا بگاڑ در آیا تھا اس میں عبدالرحمان الکواکبی کے لیے سرکاری ملازمت کرنا مشکل ہوگیا،لہٰذا انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور حلب سے ''الشہباء'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس کا مقصد نظام حکومت کے بگاڑ کو اجاگر کرنا اور مظلوموں کی آواز کو اٹھانا تھا۔اس کے ساتھ ہی عبدالرحمان الکواکبی نے تجارت کے میدان میں بھی قدم رکھا۔اس کا بڑا فائدہ انہیں یہ ہوا کہ ان کا رابطہ عام لوگوں سے بہت زیادہ بڑھ گیا اور انہیں عام انسانی زندگی کے حالات،مسائل اور مشکلات کو جاننے اور سمجھنے کا براہ راست موقع ملا۔ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سید عبدالرحمان الکواکبی کا تعلق حلب کے ایک شریف اور ذی وجاہت خاندان سے تھا،اس لیے حلب شہر کے ضرورت منداور مظلومین اپنی مشکلات اور مسائل کو لے کر ان کے پاس مشورے کے لیے آتے تھے۔عبدالرحمان الکواکبی ان کی ضرورتوں کو سنتے اور اپنے طور پر ان کے مسائل کے حل میں جتنی مدد ہوسکتی کرتے تھے،خاص طور پر مظلومین کی دادرسی کے لیے کوئی بھی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حلب کے ارباب حل وعقد میں سے بہت سارے لوگ ان کے مخالف ہوگئے خاص طور پر والی حلب (حلب کا گورنر) عارف پاشا ان کا سخت مخالف ہوگیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عارف پاشا کے غلط کاموں پر آواز اٹھائے اور دارالخلافہ تک انہیں پہنچائے۔ عارف پاشا نے اس کا بدلہ ان سے اس طرح لیا کہ کچھ جعلی کاغذات ان کی جانب منسوب کردیے اور ان پر الزام یہ عائد کیا کہ وہ حلب شہر کو کسی اجنبی طاقت کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ملک دشمنی اور غداری کا یہ الزام ایسا تھا کہ اس جرم میں انہیں فوری طور پر گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ان پر مقدمہ چلایا گیا لیکن چونکہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا اس لیے عدالت سے انہیں باعزت بری کردیا گیا اور چونکہ گورنر حلب عارف پاشا نے انہیں فرضی مقدمے میں پھنسایا تھا اس لیے اس کی پاداش میں اسے حلب کی گورنری سے ہاتھ دھونا پڑا۔

عبدالرحمان الکواکبی کے مخالفین میں حلب کے بعض نام نہاد شرفاء بھی تھے،ان میں نمایاں نام ابوالہدیٰ الصیادی کا ہے جو ان کی عزت وشرف پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کی وجہ سے بھی وہ بعض مقدمات میں ماخوذ کو اور انہیں کاروبار میں بڑے خسارے کا سامنا کرنا پڑا البتہ الکواکبی ان تمام مخالفتوں کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔

17.3.3 اوصاف اور خدمات:

سید عبدالرحمان کواکبی گوناگوں صفات کے حامل تھے۔ایک ایسے وقت میں جب پوری دنیا اور خاص طور پر جزیرہ نمائے عرب میں

مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا، انہوں نے نہ صرف یہ کہ عربوں اور مسلمانوں کے زوال و پسماندگی کے اسباب تلاش کرنے کی کوشش کی بلکہ ان کے انحطاط، پسماندگی، اقتصادی بدحالی اور سیاسی بدنظمی کے گہرے مطالعے کے بعد اپنے تئیں اصلاح حال کی تجاویز اور فارمولے بھی پیش کیے۔ اپنے وسیع مطالعے اور تجربے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بیداری آئے اور ان کے تعلیمی معیار کو بہتر بنایا جائے۔ اپنے مضامین اور تجزیوں میں انہوں نے عربوں اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ اعتدال اور بہتر حکمت عملی کے ذریعہ ہی جبر و طاغوت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اور تعلیم و ثقافت اس کا بہترین وسیلہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ بیداری اور شعور پیدا ہوتا ہے۔ بعد کے زمانے میں ان کے انہیں نظریات کو عرب قوم پرستی کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا، حالانکہ انہوں نے بذات خود عرب قومیت سے زیادہ اتحاد اسلامی پر زور دیا ہے البتہ ان میں اور جمال دین افغانی میں فرق یہ ہے کہ افغانی کے یہاں گھن گرج اور زوردار بہاؤ پایا جاتا ہے جب کہ کواکبی اتحاد اسلامی کا راستہ تعلیم و ثقافت، میانہ روی اور اسلامی شعور کی بیداری میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے سوانح نگار احمد امین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ذرہ برابر بھی سقم نہیں پایا جاتا تھا۔ لفظ ادا کرنے سے پہلے اسے خوب اچھی طرح ناپ تول لیتے تھے۔ حتیٰ کہ سلام کا جواب بھی سوچ سمجھ کر دیتے تھے۔ گفتگو میں بڑا توازن تھا۔ کوئی اگر قطع کلامی کر دیتا تو خاموش ہو جاتے اور اس کی پوری بات سن کر پھر اپنی گفتگو مکمل کرتے۔ بڑے بے نیاز اور بے لوث تھے۔ انہیں کسی عہدے اور منصب کا لالچ نہ تھا، قول و عمل میں بڑی جرأت اور بہادری کا ثبوت دیتے تھے خواہ اس کی وجہ سے جیل جانے، جلاوطنی کی ابتلا اور مال و دولت کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ وہ خوددار و غیرت مند ہونے کے ساتھ ساتھ غریبوں اور بے کسوں سے انتہائی انکساری اور تواضع سے ملتے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے۔ بہت متوازن، سنجیدہ، ہمدرد اور عقیدہ و اصول کی خاطر ہر قربانی اور ایثار کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے۔'' (بحوالہ تاریخ فکر اسلامی، اجتباء ندوی)

ان اخلاق و صفات کا اثر ان کی پوری زندگی میں رچا بسا ہوا تھا چنانچہ اپنے مقصد کے حصول اور اپنی دعوت کے فروغ کے لیے وہ ہمیشہ متحرک و فعال رہے۔ اس کے لیے انہوں نے دو طرح سے تیاری کی تھی:

اول انہوں نے مسلمانوں کے ماضی و حال کی تاریخ سے گہری واقفیت حاصل کی خاص طور پر ان کے زمانے میں شائع ہونے والی کتابوں اور اخبارات و رسائل میں مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ شائع ہوتا تھا، ان کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ دوسرے انہوں نے مسلم دنیا کے بیشتر علاقوں اور ملکوں کا دورہ کر کے ان کے حالات، مشکلات اور مسائل کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ انہوں نے ان کی تاریخ سے واقفیت کے علاوہ ان کے اقتصادی حالات، معاشی و معدنی وسائل، سماجی، فکری اور سیاسی تحریکات کا مطالعہ کیا۔ مشرقی افریقہ، مغربی ایشیا، جزیرہ نمائے عرب کا سفر کیا، قبیلوں کے سرداروں اور بااثر شخصیات سے ملاقاتیں کیں، ہندوستان کا بھی سفر کیا، اس کے بعد مصر میں قیام کیا۔ مراکش کے سفر کا ارادہ کر رہے تھے کہ آخری سفر کا وقت آن پہنچا اور 1902 کو ان کا انتقال ہو گیا۔

سید عبدالرحمان کواکبی نے مطالعے، تجربے اور مشاہدے سے مسلمانوں کے حالات و ظروف کے حوالے سے جو نتائج اخذ کیے تھے اور ان کی اصلاح کے لیے جس طریقہ کار کو وہ کارگر سمجھتے تھے، ان کو وہ اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنی ان تحریروں کو حذف و اضافے کے ساتھ دو کتابوں کی شکل میں شائع کیے۔ ان میں سے ایک کا نام ''طبائع الاستبداد'' ہے اور دوسری کا

نام ''ام القریٰ'' ہے۔ اپنے زمانے میں ان دونوں کتابوں نے عرب دنیا پر غیر معمولی اثرات چھوڑے اور آج بھی اس زمانے کے عرب ذہن و دماغ کو سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ذیل میں ان دونوں کتابوں کا تعارف پیش کیا جارہا ہے، اس کا زیادہ تر حصہ پروفیسر یونس نگرامی کی کتاب ''نئی عرب دنیا'' سے ماخوذ ہے۔

1۔ طبائع الاستبداد: سید عبدالرحمان کواکبی نے اپنی کتاب طبائع الاستبداد میں سب سے پہلے استبداد کی تعریف بیان کی ہے کہ استبداد کیا ہوتا ہے؟ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ استبداد ایک ایسی مطلق العنان حکومت ہے جو حساب کتاب اور جزا و سزا کے کسی خوف اور اندیشے کے بغیر رعایا اور عام لوگوں پر حکومت کرتی ہے۔ اس طرح کی حکومت کا کوئی قانون نہیں ہوتا اور نہ ہی عام لوگوں کی مرضی کو حکومت کے معاملات میں کسی طرح کا دخل حاصل ہوتا ہے۔ کواکبی نے طبائع الاستبداد میں استبداد اور مذہب کے تعلق اور گٹھ جوڑ پر بھی بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے اور بعض فرانسیسی دانشوروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ مذہبی استبداد سے سیاسی استبداد پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کے ذہن و دماغ میں معبود حقیقی اور دنیوی حکام کا تصور خلط ملط ہو جاتا ہے اور انہیں یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ حقیقی عزت اور تعظیم کا مستحق کون ہے؟

طبائع الاستبداد میں عبدالرحمان کواکبی نے اس امر سے بھی بحث کی ہے کہ استبدادی حکومتیں علم کی روشنی سے کیوں ڈرتی ہیں؟ انہوں نے بڑی ہی تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ایک خودسر اور جابر حاکم حقیقی علم سے ڈرتا ہے۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ رعایا اور عام لوگ جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہیں۔ کیونکہ جہالت جتنی زیادہ ہوگی فرماں روائی میں اتنی ہی زیادہ وسعت ہوتی چلی جائے گی۔ اس سلسلے میں کواکبی نے اپنی اس رائے اظہار بھی کیا ہے کہ ایک خودسر حاکم ادب (لٹریچر) اور مذہبی علوم سے ہرگز نہیں ڈرتا بلکہ ان علوم سے وہ استبداد کی حمایت اور تائید کا کام لیتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں وہ مذہبی علماء کے منہ میں چند نوالے ڈال کر ان کا منہ بند کر دیتا ہے اور پھر ان کی زبان وقلم سے وہی باتیں نکلتی ہیں جو اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خودسر وخودرائے حاکم کی جان ہمیشہ اس بات سے نکلتی ہے کہ عقلی علوم یعنی فلسفہ، حقوق الامم، علوم سیاست وسماجیات اور علم تاریخ وغیرہ کی اشاعت ہو کیونکہ ان علوم کے فروغ واشاعت سے عوام کے اندر بیداری پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ کواکبی کے مطابق استبداد اس طرح کے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ عوام کا ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جائے اور لوگ خوف کی نفسیات میں گرفتار ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان باہمی تعاون میں کمی آجاتی ہے اور استبداد کے خلاف کوئی بھی تحریک کامیاب نہیں ہو پاتی۔

عبدالرحمان کواکبی نے طبائع الاستبداد میں یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ اکثر اوقات استبدادی نظام کا مقابلہ طاقت وقوت سے کرنا بے سود ہوتا ہے بلکہ استبداد کے مقابلے میں اپنی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نرمی اور تدریج کے ساتھ اس کی برائیوں کے ازالے کی کوشش کی جائے۔ ان کے خیال میں اس کا بہترین طریقہ عام لوگوں کی تعلیم وتہذیب ہے۔ طاقت وقوت کے استعمال کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بڑے پیمانے پر وسائل اور صلاحیتوں کی تباہی و بربادی ہوتی ہے جب کہ اعتدال اور نرمی، میانہ روی اور نرم گوئی اور بہتر حکمت عملی کے ذریعہ حق اور عدل وانصاف کا راستہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کواکبی کے خیال میں استبدادی نظام کے خلاف کسی بھی تحریک کے کارگر اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے چلانے والوں کے ذہن میں متبادل نظام پہلے سے واضح ہو۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ عام لوگوں میں سیاسی بیداری اور اسلامی شعور کا پیدا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہی وہ بنیادی چیزیں ہیں جو کامیابی وکامرانی کی

طرف لے جاتی ہیں۔

کواکبی کی پوری کتاب میں موجود مباحث ان کے خلوص، عوامی ہمدردی اور اسلامی غیرت ومحبت کو نمایاں کرتے ہیں البتہ کتاب کے تمام تر مباحث بنیادی طور پر نظریاتی ہیں عملیت اکثر جگہوں پر مفقود نظر آتی ہے۔

2- ام القریٰ: سید عبدالرحمان کواکبی کی دوسری کتاب ''ام القریٰ'' ہے۔ یہ کتاب ان کی عبقریت، عظمت، وسعت مطالعہ ومشاہدہ اور معلومات کا شاہکار ہے۔ اس کتاب میں وہ امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص ایک ماہر حکیم کی طرح کرتے ہیں۔ اس میں وہ مسلمانان عالم کی سیاسی بیماری اور اس کے وجوہ واسباب کو معلوم کرتے ہیں اور پھر پوری بیماری اور اس کے علاج کو ایک افسانوی ڈرامے کی شکل میں عام لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے مکہ مکرمہ (یعنی ام القریٰ، کتاب کا نام بھی یہیں سے ماخوذ ہے) میں ایک ایسی انجمن کے قیام کا نقشہ وخاکہ پیش کیا ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے نمائندے شامل ہیں۔ اس اسلامی انجمن کا اجلاس ام القریٰ مکہ مکرمہ میں ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے نمائندے اس اجلاس میں شریک ہوتے ہیں اور سر جوڑ کر مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات پر نہ صرف یہ کہ بحث وگفتگو اور غور وخوض کرتے ہیں۔ اجلاس میں اس انجمن کے صدر کا نام مکی (فرضی) ہے جب کہ سکریٹری سید فراتی (کواکبی) ہے۔ اجلاس میں شریک ہر نمائندہ اپنی بات اور اپنے خیالات کا اظہار پوری طرح کھل کر کرتا ہے، ان کی گفتگو اور تجزیوں کا خلاصہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے:

☆ مسلمانوں نے اپنے آپ کو مجبور محض قرار دے کر خود کو دنیا اور امور دنیا سے کنارہ کش کر لیا ہے، انہوں نے سعی وعمل کی تمام کوششیں چھوڑ دی ہیں۔

☆ مسلمانوں نے اپنے عقائد میں اختلاف پیدا کر لیا ہے اور مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

☆ مسلمانوں نے دین میں وسعت اور آسانی کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے مقابلے میں تشدد اور توہم پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔

☆ مسلمانوں کے اندر انتہا پسند صوفیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ان کے دین کو لہو لعب اور تنتر منتر کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے قرآن کی آیتوں اور احادیث رسول کی دور از کار تاویل شروع کر دی ہے۔ ان لوگوں نے مذہبی فرائض وواجبات کو یہ کہہ کر ترک کر دیا ہے کہ دین باطنی عمل کا نام ہے۔

☆ مسلمانوں میں اس طرح کے خیالات کو یقین بنا کر پیش کیا گیا ہے کہ مذہب عقل وسائنس اور منطق سے متصادم ہے۔

☆ مسلمانوں کا عقیدہ توحید، جو ان کی اصل طاقت وقوت ہے، اس میں شک اور وہم پیدا کر دیا گیا ہے اور مسلم علماء جو اس میں سدراہ بن سکتے تھے انہوں نے اس جانب سے غفلت برتی ہے۔

سیاست وحکومت کے حوالے سے انجمن کے اجلاس میں جو تجزیے پیش کیے گئے ان کا خلاصہ یہ ہے:

☆ مسلم امت آزادی رائے اور حریت عمل سے محروم کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے اس نے امید وسلامتی کو کھو دیا ہے۔

☆ مسلم امت کے مختلف سیاسی گروہ اور طبقات بنا دیے گئے ہیں اور ان کے درمیان سے عدل ومساوات کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

☆ مسلم حکمرانوں نے علماء سو پر اعتماد اور بھروسہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صحیح علم و اخلاص کے حامل علماء کے مشوروں اور رہنمائی سے محروم ہو گئے۔

اخلاق و سماج کے حوالے سے جو بات چیت ہوئی اس کا خلاصہ یہ ہے:

☆ امت اسلامیہ پوری طرح جہالت و تاریکی میں ڈوب کر گمراہ ہو گئی ہے۔

☆ مسلمانان عالم کے دلوں میں مایوسی و محرومی نے گھر کر لیا ہے۔

☆ مسلمانوں کا نظام تعلیم فاسد اور بے سود ہو گیا ہے۔

☆ مسلمان عورتوں کی تعلیم سے پوری طرح لاپروائی برتی گئی ہے۔

☆ مسلمانوں کے مالی نظام کا شیرازہ بھی بکھر گیا ہے۔

عبدالرحمان کواکبی نے اپنے افسانوی ڈرامے میں اس عالمی اسلامی انجمن کے اجلاس کو ملتوی کرنے سے پہلے درج ذیل نتائج نکالے ہیں:

1- مسلمانوں کے حالات دنیا بھر میں بہت ہی خراب ہو چکے ہیں۔

2- حالات کی اس ابتری کا تدارک ہونا چاہیے۔

3- جہالت کی بیماری نے پوری مسلم قوم کو اپنے حصار میں لے لیا ہے اور اس کے جراثیم اس کے اندر بہت دور تک سرایت کر گئے ہیں۔

4- اس کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دے کر اور انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کر کے ان کے اندر روشن خیالی پیدا کی جائے اور مسلم نوجوانوں میں تعمیر و ترقی کا جذبہ بیدار کیا جائے۔

5- اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں مختلف سطحوں پر انجمنوں کا قیام عمل میں آئے۔

6- اس کام کا مکلف ہر وہ شخص ہوگا جو کسی بھی درجے میں عمل پر قادر ہو۔

اب سے سو سال سے بھی زیادہ پہلے لکھا ہوا کواکبی کا یہ افسانوی ڈرامہ ان کی معلومات کی وسعت، نیت کے خلوص، فکر کی بلندی، وسعت مطالعہ و مشاہدہ اور ان کی جرأت اظہار کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عبدالرحمان کواکبی نے حقائق کو علمی انداز میں پیش کیا، نہ صرف بیماری اور اس اسباب بیان کیے بلکہ ہمت و حوصلے کا ثبوت دیتے ہوئے علاج بھی بتایا۔

ام القریٰ ایک ایسا افسانوی ڈرامہ ہے جس کا مصنف اسلام اور عالم اسلام کا عاشق زار ہے، اس راستے میں اسے مصائب و مشکلات کی کوئی پروا نہیں، وہ مصیبتوں کو برداشت کرتا اور مال و دولت کی قربانی پیش کرتا ہے، اس کے لیے وہ اپنا وطن بھی چھوڑ دیتا ہے، اس نے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے، اس مقصد سے اس نے مسلمانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے تاکہ ان کے زوال کے اسباب کا پتہ لگائے اور اس نے تمام مسلم ملکوں کی سیاحت اس مقصد سے کی ہے کہ ہر خطے کے مسلمانوں کی خوبیوں اور خرابیوں کا صحیح طور پر ادراک کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ام القریٰ کے اجلاس کا ہر نمائندہ اپنے ملک کے احوال و ظروف کے مطابق گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ کواکبی کی توجہ

کا اصل مرکز مسلمانوں کی داخلی سیاست تھی۔ وہ دھیمے لہجے اور نرم مزاج کے طبیب تھے جو اطمینان کے ساتھ مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور پھر ایک معتدل نسخہ تجویز کرتے ہیں۔

بہر حال یہ کہا جائے گا کہ سید عبدالرحمان کواکبی نے مذکورہ دونوں کتابوں میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو اس زمانے میں شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے مضامین میں سے بعض ان کی اپنی قوت فکر کا نتیجہ ہیں جب کہ بعض ترجمہ شدہ یا دوسری تحریروں سے مستفاد ہیں۔ ان کا مخاطب کوئی خاص شخص یا مخصوص حکومت یا حکمراں نہیں ہے بلکہ ان کا مقصود اصلی غفلت کے مارے مسلمانوں کو نیند سے جگانا ہے تاکہ مسلمان یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ اپنے زوال کے ذمہ دار وہ خود ہیں اس میں قضا و قدر یا غیروں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ کواکبی نے بعض مغربی مفکرین کے خیالات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ ان کو مسلمانوں کے احوال و ظروف کے مطابق ڈھال لیا ہے اور اپنی آراء اور تجربوں سے بھی ان میں اضافہ کیا ہے۔

17.4 امیر شکیب ارسلان

عہد حاضر کی اسلامی و اصلاحی فکر پر جن شخصیات کی تحریروں کے اثرات لازوال رہے ہیں امیر شکیب ارسلان ان میں سے ایک ہیں۔ ان کا خاندانی تعلق شاہان حیرہ سے تھا اور حکمرانی و جہاں بانی ان کو ورثے میں ملی تھی۔ ان کے اجداد نے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔ خلافت عباسی اور عثمانی حکومت میں اس خاندان کے افراد مختلف اعلیٰ عہدوں پر متمکن رہے۔ خود ان کے دادا اور والد اپنے علاقے کے بڑے جاگیردار تھے اور علاقے میں ان کی حکمرانی قائم تھی، البتہ امیر شکیب ارسلان نے جہاں بانی کو چھوڑ اور شمشیر و سنان کو ترک کر کے لوح و قلم کو اپنا ہتھیار بنایا اور اس حوالے سے ایسی شہرت و ناموری حاصل کی کہ شاید ہی ان کے خاندان میں کسی اور کو حاصل ہوئی ہوگی۔ انہوں نے اپنے زمانے کی اسلامی فکر کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ اصلاح و دعوت کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کے دور کی مسلم دنیا کو سب سے بڑا خطرہ مغربی استعمار سے تھا چنانچہ انہوں نے مغربی استعمار سے لوہا لیا، اس کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور اس کے عزائم کو طشت از بام کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، امیر شکیب ارسلان صحیح معنوں میں سید جمال الدین افغانی کی ادبی روایت کے امین تھے اور اس میں انہوں نے ایسا کمال حاصل کیا کہ ''امیر البیان'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔

17.4.1 ابتدائی زندگی:

امیر شکیب ارسلان لبنان کے ایک سرسبز و شاداب قصبے 'مشویفات' میں 25 ر دسمبر 1869ء کو پیدا ہوئے۔ ارسلان ان کا خاندانی نام تھا۔ والد کا نام حمود اور دادا حسن بن یونس ارسلان تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق گھر پر ہی قرآن مجید پڑھا اور ابتدائی عربی زبان اور اسلامیات کی تعلیم پائی۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں بیروت کی ایک مشہور درس گاہ ''مدرسۃ الحکمۃ'' یا ''دار الحکمۃ'' میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے داخل کیا گیا۔ اس مدرسے میں مشہور ماہر لغت اور ادیب شیخ عبداللہ بستانی۔ جن کی تصنیف 'البستان' ادب کی معروف کتاب ہے۔ استاد تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے ان کے علم اور صحبت سے خاص طور پر استفادہ کیا جس کی وجہ سے ان کی ادبی صلاحیتوں کو جلا ملی اور وہ

مرصع ومقفیٰ عربی زبان لکھنے میں ماہر ہوگئے۔

بیروت میں امیر شکیب ارسلان کی طالب علمی کے زمانے میں ہی مصر کے مشہور زمانہ عالم شیخ محمد عبدہ بیروت میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ شیخ محمد عبدہ کی امیر شکیب ارسلان کے والد کے یہاں آمدورفت رہا کرتی تھی چنانچہ انہیں بھی ان کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملنے لگا۔ امیر شکیب ارسلان نے شیخ محمد عبدہ کی خدمت میں رہ کر 'مجلۃ الاحکام العدلیۃ' کا خاص طور پر درس لیا۔ شیخ محمد عبدہ کی صحبت میں رہتے ہوئے نہ صرف یہ کہ وہ ان کی دعوت اصلاح سے متاثر ہوئے بلکہ یہیں پر انہیں پہلی بار سید جمال الدین افغانی کے افکار وخیالات اور ان کی دعوت اتحاد اسلامی کو جاننے کا موقع بھی ملا۔ بعد میں جب شیخ محمد عبدہ کو بیروت کی جلاوطنی سے مصر واپس لوٹنے کی اجازت مل گئی اور وہ قاہرہ لوٹ گئے تو امیر شکیب ارسلان بھی 1890ء میں شیخ محمد عبدہ کے پاس قاہرہ پہنچ گئے یہاں پر شیخ محمد عبدہ کی صحبت کے بفیض ان کی ملاقات اس وقت کے قاہرہ کے اکابرین ڈاکٹر یعقوب معروف، سعد زغلول، شیخ علی یوسف، سید رشید رضا اور محب الدین الخطیب وغیرہ سے ہوئی۔ قاہرہ میں قیام کے دوران ان لوگوں سے جو رشتۂ اخوت ومحبت قائم ہوا وہ تاعمر باقی رہا۔ اس سے قبل امیر شکیب ارسلان نے 1889ء میں کچھ دنوں کے لیے شام کے مفتی اور معروف عالم شیخ محمد منینی کی صحبت میں رہے۔ ان کی مجلسوں اور علمی حلقوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ابھی تک امیر شکیب ارسلان جمال الدین افغانی کے صرف افکار وخیالات سے واقف تھے یا پھر ان لوگوں سے ملے تھے جنہوں نے ان کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا، چنانچہ مصر میں قیام کے دوران ہی انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ استنبول جائیں جہاں ان دنوں سید جمال الدین افغانی کا قیام تھا۔ مصر کے بعد امیر شکیب ارسلان استنبول پہنچے اور وہاں جمال الدین افغانی سے ملاقات کی اور ان کی خداداد ذہانت وفطانت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ امیر شکیب ارسلان نے 'حاضر العالم الاسلامی' میں افغانی کے ساتھ اپنی ملاقات کا بہت ہی دل آویز پیرائے میں ذکر کیا ہے۔

17.4.2 عملی زندگی:

امیر شکیب ارسلان کا تعلق جس خانوادے سے تھا اس میں انہیں کسی ملازمت یا عہدے کی ضرورت نہیں تھی اس کے باوجود استنبول سے وطن واپس کے بعد کچھ دنوں کے لیے سرکاری ملازمت کی اور ایک اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے لیکن جلد ہی ان کا دل سرکاری ملازمت سے اُکتا گیا اور انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی۔ اسی دوران 1891ء میں انہوں نے فرانس کا سفر کیا اور وہاں ان کی ملاقات عربی زبان کے مشہور شاعر امیر الشعراء احمد شوقی سے ہوئی جو ان دنوں وہاں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ احمد شوقی سے ان کی ملاقات بہت ہی دل چسپ رہی اور وہ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ امیر شکیب ارسلان 'الفتح' اور 'المویدٔ' جیسے گراں قدر رسائل میں مختلف موضوعات پر اہم مضامین بھی لکھتے رہے۔

سنوسی تحریک شمالی افریقہ کی ایک بڑی اور اہم تحریک تھی۔ اس کی تربیتی خانقاہوں نے اسلام کے داعی اور مصلح ہی نہیں پیدا کیے بلکہ ان خانقاہوں سے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد بھی نکلی اور ان لوگوں نے افریقہ کے مختلف علاقوں میں دعوت واصلاح کے ساتھ جہاد کا کام بھی کیا اور سامراجی قوتوں کے خلاف اسلام کا دفاع پوری جرأت وہمت کے ساتھ کیا۔ اس تحریک کے سربراہ شیخ محمد بن علی سنوسی اور شیخ احمد سنوسی نے لیبیا میں طرابلس الغرب میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور اطالوی سامراج جو اس علاقے پر قابض تھا اس کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ جب جنگ وسیع اور ہمہ جہت ہوگئی تو امیر شکیب ارسلان نے انجمن ہلال احمر مصر کی طرف سے ایک رضا کار کے طور پر اس جنگ میں

شرکت کی تا کہ وہ اس تحریک کو قریب سے دیکھ سکیں اور جہاد میں بھی شرکت ہو۔ یہیں ان کی ملاقات ترکی کے مرد مجاہد انور پاشا مرحوم سے ہوئی جو اطالوی سامراج کے خلاف مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے انور پاشا کے دوش بدوش اس جنگ میں شرکت کی۔ انور پاشا ان کی اصابت فکر اور حسن مشورہ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے اس دوران سنوسی تحریک کا بہت قریب سے مطالعہ کیا۔ تحریک کے رہنماؤں کے بارے میں اور ان کے کارناموں کے بارے میں متعدد مقالات لکھے۔ امیر شکیب ارسلان نے سنوسی تحریک اور اس کی قیادت سے عام مسلمانوں کو نہ صرف روشناس کرایا بلکہ انہیں اس کے تعاون اور ہم نوائی کے لیے بھی آمادہ کیا۔ 1912 میں جب بلقان کی جنگ چھڑی تو اس میں بھی امیر شکیب ارسلان نے مختلف وفود کی سربراہی کی۔

امیر شکیب ارسلان بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک ایسے عرب دانشور کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جنھیں ترکوں سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ آلِ عثمان اور عثمانی خلافت کے مرکز کو اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کی نشانی سمجھتے تھے۔ ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان اور وزیروں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ عالم اسلام کا اتحاد سب سے زیادہ اہم ہے۔ اگر یہ اتحاد ٹوٹ گیا تو عالم اسلام کی عظمت وشوکت خاک میں مل جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ 1914 میں جب پہلی عالمی جنگ کا آغاز ہوا۔ جس میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا، تو اس وقت بھی انہوں نے ترکوں کا ساتھ نہیں چھوڑا حالانکہ اس وقت عرب دنیا کے بیشتر قائدین اور رہنما عربوں کی اندرونی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان انہیں صرف وعدوں پر ٹال رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے امیر شکیب ارسلان کے مخالفوں نے ان پر ترکوں کی بے جا حمایت کا الزام بھی عائد کیا ہے۔ لیکن امیر شکیب ارسلان کی ترکوں یا عثمانی خلافت کی حمایت سامراج اور سامراجی طاقتوں کے وسیع تر عزائم کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ سامراجی طاقتیں آل عثمان کی حکومت کے خاتمے کے ذریعہ عالم اسلام کے شیرازے کو منتشر کرنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے وہ عرب حریت پسندوں کی نہ صرف حمایت کر رہی ہیں بلکہ ان سے ایسے وعدے بھی کر رہی ہیں جو کبھی پورے ہونے والے نہیں۔ چنانچہ پہلی عالمی جنگ میں جرمنی اور اس کے ساتھ ترکوں کو بھی شکست ہوئی تو عرب علاقے ایک ایک کر کے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ البتہ اس وقت انہیں آزادی دینے کے بجائے برطانیہ اور فرانس کی سامراجی طاقتوں نے عربوں سے کیے ہوئے اپنے تمام وعدوں سے منہ موڑ لیا اور عرب علاقوں کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا۔ اس وقت عرب حریت پسندوں پر امیر شکیب ارسلان کی رائے کی صداقت ظاہر ہوئی لیکن تب تک وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس دوران امیر شکیب ارسلان استنبول میں مقیم رہے اور ماسکو اور برلن کے چکر لگاتے رہے تا کہ بچے کھچے ترکی میں اسلام کی عظمت قائم اور برقرار رہے لیکن 1924 میں کمال اتاترک کے ذریعہ خلافت کے خاتمے، لادینی جمہوریت کے فروغ اور ترکی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی جیسے اقدامات سے وہ مایوس ہو گئے۔ امیر شکیب ارسلان نے کمالی ترکوں پر شدید تنقید بھی کی ہے۔

1925 میں امیر شکیب ارسلان نے بڑی حد تک خود کو عملی سیاست سے الگ کر لیا تھا۔ وہ برلن کو چھوڑ کر جنیوا منتقل ہو گئے اور اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں صرف کرنے لگے۔ 1927 میں امریکہ میں مقیم عرب مہاجروں کی دعوت پر وہ نیویارک (امریکہ) تشریف لے گئے۔ 1929 میں حج و زیارت حرمین سے مشرف ہوئے اور 1930 میں فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ 'La Nation Arabe' کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے کا مقصد ایک طرف اسلام اور مسلمانوں کا دفاع تھا تو دوسری طرف عالم اسلام کے

محکوم مسلمانوں کی آزادی کی حمایت تھا۔ اس حوالے سے اس رسالے کے ذریعہ امیر شکیب ارسلانؒ نے یورپی استعمار (انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور ولندیزی) کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور دسیسہ کاریوں کو طشت از بام کیا۔ اسی دوران امیر شکیب ارسلان نے اسپین (اندلس) کی سیاحت کی اور وہاں سے واپسی کے بعد اندلس کے آثار پر اپنی معرکتہ الآراء کتاب "الحلل السندسیة" تین جلدوں میں تالیف کی۔ 1934 میں سلطان ابن سعود (سعودی عرب) اور امام یحییٰ (یمن) کے باہمی تنازعات اس حد تک بڑھ گئے کہ جنگ کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ ان دونوں حکمرانوں کے باہمی اختلافات کو دور کرنے کے لیے عالم اسلام کے بڑے رہنماؤں کا ایک وفد حجاز گیا، جس کے ایک رکن امیر شکیب ارسلان بھی تھے۔ وفد کی کوششیں کامیاب رہیں اور دونوں حکمرانوں کے درمیان جنگ بند ہوگئی۔

دوسری عالمی جنگ (1945-1939) کے دوران امیر شکیب ارسلان برلن میں مقیم رہے، البتہ اس جنگ میں انہوں نے سرگرم حصہ نہیں لیا۔ جنگ کے بعد 1946 میں شام اور لبنان کو فرانسیسی اقتدار سے آزادی مل گئی۔ اس وقت امیر شکیب ارسلان کو بھی وطن واپس لوٹنے کی اجازت ملی چنانچہ اکتوبر 1946 میں تقریباً 25 برس کی جلاوطنی کے بعد امیر شکیب ارسلان اپنے وطن واپس لوٹے۔ البتہ اس وقت تک ان کی عمر کافی ہوچکی تھی۔ وطن واپس لوٹتے ہوئے انہیں دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ خفقان قلب کے عارضے میں 9 دسمبر 1946 میں بیروت میں ان کا انتقال ہوگیا۔

17.4.3 علم وفضل:

امیر شکیب ارسلان ایک ممتاز دانشور، مفکر، سیاسی رہنما اور مجاہد آزادی ہونے کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے زبردست انشا پرداز بھی تھے۔ ان کا قلم رواں اور زبان سلیس وفصیح تھی۔ عربی زبان کے علاوہ انہیں ترکی زبان - جو اس وقت سرکاری زبان تھی۔ پر بھی عبور حاصل تھا۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے بھی وہ بہت اچھی طرح واقف تھے اور ان میں لکھنے اور اظہار خیال کی عمدہ صلاحیت رکھتے تھے۔ جب سلطان عبدالحمید کی دعوت پر قیصر ولیم ثانی دمشق کی سیاحت کے لیے شام آیا تھا تو امیر شکیب ارسلان بھی عثمانی حکومت کی جانب سے اس کے ساتھ تھے۔ امیر الشعراء احمد شوقی نے قیصر ولیم کی مدح وستائش میں ایک قصیدہ لکھا تو امیر شکیب ارسلان نے اس کا ترجمہ قیصر ولیم کے سامنے جرمن زبان میں پیش کیا۔ اس کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، بین الاقوامی سیاست اور شعر وادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ مسلم دنیا کے تقریباً تمام علاقوں سے سیکڑوں کی تعداد میں خطوط ان کے پاس آتے تھے اور وہ ان کے جواب بھی دیتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً دو ہزار خطوط اور اخبارات ورسائل کے لیے دوڈھائی سو مضامین وہ ہر سال لکھتے تھے۔

17.4.4 اسلوب بیان:

امیر شکیب ارسلان کا اسلوب بیان مؤثر، دل آویز اور پرزور ہونے کے ساتھ ساتھ متین اور سنجیدہ ہے۔ اپنی ابتدائی ادبی زندگی میں وہ رسائل الصابی اور نہج البلاغة کے طرز بیان سے اور صنائع بدائع لفظی کے گرویدہ تھے۔ لیکن جب ان کی ملاقات شیخ محمد عبدہٗ سے ہوئی تو شیخ محمد عبدہ نے انہیں مقدمہ ابن خلدون کے مطالعے کی ترغیب دی اور یہ کہا کہ انہیں ابن خلدون کے اسلوب بیان کی پیروی کرنی چاہیے۔ خود امیر شکیب ارسلان نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ابن خلدون کی تحریروں کا بہت ہی غور سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے طرز انشا کا اثر

بھی قبول کیا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مشہور مصری ادیب سید رشید رضا نے المنار میں ان کے اسلوب کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ ابن خلدون سے مشابہ ہے۔ البتہ ابن خلدون اور امیر شکیب ارسلان کی تحریروں میں یہ فرق نمایاں ہے کہ ابن خلدون الفاظ کا استعمال بہت محتاط انداز میں کرتے ہیں جب کہ امیر شکیب ارسلان تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ لکھنے کے عادی ہیں۔ اکثر وہ نثر میں شاعری کرنے لگتے ہیں خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنے کسی پسندیدہ اور محبوب موضوع پر لکھ رہے ہوں تو پھر ان کا قلم بے اختیار ہو جاتا ہے۔ البتہ امیر شکیب ارسلان جب سیاسی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو پھر ان کی توجہ اپنے مخاطب پر زیادہ ہوتی ہے اور ان کی تحریر سادہ بیانی کی مثال بن جاتی ہے۔ ان کا سفرنامۂ حج ''الارتسامات اللطاف'' بھی سہل ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ بقول کسے:

''ان کی تحریروں میں علم وادب اور حسن بیان کے ساتھ سوز دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے، جس کی وجہ سے ان میں زور اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے عرب ادبا انہیں امیر البیان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔''

17.4.5 تصانیف:

امیر شکیب ارسلان نے سیاست، سماج، تاریخ، جغرافیہ، سوانح اور ادب شعر جیسے موضوعات پر درجنوں کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ذیل میں ان میں سے بعض کا مختصر تعارف دیا جا رہا ہے:

1۔ **حاضر العالم الاسلامی:** یہ امیر شکیب ارسلان کی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ اصل کتاب ایک امریکی مصنف Lothrap Stoddard نے 1921 میں جدید مسلم دنیا کی سیاست پر ایک کتاب The New World of Islam کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ جارج یولیھض نام کے ایک عیسائی عرب نے حاضر العالم الاسلامی کے نام سے کیا اور وہ شائع بھی ہو گیا۔ جب کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو مترجم نے امیر شکیب ارسلان سے درخواست کی کہ وہ اس کی ترجمہ شدہ کتاب پر تعلیقات وحواشی لکھ دیں تاکہ اس کی افادیت مزید بڑھ جائے۔ امیر شکیب ارسلان نے جب تعلیقات لکھنی شروع کیں تو ان کا حجم اصل کتاب سے تین گنا زیادہ بڑھ گیا۔ البتہ ان تعلیقات کا فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان میں یہ کتاب تقریباً پوری مسلم دنیا۔ چین اور فلپائن سے لے کر مغرب اقصی تک۔ کی علمی، مذہبی، سیاسی اور اصلاحی تحریکات کا گویا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) بن گئی۔ 1925 کے بعد سے یہ کتاب عرب دنیا میں مسلسل شائع ہوتی رہی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ اور اس کے ضمنی مباحث بھی بہت سی قیمتی اور مفید معلومات سے آراستہ ہیں۔

2۔ **لماذا تأخر المسلمون ولماذا تقدم غیرہم:** (مسلمان کیوں پیچھے رہ گئے اور اغیار کیوں آگے بڑھ گئے): سید رشید رضا کا رسالہ المنار اپنے زمانے میں عالم عرب میں ہی نہیں پوری مسلم دنیا کا معروف علمی رسالہ تھا اور ہر جگہ اسے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس نے اس زمانے کے پوری ایک نسل کو متاثر کیا تھا۔ اس رسالے میں جاوا (انڈونیشیا) کے عالم نے مسلمانوں کے اصحاب علم سے یہ سوال کیا تھا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کی کیا وجہ ہے؟ اور جاپان و دیگر مغربی اقدام کی ترقی وخوشحالی کے کیا اسباب ہیں؟ انڈونیشی عالم کے اس سوال کے جواب میں امیر شکیب ارسلان نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت المنار میں ایک طویل مضمون لکھا اور بتایا کہ مسلم دنیا کی پسماندگی اور زبوں حالی کے کیا اسباب ہیں اور کس طرح وہ ان حالات سے نکل کر دیگر ترقی یافتہ اقوام کے برابر آ سکتے ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کی بدحالی کی بنیادی وجہ مسلم حکمرانوں کے باہمی تنازعات واختلافات ہیں۔ مسلمان عام جہالت کے اندھیرے میں ہیں

اور عصری علوم سے ناواقف ہیں اور اس تباہ حالی تک مسلمانوں کو لے جانے میں علماء کے جمود نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ اگر مسلمان کو اپنے حالات بدلنے ہیں تو انہیں ایثار اور جان و مال کی قربانی دینی ہوگی، اس کے بغیر وہ ترقی وخوشحال کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہی مضمون بعد میں اسی عنوان کے تحت کتابی صورت میں شائع ہوا اور عالم عرب پر غیر معمولی اثرات کی حامل کتاب ثابت ہوئی۔ اس کتاب کا انگریزی اور اردو زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

3- **حلل السندسية فى الاخبار والآثار الاندلسية:** امیر شکیب ارسلان کے بارے میں پڑھتے ہوئے ہم یہ جان چکے ہیں کہ انہوں نے 1930 میں اسپین (اندلس) کا سفر اور سیاحت کی تھی۔ وہاں سے واپسی کے بعد انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اندلس کی تاریخ، جغرافیہ اور اہم شخصیات کے تعارف پر ایک جامع کتاب لکھیں۔ انہوں نے یہ کام شروع کیا بھی، لیکن سات برس کی محنت شاقہ کے بعد وہ صرف اس کی تین جلدیں ہی لکھ پائے جو صرف شمالی اور مشرقی اندلس سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اندلس کے بلاد وا حصار (علاقوں اور شہروں) کی تاریخ اور جغرافیہ لکھنے کے ساتھ ساتھ ہر شہر اور علاقے کے علماء، ادیبوں، شاعروں، فقیہوں اور امیروں کے حالات بھی لکھ دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا ہے کہ اندلس کے حوالے سے مغربی مؤرخین نے جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے ان کی تصحیح بھی کر دی ہے۔

4- **شوقى و صداقة اربعين سنة:** ہم پیچھے یہ پڑھ چکے ہیں کہ امیر شکیب ارسلان عرب شاعر احمد شوقی کے بہت بڑے مداح تھے۔ عربی ادب کی تاریخ میں اس طرح کے شواہد بہت کم ملتے ہیں کہ کسی ادیب وشاعر نے کسی ہم عصر ادیب وشاعر کی دل کھول کر تعریف و تحسین کی ہو۔ امیر شکیب ارسلان نے احمد شوقی کے فن، شعری محاسن اور عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ احمد شوقی کو 'امیر شعراء' کا خطاب بھی انہیں کا دیا ہوا ہے۔ انہوں نے احمد شوقی کی شخصیت، شاعری اور فن پر متعدد مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں لکھے تھے۔ اور ان کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ بھی لکھا تھا۔ اس کتاب میں انہیں مضامین کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

5- **السيد رشيد رضا و إخاء اربعين سنة:** سید رشید رضا عالم اسلام کے مشہور مصلح، ادیب، مفسر قرآن اور معروف رسالے المنار کے مدیر تھے۔ امیر شکیب ارسلان کے سید رشید رضا کے ساتھ برادرانہ تعلقات تھے۔ درج بالا کتاب ان کے حالات زندگی اور مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ ان مکاتیب کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں دوران تحریر بہت ساری ادبی ولغوی بحثیں اور متعدد دینی وعلمی نکات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مسلم دنیا کے علاوہ ہندوستان کے بھی بعض مسلم اکابرین (رہنماؤں) کے بارے میں بھی ان خطوط میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ایک خط میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک مباحثے کا بھی ذکر ہے جس میں حاضرین مجلس نے امیر شکیب ارسلان کو عہد حاضر کا عظیم ترین مسلم رہنما قرار دیا تھا۔

ان کے علاوہ بھی امیر شکیب ارسلان کی متعدد تصانیف ہیں مثلاً تاریخ غزوات العرب فی فرنسا، سویسرا و اطالیہ، الارتسامات اللطاف اور ان کی شاعری کا دیوان، دیوان الامیر شکیب ارسلان وغیرہ۔

معلومات کی جانچ

1۔ عبدالرحمٰن کواکبی کے خاندانی مدرسے کا نام بتائیں۔

2۔ کواکبی کی مشہور کتابیں کون سی ہیں؟

3۔ امیر شکیب ارسلان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں کس لقب سے یاد کیا جاتا ہے؟

4۔ سید رشید رضا کے خیال میں امیر شکیب ارسلان کا اسلوب کس سے مشابہ ہے؟

17.5 علی شریعتی

ایران میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت کا قیام قاچاری عہد کے سیاسی جبر و استبداد سے آزادی کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ رضا شاہ کے زیر حکومت ایران نے جدید دور میں قدم رکھا اور تیل کی دریافت سے ہونے والی آمدنی سے ایران نے مادی ترقی کے مختلف میدانوں میں آگے قدم بھی بڑھائے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ پہلوی حکومت نے بھی موروثی جبروت کی شکل اختیار کر لی اور ایرانی وسائل خاندانی حکومت کے استحکام و بقا پر صرف کیے جانے لگے۔ اس حوالے سے سیاست دانوں، امراء و دولت مندوں اور مذہبی قیادت کی جو تثلیث ایران میں بنی اس پر مذہبی طبقے سے ہی تعلق رکھنے والی جن آوازوں نے سب سے زیادہ کاری ضرب لگائی ان میں ایک اہم آواز علی شریعتی کی تھی۔ علی شریعتی کو جدید ایران کے فکری معماروں میں سے ایک باور کیا جاتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اپنے فکر و عمل سے ایران کو اس مقام تک لے جانے میں اہم کردار ادا کیا جہاں 1979 میں ایرانی عوام نے ایران میں شہنشاہیت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منانے والے محمد رضا شاہ کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی جگہ اسلامی اصولوں پر جمہوری اسلامی ایران کا قیام عمل میں آیا۔ علی شریعتی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایرانی کو مخصوص شیعی حصار سے نکالنے کی کوشش کی۔ اور ایرانیوں کو ''شیعیت صفوی سے شیعیت علوی'' کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔

17.5.1 ابتدائی زندگی اور تعلیم

علی شریعتی کا اصل نام محمد علی اور والد کا نام محمد تقی مزینانی تھا۔ وہ 24/نومبر 1933ء کو ایران کے صوبے خراسان کے ایک قصبے مزینان میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک مذہبی خاندان تھا اور قصبہ مزینان میں امامت و خطابت اسی خاندان کا حصہ تھی۔ ان کے والد محمد تقی مزینانی ایک روایت شکن مذہبی عالم تھے انہوں نے مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ قومی تعلیمی نظام سے بھی استفادہ کیا اور پھر مزینان کی سکونت ترک کر کے سرکاری اسکول کی ملازمت اختیار کر لی۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مستقبل کا ذمہ دار شہری بننے کے لیے نوجوانوں کو ایسی مذہبی تعلیم حاصل کرنی چاہیے جو جدید دور کے تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہو۔ چنانچہ انہوں نے علماء کا مخصوص لباس اور پگڑی باندھنے کے بجائے مغربی ہیٹ (ٹوپی) پہننا شروع کیا۔ اس طرح علی شریعتی نے ایک ایسے متوسط اور اعتدال پسند خاندان میں آنکھیں کھولیں جہاں مذہبی عبادات اور رسوم کی پابندی تو کی جاتی تھی لیکن اس گھرانے میں مذہب ماضی کا کوئی فرسودہ عقیدہ، باطنی مشاہدہ یا محض فرد کا ذاتی معاملہ نہیں تھا بلکہ مذہب

ایک سماجی حقیقت تھی اور اسے ایک زندہ نظام کی طرح برتا جاتا تھا۔

1941 میں جب کہ علی شریعتی کی عمر آٹھ برس تھی، انہیں 'ابن یمین پرائمری اسکول' کی پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ خود ان کے والد بھی اس اسکول میں ملازمت کرتے تھے۔ بچپن سے ہی علی شریعتی ایک خاموش قسم کے اور اپنی دنیا میں آپ مگن رہنے والے طالب علم تھے۔ باہر کے لوگوں سے ان کا ملنا جلنا بہت کم ہوتا تھا اور کھیلوں میں بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ انہیں پڑھائی سے لگاؤ تھا اور چونکہ ان کے پاس وقت کافی ہوتا تھا اس لیے اسکول کی کتابوں کے علاوہ بھی وہ بہت ساری کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں ہی انہوں نے وکٹر ہیوگو کی کتاب Les Miserables کا فارسی ترجمہ پڑھ لیا تھا اور بعض بالکل غیر متعلق مضامین مثلاً وٹامنز کے فوائد اور سنیما کی تاریخ وغیرہ بھی ان کے زیر مطالعہ رہتے تھے۔ جب انہوں نے ہائی اسکول کی تعلیم شروع کی تو اس وقت تک ان کی دلچسپی فلسفہ اور تصوف جیسے مضامین میں بڑھ چکی تھی اور ان موضوعات کی کتابوں کا مطالعہ وہ کرنے لگے تھے۔ مطالعہ کتب سے ان کی دلچسپی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ خود ان کے گھر پر ایک اچھی لائبریری موجود تھی جس میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔ ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ علی شریعتی کے والد ان کی روحانی تربیت کی طرف بھی خاص توجہ دیتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے کو مراقبے کے آداب سکھائے اور انسان بننے کے فوائد اور تکنیک سے آگاہ کیا۔ اسی طرح انہیں آزادی، شخصی وقار، عفو درگزر اور عقیدے کی عظمت سے بھی باخبر کیا۔

ہائی اسکول کی تعلیم کے زمانے تک علی شریعتی ایک کم گو، خاموش طبیعت اور ہر وقت مطالعے میں منہمک رہنے والے طالب علم کی حیثیت سے ہی جانے جاتے رہے۔ تنہائی پسندی اور انسان بیزاری نے انہیں مطالعے کے لیے وافر وقت ضرور بہم پہنچایا اور اس دوران انہوں نے چارلیس میٹرلنک، شوپنہار، فرانز کافکا اور صادق ہدایت کی اہم تصانیف کا مطالعہ بھی کر لیا۔ لیکن اس لٹریچر کے مطالعے نے ان کے مذہبی عقائد کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں، وجود باری تعالیٰ کے بارے میں بھی شکوک وشبہات پیدا ہو گئے اور خدا کے بغیر کائنات کا تصور انہیں بے معنیٰ اور لغو معلوم ہونے لگا۔ خود انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ 1946 سے 1950 تک کا دوران کی شخصیت کا پہلا سنگین ترین بحران تھا۔

1950 میں علی شریعتی نے فردوسی ہائی اسکول سے نویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد مشہد کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں داخلہ لیا اور یہاں پر انہوں نے اقامتی طالب علم کے طور پر آگے کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ البتہ اس دوران بھی ان کے اندرون میں زندگی کے مقصد ومعنیٰ کو لے کر متضاد تصورات کی ایک زبردست کشمکش جاری رہی۔ تاہم ان سب کے باوجود انہوں نے 1952 میں کالج کی تعلیم مکمل کر لی۔ اس دوران ان کی شخصیت کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے اور بکھرنے سے اگر کسی چیز نے بچایا تو وہ مشرقی فلسفے کی روحانیت تھی اور اس کا بنیادی حوالہ انہیں مثنوی مولانا روم میں ملا۔

جدید ایران کی تاریخ کے جانکار یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایران کی تاریخ میں 1950 اور 1951 میں ایک زبردست طوفان ڈاکٹر مصدق کی نیشنلسٹ تحریک کی صورت میں سامنے آ گیا جس نے پورے ایران میں جلسے جلوس، مظاہروں اور بحث ومباحثے کا ایک سلسلہ قائم کر دیا۔ نیشنلسٹ تحریک کے اس طوفان نے علی شرعتی کی خاموشی اور ان کے گوشۂ تنہائی کو بھی اپنی زد میں لے لیا اور پھر یہیں سے علی شریعتی کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ بحث ومباحثے میں حصہ لیتے ہیں، جلسوں اور مظاہروں میں شرکت کرتے ہیں اور توحید پر مبنی 'سائنٹفک سوشلزم' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ 1953 میں مصدق کی نیشنلسٹ حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی عوامی

تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے نوجوانوں کو بری طرح کچل دیا گیا اور اس تحریک سے پارلیمانی جمہوریت کی جو امید لگائی گئی تھی اسے خاک میں ملا دیا گیا۔ اس مایوسی و محرومی نے ایک بار پھر علی شریعتی کو شخصیت کے بحران سے دوچار کیا اور تقریباً دو برس تک (1958-1956) وہ آزادی اور جمہوریت کے بارے میں کشمکش سے دوچار رہے۔ اس سے قبل 1954 میں انہوں نے بارہویں گریڈ کا ڈپلومہ حاصل کر لیا تھا اور انہیں اسکول ٹیچر کی سرکاری ملازمت بھی مل گئی تھی۔

اب علی شریعتی نے مشہد یونیورسٹی میں داخلہ لیا (1955) جہاں ادب کا نیا نیا شعبہ کھلا تھا۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے انہیں یونیورسٹی میں چند انتظامی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا، اس کے باوجود وہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران 1957 میں انہیں ڈاکٹر مصدق کی حمایت کے جرم میں گرفتار کر کے تہران بھیج دیا گیا اور ایک ماہ بعد انہیں رہائی ملی۔ 1958 کے وسط میں (جولائی 15) ان کی شادی بی بی فاطمہ عرف پوران سے ہوئی اور اسی سال کے اواخر میں انہوں نے مشہد یونیورسٹی سے فارسی ادب میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورسٹی میں غیر معمولی علمی استعداد کا مظاہرہ کرنے پر انہیں بیرون ملک اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ مل گئی۔ چنانچہ اپریل 1959 میں وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پیرس (فرانس) چلے گئے۔

17.5.2 پیرس میں قیام:

علی شریعتی پیرس گئے تو تھے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اور وہاں اپنے قیام کے دوران (1959 تا 1964) انہوں نے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''صفی الدین بلخی'' پر تھا اور یہ پروفیسر گلبرٹ لیزرڈ کی زیر نگرانی مکمل ہوا۔ البتہ پیرس میں ان کی سرگرمیوں کا دائرہ صرف حصول علم تک محدود نہیں تھا بلکہ قیام پیرس کے دوران ہی ان پر دانشوری، سیاست، اور اصلاح کے وہ پہلو اجاگر ہوئے جنہوں نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہاں کی بے محابا آزادی نے لوگوں سے ان کی مذہبی و ثقافتی شناخت چھین لیتی ہے اور انہیں لذت پرستی کا حریص بنا دیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہاں یہ بھی پایا کہ علم کی قدر کیسے کی جائے چنانچہ انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اگر انہیں مغرب کے اساتذہ کی قربت میسر نہ آتی تو وہ ایک مفلس روح، مرجھائے ہوئے دل، متوسط سطح کے ذہن اور زندگی کے بچکانہ تصور کے مالک ہوتے۔ پیرس میں قیام کے دوران ہی علی شریعتی پر تحقیق کے دروازے کھلے اور اور یہیں پر انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ جو شیعہ عقائد نہیں رکھتے وہ شیعہ عقائد کی تشریح کیسے کرتے ہیں۔ چنانچہ خود ان کے تصور شیعیت میں یہاں پر ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوء جو ایران کے سرکاری شیعیت کے تصور سے بڑی حد تک مختلف تھی اور جس میں انہوں نے مذہب کے سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام چند توہمات، بے عملیوں، پسماندگی پر قناعت، تعطل و جمود، تقیہ، مولویوں کی بے ربط تقریروں اور احکامات پر ان کی اجارہ داری کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام ایک ترقی پسند اور عمل و کردار کی طرف دعوت دینے والا نظام ہے جو آزادی، مساوات، انصاف اور روحانیت کی قدروں سے مالا مال ہے۔ انہوں نے ایرانی شیعوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شیعیت صفوی کو چھوڑ کر شیعیت علوی کو اختیار کریں۔ اسی طرح ان کے اس بیان پر بھی ان کے معاصر شیعہ علما کے حلقے میں بڑے لے دے مچی اور ان پر سنی اور وہابی کے الزامات بھی لگے جس میں انہوں نے ان کے مطابق ''مسلمہ شیعہ عقائد'' سے انحراف کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا:

''میں وہ دن دیکھنے کی دعا کرتا ہوں جب ایران میں مذہبی آگہی اور شعور اس درجے پر پہنچ جائے کہ سرکاری شیعیت کا ترجمان

حضرت فاطمہؓ کو اس روپ میں پیش کرے جس کا ذکر مسیحی دانشور سلیمانی قطانی نے کیا ہے۔ حضرت علیؓ کی ان صفات کا ذکر کیا جائے جو ایک دوسرے مسیحی ڈاکٹر جارج جوردک (George Jordac) نے بیان کی ہیں۔ اہل بیت کا ذکر اس طرح کیا جائے جیسے میسگنان (Massignion) نے اپنی ریسرچ میں کیا ہے۔ حضرت ابوذرؓ کو جودت السحر کی آنکھ سے دیکھا جائے۔ قرآن کا وہ ترجمہ گوارا کر لیا جائے جو ریجس بلاشیر (Regis Blachere) نے کیا ہے اور آں حضرت کو یہودی دانشور میکسم روڈیسن (Maxime Rodison) کی نظر سے دیکھا جائے۔"

علی شریعتی کا یہ بیان ایران کے مخصوص شیعی تناظر میں بڑا ہی بے باکانہ تھا چنانچہ اس پر ردِ عمل بھی بڑا شدید تھا۔ ایرانی علماء کے لیے مسلمانوں کی ان مقدس ہستیوں کے بارے میں غیر شیعہ اور غیر مسلم مصنفین کے اندازِ تحریر کو برداشت کر پانا آسان نہیں تھا اس لیے انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم اسلام نہ صرف غیر شیعہ مصنفین سے بلکہ غیر مسلموں سے سیکھا کریں"۔

علی شریعتی پیرس میں جتنا عرصہ قیام پذیر رہے وہ یہاں علم و ادب کی مجلسوں میں شرکت کرتے رہے، فلسفیوں، ماہرین تعلیم، شاعروں اور عسکریت پسندوں کے لیکچرز اور خطابات غور سے سنتے اور کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ بھی کرتے رہے۔ انہوں نے ان ماہرین سے تبادلۂ خیال کیا اور ان سے سوال و جواب بھی کیے۔ غرض وہ جس سے بھی ملتے اس سے کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور کرتے مثال کے طور پر فرانز فنان نے انہیں تیسری دنیا کی یکجہتی اور بین الاقوامیت کا درس دیا۔ ترقی کے لیے یورپ کی نقالی سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے یہ پیغام بھی دیا کہ یہ ممالک 'نئے تصورات' وضع کریں، ان پر تجربات کریں اور نئی تاریخ رقم کرنے کی کوشش کریں۔ وہی ترقی اصل ترقی ہوتی ہے جو اپنے وسائل کے بل بوتے پر کی جائے۔ جیکس برک کی کلاسوں سے علی شریعتی نے مذہب کے سماجی پہلو کے بارے میں آگاہی حاصل کی۔ سارتر کی کلاسوں سے 'انسانی آزادی کا حصول' اور بعد ازاں 'ہر قسم کے جبر کے خلاف بغاوت کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری' کا سبق سیکھا۔ الیکس کیرل (Aliexis Carrel) سے 'سائنس اور عقیدے' میں ہم آہنگی کے تجربات سنے وغیرہ۔

پیرس میں قیام کے دوران علی شریعتی سیاسی طور پر بھی بہت زیادہ فعال اور سرگرم رہے اور ان ایرانی و غیر ایرانی افراد اور تنظیموں سے روابط رکھے جو اپنے اپنے ملکوں میں آزادی اور جمہوریت کی بحالی کے لیے کوششوں میں مصروف تھے۔ وہ مصدق کے بہت بڑے مداح تھے اور ان کی تحریروں کی اشاعت کے لیے بہت سرگرم رہے۔ وہ 'ایران آزاد' نامی ایک مجلّے کے ایڈیٹر رہے اور اخبارات و رسائل کے ذریعہ بیرون ملک ایرانی طلبہ میں آزادی و جمہوریت کا پیغام عام کرتے رہے۔ جون 1963 میں جب ایرانی دارالحکومت تہران میں عوامی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس وقت تک آیت اللہ خمینی ایک نمایاں اپوزیشن لیڈر کے طور پر سامنے آچکے تھے۔ انہوں نے اس تحریک کی پیرس میں رہتے ہوئے حمایت کی اور کہا یہ بھی جاتا ہے کہ اس کی حمایت میں انہوں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں مصدق کو قومی رہنما اور خمینی کو مذہبی رہنما کے طور پر پیش کیا گیا تھا لیکن یہ شائع نہیں ہوسکا۔

17.5.3 ایران واپسی

1964 کے اواخر میں علی شریعتی ایران واپس لوٹ آئے یہاں انہیں اس بات کی امید تھی کہ انہیں یونیورسٹی میں ملازمت مل جائے گی لیکن 1967 سے قبل تک انہیں یہ ملازمت نہیں مل سکی۔ اس دوران انہوں نے مشہد سے قریب کچھ اسکولوں میں فارسی گرامر اور لٹریچر پڑھایا

اور طلبہ کو مضمون نویسی سکھائی۔ 1967 میں انہیں مشہد یونیورسٹی کے کالج آف لٹریچر میں تاریخ اسلام پڑھانے کی ملازمت مل گئی۔ اسی دوران انہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب ''اسلام شناسی'' تحریر کی۔ مشہد یونیورسٹی میں علی شریعتی کے لیکچرز نے طلبہ کے اندر ایک نئی بیداری پیدا کردی اور ان کے گرد نوجوان دانشوروں کا ایک حلقہ قائم ہوگیا جو انقلابی خیالات کا حامل تھا اور جو ایران میں سماجی و سیاسی تبدیلی کا خواہاں تھا۔ ایرانی حکومت کے لیے علی شریعتی کی اس طرح کی سرگرمیاں قابل قبول نہیں ہوسکتی تھیں اس لیے انہیں مشہد یونیورسٹی میں لیکچرز دینے سے روک دیا گیا (1971) اور انہیں تہران بھیج دیا گیا۔

تہران میں علی شریعتی کا زیادہ تر وقت 'حسینیہ ارشاد' نامی کمیونٹی سینٹر میں تقریر کرنے اور بحث و مباحثے میں صرف ہونے لگا جس کی وجہ سے یہ کمیونٹی سینٹر ایک انقلابی مرکز کی شکل اختیار کر گیا۔ حکومت نے ان سرگرمیوں کا نوٹس لیا۔ اسی دوران 13 نومبر 1971 کو علی شریعتی نے 'شیعہ ہونے کی ذمہ داری' پر اپنا مشہور خطبہ دیا۔ اس خطبے میں انہوں نے انقلابی شیعوں کو حضرت علیؑ کا حقیقی پیروکار بننے کی تلقین کی تھی اور انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی تھیں۔ ان سے کہا تھا کہ وہ ناانصافیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ موجودہ سیاسی و اقتصادی نظام کو اکھاڑ پھینکیں۔ اسی خطبے میں انہوں نے اپنا وہ مخصوص نعرہ بھی دیا تھا جو آٹھ سال بعد انقلاب ایران کے وقت ہر ایرانی کی زبان پر تھا، یعنی ''سال کا ہر مہینہ محرم ہے، مہینے کا ہر دن عاشور ہے اور زمین کا ہر ٹکڑا کربلا ہے''۔ شیعہ کلچر سے واقف کوئی بھی شخص اسے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اس خطبے میں علی شریعتی کا پیغام کتنا واضح تھا۔ اس خطبے کو دیے ہوئے ابھی تین ہفتہ ہوا تھا کہ حکومت ایران کی سیکورٹی فورسیز نے حسینیہ ارشاد کو بند کر کے علی شریعتی کی آواز کو خاموش کر دیا اور ان کی نگرانی کی جانے لگی۔ علی شریعتی کو جب نگرانی کا احساس ہوا تو وہ روپوش ہوگئے۔ لیکن سیکورٹی فورسیز نے ان کے والد محمد تقی شریعتی اور بہنوئی شریعت رضاوی کو بطور یرغمال گرفتار کر لیا۔ مجبوراً انہیں ستمبر 1973 میں خود سپردگی کرنی پڑی۔ جیل میں ان پر سیاسی سرگرمیوں سے توبہ کرنے اور ٹیلی ویژن پر معافی مانگنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا۔ اٹھارہ ماہ بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی رہائی کے لیے اس وقت الجزائر کے وزیر خارجہ عبدالعزیز بوتفلیقہ۔ جو شریعتی کو قیام پیرس کے زمانے سے جانتے تھے۔ نے شاہ ایران سے درخواست کی تھی۔ البتہ رہائی کے بعد بھی حکومت نے ان کی سخت نگرانی جاری رکھی۔ انہیں خرید نے اور ان کی عوامی شبیہہ کو بگاڑنے کی بھی کوششیں ہوئیں۔ ان کی سیاسی و سماجی سرگرمیاں تقریباً ختم ہوگئیں۔ اس صورتحال میں انہوں نے 16 مئی 1977 کو خاموشی کے ساتھ ایران چھوڑ دیا۔ وہ انگلینڈ چلے گئے۔ البتہ ساواک (ایرانی خفیہ ایجنسی) نے ان کے اہل وعیال پر سخت نظر رکھی اور جب جون 1977 میں ان کی بیوی پوران دو بچیوں کے ساتھ (تیسری بچی کو ایئرپورٹ پر روک دیا گیا تھا) لندن پہنچیں تو اسے علی شریعتی کے ٹھکانے کا علم ہوگیا۔ وہ 18 جون کو انہیں ساؤتھمپٹن میں اپنے کرایے کے مکان پر لائے اور 19 جون کی صبح میں ان کی لاش فرش پر پڑی ہوئی ملی۔ اسپتال کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ان کی موت کی وجہ عارضہ قلب بتائی گئی البتہ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں ایرانی خفیہ ایجنسی نے ہلاک کیا تھا۔ 26 جون 1977 کو علی شریعتی کی نعش دمشق لے جائی گئی اور انہیں سیدہ زینب (امام حسینؓ کی صاحب زادی) کے مزار کے قریب سپرد خاک کیا گیا۔ اس طرف ایک بڑے دانشور، قدآور سیاسی رہنما اور شعلہ بیان مقرر کا صرف 44 برس کی عمر میں خاتمہ ہوگیا۔

17.5.4 تصانیف:

علی شریعتی نے مختصر عمر کے باوجود اپنے پیچھے کافی بڑا تحریری سرمایہ چھوڑا، ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں ان کی دو مشہور

کتابوں ''ابوذر غفاریؓ'' اور ''اسلام شناسی'' کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

1 - ابوذر غفاریؓ: یہ کتاب بنیادی طور پر علی شریعتی کے ایک معاصر مصری مصنف عبدالحمید جودت السحر کی عربی تصنیف کا فارسی ترجمہ ہے۔ البتہ اس میں علی شریعتی نے اپنے خیالات، تبصرے اور تحقیقات بھی شامل کر دی ہیں جن سے اس کی اہمیت اور افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اسے مستقل تصنیف کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ ابوذر غفاریؓ کی شکل میں علی شریعتی نے ایک ہیرو، ایک ماڈل (نمونہ) اور ایک علامت تخلیق کی ہے جو غریب، مظلوم اور سماجی طور پر باشعور شخص کے ''حقیقی اسلام'' کو بچانے کے لیے دولت اور اقتدار کو اپنی ٹھوکر میں رکھتا ہے اور مذہبی اتھارٹی کو بھی چیلنج کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستان حیات ہے جو مملکت اسلامیہ کے ایک عظیم حکمران کے سامنے اپنے مخالفانہ خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا انقلابی مسلمان ہے جو اخوت، مساوات، انصاف اور حریت کا درس دیتا ہے۔ علی شریعتی نے اس کتاب میں ابوذرؓ کی شخصیت کو دریافت کر کے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ سماجی انصاف، مساوات، حریت اور سوشلزم کے جو تصورات مغربی دانشوروں کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں وہ دراصل اسلامی ورثے کے اجزائے لاینفک ہیں۔ وہ پورے فخر کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انقلاب فرانس کے بعد مساوات انسانی کے جو مکاتب فکر ابھرے ہیں، ابوذر ان کے جدامجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا علی شریعتی نے بیس برس کی عمر سے لے کر اپنی وفات تک (24 برس) ابوذرؓ کو اپنی ہیرو ورشپ کا مرکز اور عقیدتوں کا محور بنائے رکھا۔ انہوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو ایک بہت ہی راست باز، حق گو اور ذمہ دار مسلمان قرار دیا ہے جس نے حضور نبی پاکؐ کے مساوات اور اخوت انسانی پر مبنی اسلام سے 'انحراف' کی مزاحمت کی تھی۔ انہوں نے کھل کر یہ بات کہی ہے کہ میں ابوذرؓ کا پیروکار ہوں اور انہی کا اسلام شیعیت کا نصب العین ہے۔ علی شریعتی کی وفات کے بعد ان کے دوست احباب انہیں اپنے دور کا ابوذر کہہ کر یاد کرتے تھے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے حضرت ابوذر کے کردار کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

2 - اسلام شناسی: اسلام شناسی علی شریعتی کی معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل علی شریعتی کے ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مشہد یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے موضوع پر دیے تھے۔ ان خطبات میں انہوں نے اپنے ان تصورات کا خاکہ پیش کیا تھا جو ان کی آئندہ کی زندگی میں ان کا مشن بنے رہے۔ اس کتاب میں سب سے پہلے انہوں نے مغرب زدہ دانشوروں کا تعاقب کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا مبلغ علم غیر ملکی کتابوں کے تراجم ہوتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ بذات خود اجنبی افکار کا تجزیہ کریں اور اس حوالے سے کوئی نئی چیز پیش کر سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے روایتی علما کے طبقے پر بھی کاری ضرب لگائی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے ان کی کتاب فارسی زبان میں اسلام کا پہلا سائنسی اور تجزیاتی مطالعہ ہے۔ اسلام شناسی میں علی شریعتی نے 'حقیقی اسلام' کی چودہ امتیازی صفات بیان کی ہیں جو بقول ان کے مروجہ اسلامی تصور اور حقیقی اسلام کے بیچ خط امتیاز ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ علی شریعتی کی تنقید ساکت سمندر میں پتھر پھینکنے جیسی تھی۔ ان پر ہم عصر علماء نے تنقید کی کہ انہوں نے اسلام شناسی میں اسلام کی من مانی تشریح و تعبیر پیش کی ہے اور غیر شیعی ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر صفت کے بیان اور وضاحت کے لیے انہوں نے قرآن مجید، احادیث نبوی اور شیعہ اماموں کے علاوہ چاروں خلفا کے اقوال کے بھی حوالے دیے ہیں۔

علی شریعتی کے پیش نظر اسلام شناسی کی تصنیف کے ذریعہ تین مقاصد تھے:

1- اسلام کو ایک جدید، جمہوری اور مساوات انسانی کے علم بردار مذہب کے طور پر پیش کیا جائے اور اسی کو حقیقی اور مثالی اسلام قرار دیا جائے۔

2- ان رکاوٹوں کی نشان دہی کی جائے جو حقیقی اسلام کے نفاذ کے راستے میں حائل ہیں۔

3- یہ واضح کیا جائے کہ مسلمانوں پر اثبات توحید کے لیے کام کرنا فرض کیوں ہے؟ اور نفاذ اسلام کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں ان کو چیلنج کرنا ان کی ذمہ داری کیوں بنتی ہے۔

اس طرح اس کتاب میں علی شریعتی نے اسلام پر قدامت پسندی اور جدیدیت مخالف ہونے کے روایتی الزامات کو مسترد کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام سبھی جدید تصورات کا مخالف نہیں بلکہ وہ ان میں سے بعض تصورات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے اللہ کے رسولؐ کا ایک ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ ''مذہب اور عقل ایک ہی حقیقت ہیں''۔ سیاست کے حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ اسلام جمہوریت پر مبنی ہے، اس کی عمارت شوریٰ، اجماع اور آزادی فکر کے ستونوں پر استوار ہے۔ اجتہاد کا تصور اور مذہب کی آزادی بھی اسی کا حصہ ہیں۔ معیشت کے حوالے سے یہ لکھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام استحصال اور طبقاتی معاشرے کی تخلیق کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ وہ مکمل انصاف اور مساوات کے قیام کا داعی ہے، تمام انسان برابر ہیں کیونکہ سب آدم کی اولاد ہیں، مرد اور عورت ایک ہی نوع سے ہیں اور ایک ہی منبع کی پیداوار ہیں۔

علی شریعتی کی نظر میں روایتی علماء رجعت پسند ہیں اور اسلامی تعلیمات کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اسلام انفرادی اور نجی رسوم وعبادات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنا کہ اجتماعی مقاصد پر زور دیتا ہے ان کے خیال میں ان علما نے اسلام کو صرف انفرادی عبارتوں تک محدود کر رکھا ہے۔ یہ لوگ روحانیت کو انسان کے سماجی اور سیاسی کردار ادا کرنے کے جذبے کو سرد کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سیاسی جبر اور اقتصادی استحصال کا ساتھ دیتے ہیں۔ انہوں نے علماء پر الزام لگایا کہ وہ عوام کو جہالت اور توہمات کی دنیا میں مگن رکھنا چاہتے ہیں۔ شیعہ فقہا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ چونکہ ان کا گزارہ دولت مندوں کے منافع بخش کاروبار میں سے ایک خاص حصے پر ہوتا ہے اس لیے وہ املاک کی ملکیت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اس پر علی شریعتی کی علماء کے طبقے کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی اور انہیں دشمن دین وایمان قرار دیا گیا۔

17.6 آیت اللہ خمینی

بیسویں صدی عیسوی کا آغاز مسلم دنیا میں بیداری کی ایک نئی صبح کا پیغام لے کر آیا۔ یہ بیداری سیاسی بھی تھی اور اصلاحات واجتہاد کے حوالے سے مذہبی بھی تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جمال الدین افغانی کی اتحاد اسلامی کی کوششوں میں مذہب وسیاست کی یکجائی کے جو ابتدائی نقوش ملتے ہیں، بیسویں صدی کی مسلم مذہبی قیادت نے اسے فکری اور نظری اعتبار سے کافی استحکام عطا کر دیا، البتہ ایرانی مذہبی رہنما آیت اللہ روح اللہ خمینی عالم اسلام کی مذہبی قیادت میں شاید پہلی ایسی شخصیت تھے جنہوں نے جدید دنیا میں مذہب وسیاست کی یکجائی اور اس کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے قیام کی نظری طور پر دعوت دی بلکہ اسلامی حکومت کے اپنے نظریے کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ آیت اللہ خمینی کا امتیاز یہ

ہے کہ انہیں ایک مذہبی عالم اور روحانی پیشوا کے طور پر ہی عوامی مقبولیت اور حمایت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بطور سیاسی کارکن بھی انہیں اپنے حامیوں کی ایک بہت بڑی تعداد نصیب ہوئی جو ان کے تیار کردہ لائحۂ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جی جان سے اور ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ 1979 کے ایران کے عوامی انقلاب کے بعد دور جدید میں اسلامی بنیادوں پر ایران میں جو جمہوری حکومت قائم ہوئی اور جو انقلاب کے 35 برس بعد بھی مذہبی قیادت کے زیر سایہ اگر پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے تو اس کا اصل کریڈٹ آیت اللہ خمینی کو ہی جاتا ہے۔ اس پر گفتگو ہو سکتی ہے کہ مذہبی قیادت کو سیاسی امور میں مداخلت کرنی چاہیے یا نہیں، یا اگر کرنی چاہیے تو کس حد تک کرنی چاہیے، ایران کے خاص شیعہ تناظر میں خمینی نے انقلاب کے بعد سیاست پر مذہب کی بالادستی کی ایک مثال ضرور قائم کی ہے۔

17.6.1 خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی:

آیت اللہ خمینی کا تعلق موسوی سیدوں کے ایک ایسے خاندان سے تھا جس کا سلسلۂ نسب شیعہ حضرات کے ساتویں امام موسیٰ کاظم کے واسطے سے حضور نبی کریمؐ سے جا ملتا ہے۔ شروع میں یہ خاندان ایران کے مشہور شہر نیشا پور میں آباد تھا۔ بعد ازاں اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس خاندان کے لوگ ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے اور یہاں اودھ کی شیعہ ریاست میں لکھنؤ کے قریب کنتور نامی ایک قصبے میں آباد ہوئے۔ آیت اللہ خمینی کے دادا سید احمد مولوی یہیں کنتور میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے سید احمد مولوی ہندی کہلاتے ہیں۔ 1830 کے قریب سید احمد موسوی زیارت کی غرض سے مزارات کے شہر نجف تشریف لے گئے۔ یہیں پر ان کی ملاقات خمین نامی گاؤں کے ایک بہت بڑے تاجر اور زمیندار سے ہوئی جو بہت جلد عقیدت اور تعلق میں بدل گئی۔ اس تاجر نے سید احمد موسوی کی خوب خاطر مدارات کی اور انہیں اپنے گاؤں خمین میں آباد ہونے کی دعوت دی۔ سید احمد موسوی نے یہ دعوت قبول کر لی اور خمین جا کر اس گاؤں کے مذہبی رہنما بن گئے۔ یہیں انہوں نے اپنے میزبان کی صاحبزادی سکینہ سے شادی کر لی۔ ان کے چار بیٹوں میں سے ایک نام مصطفیٰ تھا۔ انہوں نے نجف میں اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی تھی اور خمین واپسی نے بعد ان کا شمار ممتاز علماء میں ہونے لگا تھا۔ سید مصطفیٰ موسوی ہندی کے چھ بیٹوں میں روح اللہ (خمینی) سب سے چھوٹے تھے اور ان کی پیدائش کے سات ماہ بعد ہی مصطفیٰ کو قتل کر دیا گیا۔ روح اللہ اپنے خاندان میں پہلے فرد تھے جن کے نام کے ساتھ خمینی (لاحقہ) کی نسبت لگی۔ اس سے پہلے یہ لوگ موسوی ہندی کہلاتے تھے۔

خمینی 24 ستمبر 1902ء کو وسط ایران کے ایک گاؤں خمین میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے چھ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ والدین نے ان کا نام روح اللہ رکھا البتہ وہ اپنے وطن خمین کی نسبت سے خمینی کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش و پرداخت ان کی والدہ صاحبہ آغا خانم اور پھوپھی صاحبہ نے کی۔ چھ سال کی عمر میں خمینی نے رسمی تعلیم کا آغاز کیا۔ ابتدا قرآن مجید کی تعلیم اور ابتدائی فارسی سے ہوئی۔ اگلے برس انہوں نے ایک سرکاری اسکول -ان دنوں اسکولوں کو مکتب کہا جاتا تھا- میں داخلہ لیا۔ مکتب کی تعلیم کے دوران انہوں نے عربی، فارسی، شاعری اور خوش خطی وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہیں پر انہوں نے قرآن مجید کے آخری سپارے زبانی یاد کیے۔ آں حضرتؐ کی حیات اور بارہ شیعہ اماموں کے بارے میں بھی ابتدائی معلومات انہیں یہیں حاصل ہوئی۔ یہیں پر انہوں نے حدیث کی ایک کتاب اور شیعہ تاریخ کا مطالعہ بھی کیا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ روح اللہ خمینی عربی فارسی شاعری، خطاطی، فلسفے اور مذہبی علوم کے حصول میں آگے بڑھتے رہے۔ فارسی و عربی کے ہزاروں اشعار انہیں زبانی یاد تھے اور وہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چونکہ روح اللہ خمینی اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل

کر کے شیعہ مجتہد بننا چاہتے تھے، جو خمین میں رہتے ہوئے ممکن نہیں تھا، شیعوں کے اہم علمی مرکز نجف جانے کے لیے جس علم کی انہیں ضرورت تھی وہ ابھی انہیں حاصل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ان دنوں عراق کے حالات ایسے تھے کہ وہ نجف جاتے اس لیے انہوں نے خمین سے قریب تر علمی مرکز اصفہان کا رخ کیا۔

اصفہان ان دنوں ایران میں شیعی علوم کا ایک بڑا مرکز تھا، البتہ روح اللہ خمینی نے وہاں پہنچنے کے بعد ایک بڑے شیعہ عالم شیخ عبدالکریم حائری یزدی کی شہرت سنی۔ شیخ عبدالکریم حائری عراق میں سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے۔ جو عراق میں برطانیہ کی مخالفت میں ہو رہے تھے۔ کربلا چھوڑ کر ایران چلے آئے تھے اور یہاں اصفہان سے قریب سلطان آباد میں ان کا قیام تھا۔ روح اللہ خمینی، جن کی عمر اس وقت 17 برس تھی اور جیسا کہ ذکر ہوا وہ نجف جانے کی زبردست خواہش رکھتے تھے، نجف تو نہ جا سکے البتہ سلطان آباد میں انہیں نجف کے ایک بڑے عالم سے استفادے کا موقع مل گیا۔ اس زمانے میں قُم ایک اہم شیعی علمی مرکز کے طور پر ابھر رہا تھا، ایران میں اس شہر کی اہمیت یوں بھی ہے کہ یہیں پر شیعوں کے آٹھویں امام رضا کی بہن معصومہ کا مزار بھی ہے۔ عثمانی حکومت کے زوال کے بعد عرب کے جو علاقے برطانیہ کے قبضے میں آ گئے تھے، ان علاقوں کو چھوڑ کر بہت سے علماء ایران کا رخ کر رہے تھے اور یہاں پر قُم ان کے لیے ایک بہترین جگہ تھی۔ شیخ عبدالکریم حائری یزدی 1921 میں زیارت کی غرض سے قُم گئے اور یہاں پر ان کا زبردست استقبال ہوا۔ علماء کی درخواست پر انہوں نے اپنا علمی حلقہ قُم منتقل کر لیا اور اس طرح روح اللہ خمینی بھی سلطان آباد سے قُم کے علمی مرکز منتقل ہو گئے۔ یہاں پر انہوں نے مختلف مذہبی علوم کے ماہر اساتذہ سے استفادہ کیا خاص طور پر فقہ اور اصول فقہ کی کتابیں آیت اللہ علی یثربی کاشانی سے پڑھیں اور پھر اس کے بعد شیخ عبدالکریم حائری کے درس میں شامل ہو گئے۔ قُم میں شیخ عبدالکریم حائری کسی مخصوص فن یا کتاب کا درس دینے کے بجائے خارج از درس موضوعات پر لکچر دیا کرتے تھے۔ ان لکچرس سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ طلبہ کے اندر تجسس اور تحقیق کا جذبہ بے دار ہو اور وہ قانونی وفقہی مسائل پر آزادانہ اپنی رائے ظاہر کرنے کے لائق بن جائیں۔ 1930 کے اوائل میں روح اللہ خمینی کو مجتہد کی اعلیٰ سند دے دی گئی۔ قُم کے چار ممتاز ترین اساتذہ نے انہیں روایت حدیث کی سند عطا کی۔ تکمیل تعلیم کے ساتھ ہی روح اللہ خمینی کی تہران کے ایک آیت اللہ کی بیٹی بتول سے شادی ہو گئی۔ ان سے ان کے یہاں دو بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

حائری اور کاشانی کے علاوہ روح اللہ خمینی اپنے جس استاد سے بہت زیادہ متاثر تھے وہ تھے مرزا محمد علی شاہ آبادی، جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ خمینی نے حکومت کی پالیسیوں پر تنقید اور عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کا سبق انہیں سے سیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا محمد علی شاہ آبادی توکل کے رائج مفہوم پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ عام لوگوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے اور انہیں منظم کرنے کی منصوبہ بندی پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ اپنے خیالات ونظریات کو زیادہ سے زیادہ آسان اور سادہ زبان میں پیش کیا کریں تا کہ عام لوگوں کو ان کی باتیں سمجھنے میں پریشانی نہ ہو اور وہ آسانی کے ساتھ ان کے حمایتی اور ہم نوا بن جائیں۔ اس کے لیے وہ اللہ کے رسولؐ کی اس حدیث کا حوالہ بھی دیتے تھے کہ ''بات کرتے وقت اپنے مخاطب کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھا کرو''۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے شاگرد خمینی نے ان کی ان نصیحتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لیا اور زندگی بھر ان کے مطابق عمل کرتے رہے۔ مرزا محمد علی شاہ آبادی اپنے شاگردوں کو مسلمانوں کی مشکلات ومسائل دور کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہنے کی تلقین کرتے رہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے چار اصول وضع کیے تھے:

1- اپنے مذہبی خیالات اور مفید سرگرمیوں کی تشہیر کے لیے رسالے جاری کیے جائیں۔

2- کفایت شعاری کو مشعل راہ بنایا جائے گا تا کہ زندگی اچھی گزر سکے، عادات بد سے جلد از جلد چھٹکارا مل جائے۔

3- ملکی ضروریات پوری کرنے اور باہر بھیجنے کے لیے مصنوعات تیار کی جائیں۔ اس کام کے لیے اسلامی کمپنیاں قائم کی جائیں۔

4- غیر سودی قرضوں کے اجراء کے لیے فنڈ قائم کیے جائیں۔

17.6.2 عملی زندگی:

27 برس کی عمر میں رسمی تعلیم کی تکمیل اور مجتہد کی سند حاصل کرنے کے بعد روح اللہ خمینی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز قم میں بطور استاد کیا۔ استاد کے طور پر انہوں نے درس و تدریس کا ایک انداز اختیار کیا اور مذہبی حلقوں میں 'بحث برائے بحث' کی جو روایت قائم ہو گئی تھی خمینی نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اس کے برعکس انہوں نے یہ طریقہ اپنایا کہ طلبہ کے سامنے کوئی مثبت موضوع پیش کر دیتے، پھر ان کے سامنے اس موضوع پر دوسرے لوگوں کی جو رائیں ہوتیں انہیں پیش کرتے اور آخر میں اپنی رائے ظاہر کرتے اس طرح طلبہ کے سامنے مسئلے سے متعلق تمام پہلو آجاتے اور ان کے لیے اسے سمجھنا آسان ہو جاتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ قم میں ان کے مداح طلبہ کا ایک حلقہ قائم ہو گیا۔ رسمی تدریس کے ساتھ ہی خمینی نے 1930 کی دہائی میں اخلاقیات پر عوامی لکچر کا سلسلہ بھی شروع کیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ عوام کی اخلاقی حالت بگڑ چکی ہے اور معاشرہ اخلاقی طور پر کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ عوامی لکچر کے لیے خمینی نے قم کے فیضیہ اسکول کا انتخاب کیا جو بازار میں مزار فاطمہ سے ملحق تھا۔ جمعرات اور جمعے کو ان کے لکچر ہوتے اور لوگ بڑی تعداد میں یہاں تک کہ تہران سے بھی لوگ ان لکچرس کو سننے کے لیے قم پہنچتے تھے۔ البتہ خمینی کی یہ عوامی مقبولیت حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھی اس لیے حکومت نے دباؤ ڈال کر ان کے لکچرس کی جگہ ایک غیر معروف علاقے میں تبدیل کر دی۔ 1941 میں اتحادیوں کے ایران پر قبضے کے بعد انہوں نے پھر سے فیضیہ اسکول میں لکچرس دینے شروع کر دیے۔

خمینی نے 1930 کی دہائی میں حکومت کے دباؤ کا تو مقابلہ کر لیا البتہ 1940 کی دہائی میں ان کی مخالفت معاصر علماء نے شروع کر دی کیونکہ وہ اپنے سامعین کو جہنم سے ڈرانے اور جنت کی خوش خبری سنانے کے بجائے لوگوں کو حق و باطل کا فرق، مذہبی شعور، ضبط نفس اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب بتاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خمینی کو عوامی لکچرس کا سلسلہ بند کر دینا پڑا جو تین سال تک جاری رہا۔ اس دوران خمینی نے خود کو صرف فقہ کی تدریس تک محدود رکھا اور اپنے گھر پر مخصوص شاگردوں کے سامنے ہی سیاسی خیالات کا اظہار کرتے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد انہوں نے ایک بار پھر اپنے خیالات دینی اور عوامی دونوں طرح کے لکچرس میں ظاہر کرنے شروع کیے، ان لکچرس میں انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ سیاست بھی اسلام کا حصہ اسی طرح ہے جس طرح فلسفہ، تصوف اور فقہ وغیرہ علوم۔ اس دوران ایران کی سیاست پر ڈاکٹر مصدق چھائے ہوئے تھے البتہ خمینی ان پر یہ تنقید کرتے تھے کہ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ طاقت ور ہونے کے باوجود کمزور بادشاہ سے قوم کو نجات نہیں دلا سکے۔

1960 کی دہائی کے آغاز میں خمینی کی قائدانہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگیں جب کہ اس سے پہلے ہی وہ بطور مذہبی رہنما اور

کامیاب معلم اپنی صلاحیتوں کو منوا چکے تھے۔قم کے طلبہ اور اساتذہ سبھی لیے ان کی شخصیت میں بہت زیادہ کشش تھی۔تقریباً تین دہائیوں کی تدریسی محنت اب رنگ لا چکی تھی۔ان کے دوسو سے زائد شاگرد نہ صرف ایران بھر میں بلکہ بیرون ملک بھی مختلف شیعہ مراکز میں پھیلے ہوئے تھے جو نمازوں کی امامت کراتے، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دیتے، تبلیغی فرائض انجام دیتے اور مختلف مذہبی و دیگر تقریبات میں ایک بااثر اور عظیم آیت اللہ کی نمائندگی کرتے تھے۔صرف طلبہ ہی نہیں ایران کے مذہبی رہنما بھی اب انہیں مستقبل کے عظیم مذہبی لیڈر کے طور پر پیش کرنے لگے تھے۔یہ حالات تھے جس میں خمینی نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔اس طرح کا پہلا موقع اکتوبر 1962 میں سامنے آیا جب حکومت نے بعض اصلاحات نافذ کرنا چاہیں، خمینی نے ان اصلاحات کو مذہب دشمن قرار دیا البتہ تنہا سامنے آنے کے بجائے انہوں نے قم کے ممتاز علماء کو بھی اپنے ساتھ لیا۔جنوری 1963 میں شاہ ایران نے ایک چھ نکاتی اصلاحات بل نافذ کرنے کا فیصلہ کیا جس میں اراضی کے قوانین، انتخابی قوانین اور خواتین سے متعلق قوانین شامل تھے۔قم میں اس کی زبردست مخالفت ہوئی، شدید ہنگامے اور خوں ریز تصادم بھی ہوئے اور اس کے نتیجے میں خمینی کو گرفتار کر کے تہران بھیج دیا گیا۔البتہ ایک سال بعد جب وہ قم واپس لوٹے تو محض ایک آیت اللہ نہ تھے بلکہ اب ان کے ہاتھ میں علماء کی سیاسی قیادت آ چکی تھی۔بعد ازاں جب ایرانی پارلیمنٹ نے امریکی فوج کو ملک میں قیام کے خصوصی حقوق دیے تو اس کی بھی خمینی نے کھل کر مخالفت کی، حکومت نے انہیں دوبارہ گرفتار کر کے تہران پہنچا دیا اور پھر انہیں جلاوطن کر دیا گیا۔پہلے وہ ترکی گئے اور پھر عراق میں نجف میں قیام کیا۔خمینی یہاں بھی خاموش نہیں بیٹھے، نجف کے علما کو حرکت میں لائے اور بیرون ملک ایرانی طلبہ تنظیموں سے روابط قائم کیے۔نجف میں رہتے ہوئے خمینی نے 21/جنوری 1970 سے 8/فروری 1970 تک اسلامی حکومت کے نام سے ایک سلسلۂ خطبات شروع کیا (بعد ازاں ان خطبات کو اسلامی حکومت کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا اور اسے خمینی کی سب سے اہم کتاب باور کیا جاتا ہے) ان خطبات میں خمینی نے مسلم دنیا کی بے چارگی و بے بسی، اغیار کی چالوں اور مسلمان حکومتوں کی کارکردگی پر روشنی ڈالی، خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف یہودیوں، عیسائیوں، استعمار اور نوآبادیائی طاقتوں کی سازشوں اور عزائم کو اجاگر کیا اور ساتھ ہی مسلم حکمرانوں میں جو ان طاقتوں کے آلۂ کار اور خوش آمدی بنے ہوئے تھے ان کی بھی زوردار انداز میں مذمت کی۔خمینی نے ان خطبات میں علما کے کردار پر بھی سوال اٹھائے جو اس وقت چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل میں الجھے ہوئے تھے، انہوں نے علما کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ وہ اپنی اصل ذمہ داریوں کو سمجھیں اور اسلامی قوانین اور نظام کو اپنی بات چیت کا موضوع بنائیں۔طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے خمینی نے انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور علما سے کہا کہ وہ حکومت کے مختلف شعبوں، انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ سے متعلق ذمہ داریاں سنبھالنے کی تیاری کریں۔ان کاموں کی عملی تربیت کے لیے انہوں نے ایک لائحہ عمل بھی مرتب کیا اور اس کے مطابق مدرسوں اور دینی مراکز میں کام بھی شروع ہوا۔خمینی کے یہ خطبات اور دیگر خطبات بھی کتابچوں اور آڈیو کیسٹوں کی شکل میں ایران بھر میں پہنچتے تھے اور انہیں دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ان چیزوں نے خمینی کی عوامی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔اسی دوران 1971 میں ایران میں بادشاہت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن منانے کا حکومت کا فیصلہ ایک ایسا کام تھا جس نے شاہ کے خلاف عوامی جذبات کو بھڑکانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔اسی دوران 1978 کے اوائل میں ایران کے روزنامہ ''اطلاعات'' میں خمینی کے بارے میں ایک توہین آمیز بیان شائع ہو گیا، اس کے خلاف ایران بھر میں سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں مظاہرے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ پرتشدد تصادم میں تبدیل ہو گئے۔اس موقع پر خمینی نے فرانس کے اخبار 'لی ماندے' کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اپنے اس اعلان سے سب کو حیران کر دیا کہ اب پہلوی خاندان کو اکھاڑ پھینکنے کا وقت آ گیا ہے اور اب مثالی اسلامی

حکومت کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے۔ اس تک حالات یہ ہو گئے تھے کہ خمینی اپوزیشن کے غیر متنازعہ رہنما بن چکے تھے۔ انہوں نے ایرانی فوج سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسے شاہ کے خلاف عوامی تحریک میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اس دوران انہوں نے خود کو ایک ترقی پسند اسلامی مذہبی رہنما کے طور پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی چنانچہ پیرس کی ایک تقریر میں انہوں نے اپنا یہ تاریخی بیان بھی دیا کہ ''اسلام میں عورتیں بھی صدر مملکت بن سکتی ہے'' اور یہ کہہ کر اپنے بہت سے ناقدین کو خاموش کر دیا کہ اسلامی سزاؤں کا اس وقت تک نفاذ نہیں ہو گا جب تک اسلام کے مکمل معاشرتی عدل کے لیے کافی تیاریاں نہ کر لی جائیں۔ اسی دوران 11-10 دسمبر 1978 (10-9 محرم) کو ایران کے دارالحکومت تہران میں شاہ مخالف زبردست عوامی مظاہرے ہوئے اور خمینی کی واپسی کا زبردست مطالبہ کیا گیا۔ 16 رجنوری 1979 کو شاہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ایران چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے دو ہفتوں بعد خمینی پیرس سے تہران پہنچے۔ یہاں ان کی حیثیت ایک فاتح قائد انقلاب کی تھی۔

انقلاب کے بعد خمینی نے ایران کو ایک اسلامی جمہوریہ، جس کی وہ اب تک زبانی تبلیغ کر رہے تھے، بنانے کا کام شروع کیا۔ مخصوص شیعہ پس منظر میں اس بات کی پوری گنجائش ہے کہ خمینی کی نظریاتی ریاست سے اختلاف کیا جائے تاہم اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو سکے کہ شیعہ دینیات کے حوالے سے خمینی نے انقلاب کے بعد ایران میں ایک ایسی جمہوری عوامی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس میں اقتدار کی اصل کنجیاں مذہبی قیادت کے پاس ہوئی ہیں، جس کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ وہ خدا، رسول اور اماموں کے اصولوں کے خلاف کوئی کام نہیں کرے گی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خمینی نے بہ حیثیت سیاست داں اور مدبر و منتظم اس بات کی پوری کوشش کی کہ ایران کی مذہبی مقتدرہ، سیاست داں، منتظم اور عدلیہ کے ارکان شریعت کی مقرر کردہ حدود اور سیاسی مصلحتوں کے تابع رہیں۔ وہ حالات کے دباؤ کو سہہ سکیں اور بوقت ضرورت نازک امور پر اہم فیصلے بھی لے سکیں۔ خمینی اپنی وفات (3 رجون 1989) تک اس بات کے لیے پورے طور پر کوشاں رہے کہ ایران کی اسلامی حکومت کی بقا اور تسلسل کا انتظام کر جائیں۔ انہوں نے مثالیت پسند بننے سے زیادہ عملیت پسندی (Pragmatism) کا مظاہرہ کیا۔ ان کی کوشش رہی کہ ملک میں اندر سے اور بتدریج تبدیلیاں لائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بعض ان چیزوں کو بھی مباح قرار دیا جنہیں ماضی میں حرام اور ممنوع خیال کیا جاتا تھا مثال کے طور پر مانع حمل دواؤں کا استعمال، شطرنج کھیلنا، آلات موسیقی کی خرید و فروخت اور ملکیت زمین میں تبدیلی کے بعض قواعد وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایران میں خمینی ایک ایسی اسلامی حکومت کے لیے کوشاں رہے جو مذہب کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے خود کو جدید تقاضوں اور حالات سے ہم آہنگ کر سکے۔ ظاہری بات ہے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کے پیروکار آج بھی اس حوالے سے دو گروپوں میں تقسیم ہیں۔ ایک گروپ کا کہنا ہے کہ مذہبی رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ سیاست کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دیں، انہیں خود کو صرف مذہبی امور تک محدود رکھنا چاہیے جب کہ دوسرا گروپ اس کا قائل ہے کہ ملکی معاملات کو صرف سیاست دانوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ ملکی معاملات میں بھی مذہبی طبقے کی براہ راست مداخلت کا راستہ کھلا رہنا چاہیے۔ ایران کی موجودہ قیادت کے لیے یہ ایک بڑا چیلنج ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی اور آنے والے دنوں میں بھی اس چیلنج کے باقی رہنے کی امید ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ علی شریعتی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کہاں اور کب گئے؟

2۔ علی شریعتی کی کسی ایک تصنیف کا نام لکھیں۔

3۔ آیت اللہ خمینی کو خمینی، کیوں کہا جاتا ہے؟

4۔ ایران میں بادشاہت کا ڈھائی ہزار سالہ جشن کب منایا گیا؟

17.7 خلاصہ

اس اکائی میں عرب وعجم دونوں کی اعلیٰ علمی وعملی مہارتوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ عبدالرحمٰن کواکبی۔ جدید عرب قومیت کا باوا آدم کہا جاتا ہے حالانکہ ان کا تصور قومیت وسیع تر عرب اسلامی اتحاد کی خواہش کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور اس سے ان کا مقصد مسلم عرب دنیا کو جہالت و پسماندگی سے نکال کر علم وترقی کی راہ پر ڈالنا تھا۔ امیر شکیب ارسلان کو جمال الدین افغانی کی ادبی روایت کا امین کہا جاتا ہے۔ انہوں نے جدید عرب دنیا کی فکر پر اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ انہوں نے عملی طور پر بھی اتحادی اسلامی کی بقا کے لیے کوششیں کیں۔ علی شریعتی ایران میں اسلامی بےداری کے فکری امین باور کیے جاتے ہیں اور انہوں نے ایران میں صفوی شیعیت کو علوی شیعیت کی طرف لے جانے کی کامیاب کوشش کی، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایران کے انقلاب (اسلامی) کے فکری بنیاد کار علی شریعتی ہی ہیں۔ امام خمینی کو ایران کے اسلامی انقلاب کے حوالے سے جانا جاتا ہے۔ وہ جدید ایران کے ایک مذہبی عالم اور روحانی پیشوا تھے اور انہوں نے عملی طور پر ایرانی انقلاب کی قیادت کی۔ انہوں نے شیعہ سنی اختلاف بھی کم کرنے کے اقدامات کیے۔ اور اتحاد اسلامی کی دعوت بھی دی۔

17.8 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ عبدالرحمان کواکبی کے اوصاف وخدمات پر ایک مضمون لکھیں۔

2۔ امیر شکیب ارسلان کی تصنیفی خدمات کا جائزہ لیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3۔ علی شریعتی کی حیات وخدمات کا جائزہ لیں۔

4۔ آیت اللہ خمینی کے خاندانی پس منظر اور ابتدائی زندگی کا تعارف کرائیں۔

17.9 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ تاریخ فکر اسلامی: محمد اجتباء ندوی

2۔ نئی عرب دنیا: یونس نگرامی

3۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (سوم چہارم): ثروت صولت

4۔ امام خمینی: شخصیت اور نصب العین: موسیٰ خان جلال زئی

5۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے معمار: علی رہنما

اکائی 18: مالک بن نبی، مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر فضل الرحمان

اکائی کے اجزاء

18.1 مقصد

اس اکائی میں مسلم دنیا کے نسبتاً جدید ترین مفکرین و مصلحین کو متعارف کرایا گیا ہے، ان میں سے ایک مالک بن نبی کا تعلق الجزائر سے ہے تو دوسرے مصطفیٰ سباعی شام سے متعلق ہیں۔ ان کا شمار اخوان المسلمون کی قیادت کی دوسری پیڑھی میں ہوتا ہے اور حدیث پر اپنے غیر معمولی کام کی وجہ سے وہ علمی دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ اور فضل الرحمان کا تعلق برصغیر سے ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے یہاں روایت و جدیدیت کا بہترین امتزاج ملتا ہے تو فضل الرحمان روایت سے ہٹ کر جدیدیت کی دعوت دینے والے مفکر کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ طلبہ ان شخصیات کے مطالعے سے مسلم دنیا کے نسبتاً جدید فکری دھارے کو سمجھنے کے اہل ہوسکیں گے۔

18.2 تمہید

مالک بن نبی ہوں، مصطفیٰ حسن سباعی ہوں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ ہوں یا ڈاکٹر فضل الرحمان ان میں سے ہر ایک نے علمی دنیا میں اپنی ایک الگ اور نمایاں پہچان بنائی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی ان کی فکر سے اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن ہر ایک کے پیچھے پیروکاروں کی تعداد ہے اور یہی ان کے فکر و عمل کے مطالعے کو Relevant بناتی ہے۔

18.3 مالک بن نبی

عہد حاضر میں مسلم دنیا اور مسلمانوں کی پسماندگی اور زوال و انحطاط کو لے مسلم دنیا کے مفکرین اور دانشوروں میں دو طرح کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور دونوں رجحانات کے حاملین اپنے اپنے طور پر نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے زوال و پسماندگی پر غور وفکر کرتے رہے ہیں بلکہ اپنے اپنے دائروں میں رہتے ہوئے اس زوال و پسماندگی کو دور کرنے کے لیے ممکنہ حل بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ پہلے رجحان کے حاملین کا ماننا یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال و پسماندگی کے اسباب خود ان کے اپنے اندر اور اپنے سماجی تانے بانے میں موجود ہیں، یعنی مسلمان اپنے زوال و پسماندگی کے ذمہ دار خود ہیں اس لیے اگر انہیں اس زوال و پسماندگی سے نکل کر تعمیر و ترقی کے راستے پر آگے بڑھنا ہے تو انھیں اپنی تعلیمی، اقتصادی و سیاسی پس ماندگی کو خود ہی دور کرنا ہوگا۔ دوسرے رجحان کے حاملین کا ماننا ہے کہ خود مسلمانوں کی جانب سے بھی بعض کمیاں ضرور رہی ہیں تاہم ان کے زوال و پسماندگی کے اسباب اندرونی سے زیادہ بیرونی ہیں۔ خاص طور سے مغربی استعمار نے مسلم علاقوں پر صرف قبضہ ہی نہیں کیا بلکہ ایسے اقدامات بھی کیے کہ مسلمان ایک طویل عرصے کے لیے زوال و پسماندگی کے گڑھے میں چلے جائیں۔ اس رجحان کے حاملین کا کہنا ہے کہ جب تک مسلمان استعمار اور استعماری عزائم سے نجات حاصل نہیں کر لیتے اور استعمار کی جو مختلف شکلیں مسلم دنیا میں موجود ہیں ان سے خود کو آزاد نہیں کرا لیتے محض اندرونی اصلاحات انہیں تعمیر و ترقی کے راستے پر نہیں ڈال سکتیں۔ الجزائری مفکر و دانشور مالک بن نبی بیسویں صدی کی مسلم دنیا کے ایک ایسے ہی مفکر ہیں جنہوں نے مغربی استعماری و تہذیبی غلبے کے خلاف فکری جدوجہد کی اور بتایا کہ مسلمانوں کو اگر اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہے، انہیں اپنے ماضی کی بازیافت کرنی ہے تو اس کے لیے انہیں استعمار کی تمام شکلوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہوگی۔ ان کی تعمیر و ترقی کے دروازے اسی وقت کھلیں گے جب وہ تمام طرح کے استعمار سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔

18.3.1 ابتدائی زندگی:

مالک بن نبی کا نام مالک ہے، والد کا نام عمر بن خضر بن مصطفیٰ بن نبی تھا۔ وہ 1905 میں الجزائر کے ایک شہر قسطنطنیہ (یہ ترکی کے مشہور شہر قسطنطنیہ جواب استنبول ہے سے الگ ہے) میں پیدا ہوئے البتہ وہ زیادہ دنوں قسطنطنیہ میں رہے نہیں کیونکہ ان کے بچپن کے زمانے میں ہی ان کے خاندان کے لوگ الجزائر کے ہی ایک دوسرے شہر تبسہ منتقل ہو گئے تھے۔ یہیں پر ان کا بچپن گزرا اور یہیں پر انہوں نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم آغاز مقامی مکتب میں قرآن مجید کی تعلیم سے ہوا، اسی دوران ان کا داخلہ المدرسۃ الابتدائیۃ (پرائمری اسکول) میں ہو گیا جہاں انہوں نے ابتدائی درجات میں نمایاں طالب علم کے طور پر کامیابیاں حاصل کیں۔ بعد میں ثانوی تعلیم کے حصول کے لیے وہ قسطنطنیہ گئے جہاں وہ سرکاری تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے قسطنطنیہ کے بڑے اساتذہ مذہبی علوم شیخ ابن العابد اور شیخ مولود بن مہنا کے درس میں شرکت کرتے جو ان دنوں الجامع الکبیر میں پڑھایا کرتے تھے۔ مالک بن نبی کو بچپن سے ہی مطالعے کا بہت زیادہ شوق تھا چنانچہ انہوں نے ثانوی تعلیم کے زمانے میں ہی جاہلی، اموی اور عباسی دور کی شاعری کا مطالعہ کر لیا تھا۔ عرب شعراء میں امرؤالقیس، عنترہ، فرزدق، اخطل اور ابونواس کی شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انہیں جدید عربی شاعری سے بھی خاص دلچسپی تھی چنانچہ جدید مکتب فکر کے شعراء میں حافظ ابراہیم اور معروف رصافی اور مہجری شعراء میں خلیل جبران اور ایلیا ابو ماضی کا اثر قبول کیا۔ قسطنطنیہ میں جہاں ان کا قیام تھا،

اس کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا جس کے قریب ہی جمعیۃ العلماء المسلمین الجزائرین (جمعیت علماء اسلام الجزائر) کے صدر شیخ عبدالحمید بادیس کا دفتر تھا۔ قسطنطنیہ میں قیام کے دوران مالک بن بنی نے ایک طرف الجامع الکبیر کے اساتذہ سے مذہبی علوم میں استفادہ کیا تو دوسری طرف شیخ بادیس کے سیاسی واصلاحی افکار سے بھی متاثر ہوئے۔

1930 میں مالک بن بنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے فرانس گئے جہاں ان کے خواہش تھی کہ انہیں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز (Institute of Oriental Studies) میں داخلہ مل جائے لیکن ایسا نہیں ہوسکا، چونکہ الجزائر میں انہوں نے جدید تعلیم حاصل کررکھی تھی اس لیے پہلے انسٹی ٹیوٹ آف ریڈیولوجی میں داخلہ لیا پھر انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹری سٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی اور 1935 میں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرلی۔ فرانس میں اپنی تعلیم کے دوران مالک بن بنی نے مغربی یورپی سماج کو بہت قریب سے دیکھا اور مغربی افکار و خیالات کا مطالعہ بھی کیا۔ یہاں وہ مغرب زدگی کے سیلاب سے نہ صرف یہ کہ خود بچے رہے بلکہ ان اسباب کو جاننے کی کوشش بھی کی جو مسلم نوجوانوں کو مغربی تہذیب کا اسیر بنا دیتے ہیں۔ فرانس میں انجینئرنگ کی تعلیم کے بعد مالک بن بنی اپنے ملک الجزائر واپس لوٹے تو وہ محض ایک انجینئر ہی نہ تھے بلکہ ایک ایسی فکر کے حامل تھے جو فرانسیسی استعمار کے تحت الجزائر میں پیدا ہونے اور فرانس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود فرانس کے الجزائر پر قبضے کو نہ صرف یہ کہ ناپسند کرتا تھا بلکہ الجزائر کو فرانسیسی استعمار سے آزادی بھی دلانا چاہتا تھا۔ مالک بن بنی نے ہم عصر اسلامی احیاء کی تحریکات اور ان کے رہنماؤں کے افکار وخیالات کا مطالعہ بھی کررکھا تھا چنانچہ انہوں نے بھی سیکولر نظام کے برعکس اسلام کو ایک متبادل نظام جہات کے ساتھ پیش کیا اور اس جانب نوجوانوں کو دعوت دی۔

18.3.2 عملی زندگی

ان افکار وخیالات کے ساتھ مالک بن بنی کے لیے، گوکہ انہوں نے فرانس سے اعلیٰ تکنیکی تعلیم حاصل کررکھی تھی، الجزائر میں، جو فرانس کے زیر قبضہ تھا، ان کے لیے مواقع بہت ہی کم تھے۔ اس کے باوجود مالک بن بنی نے خود کو الجزائر میں (settle) کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں رہ سکے کیونکہ جس طرح کے خیالات وہ رکھتے تھے اور جن کا وہ لوگوں میں تبلیغ بھی کرتے تھے، ان کے چلتے ان کے لیے الجزائر کی زمین کا تنگ ہوجانا ضروری تھا۔ چنانچہ فرانسیسی استعمار نے پہلے تو انہیں لالچ دے کر خاموش کرنا چاہا لیکن جب ایسا ممکن نہ ہوسکا تو پھر دھمکی اور سزا پر اتر آیا تاکہ انہیں ان کے مشن سے دور کردیا جائے۔ انہیں طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں یہاں تک کہ ان کے والد کو سرکاری نوکری سے نکال دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الجزائر کی زمین مالک بن بنی پر تنگ ہوگئی اور انہیں الجزائر چھوڑنا پڑا۔

الجزائر میں قیام کے دوران مالک بن بنی نے ایک متحرک شخص کی طرح الجزائری مسلمانوں کو فرانسیسی استعمار کے خطرے سے آگاہ کیا۔ انہوں نے انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ استعمار صرف سیاسی طور پر ہی قابض نہیں رہتا بلکہ قوموں کو ذہنی اور فکری طور پر بھی اپنا غلام بنالیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ استعمار کا مقابلہ صرف سیاسی سطح پر ہی نہ کرتے ہوئے اقتصادی، اخلاقی اور فکری سطح پر بھی کریں۔ کیونکہ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ استعمار ظاہری طور پر تو ملک سے رخصت ہوجاتا ہے لیکن تہذیبی طور پر اس کی باقیات ہمیشہ اسے اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہیں۔ انہوں نے الجزائری مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ مغربی مادیت کے راستے کو چھوڑ کر اسلامی توحید کے راستے پر آگے بڑھیں اور ایسا کرکے ہی صحیح معنوں میں وہ استعمار سے آزادی حاصل کرپائیں گے۔

الجزائر چھوڑنے کے بعد مالک بن بنی پہلے سعودی عرب آئے جہاں کچھ دنوں انہوں نے مکہ مکرمہ میں قیام کیا۔ بعد ازاں وہ مصر کے دارالحکومت قاہرہ منتقل ہو گئے (1956) جوان دنوں آزاد حکام کی حکمرانی میں تھا اور اس وقت تک اخوان المسلمون اور اس کے رہنماؤں کی آزمائش کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ قاہرہ میں مالک بن بنی کا قیام ان کی عملی زندگی کے ایک دوسرے دور کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ان کی زندگی میں ایسا تبدیلیاں آچکی تھیں جہاں وہ خود کو ایک اسلامی کارکن (Islamic Activist) سے زیادہ ایک اسلامی مفکر اور دانشور کے طور پر پیش کر سکیں۔ چنانچہ قاہرہ میں قیام کے دوران انہوں نے خود کو مطالعے، اسلامی شخصیات سے ملاقاتوں اور تصنیف و تالیف کے کام تک محدود رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ الجزائر سے ملک بدری کے باوجود آزاد مصری حکام نے ان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور مجموعی طور پر قاہرہ میں ان کا قیام آسانی اور آرام کے ساتھ گزرا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ قاہرہ میں مالک بن بنی کو ڈاکٹر عبدالصبور شاہین کی شکل میں ایک ایسا لائق و فائق شاگرد اور پیرو کار مل گیا جس سے نہ صرف یہ کہ مالک بن بنی کی تصنیفات (جو فرانسیسی زبان میں ہوئی تھیں) کا عربی زبان میں ترجمہ کر کے ان کے افکار و خیالات کو عرب دنیا میں عام کرنے میں اہم رول ادا کیا بلکہ چونکہ عبدالصبور شاہین کے اس وقت کے حکام (آزاد حکام) سے خوش گوار تعلقات تھے اس لیے مالک بن بنی کی نقل وحرکت اور افکار کی اشاعت میں ان کی جانب سے کبھی کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔

قاہرہ میں قیام کے ابتدائی زمانے تک مالک بن بنی کی عربی زبان کی واقفیت ابتدائی شدبد سے زیادہ نہ تھی اور وہ اپنے خیالات کا اظہار اس زبان میں نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنا علمی کام فرانسیسی زبان میں کرتے اور فرانسیسی زبان سے ان کے خیالات کو ڈاکٹر عبدالصبور شاہین عربی زبان میں منتقل کرتے۔ البتہ بعد میں انہوں نے عربی زبان میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی اور براہ راست عربی زبان میں لکھنے لگے تھے۔ ایک طویل عرصے تک قاہرہ میں قیام کے بعد مالک بن بنی 1973 میں اپنے وطن الجزائر لوٹے، البتہ الجزائر لوٹنے کے بعد انہیں کچھ زیادہ مہلت عمل نہیں ملی اور اسی سال اکتوبر کے مہینے میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

18.3.3 مالک بن بنی کی فکر:

استاذ مالک بن بنی کی زندگی میں ہمیں فکر و عمل کا ایک بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ انہوں نے اسلام اور بیرونی افکار کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس مطالعے کی وجہ سے وہ اپنی ایک فکر پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے زوال و پسماندگی کی نہ صرف نشاندہی کی بلکہ اس زوال وانحطاط سے نکلنے کا ان کے سامنے حل بھی پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ان کا زوال وانحطاط اس لیے ہے کہ انہوں نے خود کو گروہوں، پارٹیوں اور گروپوں میں تقسیم کر لیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بھی چاہتا ہے انہیں تر نوالہ سمجھ کر نگل جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر انہیں اس زوال وانحطاط کی کھائی سے نکلنا ہے تو سب سے پہلے اپنے شیرازے کو منظم کرنا ہوگا اور یہ تنظیم کسی اور بنیاد پر نہیں بلکہ اسلامی توحید کے عقیدے اور عمل کی بنیاد پر وجود میں آنی چاہیے۔ انہوں نے مسلم نوجوانوں کے سامنے توحید کے عقیدے پر مبنی اسلامی تہذیب کا ایک ایسا نقشہ اور خاکہ پیش کیا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر قیادت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلم نوجوانوں کو دعوت دی کہ وہ انسانی ورثے پر غور وخوض کریں، ان کا مطالعہ کرتے ہوئے اسلامی معیارات کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور پھر اس میں سے جو اسلام کے متعین کردہ معیار پر پورا اور کھرا اترتا ہوا اسے لے لیں اور جو اس کے برعکس ہوا سے رد کر دیں انہوں نے کہا کہ ایسا کر کے ہی وہ اس

دنیا میں عزت وشرافت کی زندگی گزار سکتے ہیں اوراس ذمہ داری کو بھی بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں جو ان پر بطور خلیفۃ فی الارض عائد ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ استاذ مالک بن بنی نے اپنے پیچھے ایک فکری ورثہ چھوڑا ہے اور عرب دنیا میں نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو ان کی فکر کو حرز جاں بنائے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ وہ عالمی سطح پر بھی ان کے فکری وعلمی اثرات محسوس کیے گئے ہیں چنانچہ 1991 میں ملیشیا کی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ان کی فکر وشخصیت کے حوالے سے ایک بڑا عالمی سطح کا سیمینار منعقد ہو چکا ہے، جس میں دانشوروں اور اسکالروں کے علاوہ مختلف شعبہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے مسلم قائدین نے بھی شرکت کی تھی۔ استاذ مالک بن بنی نے اپنے پیچھے جو علمی سرمایہ چھوڑا ان میں 'الظاہرہ القرآنیۃ' (قرآنی مظاہر)، وجہۃ العالم الاسلامی (عالم اسلام کا رجحان) 'الفکرۃ الافریقیۃ الآسیویۃ (افریقی ایشیائی فکری تحریک)،' شروط النہضۃ (انقلاب کی شرطیں) اور بین الرشاد والتیہ (ہدایت وضلالت کے درمیان) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

18.4 مصطفیٰ سباعی

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسلم دنیا عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ عثمانی خلافت اگر ایک طرف آخری سانسیں لے رہی تھی تو دوسری طرف عرب دنیا میں عرب قومیت کے عفریت کو تقویت دے کر یورپ کی استعماری طاقتیں خطے میں اپنے عزائم کی تکمیل میں لگی ہوئی تھیں۔ نادان عرب عثمانی یا ترک خلافت کا قلادہ تو اپنی گردنوں سے اتارنے میں بظاہر کامیاب رہے لیکن بدلے میں انہیں جو کچھ ملا وہ مغربی استعمار کی غلامی اور عرب دنیا کی چھوٹے چھوٹے علاقوں میں غیر فطری تقسیم۔ ان حالات میں جن شخصیات نے قومیت یا علاقائیت کے حصار سے نکل کر بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی آزادی وخود مختاری اور ان کی فلاح وبہبود کے لیے نہ صرف منصوبے اور خاکے بنائے بلکہ اپنی جدوجہد کے ذریعہ ان میں رنگ بھرنے کی بھی کوشش کی، ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی ایک ایسا ہی نام ہے۔ وہ ایک نامور عالم، شعلہ بیان مقرر، ممتاز انشا پرداز اور اسلامی قانون کے ماہر تھے۔ مصطفیٰ حسن سباعی کی شخصیت کا اہم امتیاز یہ ہے کہ ایک طرف انہوں نے فکری محاذ پر یوری علماء اور دانشوروں کی جانب سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا دفاع کیا تو دوسری جانب عملی میدان میں جب برطانیہ کی مدد سے یہودیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو اس کے دفاع کے لیے فریضۂ جہاد کی عملی سعادت بھی حاصل کی۔ دفاع اسلام کے حوالے سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' (اسلامی قانون سازی میں سنت اور اس کا مقام) کی تالیف ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی میں کسی اور کام کے علاوہ صرف یہی ایک کام کرتے تب بھی علمی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے باقی رہتا۔

18.4.1 ابتدائی زندگی

ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی 1915 میں شام کے مشہور اور مردم خیز شہر حمص میں پیدا ہوئے۔ حمص وہ شہر ہے جسے سیف اللہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ان کا خاندان حمص کا مشہور ومعروف خاندان تھا اور سیکڑوں برس سے ان کے آباؤ اجداد حمص کی جامع مسجد (جامع کبیر) کے امام وخطیب ہوتے آرہے تھے، چنانچہ ان کے والد حسن سباعی کھیل کود اور دوسری تفریحی

پروگراموں سے الگ رہتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے گھر کا ماحول بہت ہی مذہبی تھا اور ان کے والد جو حمص کے بڑے عالم تھے اور ان کے یہاں اکثر علماء کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ زیادہ تر انہیں ان علمی مجلسوں میں اپنے ساتھ رکھتے تھے جو ان کے گھر پر یا جامع مسجد دمشق میں ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح بچپن سے ہی مصطفیٰ حسن سباعی کو علمی ماحول ملا۔ اسی طرح دوسری عالمی جنگ کے بعد جب مغربی سامراجی طاقتوں نے عرب علاقوں کے حصے بخرے کرنا شروع کیے تو ان کے خلاف جن لوگوں نے آواز اٹھائی ان میں ان کے والد حسن سباعی بھی شامل تھے۔ کم عمری کے باوجود مصطفیٰ حسن سباعی اپنے والد کے ساتھ ان مظاہروں اور جلوسوں میں شرکت کرتے جو ان کے ملک شام پر فرانسیسیوں کے قبضے کے خلاف ہوتے تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچپن میں ہی ان کی اس علمی اور عملی تربیت کا آغاز ہو گیا تھا جو آگے کی زندگی میں ان کے کام آنے والی تھی۔

روایت کے مطابق مصطفیٰ حسن سباعی نے تعلیم کا آغاز اپنے گھر سے کیا جہاں انہیں ان کے والد کی تربیت اور نگرانی حاصل تھی۔ بعد ازاں مقامی مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد معہد شریعۃ میں داخلہ لیا اور وہاں سے گریجویشن (بی اے) کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ہی ان کی قائدانہ اور انتظامی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آنے لگی تھیں۔ انہوں نے فرانسیسیوں کے خلاف حمص میں تقریریں کیں اور متعدد مظاہروں کو بھی منظم کیا، اس جرم میں جب کہ ان کی عمر صرف سولہ برس تھی (1931) انہیں پہلی بار گرفتار کیا گیا۔ معہد شریعۃ میں تعلیم کی تکمیل نے بعد ان کے والد نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انہیں عالم اسلام کی مایہ ناز درس گاہ جامعہ ازہر بھیج دیا۔ جامعہ ازہر میں مصطفیٰ حسن سباعی نے 1933 میں داخلہ لیا اور مصر میں ان کا قیام 1941 تک آٹھ برس رہا۔ اس دوران انہوں نے جامعہ ازہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی خاص طور پر علوم اسلامی کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا اور ازہر کے نصاب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے دیگر کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ ان کے مطالعے کا خاص محور اسلامی فقہ و قانون تھا۔ جامعہ ازہر کی تعلیم کے دوران ہی جب ان کا قیام مصر میں تھا وہ الاخوان المسلمون کے قائد و رہنما امام حسن البنا سے متاثر ہوئے اور ان سے رابطے میں آئے اور اخوان المسلمون میں شامل ہو گئے۔ قیام مصر کے دوران انہوں نے مصر پر انگریزی قبضے کے خلاف جدوجہد میں بھی حصہ لیا اور دوبار (1934، 1941) جیل بھی گئے۔ بعد میں برطانوی حکام نے انہیں فلسطین میں بھی کچھ دنوں قید رکھا جہاں سے رہائی کے بعد وہ اپنے وطن شام واپس لوٹے۔ البتہ شام لوٹ کر ان کی استعمار مخالف سرگرمیاں جاری رہیں۔

18.4.2 میدان عمل میں

مصر سے واپسی کے بعد استاذ مصطفیٰ سباعی کچھ عرصہ اپنے آبائی شہر حمص میں درس و تدریس سے وابستہ رہے اور اس دوران ان کی مسلمانوں کی اصلاح اور استعمار سے آزادی کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ البتہ ان کے عزائم کے لیے حمص کی سرزمین محدود تھی اس لیے انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو وسعت دینے کے مقصد سے شام کے دارالحکومت دمشق منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا جہاں انہیں کام کرنے کے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔ دمشق پہنچنے کے بعد انہیں ایک احساس یہ ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کو نہ تو جدید تعلیمی ادارے پورا کرتے ہیں نہ ہی روایتی تعلیمی ادارے اس کے لیے کافی ہیں۔ اس لیے دمشق منتقلی کے بعد ایک بڑا کام انہوں نے یہ کیا کہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر 'المعہد العربی الاسلامی' کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی جہاں ابتدا سے لے کر ہائی اسکول تک طلبہ و طالبات کی تعلیم کا علیحدہ علیحدہ انتظام

تھا۔اس میں جدید نصاب کی تدریس کے ساتھ ساتھ اسلامیات کی تعلیم اور اسلامی خطوط پر طلبہ کی تربیت کا خاص اہتمام تھا۔ یہ ایک مثالی تعلیم گاہ تھی بعد میں جس کی متعدد شاخیں شام کے مختلف شہروں میں قائم ہوگئیں۔

اس دوران 1942 میں استاذ مصطفیٰ سباعی نے اخوان کے طرز پر ایک ڈھیلا ڈھالا اجتماعی نظم قائم کیا جسے 1945 میں باقاعدہ ایک تنظیم کی شکل دے دی گئی اور انہیں اس کا پہلا مراقب عام منتخب کیا گیا۔ شام میں اخوان کی ترجیحات کے حوالے سے انہوں نے ایک کتابچہ ''دروس فی دعوۃ الاخوان'' (اخوانی دعوت کے چند اسباق) کے نام سے ترتیب دیا۔ اس میں انہوں نے سیاسی اصلاح، وطن کی آزادی، مزدوروں اور کسانوں پر ہونے والے ظلم کے خاتمے کا پروگرام، اسکولوں اور مدارس کے قیام کی ضرورت، نوجوانوں کے مراکز کے قیام اور مختلف امور سے متعلق کمیٹیوں کے قیام کی نہ صرف تجویز پیش کی بلکہ پورے ملک شام میں دورہ کرکے انہیں یقینی بنانے کی کوشش بھی کی۔ 1948 میں مصری، اردنی اور فلسطینی اخوان کے ساتھ مل کر انہوں نے فلسطین کی جنگ میں عملی طور پر حصہ لیا خاص طور پر یروشلم اور مسجد اقصیٰ کے دفاع کے لیے ان کی کوششیں قابل ذکر ہیں۔

مصر میں قیام کے دوران ہی بعض مصری متجددین کی جانب سے اسلام اور اس کے مختلف پہلوؤں پر خاص طور پر سنت پر متعدد اعتراضات سامنے آئے تھے۔ یہ وہ متجددین تھے جو یورپی مستشرقین سے متاثر تھے اور ان کے افکار و خیالات کی عرب دنیا میں اشاعت کے کام میں مصروف تھے، استاذ مصطفیٰ حسن سباعی نے ان الزامات اور اعتراضات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور سنت کے حوالے سے ان کے اعتراضات کے جواب میں ایک طویل مضمون مصری رسائل میں شائع بھی کیا تھا۔ لیکن یہ ان کی نظر میں کافی نہیں تھا۔ چنانچہ 1949 میں جب شام میں اخوان کا کام کسی قدر مستحکم ہو چکا تھا تو انہوں نے 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا وقیع مقالہ پیش کیا اور اس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل ہوئی۔ یہ مقالہ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔ اس مقالے میں انہوں نے مصری دانشور احمد امین (مصنف فجر الاسلام وضحیٰ الاسلام)، محمود ابوریہ اور مستشرق گولڈزیہر کے ذخیرہ حدیث سے متعلق اشکالات، اعتراضات اور الزامات کا جائزہ لیا ہے اور ان کا مدلل جواب دیا ہے۔

1950 میں استاذ مصطفیٰ حسن سباعی کا تقرر دمشق یونیورسٹی میں بطور لکچرر شعبۂ قانون میں ہوا اور بعد میں انہیں اس شعبے کا سربراہ بھی بنا دیا گیا۔ بطور استاد ان کا اثر طلبہ کے سبھی حلقوں میں تھا اور ان کے لکچر دلچسپی سے سنے جاتے تھے۔ چونکہ ان کے ذمہ عائلی قانون کی تدریس تھی اس لیے انہوں نے اس کی ایک شرح ''شرح قانون الاحوال الشخصیہ'' کے نام سے تیار کی جو دو جلدوں میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ اس دوران استاذ سباعی شامی سیاست میں بھی سرگرم رہے اور دمشق سے پارلیمنٹ کے لیے منتخب ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہم خیال ممبران پارلیمان کے ساتھ ملک میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لیے جدوجہد کی جس کے نتیجے میں شام کے قانون کا بنیادی ماخذ اور اصل سرچشمہ فقہ اسلامی کو قرار دیا گیا۔ البتہ اس کے لیے افراد کار کہاں سے فراہم ہوں گے ملک میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا چنانچہ استاذ مصطفیٰ سباعی نے دمشق یونیورسٹی میں 'کلیۃ الشریعۃ' کے نام سے اسلامی قانون اور اس کے مختلف شعبوں کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کے لیے ایک مستقل فیکلٹی کے قیام کے لیے تحریک شروع کی گو مختلف حلقوں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن بالآخر 1952 میں شامی پارلیمنٹ کے ذریعہ دمشق یونیورسٹی میں ایک نئی فیکلٹی کلیۃ الشریعۃ کے قیام کا قانون منظور ہو گیا اور دسمبر 1954 میں باضابطہ اس فیکلٹی کا افتتاح ہوا اور استاذ مصطفیٰ سباعی اس کے پہلے

ڈین مقرر ہوئے، اسی طرح استاذ مصطفیٰ سباعی نے 'موسوعۃ الفقہ الاسلامی' (فقہ اسلامی کا انسائیکلو پیڈیا) کی تیاری کے کام کے آغاز میں بھی کلیدی رول ادا کیا اور اس کے سربراہ بھی رہے۔ البتہ یہ کام شام میں تکمیل نہ پاسکا اور بعد میں اس پورے پروجیکٹ کو کویت منتقل کردیا گیا اور وہیں اس کی تکمیل عمل میں آئی۔

استاذ مصطفیٰ حسن سباعی نے دنیا بھر میں مختلف موضوعات پر ہونے والی اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور وہاں اسلام کا دفاع علمی طور پر کیا۔ انہوں نے مختلف ممالک کے تعلیمی نظام کو جاننے اور سمجھنے کے مقصد سے اور وہاں کے علماء ودانشوروں کے خیالات کو جاننے کے لیے مختلف مغربی ملکوں کا بھی دورہ کیا تاکہ ان کے طریقۂ تعلیم وتحقیق کو سمجھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے 1956 میں اٹلی، برطانیہ، آئرلینڈ، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، فن لینڈ، جرمنی، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور فرانس وغیرہ ملکوں کا علمی وتعلیمی سفر کیا اور ان کی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کو دیکھنے کے علاوہ وہاں کے اساتذہ خاص طور پر اسلام پر کام کرنے والے مستشرقین سے ملاقاتیں کیں۔ اسی طرح 1957 دمشق یونیورسٹی کے تمام کالجوں کے ذمہ داروں کا ایک وفد لے کر روس کے سفر پر گئے جس کی دعوت ماسکو یونیورسٹی نے دی تھی۔ اس سفر کے دوران انہوں نے روس کے مختلف علاقوں میں موجود بیشتر یونیورسٹیوں کو دیکھا خاص طور پر ان میں مشرقی علوم، تاریخ اور سماجیات کے اساتذہ سے ملاقاتیں کیں اور مختلف موضوعات پر ان کے نقطۂ نظر کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

18.4.3 تصانیف

استاذ مصطفیٰ حسن سباعی ایک باعمل عالم، نامور محقق اور درجہ اجتہاد کے حامل فقیہ تھے انہوں نے داعی ومصلح ہونے کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی کے آغاز کے دنوں سے ہی صحافت سے جڑے رہے۔ مختلف اخبارات ورسائل کے مدیر رہے، ان میں اداریے اور مضامین لکھے۔ ڈاکٹر سباعی نے مختلف موضوعات پر دو درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، ان میں کئی ایسی ہیں جو سیکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

1- السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی

2- اخلاقنا الاجتماعیۃ

3- شرح قانون الاحوال الشخصیۃ

4- المرأۃ بین الفقہ والقانون

5- من روائع حضارتنا

6- احکام المواریث والوصایا والفرائض

7- نظام السلم والحرب فی الاسلام

8- الدین والدولۃ فی الاسلام

9- المرونۃ والتطور فی التشریع الاسلامی

10- احکام الصیام وفلسفۃ

11- القلائد من فرائد الفوائد

12- الصراع بین القلب والعقل

13- منہجنا فی الاصلاح

14- آلام وآمال

15- ہکذا علمتنی الحیاۃ

16- السیرۃ النبویۃ

السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی: یہ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب ان کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اور اس میں انہوں نے اسلامی قانون سازی کے حوالے سے سنت نبویؐ اور اس کی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوران مستشرقین یورپ کے زیر اثر مسلم دنیا میں بعض ایسے نام نہاد دانشور پیدا ہو گئے تھے جنہوں نے اس فکر کو عام کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی زندگی کے لیے صرف قرآن کی ہدایات کافی ہیں، کسی اور چیز کی ضرورت نہیں اور اس طرح انہوں نے سنتِ رسول اللہ کی حیثیت و مقام کو کم کرنے کی دانستہ کوشش کی۔ اس میں بعض مصری دانشور بھی شامل تھے اور انہوں نے حدیث و سنت کے حوالے سے بعض ایسے اعتراضات و سوالات اٹھائے تھے جو مغربی مستشرقین کے ذہن کی پیداوار تھے۔ اس سلسلے میں ان کی تحریروں کا بنیادی حوالہ مشہور مستشرق گولڈ زیہر کی 'تحقیقات' تھیں۔ مثال کے طور پر گولڈ زیہر نے مشہور محدث امام زہری کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس حوالے سے امام زہری کی شخصیت کے ساتھ ساتھ پورے ذخیرۂ حدیث کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا الزام ہے کہ امام زہری نے اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی خوشنودی حاصل کرنے کی لیے اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی مخالفت اور عداوت میں مسجد اقصیٰ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے ثابت کیا ہے کہ گولڈ زیہر کا یہ الزام غلط ہے اور دلائل کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ امام زہری کی ملاقات عبدالملک بن مروان سے حضرت عبداللہ بن زبیر کی وفات کے سات سال بعد ہوئی۔

ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی نے اپنی کتاب 'السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی' میں انہیں اعتراضات اور سوالات کا تعاقب کیا ہے اور دلائل کے ساتھ مستشرقین کی غلطیوں کو ثابت کیا ہے جو ان سے سرزد ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے سنت کے مقام، اسلامی شریعت میں اس کی حیثیت اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس کی اہمیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ذخیرہ سنت سے بے نیاز ہو کر اسلامی زندگی گزاری نہیں جاسکتی۔

18.4.4 بیماری اور وفات

ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی کو اللہ تعالیٰ نے دعوت و اصلاح، تنظیم اور تصنیف و تالیف کی بے پناہ صلاحیت عطا کی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس صلاحیت کا بھر پور استعمال کیا۔ 1958 میں ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور اس نے ان کے جسم کے نصف حصے کو بے کار کر دیا وہ چلنے پھرنے اور جسمانی کام کرنے سے معذور ہو گئے۔ اس وقت انہوں نے اپنے علمی کاموں کو منظم کرنا شروع کیا اور بیماری کے باوجود صرف سات برس کے عرصے میں اتنا علمی کام کر دکھایا جتنا کہ پوری پوری اکادمیاں کرتی ہیں۔ 1964 میں وہ حج کے ارادے سے حجاز گئے۔ کئی مہینے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے جوار میں قیام کیا۔ اس قیام کے دوران ہی مکہ مکرمہ کے کلیۃ الشریعۃ نے انہیں بحیثیت استاد مکہ مکرمہ میں قیام کی دعوت دی۔ استاد اس پر راضی بھی ہو گئے اور تیاری کے لیے دمشق گئے تا کہ حجاز منتقل ہو سکیں لیکن اللہ کو ایسا منظور نہیں تھا 3 / اکتوبر 1964 کو ان کا دمشق میں انتقال ہو گیا اور دمشق کے قدیم قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

معلومات کی جانچ

1۔ مالک بن بنی کا تعلق کس ملک سے تھا؟

2۔ مالک بن بنی کی کسی ایک تصنیف کا نام لکھیں۔

3۔ مصطفیٰ سباعی کا تعلق شام کے کس شہر سے تھا؟

4۔ دمشق یونیورسٹی میں کلیۃ الشریعۃ کا باضابطہ قیام کس سنہ میں عمل میں آیا؟

18.5 ڈاکٹر محمد حمید اللہ

بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی مسلم دانشوری کے افق پر جو چند نام بہت ہی نمایاں طور پر چھائے رہے ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب مسلم دانشوری کو اندرونی اور بیرونی سطح پر مختلف طرح کے چیلنجز کا سامنا تھا ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے مغرب کے قلب میں بیٹھ کر مغربی معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے تحقیق، تصنیف اور ترجمے کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ ہمیشہ ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ دنیا کی 22 زبانیں جاننے والا ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اردو، عربی، فارسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمن، ترکی (قدیم و جدید دونوں)، اطالوی اور روسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے دنیا کی سات زبانوں میں تحریری و تحقیقی کام کیا۔ اردو ان کی مادری زبان تھی، اس کے علاوہ انہوں نے عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں بھی مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ زبانوں سے ان کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے 85 سال کی عمر میں تھائی زبان سیکھی اور جب تک ان کے قویٰ نے ساتھ دیا وہ لکھنے پڑھنے کا کام مسلسل کرتے رہے۔ علم سے ان کی یہ دلچسپی اور لگاؤ ہی تھا کہ انہوں نے علائق دنیا سے بڑی حد تک خود کو آزاد رکھا۔ چند ضروری لوازمات کے علاوہ پیرس کے ان کے فلیٹ میں کتابیں ہی کتابیں تھیں اور حقیقی معنوں میں انہوں نے پوری زندگی کتابوں کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

18.5.1 پس منظر اور ابتدائی زندگی:

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا تعلق حیدر آباد کے ایک شریف، صاحب حیثیت اور علم دوست خاندان سے تھا۔ ان کے آباء واجداد کئی صدیوں پہلے عرب سے آ کر ہندوستان میں آباد ہو گئے تھے۔ مشہور صوفی اسکالر علاؤالدین علی ابن احمد مہائمی (جو ممبئی میں مدفون ہیں)، دکن کے معروف صوفی حبیب اللہ بیجاپوری اور بہمنی سلطنت کے نامور وزیر محمود گاواں کے قائم کردہ مشہور مدرسے کے آخری پرنسپل محمد حسین شاہد کا شمار ان کے اجداد میں ہوتا ہے۔ ان کے پردادا محمد غوث شرف الملک اسلامی وعربی علوم کے ماہر اور اردو، عربی، فارسی میں تیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے نانا قاضی محمد صبغت اللہ بھی ایک بڑے اسکالر اور فقیہ تھے اور مدراس کی ریاست میں چیف جسٹس کے عہدے پر مامور تھے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے والد مفتی ابو محمد خلیل بھی نامور عالم اور ادیب تھے اور ریاست حیدر آباد کے محکمہ مالیات میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

اس طرح کے سرسبز وشاداب خاندانی پس منظر میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ 9/فروری یا بعض حوالوں کے مطابق 19 فروری 1908 کو ریاست حیدر آباد (مملکت آصفیہ) کے دارالحکومت حیدر آباد، دکن میں پیدا ہوئے۔ مظہر ممتاز قریشی کے نام ایک خط میں ڈاکٹر حمید اللہ نے ہجری کیلنڈر کے مطابق اپنی تاریخ پیدائش 16 محرم الحرام 1326 ہجری لکھی ہے۔ ان کے والد کا نام جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ابو محمد خلیل اللہ تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنے آٹھ بھائی بہنوں (پانچ بہنیں اور تین بھائی) میں سب سے چھوٹے تھے، جو سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جس کی فضائیں روحانیت اور تصوف سے معطر تھیں۔ اس خاندان میں جدید علوم کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ان کی تعلیم کا آغاز روایتی انداز میں گھر سے ہوا، جہاں انہوں نے بعض ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا داخلہ حیدر آباد کے مشہور مدرسے جامعہ نظامیہ میں کرا دیا گیا۔ یہاں سے انہوں نے 1924 میں مولوی کامل کا درجہ پاس کیا اور اس طرح روایتی تعلیم کی تکمیل کی۔ اس زمانے تک جدید علوم کا چرچا عام ہو چکا تھا، اس کی اہمیت نوجوان حمید اللہ پر بھی واضح تھی البتہ گھریلو ماحول اور خاندانی روایات اس راہ میں حائل تھیں۔ چنانچہ انہوں نے گھر والوں کو بتائے بغیر میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان دیا اور اس میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ راز چھپا نہیں، مقامی اخبارات نے ان کی کامیابی کو نمایاں کر کے شائع کیا اور بات ان کے والد تک پہنچ گئی۔ خاندانی روایت کو توڑنے پر ان کے والد نے ان کی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی بلکہ نمایاں کامیابی حاصل کرنے پر انہوں نے بیٹے کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ اس طرح نوجوان حمید اللہ پر روایتی تعلیم کے بعد جدید تعلیم کے دروازے بھی کھل گئے۔

1924 میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے حیدر آباد کے مشہور تعلیمی ادارے جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) میں داخلہ لیا۔ یہاں سے انہوں نے اسلامیات میں ایم اے کرنے کے علاوہ بی اے اور قانون میں ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ان نمایاں کامیابیوں پر جامعہ عثمانیہ نے انہیں بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے اور بین الاقوامی اسلامی قانون میں ڈاکٹریٹ کے لیے وظیفے (اسکالرشپ) سے نوازا۔ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کے لیے متعدد مسلم اور یورپی ملکوں کا سفر کیا اور 1932 میں جرمنی کی بون یونیورسٹی سے ڈی فل (ڈاکٹر آف فلاسفی) کی ڈگری حاصل کی۔ بون یونیورسٹی نے ان کی صلاحیت اور مختلف مشرقی

زبانوں میں ان کی مہارت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اپنے یہاں اردو اور عربی کا لکچرر (استاذ) مقرر کرلیا۔ کچھ عرصہ جرمنی میں گزارنے کے بعد ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی مزید علمی پیاس کو بجھانے کی غرض سے پیرس (فرانس کا دارالحکومت) منتقل ہوگئے۔ پیرس میں انہوں نے سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور صرف گیارہ مہینے کے مختصر عرصے میں سوربون یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ڈگری عطا کی۔ یورپ میں قیام کے دوران ہی ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو ترکی کے دارالحکومت استنبول جانے کا موقع بھی ملے۔ یہاں پر انہیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے بہت سارے مخطوطات دیکھنے کو ملے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔

18.5.2 عملی زندگی

1935 میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بیرون ملک اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوکر وطن واپس لوٹے۔ وطن واپسی کے فوراً بعد ہی انہیں اسلامی فقہ اور بین الاقوامی اسلامی قانون کا جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر بنادیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے ان کی وابستگی 1948 تک رہی۔ بعدازاں 1948 میں جب ریاست حیدرآباد ہندیونین میں انضمام عمل میں آیا تو ڈاکٹر محمد حمید اللہ پیرس منتقل ہوگئے۔ پیرس منتقلی کے بعد انہوں نے یورپ اور دنیا کی دیگر مختلف یونیورسٹیوں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے، پیرس میں وہ نیشنل سائنٹفک ریسرچ سینٹر سے 1954 میں وابستہ ہوئے اور 1978 تک یہاں خدمات انجام دیں۔ اس دوران انہوں نے دنیا بھر میں مختلف کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کی اور یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔

18.5.3 تصنیفات

تدریس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا اصل میدان عمل تحقیق وتصنیف ہے۔ ان کی علمی تحقیقات اور تصنیفی خدمات کا دائرہ سات دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران انہوں نے دنیا کی سات بڑی زبانوں میں ایک ہزار سے زائد مقالات ومضامین لکھے جو سب کے سب علمی نوعیت کے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی تصنیفات کی تعداد بھی دو درجن سے زیادہ ہے جو بیشتر اردو، انگریزی، فرانسیسی اور عربی میں ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے تمام ہی کام علمی نوعیت کے ہیں اور ان میں سے سبھی کا تعلق کسی نہ کسی طور علوم اسلامی سے ہے، ان تمام کا احاطہ اور تعارف مختصر صفحات میں ممکن نہیں۔ ذیل میں ان میں سے چند کا مختصر تعارف دیا جارہا ہے:

1- **قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ اور تفسیر:** ڈاکٹر محمد حمید اللہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اس کی تفسیر بھی لکھی۔ اب تک اس ترجمہ وتفسیر کے تیس سے زائد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، آخری ایڈیشن جو شائع ہوا اس کی 20 لاکھ کاپیاں چھاپی گئیں۔ پہلی مرتبہ یہ ترجمہ قرآن 1959 میں پیرس سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ترجمہ قرآن مجید کسی بھی یورپی زبان میں قرآن مجید کا سب سے زیادہ چھپنے والا ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرانسیسی کے علاوہ انگریزی اور جرمن زبانوں میں بھی قرآن مجید کے ترجمے کیے۔ ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بعض اجزاء 1960 میں جنوبی افریقہ سے شائع ہوئے تھے جب کہ جرمن زبان میں ان کا ترجمہ قرآن مجید ہنوز طباعت کا منتظر ہے۔ قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ایک پوری کتاب قرآن مجید کے ترجموں کے حوالے سے "The Quran in Every Language" کے نام سے ترتیب دی ہے جس میں دنیا کی 125 زبانوں میں قرآن مجید کے ترجموں کا ذکر ہے اور ہر زبان میں قرآن کی پہلی سورہ (سورۂ فاتحہ) کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

یہ کتاب 1939 میں شائع ہوئی تھی۔

2- **خطبات بہاول پور:** اسلامیات یا اسلامک اسٹڈیز کا کوئی بھی طالب علم اس کتاب سے بے نیاز نہیں رہ سکتا، ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بنیادی طور پر یہ کتاب ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ان خطبات پر مشتمل ہے جو انہوں نے 1980 میں 8/مارچ سے لے کر 20/مارچ کے دوران بہاول پور کی اسلامک یونیورسٹی میں دیے تھے۔ مختلف عنوانات کے تحت دیے جانے والے ان خطبات میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اسلام کی ابتدائی تاریخ، قرآن، حدیث اور فقہ کی تدوین و تاریخ، بین الممالک اسلامی قانون اور غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ خطبات اردو زبان میں دیے گئے تھے اور ان کی اشاعت بھی اردو زبان میں ہوئی۔ بعد میں ان کا انگریزی ترجمہ "Emergence of Islam" کے نام سے شائع ہوا۔ خطبات کی تفصیل اس طرح ہے:

1- پہلا خطبہ: تاریخ قرآن

2- دوسرا خطبہ: تاریخ حدیث

3- تیسرا خطبہ: تاریخ فقہ

4- چوتھا خطبہ: تاریخ اصول فقہ و اجتہاد

5- پانچواں خطبہ: اسلامی قانون بین الممالک

6- چھٹا خطبہ: دین (عقائد، عبادات، تصوف)

7- ساتواں خطبہ: عہد نبوی میں مملکت اور نظم و نسق

8- آٹھواں خطبہ: عہد نبوی میں نظام دفاع اور غزوات

9- نواں خطبہ: عہد نبوی میں نظام تعلیم

10- دسواں خطبہ: عہد نبوی میں نظام تشریع و عدلیہ

11- گیارہواں خطبہ: عہد نبوی میں نظام مالیہ و تقویم

12- بارہواں خطبہ: عہد نبوی میں تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ

3- **تعارف اسلام:** اس کتاب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سادہ اسلوب اور عام فہم انداز میں اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے۔ کتاب کا دنیا کی 22 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جس سے اس کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

4- صحیفہ ہمام بن منبہ: تاریخ حدیث کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا کام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ صحیفہ ہمام بن منبہ وہ کتاب ہے جسے حدیث کے مشہور راوی اور صحابی رسول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اپنے شاگردوں کو پڑھانے کے لیے تیار کیا تھا۔

حضرت ہمام بن منبہ حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہیں اور انہوں نے اس صحیفے میں مندرج احادیث کی روایت حضرت ابو ہریرہ سے کی ہے۔ انہوں نے اس صحیفے میں مندرج احادیث (جن کی تعداد 138 ہے) کو لکھ کر اپنے استاد حضرت ابو ہریرہ کے سامنے پیش کیا تھا اور ان سے اس کی تصحیح و تصویب کرائی تھی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی وفات 58 ہجری میں ہوئی ہے گویا یہ صحیفہ بہرحال 58 ہجری سے پہلے کا ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا جیسا کہ بعض مستشرقین پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کا ایک قلمی نسخہ 1933 میں برلن کی کسی لائبریری سے حاصل کیا اور پھر ان دونوں مخطوطوں کی تحقیق کے بعد 1955 میں اسے حیدر آباد دکن سے شائع کیا۔ یہ پورا صحیفہ حدیث کی مشہور کتاب مسند احمد بن حنبل میں بھی نقل ہوا ہے اور چند لفظی اختلافات کے علاوہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زبانی روایت کا سلسلہ پورے طور پر قابل اعتماد ہے۔ واضح رہے کہ امام احمد بن حنبل کا سن وفات 240 ہجری ہے اور اس طرح دونوں کے درمیان 200 برس کا وقفہ ہے۔

ان کے علاوہ اردو زبان میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی مشہور کتابوں میں ''عہد نبوی میں نظام حکمرانی''، ''عہد نبوی کے میدان جنگ''، سیاسی وثیقہ جات''، ''امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی'' اور اسلامی قانون کا ارتقاء'' اہمیت کی حامل ہیں۔

بلاشبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایک نادرہ روزگار شخصیت تھے۔ انہوں نے دنیوی نام ونمود اور شہرت سے خود کو الگ رکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ یورپ کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اسلام اور اسلامی دانشوری کی ایسی خدمت کی اور اتنا بڑا کام کیا کہ اس کے لیے بڑی بڑی اکادمیوں کی ضرورت ہوتی ہے تقریباً 50 برس تک ان کا قیام پیرس کی ایک عمارت کی چوتھی منزل پر واقع ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہا، جس میں لفٹ کا انتظام بھی نہیں تھا اور اس کے لیے انہیں 180 سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ ان کا نام اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ مؤقر انعام ''شاہ فیصل ایوارڈ'' کے لیے پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اسے لینے سے منع کر دیا۔ اسی طرح 1987 میں حکومت پاکستان نے اعلیٰ ترین شہری اعزاز ''ہلال امتیاز'' سے انہیں سرفراز کیا لیکن انہوں نے اعزاز کے ساتھ ملنے والی 25000 امریکی ڈالر کی رقم ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد کو عطیہ کر دی، 1996 میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ شدید بیمار پڑ گئے اور انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں سے امریکہ میں مقیم ان کے اعزہ انہیں امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ول لے گئے تاکہ ان کی اچھی خدمت اور دیکھ بھال ہو سکے۔ یہیں پر 17 دسمبر 2002 کو ان کا انتقال ہوا۔

3.6 ڈاکٹر فضل الرحمان

بیسویں صدی کے مسلم اسکالرس اور دانش وروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا ہے۔ ایک ایسے دور میں جب روایت اور جدیدیت کے درمیان کش مکش اپنے عروج پر تھی ایک روایتی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر فضل الرحمان نے نہ صرف یہ کہ مشرق و مغرب کے جدید تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کی۔ وہ ایک جدید اور پروگریسو ذہن کے مالک تھے اور اس حوالے سے انہوں نے اسلام کو ایک جدید اور پروگریسو مذہب کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے حوالے سے، اپنی وابستگی کے دوران، وہ جدید مسلم سماج کو درپیش مسائل اور چیلنجوں کا ایک قابل عمل حل پیش کرنے کے خواہاں

تھے۔ یہ ممکن ہے کہ اس دوران ان کے جوافکار وخیالات منظر عام پر آئے ان میں سے بعض سے کچھ لوگ اتفاق نہ رکھتے ہوں لیکن اس سے ان کی علمیت اور فکر کی پختگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ خود کو راسخ العقیدگی کے دائرے کے اندر رکھیں اور اس کی بنیادی وجہ شاید یہ تھی کہ انہوں نے قدیم وجدید دونوں طرح کے علوم کے سرچشموں سے استفادہ کیا تھا اور دونوں کے ہی تقاضوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ انہوں نے مسلم دانش وری کے جامد ذہن کی سطح پر کچھ کنکر ضرور پھینکے لیکن اس سے ان کا مقصد اسلام کی کوئی نئی اور سواد اعظم سے الگ تعبیر پیش کرنا نہیں تھا بلکہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں جمود کی کیفیت ختم ہو اور مسلم دانش وری کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں۔ اس اعتبار سے فضل الرحمان کا مطالعہ ہماری نئی نسلوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

3.6.1 پس منظر اور ابتدائی زندگی

ڈاکٹر فضل الرحمان کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے کے ضلع ہزارہ سے تھا جو اب پاکستان کے صوبے خیبر پختون خوا میں ہے۔ انہوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو علم وفضل میں ممتاز تھا اور اس وجہ سے اطراف میں اسے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چوں کہ ان کا تعلق ضلع ہزارہ کے ملک خاندان سے تھا اس لیے ان کے نام کے ساتھ بھی کئی بار ملک کا لاحقہ لگا دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر فضل الرحمان 21 ستمبر 1919ء کو ضلع ہزارہ کے ملک خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولانا شہاب الدین تھا، چوں کہ ان کا خاندان دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے ان کے والد (مولانا شہاب الدین) کو مذہبی تعلیم کے حصول کے لیے دیوبند (موجودہ ہندوستان کا ایک قصبہ) بھیجا گیا جہاں سے انہوں نے اعلیٰ مذہبی تعلیم حاصل کی۔ دیوبند میں تعلیم کے دوران ان کے والد کو اس مشہور ادارے کے ممتاز اساتذہ خاص طور پر شیخ الہند مولانا محمود حسن (وفات 1920ء) اور مشہور فقیہ وصوفی مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات 1905ء) سے علمی وروحانی استفادے کا موقع ملا۔ البتہ وہ نرے روایت پسند نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے فضل الرحمان کی دینی اور جدید دونوں طرح کی تعلیم کا اہتمام کیا۔

ڈاکٹر فضل الرحمان مذہبی یا دینی تعلیم کے حصول کیلیے کسی مدرسے یا دارالعلوم میں داخل نہیں کیے گئے اس کے باوجود انہوں نے دینی علوم میں مہارت حاصل کی اور اپنی ذاتی دل چسپی سے انہوں نے اس وقت کے مدارس میں رائج درس نظامی کا پورا نصاب اپنے والد کی نگرانی اور سرپرستی میں مکمل کیا۔ اس تعلیم کی وجہ سے فضل الرحمان کو روایتی مذہبی علوم مثلاً فقہ، علم کلام، حدیث، تفسیر، منطق اور فلسفے وغیرہ میں خاص مہارت حاصل ہوگئی اور اس نے ان کی مستقبل کی شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمان نے آگے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں داخلہ لیا اور عربی زبان میں بی اے کی ڈگری امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔ بعد ازاں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ہی انہوں نے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ 1946ء میں ڈاکٹر فضل الرحمان مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مقصد سے انگلینڈ روانہ ہوئے، یہاں انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہاں پر انہوں نے ابن سینا کی نفسیات پر اپنا تحقیقی مقالہ پروفیسر سائمن وان دین برگ کی نگرانی میں مکمل کیا۔ آکسفورڈ یونی ورسٹی میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمان واپس وطن نہیں لوٹے بلکہ برطانیہ میں ہی تدریس سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔

18.6.2 عملی زندگی

1950ء میں آکسفورڈ سے تعلیم کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر فضل الرحمان تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا تقرر ڈرہم یونی ورسٹی میں فارسی اور مسلم فلسفہ کے استاد کے طور پر ہوا۔ یہاں پر وہ آٹھ برس تک پڑھاتے رہے تا آں کہ 1958ء میں ان کا تقرر کناڈا کی مشہور زمانہ یونیورسٹی میک گل یونی ورسٹی، مونٹریال کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں اسلامک اسٹڈیز کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کے طور پر ہو گیا، میک گل یونی ورسٹی کا انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، شمالی امریکہ میں اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد ادارہ تھا اور جس سے ولفرڈ کینٹول اسمتھ جیسے اسلامک اسٹڈیز کے ماہرین وابستہ رہ چکے ہیں۔ میک گل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے وابستگی نے ڈاکٹر فضل الرحمان کی شہرت کو دور دور تک پھیلا دیا اور اسلامک اسٹڈیز کے ماہر کے طور پر وہ پوری دنیا میں معروف ہو گئے۔ ان دنوں پاکستان میں اس وقت کے صدر جنرل ایوب خان کی قیادت میں جدیدیت کے فروغ کی تحریک جاری تھی اور وہ قانونی و سیاسی اصلاحات شروع کر چکے تھے۔ اس سے ان کا مدعا یہ تھا کہ وہ پاکستان میں جدید اصلاحات کو اس طرح نافذ کریں کہ وہ اسلامی اصول و ضوابط سے متصادم نہ ہوں۔ اس مقصد کے تحت ہی انہوں نے مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کیا تھا کہ جدیدیت اور اسلام کو ایک توازن کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ اس ادارے کی سربراہی کے لیے جنرل ایوب خان کو کسی ایسے اسکالر کی تلاش تھی جو نہ صرف جدیدیت اور اسلام کے تقاضوں سے واقف ہو بلکہ دونوں کے درمیان توازن کو برقرار رکھتے ہوئے درپیش مسائل اور چیلنجز کا حل پیش کرنے میں ادارے کی رہنمائی بھی کر سکے۔ ایوب خان کی نظر انتخاب مانٹریال میں ڈاکٹر فضل الرحمان پر پڑی۔ ڈاکٹر فضل الرحمان نے بھی اس چیلنج کو قبول کیا اور کناڈا کی نسبتاً محفوظ اور آرام دہ نوکری چھوڑ کر 1961ء میں پاکستان آ گئے۔ پہلے وہ ادارہ تحقیقات اسلامی سے بطور وزیٹنگ پروفیسر وابستہ ہوئے اور بعد ازاں اس کے ڈائرکٹر بنا دئے گئے جہاں وہ اس عہدے پر 1961 سے لے کر 1968ء تک سات برس فائز رہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائرکٹر کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل میں بھی کام کرنے کا موقع ملا، جو پاکستان کا اعلی پالیسی ساز ادارہ تھا۔

ڈاکٹر فضل الرحمان کو پاکستان میں اس سات سالہ قیام کے دوران اس اہم عہدے پر رہتے ہوئے اس بات کا موقع ملا کہ وہ حکومت کے اختیارات اور طریقہ کار کا بہت قریب سے مشاہدہ کر سکیں۔ پاکستان میں ان کے قیام کا یہ زمانہ ہنگامہ خیز بھی رہا کیوں کہ اس عہدے پر کام کرتے ہوئے ان کی حیثیت ایک ایسے دانش ور کی بنی جو حکومت کے آلہ کار کے طور پر کام کرتا ہے۔ اسی طرح اس دوران انہیں ان تلخ حقائق اور مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی حکومت کے ساتھ کام کرتے ہوئے پیش آتے ہیں اور جن سے اس وقت کا پاکستانی سماج سیاسی، سماجی اور علمی طور پر دو چار تھا۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ کے طور پر ڈاکٹر فضل الرحمان کو وسائل کی فراوانی تو ملی جس سے کہ وہ اپنے علمی و تحقیقی پروجیکٹوں کو آگے بڑھا سکتے۔ البتہ سماجی اصلاح کے جس مقصد کو لیکر وہ علمی کام کر رہے تھے حکومت یا سیاست سے قربت کے سبب انہیں سیاسی اور مذہبی دونوں حلقوں کی مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جو سیاسی پارٹیاں یا مذہبی جماعتیں ایوب خان کی مخالف تھیں انہیں پتہ تھا کہ ایوب خان کی اصلاحات پر روک لگانے کے لیے ضروری ہے کہ اصلاحات کے پروگرام کے پیچھے جو نظریاتی شخصیت کارفرما ہے اس کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے۔ چنانچہ ان جماعتوں اور گروہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمان پر زبردست تنقیدیں کیں۔ جن حوالوں سے فضل الرحمان پر تنقیدیں ہوئیں ان میں سے بعض یہ ہیں:

1۔ بینک کے سود کا مسئلہ اور اس کی حیثیت۔

2۔ زکوۃ

3۔ جانوروں کا مشینی ذبیحہ

4۔ عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی

5۔ سنت و حدیث کی حجیت کا مسئلہ

اس میں شک نہیں کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کی سربراہی اور اسلامی نظریاتی کونسل سے وابستگی کا یہ زمانہ ڈاکٹر فضل الرحمان کے لیے بہت ہی ہنگامہ خیز رہا۔ اس دوران نہ صرف یہ کہ ان کے علمی کام متاثر ہوئے بلکہ ان کی صحت بھی خراب ہوگئی۔ چنانچہ 1968ء کے موسم خزاں میں ان کا تقرر یونیورسٹی آف شکاگو میں افکار اسلامی کے پروفیسر کے طور پر ہوگیا۔ 1968ء میں انہیں شکاگو میں ہیرالڈ ایچ سوفٹ ڈسٹنگوشڈ سروس پروفیسر (Herald H. Swift Distinguished Service Professor) کے خطاب سے نوازا گیا۔ جس پر وہ 1980ء میں اپنی وفات تک کام کرتے رہے۔

18.6.3 تصانیف:

ڈاکٹر فضل الرحمان کی درج ذیل کتابوں کو علمی حلقوں میں شہرت حاصل ہے۔

1۔ اسلام، اس کا دوسرا ایڈیشن 1979 میں شکاگو یونیورسٹی سے شائع ہوا ہے۔

2۔ Prophecy in Islam: Philosophy and Orthodoxy یہ کتاب بھی شکاگو یونیورسٹی سے 1979 اور 2011 میں شائع ہوئی ہے۔

3۔ Islam and Modernity: Transformation of an Intellectud Tradition یہ کتاب شکاگو یونیورسٹی سے 1982ء میں شائع ہوئی ہے۔

4۔ Major Themes of the Quran، 2009 میں شکاگو یونیورسٹی نے شائع کی۔

5۔ Rivival & Reform in Islam، ون ورلڈ پبلی کیشن سے 1999ء میں شائع ہوئی ہے اسے ابراہیم موسیٰ نے ایڈیٹ کیا ہے۔

6۔ Islamic Methodology in History، ادارہ تحقیقات اسلامی نے 1965ء میں شائع کیا۔

7۔ Health & Medicine in the Islamic Tradition، 1987 میں کراس روڈ پبلی کیشن نے شائع کی ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا تعلق برصغیر کے کس شہر سے تھا؟

2۔ حدیث کی کون سی کتاب ڈاکٹر حمید اللہ کی کھوج ہے؟

3۔ ڈاکٹر فضل الرحمان پاکستان کے کس ادارے کے سربراہ رہے؟

4۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی زندگی کے آخری ایام کہاں گزرے۔

18.7 خلاصہ

خلاصہ یہ کہ اس اکائی میں مسلم دنیا کے نسبتاً جدید ترین مفکرین و مصلحین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مالک بن نبی الجزائر کے ایک مفکر و دانشور تھے جنہوں نے مغرب کے استعماری اور تہذیبی غلبے کے خلاف جدوجہد کو اپنی علمی سرگرمیوں کا محور بنایا اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کی ترقی کا راز ماضی کی بازیافت میں پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن سباعی علم و عمل کے جامع تھے، انہوں نے بیت المقدس کے دفاع کے لیے ہونے والے جہاد میں بنفس نفیس حصہ لیا۔ اسی طرح علمی محاذ پر ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی، جو اسلام پر مغربی مفکرین کی جانب سے کیے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے حدیث پر ان کا علمی کارنامہ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' اپنی نوعیت کی بے مثال علمی کاوش ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اسلام کے حوالے سے علمی کاموں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ انہوں نے یورپ میں رہتے ہوئے دفاع اسلام کا اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا کہ خود یورپ والے ان کی علمیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ و تفسیر ہو حدیث کی تحقیق و تالیف ہو یا اسلامی علوم کا تعارف انہوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا علم و تحقیق کے نادر نمونے یکجا کر دیے۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر کرنے کی کوشش کی جو اسلامی راسخ العقیدگی کو نقصان پہنچائے بغیر جدید مسلم معاشروں کی اسلامی بنیادوں پر تعمیر کو ممکن بنا سکے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی سے ان کی وابستگی اسی خواہش کا اظہار تھی۔ حالانکہ اس دوران بعض مسائل کے حوالے سے ان کی آراء کو لے کر ان کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن اس سے ان کی علمی حیثیت کم نہیں ہوئی۔

18.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ مالک بن نبی کی حیات و خدمات پر ایک مضمون لکھیں۔

2۔ مصطفیٰ سباعی کا تعارف ان کی تصانیف کے حوالے سے کرائیں۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے اہم تصنیفی کارناموں کا جائزہ لیں۔

4۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیں۔

18.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ مغربی افریقہ میں اسلام: شیخ محمد اسماعیل

2۔ تاریخ فکر اسلامی: محمد اجتباء ندوی